تلمیحاتِ اقبال

تلمیحاتِ اقبال

سید عابد علی عابد

بزمِ اقبال لاہور

تلمیحاتِ اقبال

تلمیحاتِ اقبالؒ

سیّد عابد علی عابد

بزمِ اقبالؒ، لاہور

جملہ حقوق محفوظ

طبع دوم : دسمبر ۱۹۸۵ء
تعداد : ۱۱۰۰

ناشر : احمد ندیم قاسمی
اعزازی سیکرٹری بزم اقبال، لاہور
طابع : رشید احمد چودھری
مطبع : مکتبہ جدید پریس، نوائے وقت ہاؤس، لاہور
قیمت : ۹۰ روپے

اِنتساب

ایس اے رحمٰن کے نام

جن کے ہاتھوں میں ثقافت اور ادب کے سر رشتے ہیں

"کہ گُل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند"

عابدؔ

صاحب طرز نثر نگار اور شاعر ابن انشاء مرحوم
کی یاد میں یہ کتاب انجمن ترقی اردو ہند
کی لائبریری کو پیش کی جاتی ہے

دیباچہ

اس کتاب کی اشاعت میں، جو تاخیر ہوئی، اس کی تفصیل سے آپ کو دلچسپی نہ ہوگی اور مجھے اس داستان کے دہرانے سے خواہ مخواہ اُلجھن ہوگی، اس لیے ان باتوں سے قطع نظر کرتا ہوں اور اُن دوستوں اور کرم فرماؤں کا ذکر کرنے پر اکتفا، جنھوں نے اس کتاب کی تالیف میں ہر طرح کی مدد دی۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم اور میاں محمد شریف نے بہت سے مشکل مرحلے طے کرنے میں اعانت فرمائی۔ اُن کی علمی رہنمائی کا سراغ ہر جگہ ملے گا۔ کہ کتاب کے حوالے اس کے شاہد ہوں گے۔

محبوب صدیقی نے اس تالیف کا مسودہ صاف کیا۔ یوں ایک کٹھن مرحلہ بہ خیر و خوبی طے ہو گیا۔ انھوں نے جس صبر (اور شکر) سے کام لیا ہے اس کا ذکر شاید ان کی عالی ظرفی کو گوارا نہ ہو لیکن مجھے بھی یہ منظور نہیں کہ اپنی احسان مندی کے اعتراف سے جی چراؤں۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۵۹ء — عابد علی

فہرست

حصۂ اردو

بانگِ درا

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
	الف	
۱	ابنِ بدرون	۳
۲	ارم	۴
۳	آرنلڈ	۵
۴	آغا خان (سر)	"
۵	امیر مینائی	"
۶	ان الملوک	۷
۷	اندلس	"
۸	ان وعد اللہ حق	۸
۹	انیسی شاملو	"
۱۰	اویس (حضرت)	۹
۱۱	ایمرسن	"
	ب	
۱	بلال رضؓ	۱۰
۲	بلبلِ شیراز	۱۱
۳	بو عبیدہ (جنگِ یرموق)	۱۳

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۴	بولہب	۱۳
۵	بیدل	〃
	پ	
۱	پورس	۱۶
۲	پیرِ کنعاں	〃
	ٹ	
۱	ٹینی سن (انگریزی شاعر)	۱۷
	ج	
۱	جوگندر (سر جوگندر سنگھ)	۱۸
	چ	
۱	چشتی (خواجۂ خواجگان)	۱۹
	ح	
۱	حالی	۲۱
۲	حرا	۲۳
	خ	
۱	خانم سلیمانی	۲۴
۲	خواجۂ بدر و حنین	۲۵
۳	خلافت	〃
	د	
۱	دارا	۲۶
۲	داغ	۲۷
	ذ	
۱	ذوالفقار علی خان (سر)	۳۰
	ر	
۱	رام	۳۱

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۲	رام تیرتھ (سوامی)	۳۱
۳	رضی دانش	۳۲
۴	رفعنالک ذکرک	〃
	ز	
۱	زلیخا	۳۳
	س	
۱	ساحرالموط	۳۵
۲	ساسانی	۳۷
۳	سامری	۳۸
۴	سربن	۳۹
۵	سروش	〃
۶	سکندر	۴۰
۷	سلجوق	۴۱
۸	سیّد (سر سید احمد خان)	۴۲
	ش	
۱	شالامار	۴۴
۲	شہ سوار چغتائی	۴۵
۳	شبلی (نعمانی)	۴۶
۴	شرابِ طہور	۴۷
۵	شگفتی (شانتی)	۴۸
۶	شکری (پاشا)	〃
۷	(وہ) شمع بارگاہِ خاندانِ مرتضوی	۴۹
۸	شودر	〃

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ	نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۹	شیکسپیئر	۴۹		**ک**	
	ص		۱	کرزن	۶۲
۱	صائبؔ	۵۱	۲	کلیم ہمدانی	〃
۲	صقلیہ	۵۲	۳	کُن (گلشنِ کُن)	۶۳
	ط			**گ**	
۱	طوبیٰ	۵۳	۱	گائیتری	۶۴
	ع		۲	گل شیراز	۶۶
۱	عبدالقادر	۵۴	۳	گنگا	〃
۲	عشرتِ امروز	۵۵	۴	گوتم (بُدھ)	۶۷
۳	عمر	〃	۵	گیتا	〃
۴	عنتری	۵۶		**ل**	
۵	عیسیٰ (حضرت)	〃	۱	لانگ فیلو	۶۸
	غ		۲	لایخلف المیعاد	〃
۱	غزالی	۵۷	۳	لولاک لما خلقت الافلاک	〃
۲	غلام قادر (روہیلہ)	۵۸	۴	لیس للانسان الا ما سعیٰ	〃
۳	غنچۂ دل	〃		**م**	
۴	غنی	〃	۱	مازنی	۶۹
	ف		۲	ماعرفنا	۷۰
۱	فاطمہ (بنتِ عبداللہ)	۵۹	۳	محبوبِ الٰہی (حضرت خواجہ نظام الدین)	〃
۲	فضل حسین (سر)	〃	۴	مہدی مجروح	۷۱
۳	فیصل	۶۰	۵	میر حجاز	〃
۴	فیضی	〃		**ن**	
	ق		۱	نانک (گورو)	۷۲
۱	قمی (ملک)	۶۱	۲	نمرود	۷۳

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۳	نوح (حضرت)	۷۳
۴	نیکر (دریا)	〃
	و	
۱	وقد کنتم	۷۴
۲	ولیم کوپر	〃
	ہ	
۱	ہفتاد و دو ملت	۷۵
۲	ہمایوں	〃

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۳	ہمالہ	۷۶
۴	ہیچو نے......	〃
	ی	
۱	یاجوج (ماجوج)	۷۷
۲	ینسلون	〃
۳	یورشِ بلغاری	〃
۴	یورشِ تاتار	〃
۵	یوسفِ ثانی (برادرِ علامہ مرحوم)	۷۸

ضربِ کلیم

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
	الف	
۱	ابوالہول	۸۱
۲	ابی سینیا	〃
۳	ارتباطِ حرف و معنی	۸۲
۴	اشتراکیت	۸۳
۵	اشراق	۸۷
۶	اہرامِ مصر	〃
۷	ایجادِ معانی	۹۰
	ب	
۱	بلشویک روس	۹۱
۲	بوعلی سینا	۹۲
۳	بہزاد	۹۵
۴	بیاں میں نکتۂ توحید آتو سکتا ہے	۹۷

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
	پ	
۱	پیرس کی مسجد	۹۹
	ت	
۱	تربیتِ لعل بدخشاں	۱۰۰
۲	تقدیر	〃
	ٹ	
۱	ٹیپو سلطان	۱۰۲
	ج	
۱	جامی	۱۰۶
۲	جلال و جمال	۱۱۰
۳	جل ترنگ	۱۱۱
۴	جمعیتِ اقوام	۱۱۳
۵	جنیوا	〃

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۶	جہاد	۱۱۳
	چ	
۱	چنگیز خاں	۱۱۴
۲	چوں دیدۂ راہ بیں نداری	۱۱۶
	ح	
۱	حُمہ	۱۲۰
۲	حرفِ لاتدع مع اللہ الٰہاً آخر	۱۲۱
۳	حمید اللہ خاں	″
	س	
۱	سپائی نوزا	۱۲۳
۲	سر راس مسعود	۱۲۶
۳	سرود	″
۴	سورۂ رحمان	۱۲۸
	ش	
۱	شریعت اور طریقت	۱۲۹
	ص	
۱	صاحبِ مازاغ	۱۳۳
	ط	
۱	طالبِ آملی	۱۳۴
	ع	
۱	علم کلام (الکلام)	۱۳۶
	ف	
۱	فلسطینی عرب	۱۳۹

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۲	فلسفہ	۱۳۹
۳	فلسفۂ ذات وصفات	۱۴۱
	ق	
۱	قم باذن اللہ	۱۴۲
۲	قل العفو	۱۴۴
	ک	
۱	کرامات	۱۴۵
	ل	
۱	لاالٰہ الا اللہ	۱۴۷
	م	
۱	محراب گل افغان	۱۴۹
۲	محی الدین ابن العربی	″
۳	مرزا علی محمد باب	۱۵۲
۴	مسجدِ قوت الاسلام	۱۵۴
۵	مقامِ شوق وسرور ونظر	″
۶	مکالماتِ فلاطون	۱۵۵
۷	مہدی (برحق)	۱۵۶
	ن	
۱	نادر شاہ افشار	۱۵۸
۲	نظامی	۱۵۹
	و	
۱	والنجم	۱۶۹
	ہ	
۱	ہیگل	۱۷۱

نمبرشمار	عنوانات	صفحہ	نمبرشمار	عنوانات	صفحہ
	ارمغانِ حجاز (اردو)				
	ب			**ص**	
۱	برزخ	۱۷۵	۱	صدائے تیشہ کہ بر سنگ می خورد دگر است	۱۹۲
	ج			**غ**	
۱	جمہوریت	۱۷۶	۱	غیبتِ صغریٰ	۱۹۳
	چ			**ق**	
۱	چیلیپا	۱۸۱	۱	قوالی	۱۹۴
	ح			**ک**	
۱	حسین احمد مدنی	۱۸۲	۱	کلیسا	۱۹۶
	د			**م**	
۱	دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است	۱۸۴	۱	معزول شہنشاہ	۱۹۷
۲	دیر	۱۸۸	۲	ملازادہ ضیغم لولابی	۱۹۸
	س		۳	ملوکیت	″
۱	سالک	۱۸۹		**ن - و**	
۲	سرِ اکبر حیدری	″	۱	نیرنگ و سیمیا	۲۰۰
۳	سرمایہ داری	″	۲	ولر	″
۴	سیزر	۱۹۱			
	بالِ جبریل				
	الف		۴	اسماعیل (حضرت)	۲۰۴
۱	ابوالحسن	۲۰۳	۵	اندیشۂ عجم	″
۲	ابوالعلا معری	″	۶	انقلاب	۲۰۶
۳	اسرافیل	″	۷	انوری	″

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
	ب	
۱	بدر و حنین	۲۰۹
۲	بسطامی	〃
	پ	
۱	پاژند	۲۱۱
	ت	
۱	تبریز	۲۱۲
	ج	
۱	جاوید	۲۱۳
۲	جنید	〃
۳	جنیدی و اردشیری	۲۱۴
	خ	
۱	خانقہی سلسلہ	۲۱۵
۲	خبر و نظر	〃
	ر	
۱	رشی	۲۱۷
	ز	
۱	زہرا	۲۱۸
	س	
۱	ستاروں سے آگے ...	۲۲۱
۲	سلمان (مسعود سعد)	۲۲۲
۳	سلیم	۲۲۳
۴	سنائیؒ	〃
۵	سنجر	۲۲۴

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
	ش	
۱	شورشِ اصلاحِ دین	۲۲۶
۲	شعیب (حضرت)	۲۲۷
	ص	
۱	صفاہاں	۲۲۸
	ط	
۱	طٰحہ	۲۲۹
۲	طغرل	〃
	ع	
۱	عبدالرحمٰن	۲۳۰
	غ	
۱	غزنی	۲۳۱
۲	غوری	〃
	ف	
۱	فردوسی	۲۳۳
۲	فرعون	۲۳۵
۳	فرقان	۲۳۶
	ق	
۱	قاآنی	۲۳۷
	ک	
۱	کابل	
۲	کشاف	
۳	کوفہ	۲۳۹

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ	نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
	ل			**ن**	
۱	لاتذر	۲۴۱	۱	نپولین	۲۴۸
۲	لاتخف	〃	۲	نطشہ	〃
۳	لاتقنطوا	〃	۳	نوشیرواں	۲۴۹
۴	لایحزنون	۲۴۲		**ہ**	
	م		۱	ہارون رشید	۲۵۰
۱	مجدد (الف ثانی)	۲۴۲	۲	ہرات	〃
۲	مریخ	۲۴۳		**ی**	
۳	مسجد قرطبہ	〃		یاسین	۲۵۲
۴	مسولینی	۲۴۷			

حصۂ فارسی

زبور عجم

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ	نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
	الف		۹	آفلین (جہاں بکیسر مقام آفلین است)	۲۶۵
۱	ابراہیم و آذر (نے براہیمی در و نے آذری)	۲۵۷	۱۰	اقلیدس	۲۶۶
۲	ابلیس	۲۶۱	۱۱	الاّ	〃
۳	ابنِ مریم	۲۶۲	۱۲	الست	〃
۴	احد	۲۶۳	۱۳	الوند	۲۶۷
۵	ارسطو	〃	۱۴	انا الحق (منصور حلاج)	〃
۶	اشراق	۲۶۴	۱۵	انا المسموم ما عندی بہ تریاق و لاراقی ادر کاسا و ناولہا الا یا ایہا الساقی	۲۶۹
۷	آفتاب	〃	۱۶	انا عرضنا	〃
۸	افلاطون	۲۶۵	۱۷	اہرمن	۲۷۰

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱۸	آہنگ	۲۷۰
۱۹	ایبک	۲۷۱
	ب	
۱	بدخشاں (لعل بدخشاں)	۲۷۲
۲	برہمن (برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است)	〃
۳	بیذق۔ فرزیں (اصطلاحاتِ شطرنج)	۲۷۳
۴	بیستوں	۲۷۴
۵	بیکن	۲۷۵
	پ	
۱	پروانہ	۲۷۶
۲	پرویز (خسرو)	۲۷۷
۳	پرویں	〃
۴	پطرس	〃
۵	پیرِ مغاں	۲۷۸
	ت	
۱	تاج (روضۂ تاج محل)	۲۷۹
۲	تجلی (کلیم)	۲۸۰
	ج	
۱	جاں	۲۸۲
۲	جبرئیل (امین)	۲۸۳
۳	جبر و قدر	〃
۴	جیحوں (دریا)	۲۸۶
	ح	
۱	حجاز	۲۸۷

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۲	حرم	۲۸۷
۳	حسن را دریوزہ از فطرت کند	۲۸۸
۴	حسین (سیدنا)	〃
۵	حکیم	〃
۶	حی الذی لا یموت	〃
۷	حیدر (خیبر)	۲۹۰
	خ	
۱	خواجہ	۲۹۱
۲	خاور	〃
۳	خدا خواہی بہ خود نزدیک تر شو	۲۹۲
۴	خسرو (بہ امید آنکہ روزے بہ شکار خواہی آمد)	۲۹۳
۵	خسرو (پرویز)	〃
۶	خضر (حضرت)	〃
۷	خلیل (حضرت)	۲۹۴
۸	خودی	〃
	د	
۱	دارا	۲۹۷
۲	دانائے تبریز (محمود شبستری)	〃
۳	دانۂ گندم	۲۹۸
۴	دمِ عیسیٰ	۲۹۹
۵	دے	〃
	ر	
۱	رازی	۳۰۰
۲	رضا	۳۰۱

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۳	راہ	۳۰۱
۴	رہرو	〃
۵	رومی	۳۰۲
	ز	
۱	زبورِ عجم	۳۰۴
۲	زم زم	۳۰۵
۳	زنار	〃
۴	زیر و بم	۳۰۶
	س	
۱	ساغرِ جم	۳۰۷
۲	سدرہ	۳۰۹
۳	سلطانِ بدر (رسول اکرمؐ)	〃
۴	سلیمان (حضرت)	〃
۵	سمرقند	۳۱۰
۶	سومنات	〃
۷	سہ پہلو	۳۱۱
۸	سینا (بوعلی - کوہِ سینا)	〃
	ش	
۱	شاخِ نبات	۳۱۳
۲	شام	〃
۳	شاہین	〃
۴	شنکر آچاریہ	۳۱۴
۵	شیر شاہ سوری	۳۱۵
	ص	
۱	صدیق	۳۱۷

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۲	صور	۳۱۸
۳	صوفی	〃
	ط	
۱	طوسی (خواجہ نصیر الدین، صاحبِ رصد مراغہ)	۳۱۹
	ع	
۱	عراق (عرب اور عجم)	۳۲۱
۲	عرفیؔ تو در زیرِ سخناں ہمچوں طفلاں آشنا بینی	〃
۳	عشق	〃
۴	عطار	۳۲۳
	غ	
۱	غزل	۳۲۴
۲	غزنوی (محمود غزنوی)	۳۲۵
	ف	
۱	فر	۳۲۶
۲	فرات	〃
۳	فرشتہ	۳۲۷
۴	فرنگ	〃
۵	فقر	〃
۶	فنون لطیفہ	۳۲۸
۷	فروردیں	۳۳۰
۸	فریدوں	〃
	ق	
۱	قدیم و محدث (گلشنِ راز جدید)	۳۳۱
۲	قلندر (دیکھئے فقر)	۳۳۲

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۳	قیامت ہاکہ رست از دستِ چنگیز (قیامتِ چنگیزی) چنگیز کا حملہ اسلامی ممالک پر	۳۳۲
	ک	
۱	کلیم (حضرت موسیٰؑ)	۳۳۴
۲	کم لبثتم	۳۳۵
۳	کہکشاں	۳۳۶
۴	کوفہ	〃
۵	کے	〃
۶	کیقباد	〃
۷	کیمیا	۳۳۷
	ل	
۱	لا	۳۳۸
۲	لات ومنات	〃
۳	لن ترانی (دیکھئے کلیم بھی اور حضرت موسیٰ)	۳۳۹
۴	لوح (لوح محفوظ، لوح وقلم)	〃
	م	
۱	ماہ	۳۴۱
۲	محمود و ایاز (تاریخ اور علامتی اہمیت)	۳۴۲
۳	مشائی	۳۴۳
۴	مشتری	〃
۵	مصر، یمن، کنعاں	〃
۶	معراج (بدنی معراج)	۳۴۴
۷	معنی	۳۴۵
۸	مغ بچہ	۳۴۶

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
9	مطلق	۳۴۷
۱۰	مقام	〃
۱۱	ملاّ	〃
۱۲	ملت	۳۴۸
۱۳	ممکن، واجب (اصطلاحات)	۳۴۹
۱۴	من	۳۵۰
۱۵	من یزدانی	۳۵۱
۱۶	موسیقی	〃
۱۷	مہرگاں	۳۵۲
	ن	
۱	نامۂ محمود (محمود شبستری)	۳۵۳
۲	نور السموات	۳۵۴
۳	نے نوازی (علامت)	〃
	و	
۱	وجود	۳۵۶
۲	وحدت	۳۵۷
	ہ	
۱	ہلال و چلیپا	۳۵۸
۲	ہمدان	۳۵۹
	ی	
۱	یزداں (اہرمن بھی دیکھئے)	۳۶۰
۲	یوسف (حضرت)	۳۶۱

پیامِ مشرق

الف

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	آتش تبریز	۳۶۵
۲	اردشیر پاپکاں	۳۶۶
۳	ادریس	″
۴	ارژنگ	۳۶۸
۵	آگسٹس کومٹ	۳۶۹
۶	اللہ	۳۷۰
۷	آلِ عثمان	″
۸	امیر امان اللہ خان	۳۷۱
۹	آئن سٹائن	۳۷۲
۱۰	آئینِ سلیمانی	۳۷۳
۱۱	ایوب (حضرت)	۳۷۴
۱۲	ایوبی	۳۷۵

ب

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	بائرن	۳۷۶
۲	بخارا	۳۷۷
۳	براؤننگ	۳۷۸
۴	برگساں	″
۵	برہمن	۳۷۹
۶	بوذر	۳۸۰

پ

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	پہلوی	۳۸۱
۲	پیرِ مغرب (گوئٹے)	۳۸۲

ت

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	تاتار	۳۸۳
۲	تورانی	۳۸۴
۳	تیمور	″

ٹ

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	ٹالسٹائی (روسی مفکر اور ادیب)	۳۸۶

ج

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	جبروت	۳۸۷

خ

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	خانم سلیمانی	۳۸۸
۲	خاقانی	۳۸۹
۳	خالد بن ولید	″
۴	خراسان	۳۹۰
۵	خیبر کیتھر	″

د

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	دل	۳۹۱

ر

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	رازی	۳۹۲
۲	ربِّ زدنی	۳۹۳

ز

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	زحل	۳۹۴

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۲	زہرہ	۳۹۵
	س	
۱	سلمیٰ سلیمیٰ	۳۹۷
۲	سمندر	″
۳	سیدکلؒ صاحب ام الکتاب	۳۹۸
۴	سیمیا	″
	ش	
۱	شبیر	۳۹۹
۲	شوپن ہار	۴۰۰
۳	شیراز	۴۰۱
	ط	
۱	طارق بن زیاد	۴۰۲
	ع	
۱	عالمگیر	۴۰۴
۲	عرفی	۴۰۵
۳	علم الاسماء	۴۰۶
	غ	
۱	غالب	۴۰۸
	ف	
۱	فارابی	۴۱۱
۲	فاروق (حضرت عمرؓ)	″
۳	فردوس گوش	۴۱۲
۴	فغفور	″

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
	ق	
۱	قلزم	۴۱۳
۲	قہستان	″
	ک	
۱	کابل	۴۱۴
۲	کارل مارکس	″
۳	کاشان	۴۱۵
۴	کاشغر	″
۵	کاشمر	۴۱۶
۶	کانٹ	۴۱۶
۷	کعبتین	۴۱۷
۸	کوثر و تسنیم	″
	گ	
۱	گوئٹے	۴۱۷
	ل	
۱	لاک	۴۱۸
۲	لالۂ طور	″
۳	لینن	۴۱۹
	م	
۴	مات (اسپ۔ فیل۔ فرزیں)	۴۲۰
۵	مدائن	۴۲۱
۶	(ما) توارت بالحجاب	″
۷	مراد	″
۸	مزدک	″

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۶	مصطفےٰ کمال پاشا	۴۲۲
	ن	
۱	نظیری	۴۲۳
۲	نیل	"

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
	و	
۱	ولیم قیصر	۴۲۵
	ی	
۱	یسفک الدماء خصیم مبین	۴۲۶

جاوید نامہ

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
	الف	
۱	ابغض الاشیاء عندی الطلاق	۴۲۹
۲	ابوجہل	"
۳	ابوسعید ابوالخیر	۴۳۰
۴	احمد شاہ ابدالی	۴۳۵
۵	ادعونی	۴۳۶
۶	ارّہ	"
۷	افرنگیس	۴۳۷
۸	الآ بسلطان	۴۳۸
۹	الارض للہ	۴۳۹
۱۰	الاسلام جاء غریب	"
۱۱	الہ الواصل	"
۱۲	آں ز ایراں بود و ایں ہندی نژاد آں ز حج بیگانہ و ایں از جہاد	۴۴۰
۱۳	انقلاب المان	"
۱۴	ان کنت ازمعت الفراق	۴۴۱
۱۵	انہم اعجاز نخل خاویہ	"
۱۶	انی جاعل	۴۴۲
۱۷	اہل خطہ	۴۴۴
۱۸	آیۂ تسخیر	۴۴۵
۱۹	آیۂ لا تفسدوا	۴۴۶
	ب	
۱	برتری ہری	۴۴۷
۲	بر مقامِ عبدہٗ گردد رقیب	۴۴۸
۳	بعل	"
	ت	
۱	تا نہ بینی از مقام ما رمیت	۴۵۰
	ج	
۱	جمال الدین افغانی	۴۵۱
۲	جنگ را رہبانیِ اسلام گفت	۴۵۳
	چ	
۱	چاہِ بابل	۴۵۴
	ح	
۱	حضور	۴۵۵
	خ	
۱	خافطین و یلدرم	۴۵۶
۲	خالصہ	"
۳	خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست	"

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۴	خوشحال خاں خٹک	۴۵۷
۵	خیام	۴۵۹
	د	
۱	داؤد	۴۶۲
۲	دودہ آدم کنفس واحدہ	۴۶۳
۳	دہقاں	〃
۴	دیو	۴۶۴
	ر	
۱	رب الفراق	۴۶۵
۲	رستم	〃
۳	رخش	۴۶۷
	ز	
۱	زاں سوئے گردوں بگوائی قریب	۴۶۸
۲	زروان	〃
۳	زوج مشتری	۴۶۹
۴	زہرہ	۴۷۰
۵	زہیر	۴۷۱
۶	زین العابدین	〃
	س	
۱	سام وحام	۴۷۳
۲	سعید حلیم پاشا	۴۷۴
۳	سحبان	〃
۴	سید علی (ہمدانی)	〃
	ش	
۱	شاپور	۴۷۸

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۲	شبلی	۴۷۸
۳	شرف النساء	۴۷۹
۴	شہاب الدین	〃
	ص	
۱	صادق	۴۸۱
	ط	
۱	طاسین گوتم	۴۸۴
۲	طاہر غنی	۴۸۶
۳	طواسین	۴۸۸
	ع	
۱	عارف ہندی	۴۸۹
۲	عبد الصمد	〃
۳	عسر (بت)	〃
	غ	
۱	غسر (بت)	۴۹۰
۲	غیر حق ہر شے کہ بینی ہالک است	〃
	ف	
۱	فسر	۴۹۱
۲	فضیل	〃
۳	فلاطوس	۴۹۲
۴	فواد	۴۹۳
۵	فیصل	〃
	ق	
۱	قرۃ العین طاہرہ	۴۹۴
۲	قریہ ہا از دخل شاہاں خوار و زبوں	۴۹۷

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۳	قشرود	۴۹۷
	ک	
۱	کرم (حضرت ایوب)	۴۹۸
۲	کشز (کچنر)	۴۹۹
۳	کل یوم	″
۴	کیمیائے آفتاب	۵۰۰
	ل	
۱	لا یراعی لا یخاف	۵۰۱
۲	لاہوت	″
۳	لن تنالو البر	۵۰۲
۴	لی مع اللہ وقت	″
	م	
۱	مرو	۵۰۴
۲	مظفر بیگڑہ	″
۳	مہدی سوڈانی	۵۰۵
۴	میر جعفر	″
۵	می شناسی حرص فقر حاضر است	۵۰۷
	ن	
۱	نازعات	۵۰۸
۲	ناسوت	۵۰۸
۳	ناصر خسرو	″
۴	نسر	۵۱۰
۵	نسل مہر	″
۶	نشاط باغ	″
۷	نوجوانا نیمۂ پیری است عمر	۵۱۱
۸	نور	″
	ہ	
۱	ہبل	۵۱۲
۲	ہرچہ از حاجت فزوں داری بدہ	۵۱۳
	ی	
۱	یا اولی الامر کہ منکم شان اوست	۵۱۴
۲	یا لیت	″
۳	یرعنید	۵۱۵
۴	یزدجرد	″
۵	یعوق	″

پس چہ باید کرد

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
	الف	
۱	ابریشیاں	۵۱۹
۲	الحمراء	۵۲۰
۳	الصّفّٰت	۵۲۶
۴	اُمّی	″
۵	آیۂ فاصبحتم	″

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
	ب	
۱	بایزید	۵۲۷
	ج	
۱	جاناں	۵۲۸
	ح	
۱	حکم انظر	۵۳۰
۲	حکمتِ فرعونی	″
	ر	
۱	ربی الاعلیٰ	۵۳۲
۲	روس	۵۳۲
	س	
۱	سلطان صلاح الدین ایوبی	۵۳۴
	ف	
۱	فکرِ کافر	۵۳۸
	ل	
۱	لاقیصر و کسریٰ	۵۴۰

ارمغانِ حجاز

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
	الف	
۱	ابوحامد	۵۴۳
	ب	
۱	بہشت	۵۴۷
	خ	
۱	خواب و خستگی	۵۴۸
۲	خسرو	″
	د	
۱	دخمہ	۵۵۹
	ص	
۱	صلبت الکاس عنا ام عمرو وکان الکاس مجراہا الیمینا	۵۶۱
	ط	
۱	طاغوت	۵۶۳
	ع	
۱	عبدالعزیز (ابن سعود)	۵۶۵
	ق	
۱	قد قامت	۵۶۸
	ک	
۱	کیکاؤس	۵۶۹
	م	
۱	منکر نکیر	۵۷۲
۲	منوچہری	″
	ن	
۱	نخستیں بادہ کاندر جام کردند	۵۷۵

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۲	نرگس	۵۷۷
۳	نیاگاں	۵۷۷

مثنوی مسافر

الف

۱	آب جیواں	۵۸۱
۲	اسریٰ	۵۸۲

ب

۱	بابر	۵۸۳
۲	بحیرۂ احمر	۵۸۷
۳	برزخ	۵۸۸

ح

۱	حکیم غزنوی	۵۸۹
۲	حی لایموت	″

د

۱	دانائے طوس	۵۸۹

س

۱	سلطان محمد فاتح	۵۹۰

ص

۱	صبغۃ اللہ	۵۹۳
۱	ظاہر شاہ	۵۹۴

ع

۱	عارف	۵۹۵

ف

۱	فاران	۵۹۸

ق

۱	قندھار	۵۹۹
۲	قیام و سجود	۶۰۱

ک

۱	کتاب	۶۰۳
۲	کعبہ	۶۰۴

ل

۱	لطف اللہ آذر	۶۰۹
۲	لی خہ قتان	″

م

۱	محمود غزنوی	۶۱۰
۲	مسجد اقصیٰ	۶۱۳

ہ

۱	ہندوستان	۶۱۴
۲	ہاشم و محمود	۶۱۵

اسرارِ خودی

الف

۱	اخوند روم	۶۱۹
۲	ادراک	۶۱۹
۳	اشراق	۶۲۰

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۴	اصفہان	۶۲۲
۵	اقراء	۶۲۵
۶	الوقت سیف	″
۷	ایران	۶۳۱
	ب	
۱	بلبل	۶۳۲
۲	بنات آشیاں اندیم	۶۳۴
۳	بنارس	۶۳۵
۴	بوعلی قلندر	″
	پ	
۱	پہلوی	۶۳۸
	ت	
۱	تاجدار ملکِ لا یبلی	۶۳۹
۲	تخیل	۶۴۱
۳	تشکک	۶۴۲
	ج	
۱	جوع الارض	۶۴۴
	چ	
۱	چین	۶۴۸
	خ	
۱	خاضعین	۶۵۰
۲	ختن	″
۳	خوالنسار	۶۵۱
۴	خود فزود آ۔۔۔	۶۵۲
	د	
۱	دروازہ شہر علوم	۶۵۳
۲	دری	″
	ز	
۱	زرتشت	۶۵۶

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۲	زین سخن آتش بہ پیراہن شدم	۶۶۸
	س	
۱	سبزہ پامال است در دید بار بار	۶۶۹
۲	سلمائے عرب	۶۷۰
	ش	
۱	شافعی (امام)	۶۷۱
۲	شعور	۶۸۵
۳	شمس تبریز	۶۸۶
۴	شیرِ خدا	۷۰۱
	ع	
۱	علی مرتضیٰ	۷۰۶
۲	عندہٗ حسن المآب	۷۰۷
	ق	
۱	قاتل الفحشاء	۷۰۸
۲	قال و حال	″
	ک	
۱	کوچک ابدال	۷۱۰
۲	کیف و کم	۷۱۱
	گ	
۱	گرگ باراں دیدہ	۷۱۲
	ل	
۱	لا تشریب علیکم	۷۱۴
۲	لا تسبوا الدہر	″
۳	لالہ	″
۴	لالۂ صحرا	۷۲۴

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	ماہ از انگشتِ او	۷۲۶
۲	مارا روزی رسد از خوانِ او	〃
۳	مخدوم علی ہجویری	۷۲۷
۴	مرد کاسب را حبیب اللہ گفت	۷۳۱
۵	مسلکِ گوسفندی	〃
۶	ملتِ بیضا	۷۳۸
۷	میاں میر	〃
۸	میر نجات نقشبند	۷۴۴
۹	می شود از جبر پیدا اختیار	۷۴۴
	ن	
۱	نعرہ زد اے قوم	۷۴۵
۲	نیستاں	۷۴۶
	ہ	
۱	ہارون	۷۴۷
۲	ہندی	〃

رموزِ بے خودی

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
	الف	
۱	ابنِ مسعود	۷۵۱
۲	ابکم	〃
۳	اخلاص (سورہ)	〃
۴	از سخن آئینہ سازم کردہ اند	۷۵۶
۵	آفل	۷۵۸
۶	اکبر	〃
۷	اکرم او نزد حق اتقائے او	۷۶۷
۸	الیٰ شئ نکر	۷۶۸
۹	آمن الناس	〃
۱۰	امتِ پاک از ہوا گفتارِ او	〃
۱۱	آں خدائے لم یزل را آیتے	۷۶۹
۱۲	آں کہ حفظِ جاں او موعود بود	〃
۱۳	آں کہ دوش کوہ بارش برنتافت	〃
۱۴	ان لیطفئوا	۷۷۰
۱۵	اے تماشاگاہِ عالم روئے تو	〃
	ب	
۱	بالعدل والاحسان	۷۷۱
۲	بحر ما ویرانہ آباد کرد	〃
۳	بغداد	۷۷۲
۴	بو عبید	۷۷۳
۵	بود اندر آب و گل آدم ہنوز	〃
	پ	
۱	پوشش عریانی مردان زن است	۷۷۴
	ت	
۱	تب علینا	۷۷۵
۲	توحید	〃
	ج	
۱	جاپان	۷۷۹
۲	(امام) جعفر (صادق)	〃
۳	جلوہ در تاریکی ایام کن	〃
۴	جنتے جستند در بئس القرار	۷۸۰
	ح	
۱	حرفِ او را ریب نے تبدیل نے	۷۸۱
۲	حیّ و قیوم	۷۸۲
	خ	
۱	خجند	۷۸۳
۲	خرقۂ لاتحزنوا اندر برش	〃
۳	خطیب	〃

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
	د	
۱	درفش کاویانی	۷۸۴
۲	دوئی (ثنویت)	۷۸۵
۳	دہلی	۷۸۶
	ذ	
۱	ذبح عظیم	۷۸۷
۲	ذکر او فرمود باطیب و صلوٰۃ	〃
	ر	
۱	روما	
	ز	
۱	زبر	۷۹۳
	س	
۱	ساسان	۷۹۴
۲	سبحہ اقلل من الدنیا شمار	۷۹۵
	ش	
۱	شیخ احمد رفاعی	۷۹۶
	ض	
۱	ضعیف	۷۹۸
	ط	
۱	طرابلس	۷۹۹
	غ	
۱	غرناطہ	۸۰۰
	ف	
۱	فردوس	۸۰۱
۲	فلارتناوی باطل پرست	〃
۳	فی القصاص	۸۰۲
	ق	
۱	قاف (کوہ)	۸۰۳
۲	قائدِ اسلامیاں ہارون رشید	۸۰۴
۳	قصیدہ بردہ (بصیری)	۸۰۶
۴	قل ہو اللہ	〃
	ک	
۱	کربلا	۸۰۷
۲	(حضرت) کعب (بانت سعاد)	〃

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۳	کل مومن اخوۃ	۸۰۸
	گ	
۱	گرچہ ملّت ہم بمیرد مثل فرد	۸۰۹
۲	گورگاں	〃
	ل	
۱	لاتحزن	۸۱۱
۲	لاخوف علیہم	〃
۳	لانبی بعدی	۸۱۲
	م	
۱	مالک (امام)	۸۱۴
۲	مراد (سلطان)	۸۱۵
۳	می ندانی آیۂ ام الکتاب	〃
	ن	
۱	نحن نزلنا	۸۱۶
۲	نعم الجمل	〃
	ہ	
۱	ہست شیطاں از جماعت دور تر	۸۱۷
۲	ہفت اندام	۸۲۰
۳	ہل اتیٰ	〃
	ی	
۱	یزداں	۸۲۱
۲	یزدجرد	〃
۳	یزید	۸۲۲
۴	یہدی من یرید	〃

حصّہ اُردُو

بانگِ درا

الف

ابنِ بدرون (دولتِ غرناطہ): مسلمانوں نے ہسپانیہ کو ۷۱۰ء اور ۷۱۲ء کے دوران میں تسخیر کیا اور مقبوضاتِ ممالکِ اسلامی میں شامل کر لیا۔ جب بنو امیہ کی ہلاکت کے دن آن لگے تو ایک اموی شہزادہ عبدالرحمٰن نامی ہسپانیہ پہونچا (۷۵۵ء) اور وہاں اس نے اموی فرمانرواؤں کی سلطنت قائم کی۔ ۱۰۳۱ء تک یہ اموی سلطنت قائم رہی اور اس دوران میں ہسپانیہ گویا علم و فضل اور تہذیب کا گہوارہ بن گیا۔ عالی شان عمارات تعمیر ہوئیں، صنعت و حرفت کو ترقی ہوئی، تجارت کے نئے راستے کھلے، فنونِ لطیفہ کی سرپرستی کی گئی۔ ۱۰۳۱ء کے بعد ہسپانیہ کا ملک مختلف امرا کے درمیان بٹ کر رہ گیا جس کی وجہ سے مسلمانوں کی طاقت روز بروز کمزور ہوتی چلی گئی۔ غرناطہ میں بنی زیری نے مسندِ حکومت پر جلوس کیا۔ ان کی فرمانروائی کا زمانہ ۱۰۱۲ء سے ۱۰۹۰ء تک ہے۔ اس سلسلے کو مرابطین نے ختم کر دیا۔ یہ ۱۰۹۰ء کا واقعہ ہے ۱۲۳۲ء میں پھر غرناطہ

میں بنی نصر کی حکومت قائم ہوئی جو ۱۴۹۲ء تک قائم رہی۔ اس سلسلے کو فرڈی ننڈ اور ازابلا نے ختم کر دیا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابن بدرون جس دولتِ غرناطہ کی بربادی کا ماتم کر رہا ہے وہ کون سی ہے۔ پہلے تو یہ سن لیجیے کہ غرناطہ کی تباہی کا مشہور مرثیہ ابن بدرون نے نہیں بلکہ عبدون نے لکھا ہے جس کا پورا نام ابو محمد عبدالمجید الفہری ہے۔ یہ شاعر ۱۱۳۴ء میں وفات پاتا ہے۔ اس مرثیہ کی متعدد شرحیں لکھی گئیں۔ اس میں ابنِ بدرون کی شرح سب سے اچھی خیال کی جاتی ہے۔[۱] اب واضح ہو گیا کہ غرناطہ کے جس مرثیہ کا ذکر علامہ کر رہے ہیں وہ بنی نصر سے تعلق نہیں رکھتا کہ ابن عبدون ۱۱۳۴ء میں وفات بھی پا جاتا ہے بہ قطع ویقین معلوم ہوا کہ یہ مرثیہ بنی زیری کے عہدِ حکومت سے متعلق ہے کہ یہ سلسلہ ۱۰۹۰ء میں منقرض ہو جاتا ہے۔ بنی زیری میں آخری فرماں روا عبداللہ ہے۔ جو ۱۰۷۳ء میں جلوس کرتا ہے۔ یہاں تک مسئلہ صاف ہے، لیکن عجیب بات ہے کہ ڈوزی لکھتا ہے کہ ابن بدرون نے ابن عبدون کے قصیدے کی شرح لکھی اور ساتھ ہی کہتا ہے کہ اس قصیدے کا مضمون بنی افطس کی حکومت کا زوال ہے جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے غرناطہ میں ملوک الطوائف کے دو سلسلے فرماں روائی کرتے ہیں ایک بنی زیری اور ایک بنی نصر، بہر حال مراد علامہ کی یہ ہے کہ غرناطہ کی بربادی پر ابن عبدون نے قصیدہ لکھا، ابن بدرون نے اس کی شرح کی لیکن صقلیہ کا ماتم کسی نے نہیں کیا وہ میرے حصے آیا۔

ارم: ادبی روایت میں یہ مسلّم ہے کہ شداد نے ایک جنتِ ارضی تعمیر کی تھی اسے باغِ ارم کہتے تھے۔ اب مطلقاً مقامِ عشرت اور دلپذیر سیرگاہ کے لئے بھی استعمال

۱؎ طبقاتِ سلاطین اسلام (فارسی) تالیف لین پول ترجمہ عباس اقبال، مطبوعہ مہر
عبرت نامۂ اندلس (اردو) تالیف ڈوزی ترجمہ عنایت اللہ ۱۹۲۹ء دیکھئے جلد ثانی صفحات ۵۲۹ تا ۵۳۴
لغت نامہ دہ خدا جلد اول صفحہ ۳۲۸۔

ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں بھی عاد ارم کا ذکر آیا ہے[۱]۔

آرنلڈ: اشارہ ہے سر ٹامس آرنلڈ کی طرف۔ جو اپنے زمانے میں فلسفے کے بہت جلیل القدر معلّم تصور کیے جاتے تھے۔ پہلے وہ علی گڑھ کالج میں ملازم تھے جب وہاں سے قطع تعلق ہوگیا تو وہ لاہور آگئے اور یہاں گورنمنٹ کالج میں ملازم ہوگئے۔ ان ہی کی ترغیب پر غالباً اقبال نے فلسفہ میں ایم اے کیا۔ پروفیسر آرنلڈ بھی اقبال کی صلاحیتوں سے ایسے متاثر ہوئے کہ وہ اپنے احباب سے اقبال کی تعریف کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ایسا شاگرد استاد کو محقق اور محقق کو محقق تر بنا دیتا ہے۔ جب اقبال انگلستان گئے تو وہاں بھی پروفیسر آرنلڈ سے ملاقاتیں رہیں اور اس زمانے میں بھی آرنلڈ نے اقبال کو ہر طرح تحصیل علم پر آمادہ کیا۔ سالک صاحب نے آرنلڈ اور اقبال کی پُر لطف صحبتوں کا ذکر کیا ہے[۲]۔

(سر) آغا خان: سلطان محمد شاہ جو سر آغا خان کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ ۱۸۷۷ء میں متولد ہوئے۔ اٹھارہ سال کے تھے کہ اُن کو فرقۂ اسماعیلیہ کا امام مقرر کر دیا گیا۔ اس فرقے کے بہت سے لوگ بمبئی میں آباد ہوئے۔ سر آغا خان نے فلسطین اور عراق کا مسئلہ طے کرنے کے لئے ہندوستان سے ایک وفد طلب کیا تھا۔ کہ وہ حسن بن صباح کی اولاد سے ہیں[۳] مسلمہ عقیدے کی طرح مشہور ہے۔

امیر (امیر مینائی): منشی امیر احمد امیر مینائی لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور ان کی تاریخِ ولادت ۱۶ شعبان ۱۲۴۳ھ ہے۔ انھوں نے منشی مظفر علی اسیر سے اپنے کلام پر

---

۱ فرہنگِ آصفیہ ۲ ذکر اقبال۔ عبدالمجید سالک۔ بزم اقبال لاہور۔ اقبال۔ تالیف احمد دین۔
۳ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔

اصلاح لی اور کچھ عرصہ اودھ کے دربار سے منسلک رہے، پھر رام پور چلے گئے اور جب نواب کلب علی خاں مسند آرائے سلطنت ہوئے تو انھوں نے امیر کو اپنا کلام دکھانا شروع کیا۔ اُن دنوں رام پور میں حسنِ اتفاق سے اچھے اچھے انشا پرداز اور عالم جمع ہو گئے تھے مثلاً علامہ عبدالحق خیرآبادی، مفتی سعید اللہ، امداد علی بحر، اسماعیل حسین منیر، امیر اللہ تسلیم، ضامن علی جلال، نواب میرزا خاں داغ اور آفتاب الدولہ قلق۔ نوابانِ رام پور ہر طرح عالموں اور انشاپردازوں کی دلدہی کرتے تھے، علاوہ ازیں رام پور میں جو پُرلطف صحبتیں شعرا کو میسر آئی تھیں وہ رام پور ہی سے مخصوص تھیں۔

جب نواب میرزا داغ حیدرآباد سدھارے تو امیر مینائی بھی کچھ دل برداشتہ ہو گئے اور حیدرآباد پہونچے لیکن وہاں ابھی کوئی خاطر خواہ انتظام نہ ہوا تھا کہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یہ ۱۳۱۸ھ کا واقعہ ہے۔ امیر مینائی کی بہت سی تصانیف ہیں۔ ان میں دیوان صنم خانۂ عشق شعری تخلیقات میں زیادہ مشہور ہے۔ نثر میں ان کا ایک نایاب تذکرہ شعرائے رام پور کا ہے جس کا نام انتخاب یادگار ہے۔

انھوں نے اپنی زندگی میں ایک نہایت نفیس اردو لغت لکھنی شروع کی تھی لیکن افسوس کہ ابھی الفِ ممدودہ اور مقصورہ کے ماتحت الفاظ سے بحث ہوئی تھی کہ امیر کا انتقال ہو گیا۔

امیر مینائی کے کلام میں وہ تیکھاپن اور نوک پلک موجود نہیں جو داغ کا حصہ ہے لیکن کبھی کبھی وہ نہایت بلند رتبہ شعر کہتے ہیں۔ وہ طبعاً متقی تھے اور ایسے ماحول میں پرورش پائی تھی کہ رندانہ محفل آرائیوں کی طرف بالکل مائل نہ تھے، ان کے معاشقہ کی بھی کوئی داستان مشہور نہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل میں جو خالص تغزل کے

شعر ہیں ان کی بنیاد محض تخیل پر ہے ظاہر ہے کہ ایسے اشعار میں وہ چیز مفقود ہوتی ہے جسے جذباتی صداقت کہتے ہیں۔[۵]

اِن المُلوکُ: قرآن مجید کی آیت کی طرف اشارہ ہے۔ حوالہ یہ ہے ۲۶/۳۴۔

"بادشاہ جب کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو تباہ کر دیتے ہیں۔"

اندلس: ہسپانیہ کا ایک نام ہے۔

مسلمانوں کا عہدِ حکومت۔ قرن دوم سے قرن نہم ہجری تک)

۹۱ء اور ۹۳ء ہجری کے درمیانی وقفے میں مسلمانوں نے ہسپانیہ یا اندلس کا زرخیز ملک فتح کر لیا اور اس کے بعد ۱۳۸ء ہجری تک وہاں خلفائے اموی کے نائب حکومت کرتے تھے۔ جب عباسیوں کا ستارۂ اقبال اُبھرا اور امویوں پر تباہی آئی تو ایک اموی شہزادہ عبدالرحمٰن جو ہشام اموی کی اولاد میں سے تھا جان بچا کر یہاں پہونچا اور ملک کی بدنظمی سے فائدہ اٹھا کر یہاں کا امیر ہو گیا۔ اس نے اس دودمانِ جلیل کی بنیاد رکھی۔ اس کا ایک فرد عبدالرحمٰن ثالث بھی تھا جس کے جاہ و جلال کی حکایتیں اب تک تاریخ کو یاد ہیں۔ اموی خلفاء کی حکومت ۴۲۲ء ہجری تک قائم رہی۔ اس کے بعد ملوک الطوائفی کا دور دورہ ہو گیا۔ ان ملوک میں بنی حمود، بنی زیری، بنی جہور اور بنی عامر بہت مشہور ہیں۔ آخر میں غرناطہ میں بنی نصر کی حکومت قائم ہوئی جس کے بانی کا نام یوسف بن نصر تھا۔ اسی سلسلے کا آخری فرماں روا محمد ابو عبداللہ ہے جس کی سلطنت کے زوال کی داستانیں ناولوں اور تاریخوں کی زبان کو اب تک یاد ہیں۔ لارڈ لٹن نے محاصرۂ غرناطہ کے نام

---

[۵] خمخانۂ جاوید، سری رام۔
مراۃ الشعراء، تنہا۔
گلِ رعنا، عبدالحی۔
(نساخ صاحبِ سخن شعراء صرف ان کا ایک شعر نقل کرتے ہیں۔)

سے ایک ناول لکھا ہے جس کا ترجمہ سید امتیاز علی تاج نے کیا ہے۔

جب تک مسلمان اندلس میں حکمراں رہے انھیں یورپ کے تمام ممالک سے ملنے جلنے کے مواقع میسر آتے رہے چنانچہ ہسپانیہ میں ایک ایسی درخشاں تہذیب و ثقافت وجود میں آئی جس کی تعریف کرتے کرتے مورخوں کی زبانیں سوکھتی ہیں مسلمانوں کے عہد حکومت میں ہسپانیہ میں نہایت خوبصورت عمارتیں تعمیر ہوئیں مسجدیں بنائی گئیں، کتب خانے قائم کیے گئے، شہروں کی زینت کی طرف خاص توجہ دی گئی۔ عربی اور دوسرے اسلامی لوگوں کے خون کی آمیزش سے ہسپانیہ میں ایک نئی نسل وجود میں آئی جس کے نقش و نگار کا نیکھا پن مشہور ہے۔

ہسپانیہ میں دراصل اسلامی تہذیب اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی تھی۔ ملک زرخیز اور شاداب تھا۔ باشندے ذہین تھے اس لئے ایسی ایسی ایجادات وجود میں آئیں کہ بایدو شاید۔ اندلس کے علما میں ابن رشد کا مقام بہت بلند ہے اور فلسفے کی تمام تاریخیں اُسے پہچانتی ہیں[1]۔

ان وعداللہ حق: قرآن مجید کی آیت کی طرف اشارہ ہے، حوالہ یہ ہے: $\frac{30}{60}$

"بے شک خدا کا وعدہ سچا ہے"

انیسی شاملو: ایران سے ہندوستان آئے اور مدت تک خانِ خاناں کے دربار سے منسلک رہے، خوش گو شاعر تھے ۱۰۱۴ھ میں برہانپور میں وفات پائی[2]۔

---

[1] نفح الطیب۔ اخبار اندلس مصنفہ سکاٹ مترجمہ خلیل الرحمٰن۔ عبرت نامہ اندلس، تصنیف ڈوزی مترجمہ عنایت اللہ۔ طبقات سلاطین اسلام۔ عباس اقبال۔ اندلس کا جغرافیہ۔ عنایت اللہ۔ تاریخ اسلام۔ امیر علی (انگریزی)۔ تاریخ اسلام۔ ہٹی (انگریزی)۔ تاریخ اسلام، براکل مین (انگریزی)۔

[2] سرو آزاد۔ ذکر انیسی شاملو۔

اویس: آپ کا شمار تابعین میں ہوتا ہے۔ اویس قرنی کے نام سے زیادہ مشہور ہیں ۳۷ھ میں جب حضرت علی اور امیر معاویہ کے درمیان جنگ ہوئی تو اس میں آپ شہید ہوئے۔ رسولِ پاکؐ نے اویس کے احسان کی تعریف کی ہے، حالانکہ اویس کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی کہ رسول پاکؐ کی خدمت حاضر ہو سکتے۔[۱]

ایمرسن: امریکی شاعر، فلسفی، مفکر، انشاپرداز، مقالہ نگار، مصلح، واقعی ہرفن مولا (۱۸۸۲-۱۸۰۳) اس کے خطبات، مقالات اور مضامین بہت مشہور ہیں۔ وہ یورپ بھی آیا ہے اور کالرج ورڈزورتھ وغیرہ سے ملا ہے۔ کارلائل سے اس کی ملاقات زیادہ تھی۔ اس کے کارناموں کی حیثیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ "لغتِ فلسفہ" جو ساڑھے تین سو صفحات سے کم کی کتاب ہے اس میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔[۲]

---

[۱] تابعین۔ شاہ معین الدین ندوی۔ دار المصنفین اعظم گڑھ۔
تذکرۃ الاولیا۔ فرید الدین عطار۔

[۲] Dictionary of Philasophy, New York
ولیم کوپر پرنوٹ اور حواشی بھی دیکھئے۔

ب

بلال: ان کا نام بلال تھا ابو عبداللہ کنیت تھی مسلم ہے کہ یہ غلام تھے اور حبشی تھے ان کی ولادت مکہ میں ہوئی جہاں وہ امیہ بن خلف کی غلامی میں زندگی بسر کرتے تھے جب انھوں نے اسلام قبول کیا تو آقا نے ان پر ظلم ڈھانے شروع کیے آخر حضرت ابو بکر صدیق نے بلال کو خرید لیا اور آزاد کر دیا۔ انھیں رسول پاک سے اتنی عقیدت تھی کہ محبت کے مقام پرستار تک جا پہونچی تھی مسجد نبوی میں اذان بھی وہی دیتے تھے جب رسول پاک نے وفات پائی تو وہ ہجرت کر کے شام چلے گئے، وہیں انھوں نے ۲۰ھ یا ۶۴۱ء میں وفات پائی کہ یہ حضرت عمر کا عہد حکومت تھا۔[1]

۱ ادبی روایت میں رسول پاک کے سلسلے میں جب بلال کا نام آتا ہے تو عقیدت شیفتگی اور محبت کی معراج ملحوظ ہوتی ہے، علامہ مرحوم کی نظم میں بھی یہی پہلو خاص طور پر پیش نظر ہے

---

[1] مہاجرین حصہ اول معین الدین ندوی۔ دارالمصنفین اعظم گڈھ۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔ تاریخ اسلام شرر۔

بلبلِ شیراز (سعدی)، یہ کہنا مشکل ہے کہ اقبال کا اشارہ سعدی شیرازی کی طرف ہے یا حافظ شیرازی کی طرف کہ دونوں شیراز کے ساکن ہیں اور دونوں کو بلبل کہا جا سکتا ہے، میں گمان کرتا ہوں کہ داغ کا مسلکِ شعرگوئی سعدی سے قریب تر ہے اس لئے غالباً یہ اشارہ سعدی کی طرف ہے، بہرحال بہ اختصار اس موقعہ پر سعدی شیرازی کا ذکر کیا جاتا ہے، حافظ کے متعلق تفصیلی حالات رموزِ بے خودی اور اسرارِ خودی کی تلمیحات کے سلسلے میں ملیں گے۔

سعدی کے متعلق جدید ترین تحقیقات سے اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ان کی ولادت سنہ ۶۱۰ھ اور سنہ ۶۱۵ھ کے درمیان محصور رہے اور وفات کا سال یا ۶۹۱ھ ہے یا ۶۹۴ھ، سعدی نے اپنا تخلص سعد بن ابوبکر بن سعد بن زنگی کے نام پر رکھا تھا کہ وہ اور اس کا باپ ابوبکر سعدی کے خاص مربی تھے اور یہ جو روایت مشہور ہے کہ سعدی کا تعلق سعد بن زنگی سے ہے غلط محض ہے۔

سعدی نے بغداد میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے بعد سیر و سیاحت کی ٹھانی اس سیر و سیاحت کے دوران میں انھوں نے ایک ضعیف روایت کے مطابق ہندوستان کو بھی اپنے ورود سے سعادت اندوز کیا۔ سیر و سیاحت کے بعد وہ شیراز واپس پہنچے اور یہ ۶۵۴ھ کا واقعہ ہے) تو سعد بن ابوبکر کے دربار سے منسلک ہو گئے۔ سعدی کی دو تصانیف بہت مشہور ہیں۔ بوستان (مثنوی)، جو ۶۵۵ھ میں تالیف کی گئی اور ابوبکر بن سعد سے منسوب ہے اور گلستان (نثر) یہ کتاب بھی ابوبکر بن سعد سے منسوب ہے لیکن اس کے دیباچہ میں سعد بن ابوبکر کی تعریف کی گئی ہے۔

گلستان میں شاعر کے تجربات کا نچوڑ حکایتوں اور مقولوں کی صورت میں قلمبند

ہو گیا ہے اس کتاب کی فصاحت اور سلاست کی یہ حالت ہے کہ اب تک فارسی زبان کا بے نظیر شاہکار تصور کی جاتی ہے[1]۔

عالم شعر میں سعدی کی اہمیت اس کی غزل گوئی کی وجہ سے ہے بعض ایرانی مؤرخ یہ کہتے ہیں کہ وہ دبستانِ عراقی ہی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن کچھ نے دعوی کیا ہے کہ انھیں سبک شیرازی کا پیرو تصور کرنا چاہیئے۔ ان کی غزل میں بھی عشق حقیقی کے بجائے عشق مجازی اور عشق مجازی کی جنسی صورتوں کی تصویریں زیادہ ملتی ہیں لیکن اپنے دائرہ میں ان کی غزلیں بے نظیر ہیں۔

ان کے اکثر اشعار سہل ممتنع کے درجے تک پہونچتے ہیں وہ دوراز کار تشبیہوں اور استعاروں سے پرہیز کرتے ہیں اور اپنا مطلب بہ کمال اختصار و ایجاز ادا کرتے ہیں ان کی غزل گوئی کے اسلوب نے حافظ سے لے کر جامی تک کم و بیش سب ہی کو متاثر کیا بلکہ بعض نقاد تو یہ کہتے ہیں کہ دبستان فغانی دراصل سعدی کے دبستان ہی کی ایک دوسری صورت ہے۔

سعدی کے قصیدے خالص مدحیہ بھی ہیں اور ایسے بھی ہیں جو اخلاقی و عرفانی مطالب پر مشتمل ہیں جن قصیدوں میں انھوں نے نصیحت گری کا اسلوب اختیار کیا ہے وہاں بھی صنعت گری کو ملحوظ رکھا ہے محض روکھی پھیکی پند گری اور تبلیغ سے پرہیز کیا ہے عباس اقبال کا تو یہ خیال ہے کہ فارسی زبان کی موجودہ صورت سعدی کی نثر کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

---

[1] تاریخ مفصل ایران۔ عباس اقبال؛ سعدی نامہ؛ تاریخ ادبیات ایران یسیلم "تازی"۔
"تاریخ ادبیات ایران۔ رضا زادہ شفق　　　　تاریخ ادبیات ایران۔ براؤن جلد دوم)۔
شعر العجم (سعدی کے حالات)۔　　　　حیات سعدی۔ حالی۔
علامہ محمد عبد الوہاب قزوینی کا دیباچہ شمس قیس رازی کی تصنیف "المعجم" پر
عابد علی کا مضمون سعدی شیرازی مطبوعہ بیاض نصاب فارسی بی اے۔ دانش گاہ پنجاب۔

بوعبیدہ (جنگ یرموک) : ابو عبیدہ اسلام کے نامور سپہ سالاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ حضرت ابوبکر کی دعوت پر اسلام قبول کیا تھا۔ جنگ یرموک میں آپ نے غیر معمولی شجاعت اور جیالے پن سے کام لیا۔ آپ نے ۱۸ھ میں وفات پائی۔

جنگ یرموک ۱۵ھ میں واقع ہوئی۔ ایک فریق ہرقل (رومی فرماں روا) تھا اور دوسرا فریق، عرب کے مسلمان (یرموک ایک دریا ہے جو دریائے اردن کا مشرقی معاون ہے)

جنگ ایسے مقام پر ہوئی جو صحرائے عرب کے کنارے واقع تھا۔ مسلمان تعداد میں کم تھے لیکن جوش ایمان کے بل پر رومیوں کے ٹڈی دل سے ٹکر لینے کے لیے تیار تھے اس جنگ میں مسلمانوں کو فتح ہوئی تو گویا طے ہو گیا کہ شام و فلسطین پر اب رومی فرمانروائی نہ کر پائیں گے۔ اسی جنگ کے نتائج یہ نکلے کہ مسلمانوں کا حوصلہ بڑھ گیا، رومی پست ہمت ہو گئے، اور تسخیر کا وہ سلسلہ شروع ہوا جسے آخر ہسپانیہ کی فتح پر ختم ہونا تھا۔ جنگ یرموک فیصلہ کن جنگوں میں شمار کی جاتی ہے کہ اس کے بعد، دراصل رومیوں کی طاقت ٹوٹ گئی[۵]

بولہب : رسول پاک کے چچا تھے لیکن ان کی مخالفت میں پیش پیش رہتے تھے اس لیے اقبال کے کلام میں بولہبی حق کی مخالفت کی علامت بن گئی ہے۔

بیدل (مرزا عبدالقادر) فارسی کے ان نازک خیال شعرا میں صفِ اوّل کے سخن طراز ہیں جو دبستان فغانی ہندی کے مقلد تھے۔ ان کی تاریخ ولادت ۱۰۵۴ھ ہے اور مولد عظیم آباد۔ یہ وہی مردم خیز شہر ہے، جہاں سے بڑے بڑے عرفا، علما، صلحا ور شعرا نے ظہور کیا ہے۔ (امداد امام اثر جو کاشف الحقائق کی تصنیف کی بنا پر

---

۵ تاریخ اسلام۔ امیر علی (انگریزی)۔
تاریخ عالم اسلام۔ براکلمین (انگریزی)۔
تاریخ عرب۔ ہٹی (انگریزی)۔
تاریخ اسلام۔ بشیر۔

شہرتِ دوام کے حقدار ہو چکے ہیں اسی بلدۂ علم و فضل کے رہنے والے تھے)

بیدل کی ولادت شاہ جہاں کے زمانے میں ہوئی لیکن انھوں نے اتنی لمبی عمر پائی کہ اورنگ زیب کا طمطراق اور جاہ جلال دیکھنے کے بعد مغلیہ سلطنت کا انتشار بھی دیکھا۔ دہلی میں مستقل مقیم ہو گئے تھے وہیں ۱۱۳۳ھ میں وفات پائی صاحبِ سروآزاد لکھتے ہیں کہ وہ شاہزادہ محمد اعظم کے دربار سے منسلک تھے۔ ایک دن شہزادے نے فرمایش کی کہ ہماری تعریف میں قصیدہ لکھ کر پیش کرو۔ اسی دن ملازمت سے مستعفی ہو گئے اور بقایا عمر، دہلی میں گوشہ نشینی میں بسر کر دی۔

بیدل لاکھ چاہتے تھے کہ زندگی عزلت میں بسر ہو جائے لیکن امرائے کبار ان کی شاگردی کا دم بھرتے تھے اور برابر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ نواب نظام الملک آصف جاہ شعر میں مرزا بیدل ہی سے اصلاح لینے کا دعویٰ کرتے تھے، سید حسین علی خاں سے، بیدل کے خاص روابط تھے جن دنوں وہ دکن کے انتظام میں مصروف تھے بیدل نے لکھ کر بھیجا۔

مے در قدحی، گل بسری، جام بدستی　　　رنگ چمنی، موج گلی، جوشِ بہاری

لیکن جب، بیدل ہی کی مشہور تاریخ زبان زدِ خاص و عام ہوئی کہ

سادات بوے نمک حرامی کردند

۱۱۳۱ھ

(محمد فرخ سیر کا واقعہ)

تو میرزا متوحش ہو کر دہلی سے لاہور چلے آئے۔ یہاں عبدالصمد خاں ناظم لاہور نے ان کی دلدہی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا

میرزا کی تصانیف میں چہار عنصر، نکات اور دیوان غزلیات کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ان کے اسلوب کلام نے، ان کی وضع زیست نے، ان کی معانی آفرینی اور گوشہ گزینی نے، غالب کو اور پھر علامہ اقبال کو بہت متاثر کیا ہے[1]۔ بیدل کے ہاں دقیق، فلسفیانہ مطالب کے ساتھ اخلاق و عرفان کے مباحث بھی، تغزل کے رنگ میں رنگے ہوئے ملتے ہیں بعض غزلیں نہایت رنگین، بانکی تیکھی اور ہوش ربا ہیں۔ فارسی تراکیب کے استعمال پر جو انہیں قدرت تھی وہ اپنی مثال آپ تھی۔

حقیقت مطلقہ کے متعلق یہ شعر شنیدنی ہیں:

نسخہ ہا در بغل و فہم محال　　　جلوہ ہا در نظر و دیدن نیست
بیدل آں گوہر نایاب سراغ　　　بہ محیطیست کہ پرسیدن نیست

اور یہ شعر ملاحظہ فرمایئے:

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نرفت رنجِ خمارِ ما
چہ قیامتی کہ نمی رسی ز کنارِ ما بہ کنارِ ما

ایک غزل کے یہ شعر بھی بہت پہلو دار ہیں:

تو سخت بے خبری ورنہ رفتگان یکسر
ز خجلت مژہ واکردن تو روپوش اند
نرفتہ اند از یں بزم تا سخن باقی ست
ز دیدہ رفتہ حریفاں ہنوز در گوش اند

---

[1] سروِ آزاد۔ ذکر بیدل۔　　　بیدل۔ عبادالله اختر (ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور)۔
غالب اور بیدل۔ نئی تحریریں (حلقۂ اربابِ ذوق لاہور) کلیاتِ بیدل۔

پ

پورس[1]: یہ وہی ہندوستانی راجہ ہے جس نے سکندر مقدونی کا مقابلہ کیا تھا اور گرفتار ہوا تھا۔ اس کی شجاعت اور بہادری کے افسانے مشہور ہیں (۳۲۶ ق م)

پیرِ کنعان: حضرت یعقوب کا لقب ہے کہ کنعان کے رہنے والے تھے اس ملک کا موجودہ نام فلسطین ہے۔ اپنے بیٹے حضرت یوسف کے فراق میں رو رو کے اندھے ہو گئے تھے۔ ان کی یہ داستان ادبی روایت کا بڑا اہم جزو ہے[2]

---

[1] تاریخ ہندوستان۔ مورلینڈ (انگریزی)۔

[2] قصص القرآن۔ حفظ الرحمان۔

ٹ

ٹینی سن (Tennyson): مشہور انگریزی شاعر جس کی تاریخ ولادت ۱۸۰۹ء ہے اور تاریخ وفات ۱۸۹۲ء ہے۔ مرنے کے بعد نقادوں نے اس کے کلام پر اتنی لے دے کی کہ یہ طے کرنا دشوار ہو گیا کہ ادب میں اس کا کیا مقام تھا۔ یہ تو سب مانتے ہیں کہ انگریزی کے ذخیرۂ الفاظ پر جیسی اسے قدرت حاصل تھی ویسی کسی دوسرے شاعر کو کم حاصل ہوئی ہے البتہ فکر کی گہرائی اور اپج کی کمی تھی۔ غنائی نظموں میں اس کا آرٹ معراجِ کمال پر پہونچا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے مقلد بھی بہت تھے

لہ تاریخِ ادبیاتِ انگریزی۔ بی۔ آئی۔ ایونز۔

ج

جوگندر: مراد سردار جوگندر سنگھ ہیں جن کی ولادت ۱۸۷۷ء میں ہوئی تھی اپنے وقت کے بہت بڑے تعلقہ دار تھے۔ ۱۹۱۹ء میں حکومت نے انھیں سر کا خطاب دیا۔ یہ خود نواب ذوالفقار علی خاں اور علامہ اقبال کے جگری دوست تھے۔ سردار صاحب دو سال تک پنجاب میں وزیر بھی رہے، پنجاب یونیورسٹی کے فیلو بھی تھے۔ مشہور رسالہ ایسٹ اینڈ ویسٹ اُن کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ انگریزی میں انھوں نے بہت سے مضمون اور کتابیں لکھیں جن میں کملا اور نورجہاں قابل ذکر ہیں۔

اپنے زمانے میں سکھوں کی قیادت کا کام یہی کرتے تھے۔ زندہ باش، خوش دل اور بنسوڑ آدمی تھے۔ ان کے ہاں ہر وقت دوستوں کی محفل جمی رہتی تھی۔[۱]

---

[۱] The Indian Year Book and Who's Who; 1939-1940; pp. 1024-1025

چ

چشتی (متوفی سنہ ۶۳۳ھ): حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی طرف اشارہ ہے۔ یہ عام طور پر مسلّم سمجھا جاتا ہے کہ آپ سیستان کے سادات میں سے ہیں (سیستان کو سجستان یا سگستان بھی کہتے ہیں، اسی نسبت سے خواجہ سجزی بھی کہلاتے ہیں) خواجہ صاحب نے شروع ہی سے سیاحت کا مسلک اختیار کر لیا اور جگہ جگہ فیوض باطنی کی جستجو کرتے رہے۔ شیخ نجم الدین کبریٰ کی خدمت میں بھی مقیم رہے شیخ عبدالقادر جیلانی سے ملنے کی سعادت بھی حاصل کی، آخر ہندوستان کا قصد کیا اور اجمیر آئے۔ ہندوستان پہونچ کر انھوں نے شیخ علی ہجویری کے دربار میں چلّہ کاٹا یہ داتا گنج بخش ہیں۔ اجمیر میں خواجہ صاحب کے تشریف لانے کی تاریخ ۱۰ محرم سنہ ۵۶۱ھ ہے۔

جب خواجہ صاحب نے اسلام کی تبلیغ کی تو ہندوؤں کو طبعاً ناگوار گزرا اجمیر اور دلّی کے حکمراں رائے پتھورا نے خواجہ کو مرعوب کرنا چاہا لیکن یہ مقدر ہو چکا تھا کہ پتھورا

شہاب الدین کے مقابلہ میں گرفتار ہو کر مارا جا رہا جائے۔

خواجہ صاحب کو سماع سے بھی ذوق تھا اور اکثر اس قسم کی محفلوں میں کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ہندوستان میں جن صوفیا کرام نے اسلام کی تبلیغ کی ہے اور اپنے اسوۂ حسنہ سے اغیار کو متاثر کیا ہے ان میں خواجہ صاحب پیش پیش ہیں۔

یہ امر مشکوک ہے کہ آیا خواجہ صاحب نے کوئی تصنیف اپنی یادگار چھوڑی کہ نہیں لیکن ان کے نام سے کئی تالیفات منسوب ہیں۔ حضرت بختیار کاکی نے خواجہ صاحب کی گیارہ صحبتوں کے ملفوظات جمع کئے ہیں۔ خواجہ صاحب کے اثر سے بہت سے لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے، ان کا سلسلہ اب تک عالی مرتبت سلسلہ تصور کیا جاتا ہے[1]۔

---

[1] اسلامی ثقافت کا خاکہ (انگریزی) شستری۔ بنگلور۔ تاریخ تصوف در اسلام۔ محمد معین۔ بزم صوفیہ۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ دار المصنفین اعظم گڈھ۔

ح

حالی شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی کی ولادت پانی پت میں ہوئی۔ ولادت کا سال ۱۸۳۷ء ہے۔ وہ ایک عالی نسب گھرانے سے متعلق تھے لیکن کم عمری ہی میں یتیم ہو جانے کی وجہ سے اُن کی تعلیم و تربیت کا آغاز کا راہی میں ٹھیک انتظام نہیں ہو سکا ۱۷ سال کے ہوئے تو شادی کر دی گئی۔ یہ گھبرا کر دہلی چل دئے۔ پھر رشتہ داروں کے مجبور کرنے سے پانی پت گئے۔ جن دنوں تحصیل علم کے لئے دہلی میں اقامت گزیں تھے تو میرزا غالب سے ملا کرتے تھے انھیں دنوں غالب سے اصلاح لینا شروع کی اور ان سے دوستانہ روابط بھی قائم ہو گئے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد وہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ رئیس جہانگیر آباد کے مصاحب ہو گئے۔ چھ سات سال وہ اُن کے پاس رہے اور اس دوران میں انھوں نے بڑے معرکے کی غزلیں کہیں۔

آخر انھوں نے سرکار انگریزی کی ملازمت اختیار کرلی۔ جب اُن کا لاہور تبادلہ ہوا تو کرنل ہالرائڈ کے ایما پر انھوں نے مصرع طرح پر غزلیں کہنے کے بجائے چار مثنویاں پڑھیں یعنی برکھا رُت۔ انصاف وامید، مناظرۂ رحم وانصاف، حب وطن مثنویوں میں اُن کی تصنیف فریادِ بیوہ بہت اہم ہے۔ اور بغایت موثر ہے

حسنِ اتفاق سے ان کی ملاقات سرسید احمد خاں سے ہوگئی۔ اس ملاقات کا ذکر انھوں نے اپنے دیوان کے مقدمے میں بڑے دل کش انداز میں کیا ہے۔ سرسید احمد خاں کی ترغیب پر انھوں نے اپنی مشہور نظم مسدس لکھی، جس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اب تک اس نظم کے اشعار محفلوں میں پڑھے جاتے ہیں اور دلوں کو گرماتے ہیں۔

حالی نے یوں تو بہت سی تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں لیکن مندرجہ ذیل تالیفات نسبتاً زیادہ اہم ہیں۔

(۱) حیات جاوید۔ سرسید کے سوانح حیات ہیں جس میں ان کے علمی اور معاشرتی کارناموں کو تفصیل سے قلمبند کیا گیا ہے۔

(۲) یادگارِ غالب۔ غالب پر بنیادی کتاب ہے۔ اس میں غالب کے سوانح بھی ہیں اور ان کے کلام پر انتقاد بھی۔

(۳) حیات سعدی۔ سعدی شیرازی کے سوانح حیات۔

سرسید احمد خاں نے جو تحریک شروع کی تھی کہ اُردو نثر تصنع اور تکلف کے دائرے سے نکل کر سادگی اور سلاست اختیار کرے، حالی اس کے بہت بڑے علمبرداروں میں سے تھے لیکن سلاست سادگی اور وضاحت کے علاوہ بھی ایک چیز ہے جس سے حالی کی

تالیفات گویا جگ مگ کرتی ہیں وہ ان کے خلوص اور علمی دیانت داری کا نور ہے۔

مولانا حالی نے ۱۹۱۴ء میں وفات پائی۔[1]

حرا (غار حرا): مکے کے قریب وہ مشہور غار ہے جہاں رسول اللہ بہ تقاضائے مشیتِ الٰہی عبادت کے لئے جایا کرتے تھے۔[2]

---

[1] تاریخ ادب اردو: سکسینہ۔ سیر المصنفین: تنہا۔
مرأۃ الشعراء: تنہا۔ گل رعنا: عبدالحی۔
شعر الہند۔

[2] قصص القرآن: حفظ الرحمٰن، جلد چہارم۔ دہلی۔

خ

خاتم سلیمان: مشہور ادبی روایت کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت سلیمان کے ہاتھ میں انگشتری تھی جس پر اسم اعظم کندہ تھا۔ اسی اسم اعظم کی برکت کے بدولت وہ انسان اور جن وطیور پر فرماں روائی کرتے تھے روایتوں کا بیان ہے کہ ایک بار یہ انگشتری ان کے ہاتھ سے گر پڑی تھی اور ایک اہرمن کے ہاتھ لگ گئی تھی، بعد میں یہی انگشتری ایک ماہی گیر کی بیٹی کو مچھلی کے پیٹ میں ملی۔ روایت کے مطابق حضرت سلیمان اس ماہی گیر کے گھر مقیم تھے اور اہرمن تختِ سلیمان پر جلوہ افروز تھا۔ جب حضرت سلیمان کو یہ انگشتری ملی تو انھوں نے پھر تختِ سلطنت پر قبضہ کر لیا۔

تلمیحات میں شعرا اکثر ادبی اور تاریخی روایات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ان روایات کے ساتھ مطالب کے بہت سے پہلو اس طرح مربوط ہوتے ہیں کہ ایک آدھ کلمہ کے ذکر سے سارا واقعہ آنکھوں کے آگے پھر جاتا ہے اسی بات کو ملحوظ رکھ کر

خاتم سلیمان کے متعلق جو روایت مشہور ہے وہ ذرا تفصیل سے بیان کر دی گئی۔

اردو اور فارسی ادبیات میں خاتم سلیمان اور خاتم جمشید ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں چنانچہ غالب کہتا ہے:

سلطنت دست بدست آئی ہے   جام مے خاتم جمشید نہیں

جام جم کے سلسلے میں یہ تفصیل بیان کیا جا چکا ہے کہ ایرانی ادبیات میں جمشید سلیمان اور سکندر ایک ہی شخصیت کے مختلف نام ہیں یا کم از کم ان میں تشابہ ضرور ہوتا ہے۔[۵]

خواجۂ بدر و حنین: رسول پاک کی ذاتِ گرامی کی طرف اشارہ ہے۔

خلافت (کی قبا) چاک کر دی ترک ناداں نے خلافت کی قبا

جب ترکانِ عثمان نے اسلامی دنیا میں سیادت کا رتبہ حاصل کر لیا تو ترکیہ کا فرماں روا ہی خلیفۃ المسلمین کہلاتا تھا اور وہ گویا ایک طرح دودمانِ عباسی کا وارث تھا۔ جب پہلی جنگ عظیم کے بعد ترکیہ میں انقلاب رونما ہوا تو غازی مصطفیٰ کمال پاشا مرحوم اور ان کے ساتھیوں نے ملک میں خالص یورپی انداز کی حکومت قائم کی اور "خلافت" کے حق سے دست بردار ہو گئے، گویا مسلمانوں کی مرکزی قیادت کوئی نہ رہی۔[۲]

---

[۱] غیاث اللغات، کلمہ جم۔ فرہنگِ آنند راج۔ کلمہ جم۔

جامِ جہاں نما بھی دیکھئے۔ مزدیسنا، تالیف محمد معین، کلمہ جمشید۔

زرتشت کی زندگی کے حالات بھی دیکھئے۔

[۲] تاریخ عالم اسلام، براکلمین (انگریزی)۔

د

دارا، دارا الثالث، ہخامنشی خانوادے کا وہ بد نصیب فرماں روا ہے جس نے سکندر مقدونی کے ہاتھوں شکست کھائی یہ ۳۳۱ء ق۔م کا واقعہ ہے۔ داریوش یوں تو بڑا باہمت اور عالی حوصلہ فرماں روا تھا لیکن خود اس کے امرا اس کے خلاف ہو گئے تھے یہ تو مسلم ہے کہ وہ اپنوں ہی کے ہاتھوں مارا گیا اور روایت نے تو اس کے قاتلوں کے نام بھی محفوظ رکھے ہیں یعنی جانوسپار اور ماہیار دقاآنی نے ایک قصیدے میں ان دونوں کا ذکر کیا ہے) (دلبر وا فتن سکندر داشتن)

دارا کی بیٹی سکندر کے عقد نکاح میں آئی اور یوں ایرانی تمدن کا اثر براہ راست یونانی دربار میں جا پہونچا، دارا کی عظمت اور اس کی حسرت ناک موت فارسی اور اُردو شعری روایات کا بڑا اہم جزو ہے۔[1]

---

[1] تاریخ ایران۔ سر پرسی سائیکس۔ ایران باستان، حسن پیرنیاں۔ تاریخ عالم (امریکی سپاہیوں کا ادارہ)۔

داغ: نواب میرزا المتخلص بہ داغ کی تاریخ ولادت ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء ہے۔ صرف ان کے متعصب مخالف ہی اس بات سے انکار کر سکتے ہیں کہ وہ نواب شمس الدین خاں خلف نواب احمد بخش خاں کا بیٹا تھا البتہ یہ بات کہ آیا اس کی والدہ شمس الدین کے عقدِ نکاح میں تھیں یا نہیں محل نظر ہے۔ خود شمس الدین کے خاندان والوں کی نظر میں وہ قانوناً شمس الدین کا وارث نہ تھا جب نواب کی ریاست ضبط ہوئی ہے تو ان کی ایک بیاہتا بیگم نے بیٹوں کی طرف سے چارہ جوئی کی لیکن داغ کی والدہ اس سلسلے میں بالکل خاموش رہیں۔ نساخ "سخن شعرا" میں داغ کے متعلق لکھتے ہیں داغ ولد چھوٹی بیگم یعنی وہ سرے سے داغ کو شمس الدین کی اولاد تصور نہیں کرتے لیکن یہ ان کی دھاندلی ہے۔ امتیاز علی خاں عرشی نے اس سلسلے میں ناطق فیصلہ صادر کیا ہے۔

داغ کی والدہ چھوٹی بیگم یوسف سادہ کار کی لڑکی تھی اور ذات کی کشمیری تھی۔ صاحب بہارستانِ ناز لکھتے ہیں کہ یوسف سادہ کار کشمیری کی ایک نواسی مسمی نام بزبانِ انگریزی بادشاہ بیگم نام بزبان ہندوستانی شعر بھی کہتی تھی اور زہنی تخلص کرتی تھی۔ وہ اس بات کے مدعی بھی ہیں کہ وہ اپنے بھائی داغ سے اصلاح لیتی تھی۔ ان امور کو ملحوظ رکھتے ہوئے بہ قطع ویقین دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ داغ کی ماں خانگی یا طوائف تھی اسکی لڑکیاں یا لڑکی بھی اسی زمرے میں شامل تھیں اور یوسف والیاں کہلاتی تھیں۔ چھوٹی بیگم نے چار شادیاں کی ہیں۔ پہلے نواب شمس الدین خاں سے (بیان کیا جا چکا ہے کہ اس شادی کی حیثیت مشتبہ ہے)، داغ اسی تعلقِ خاطر کا ثمر ہے۔ چھوٹی بیگم کی دوسری شادی آغا تراب سے ہوئی جن سے ان کا ایک لڑکا مرزا شاغل کے نام سے ہوا، تیسری شادی مرزا فخرو ولی عہد بہادر شاہ ظفر سے ہوئی، مرزا خورشید عالم ان ہی مرزا فخرو

کے صاحبزادے تھے (چھوٹی بیگم کے بطن سے) چوتھی شادی ایک انگریز بلاک نامی سے ہوئی جس سے بادشاہ بیگم پیدا ہوئی اس کا ذکر پہلے آچکا ہے (تخلص خفی) رام پور کے نواب سے داغ کے تعلقات داغ کی خالہ کی وجہ سے استوار ہوئے اس کا نام عمدہ خانم تھا

جب چھوٹی بیگم شہزادہ فخرو کے یہاں بیٹھ گئیں تو داغ کی تربیت بھی لال قلعہ میں ٹھاٹ سے ہوئی ظفر کی طرح داغ نے بھی ذوق ہی کی شاگردی اختیار کی ہنگامہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کی دہلی کے تمام دلفریب نقشے داغ نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس کا شہر آشوب بہت موثر اور دلپذیر ہے۔ جب داغ نے غزل سرائی شروع کی تو لوگ یہ کہتے تھے کہ ذوق اسے شعر کہہ کر دیتے ہیں۔ ذوق کے مرنے کے بعد البتہ داغ کی دھاک بیٹھ گئی۔ غدر سے پہلے ہی وہ بڑے معرکے کی غزلیں کہہ چکا تھا وہ غزل جس کا مقطع درج ذیل ہے اسی زمانے کی ہے:

تجھ کو چپ لگ گئی اے داغِ حزیں اتنی کیوں
مجھ کو کچھ حال تو کمبخت بتا تو اپنا

جب داغ رام پور پہونچا تو وہاں اور بھی سخن سرا جمع ہو گئے اور مزے کی صحبتیں رہیں۔ جب تک نواب کلب علی خاں زندہ رہے داغ رام پور سے نہیں گیا ان کے مرنے کے بعد البتہ حیدر آباد چلا گیا۔

رام پور کی ملازمت کے دوران میں بے نظیر کے میلے میں داغ کی ملاقات حجاب سے ہوئی جو کلکتہ کی طوائف تھی اور شعر بھی کہتی تھی اسی سے ملنے کے لئے داغ کلکتہ پہونچا اور عظیم آباد سے ہوتے ہوتے گیا۔ یہ غزل اسی سفر کی یادگار ہے:

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتہ چلے جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

داغ نے اپنی زندگی کے اس پہلو کی تصویر مثنوی فریادِ داغ میں کھینچی ہے جسے منظوم سوانح عمری کا ایک باب تصور کرنا چاہیے۔

جب داغ حیدر آباد پہونچا تو میر محبوب علی خاں آصف جاہ کا ملازم ہو گیا اور ان ہی کی سرکار سے ناظم یار جنگ دبیر الدولہ فصیح الملک کا خطاب پایا۔ فرمانروایانِ دکن کے کلام پر اصلاح بھی دیتا رہا۔ دکن میں اس کے بہت سے شاگرد ہوئے جن کی تفصیل نور اللہ محمد نوری کی تالیف "داغ دہلوی" میں ملے گی

داغ بقول صاحب گل رعنا حریف، ظریف، خوش طبع اور رنگین مزاج تھے عبدالرزاق کانپوری صاحب البرامکہ نے بھی ان کی ملاقات کے بہت دلچسپ حالات قلمبند کیے ہیں۔

عمر کے آخری حصے میں حجاب داغ کے یہاں آ گئی تھی لیکن کچھ ان بن سی رہتی تھی۔

داغ درحقیقت جرأت کی ادبی روایت کا پیرو ہے۔ جرأت نے وقوع گوئی اور معاملہ بندی کا جو اسلوب پیش کیا تھا وہ دراصل اُردو شاعری کی اس روایت کے خلاف بغاوت کی حیثیت رکھتا تھا کہ عشق مجازی اور عشق حقیقی میں تشابہ پیدا کر دیا جاتا تھا۔ داغ نے بتصریح عشق حقیقی کو عشق مجازی سے علیحدہ کر دیا اور عشق کے جنسی پہلوؤں پر زیادہ زور دیا۔ یہی داغ کی کمزوری ہے اور یہی اس کی شاعری کا طغرائے امتیاز ہے۔

لے سخن شعرا۔ نساخ۔ — خمخانۂ جاوید، سری رام۔

داغ۔ نور اللہ نوری۔ — جلوۂ داغ، احسن مارہروی۔

گل رعنا۔ — بہارستانِ ناز۔

امتیاز علی عرشی کا مضمون "کچھ داغ کے متعلق" رسالہ ادب مارچ ۱۹۵۲ء ڈھاکہ۔

ذ

ذوالفقار علی خاں: نواب ذوالفقار علی خاں مالیر کوٹلہ کے رہنے والے تھے۔ اِن کی ولادت ۱۸۷۵ء میں ہوئی اور وفات ۱۹۳۳ء میں۔ بڑے ادب دوست اور ہنر پرور بزرگ تھے۔ علامہ سے بڑی گہری دوستی تھی۔ انھوں نے علامہ کے متعلق انگریزی میں ایک کتاب بھی لکھی ہے۔

ر

رام: رام چندر جی مہاراج جو اجودھیا کے راجہ دسرتھ کے فرزند اکبر تھے۔ رامائن بالمیکی اُن ہی کے حالات پر مشتمل ہے۔ سناتن دھرمی ہندو ان کو خدا کا ساتواں اوتار مانتے ہیں۔ اُن کی زندگی ایک مثالی زندگی تھی اور ان کی داستان میں ماں باپ کی اطاعت، قول کی پابندی، ظلم کے خلاف جہاد کے جو عناصر ملتے ہیں اُن کی اہمیت آفاقی[1] ہے۔

(سوامی) رام تیرتھ: سوامی رام تیرتھ کا سال ولادت ۱۸۷۳ء ہے اور مولد گجرانوالہ، انھوں نے تعلیم کا زمانہ بہت افلاس میں بسر کیا لیکن بہر حال گورنمنٹ کالج سے ریاضی میں ایم اے کرنے کے بعد ایف۔سی کالج میں اسی مضمون کے معلم مقرر ہو گئے وہ شروع ہی سے ویدانت کے فلسفے کے شائق تھے اور متعلقہ علوم پر بھی کتابیں

---

[1] مختصر تاریخ ہندوستان۔ مورلینڈ (انگریزی)۔ فرہنگِ آصفیہ، کلمہ رام۔

پڑھتے رہتے تھے مشہور ہے کہ وہ ہفتوں دریائے راوی کے کنارے بارہ دری میں محویت کے عالم میں بیٹھے رہتے۔ ۱۹۰۶ء میں جب وہ ہردوار میں تھے تو ایک دن تیرتے ہوئے گنگا میں دور تک نکل گئے، بیان کیا جاتا ہے کہ حالتِ جذب و مستی میں وہ نذرِ آب ہو گئے اور انھوں نے اپنے آپ کو بچانے کی کوئی کوشش نہیں کی ۔

سوامی جی نے ایشیا اور یورپ کے بہت سے ممالک کی سیاحت کی تھی۔ وہ توحید کے رموز سے بہ خوبی آگاہ تھے اور ان کی زندگی نیک سیرتی اور خوش خلقی کا نمونہ تھی۔[1]

رضی دانش: شاہجہاں کے عہد میں ہندوستان آیا۔ ۱۰۶۵ھ میں باریاب ہوا نہایت نازک خیال شاعر تھا۔ ۱۰۷۶ھ میں وفات پائی اس کا یہ شعر بہت مشہور ہے[2]

تاک را سرسبز کن اے ابرِ نیسانِ بہار
قطرہ تا مے تواند شد چرا گوہر شود

امیر مینائی نے غالباً یہی شعر ملحوظ رکھ کر کہا ہے۔

انگور میں تھی یہ مے پانی کی چند بوندیں
جس دن سے کھنچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے

رفعنا لک ذکرک: سورہ انشراح کی چوتھی آیت ہے جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"اور ہم نے تری خاطر تیرا ذکر بلند کر دیا۔"

اس میں رسول اللہؐ کی طرف اشارہ ہے۔

---

[1] سوانح عمری سوامی رام تیرتھ۔ پنڈی داس ۔
[2] سروِ آزاد ۔

ز

زلیخا: عزیزِ مصر کی بیوی جس کے متعلق مشہور ہے کہ حضرت یوسف پر عاشق ہوگئی تھی اسی کی شکایت پر حضرت یوسف کو قید خانے میں بھیجا گیا۔ اس کلمے کا مادہ زلخ ہے جس کے معنی ہیں لغزش کھانا۔ زلیخا ایسی حسین عورت ہوئی جسے دیکھ کر آدمی لغزش کھا جائے اور اپنے قابو میں نہ رہے۔ یہ قصہ سب جانتے ہیں کہ زلیخا نے ایک موقع پر حضرت یوسف کو اور مصر کی بہت سی عورتوں کو جمع کیا تھا اور انھوں نے پھل کاٹنے کے بجائے چھریوں سے اپنی انگلیاں کاٹ لی تھیں۔ اس واقعہ کی اصل اہمیت کے متعلق شدید اختلاف رائے ہے۔ ایک تاویل یہ ہے کہ عورتوں نے حضرت یوسف کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے جان بوجھ کر یہ کام کیا تھا اور عورتوں کے لئے کید کا کلمہ اسی لئے استعمال ہوا ہے۔ بہرحال ادبی روایت میں حضرتِ یوسف، زلیخا، حضرت یعقوب اور حضرت یوسف کے بھائیوں کی داستان

بہت اہم ہے۔ اور اُس نے نہایت نادر مضامین کو اشعار کی صورت بخشی ہے مثلاً

نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

گرگِ دہن آلودہ و یوسف نہ دریدہ

لہ قصص القرآن، حفظ الرحمان۔ استفسار و جواب، نیاز فتحپوری۔

س

ساحرِ الموط: یہ حسن بن صباح کی طرف اشارہ ہے جس نے قلعہ الموط (الموت) کو اپنا مستقر بنایا۔ قزوین کے شمال مغرب میں جو پہاڑ تھے ان ہی کی چوٹیوں پر فرقہ اسماعیلیہ کے مضبوط قلعے واقع تھے مستوفی کہتا ہے کہ یہ قلعے تعداد میں پچاس تھے ان میں سب سے مضبوط قلعے دو تھے ایک میمون دز دوسرے الموط۔ طبری زبان میں الموط کے معنی نشیمن عقاب کے ہیں۔ کہتے ہیں کہ دیلم کا ایک بادشاہ شکار کھیل رہا تھا کہ اس کا عقاب اتفاق سے ایک پہاڑ کی چوٹی پہ آن بیٹھا۔ اس مقام کو محفوظ دیکھ کر بادشاہ نے قلعہ تعمیر کروا دیا کہ چاروں طرف نہایت گہرے غار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ اس قلعے تک تیر پہونچتے تھے نہ پتھر۔ الموط کا قلعہ قزوین سے چھ فرسخ کے فاصلے پر واقع تھا۔ ۴۸۳ھ میں حسن بن صباح نے اس قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ ایک سو اکہتر برس تک حسن بن صباح کے جانشین اس قلعے پہ قابض رہے۔ آخر ۶۵۴ھ میں ہلاکو خاں نے

اس قلعے کو فتح کیا اور مسمار کرادیا۔ الموط کے قلعے کے نشان اب تک باقی ہیں۔

موجودہ زمانے کی ایک سیاح خاتون فریا سٹارک نے اُس وادی کی سیاحت کی ہے جو اس قلعے سے متعلق تھی اور اُس کے متعلق ایک مفصل کتاب لکھی ہے (انگریزی) "حشیشین کی وادی" کے نام سے موسوم ہے۔

حسن بن صباح جسے علامہ نے ساحرِ الموط کہا ہے فرقہ اسماعیل کا پیرو تھا۔ اس فرقے کے عقائد یہ تھے کہ امام جعفر صادق کے بعد ان کا بیٹا اسماعیل امام ہوا۔ اس کے مقابلے میں اثنا عشری شیعہ یہ کہتے ہیں کہ امامت اسماعیل کو نہیں ملی اور امام موسیٰ سے ہوتی ہوئی امام مہدی تک پہونچی۔

اسماعیلی فرقے نے مصر کے فاطمی خلفا کی تبلیغ کا کام اپنے ذمے لیا، چنانچہ ناصر خسرو اس فرقے کا بہت بڑا داعی تھا اور حجتِ خراساں کہلاتا تھا اسماعیلی دعویٰ کرتے تھے کہ قرآنِ مجید کے ظاہری معانی یعنی تنزیل عام لوگوں کے لئے ہیں اور تاویل خاص لوگوں کے لئے ہے۔ تاویل کا حق صرف امام کو حاصل ہے۔ اس اعتبار سے یہ فرقہ باطنی بھی کہلاتا تھا کہ ظاہر کے بجائے باطن کی اہمیت پر زور دیتا تھا اسی فرقے کو ہفت امامیہ بھی کہتے تھے کہ سات اماموں کا قائل تھا

حسن بن صباح یا حسن صباح کا پورا نام یہ ہے حسن بن علی بن محمد بن جعفر بن حسین بن صباح، معلوم ہوتا ہے کہ شروع ہی سے حسن کو مذہبی معاملات میں دلچسپی تھی، چنانچہ وہ پہلے ایران میں اسماعیلی اکابر سے ملتا رہا اور آخر ۴۶۴ھ میں اسے ایک اسماعیلی داعی نے مصر جانے کا مشورہ دیا حسن مصر پہونچا اور وہاں فاطمی خلفا کے نائبوں سے ملاقات کی آخر ۴۷۲ھ میں وہ ایران واپس آیا اور اپنی تبلیغ بڑے

زور شور سے شروع کی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حسن بن صباح نے ۱۱۲۴ء میں وفات پائی۔
یہ مسلم ہے کہ حسن بن صباح نے ایک جنت ارضی تعمیر کروائی تھی جہاں ہر طرح کا سامان عیش و عشرت مہیا تھا اور جہاں پری پیکر نازنینیں حوروں کا بہروپ بھر کے رہتی تھیں، جن آدمیوں سے کام لینا مقصود ہوتا تھا پہلے انہیں بھنگ پلاتے تھے اسی کو حشیش کہتے ہیں، جب آدمی بیہوش ہو جاتا تھا تو جنت ارضی میں لیجاتے تھے، کوئی حور کہتی تھی کہ فلاں آدمی کو قتل کر آؤ تو مجھ سے وصال نصیب ہوگا۔ اس جنت ارضی میں پہونچا ہوا فریب خوردہ انسان جب بھنگ کے نشے میں پھر دنیا میں گویا واپس لایا جاتا تھا تو دوبارہ جنت میں داخل ہونے کے لئے بیتاب ہوتا تھا یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے جان پہ کھیل جاتا تھا اور حکم کے مطابق عمل کرتا تھا۔
ان فریب خوردہ انسانوں کے ہاتھوں بے شمار شہزادے، امراء اور علما مارے گئے۔
نظام الملک طوسی کا قاتل بھی اسماعیلی فرقے کا ایک رکن تھا جو لوگ اپنی جان ہتھیلی پہ رکھ کے ساحر الموط کے احکام پر عمل کرتے تھے وہ فدائی کہلاتے تھے چھری بند ہوتے تھے، ہر جگہ جا پہنچتے تھے، ان کا نام سن کر دلوں پہ دہشت طاری ہوتی تھی۔ بڑے بڑے فرماں روا ان لوگوں سے ڈرتے تھے، عربی میں قلعۂ الموط کے فرماں روا کو شیخ الجبل کہتے تھے۔ انگریزی میں اسی کا ترجمہ کیا گیا ہے یعنی کوہستان کا بوڑھا۔[۵]
ساسانی: ایران قدیم کا وہ دودمان ہے جس کی فرماں روائی کی دھاک دور دور تک

۵۔ حسن بن صباح۔ بشر ر۔
تاریخ ادبیات ایران، جلد دوئم براؤن (انگریزی)۔
حشیشین کی وادی۔ سٹارک (انگریزی)۔
نظام الملک طوسی، عبدالرزاق کانپوری۔
جغرافیۂ خلافتِ مشرقی، جمیل الرحمان۔
تاریخ ایران۔ جلد دوئم سائیکس (انگریزی)۔
حشیشین۔ ناول مترجمہ بیگم محمد سعید۔

بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کا عہدِ حکومت ۲۲۶ء سے ۶۵۱ء تک ہے، خسرو پرویز، نوشیروان عادل، بہرام گور، بہرام چوبیں۔ اسی دودمان سے تعلق رکھتے ہیں اسی خاندان کا آخری فرماں روا یزدجرد ثالث تھا جسے مسلمانوں نے شکست دے کر اس خطِ تسخیر کا راستہ کھولا جسے ہسپانیہ تک پہنچنا تھا۔ جب عباسی خلفا مسند آرائے حکومت ہوئے تو ملک ایرانی تمدن کے رنگ میں رنگا گیا۔ بڑے بڑے منصبوں پر وہ ایرانی فائز ہو گئے جو ساسانیوں کی عظمت کے وارث تھے اور ان کے تمدن کو زندہ رکھنا چاہتے تھے ان میں البرامکہ بہت مشہور رہیں[۵]۔

سامری؛ واضح رہے کہ یہ جو قرآن مجید میں مذکور ہے کہ حضرت موسیٰ کی غیر موجودگی میں سامری نے بنو اسرائیل کو گمراہ کر دیا اور ایک گوسالہ زر کی پرستش پر آمادہ کیا تو یہ سامری درحقیقت کسی شخص کا نام نہیں کہ اس سے پہلے کلمہ ال اس بات کی شہادت دیتا ہے۔

بعض لوگوں کو یہ گمان گذرا ہے کہ سامری سامرہ کا رہنے والا تھا جو فلسطین کا ایک شہر ہے لیکن یہ غلط ہے شہر سامرہ حضرت موسیٰ کی وفات کے پانچ سو سال بعد وجود میں آیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کلمہ سامری شمرون کا معرب ہے۔ تورات میں یہ کلمہ تین معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

(الف) فلسطین کا ایک شہر جسے عمری نے آباد کیا تھا۔

---

۵ تاریخ ایران۔ سائیکس (انگریزی)۔ تاریخِ ایرانِ قدیم (ایران باستان) حسن پیرنیا۔ ایران بہ عہدِ ساسانیاں، ترجمہ ڈاکٹر محمد اقبال (دہلی)۔

(ب) فلسطین کا ایک پرانا شہر ہے جسے یوشع نے حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد فتح کیا تھا۔ اس شہر کے رہنے والے شمرونی یا سامری کہلاتے تھے۔

(ج) بنو اسرائیل میں ایک قبیلہ تھا جو شمرون کی اولاد تھا، حضرت موسیٰ کے زمانے میں ایسے قبیلے کے تمام افراد شمرونی یا سامری کہلاتے تھے۔

جس سامری کا قرآن مجید میں ذکر کیا ہے وہ اسی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔

دجلہ اور فرات کے گرد و نواح میں جو چھوٹی چھوٹی شہری مملکتیں قائم ہوئی تھیں ان کے مجموعے کو سامرستان کہتے تھے۔ سامرستان میں مجسمہ سازی عروج پر پہونچی ہوئی تھی یہی وجہ ہے کہ جب سامری نے بنو اسرائیل کو گمراہ کرنا چاہا تو سونے کا گوسالہ بنایا۔ یوں بھی ان ملکوں میں گائے بہت احترام اور عقیدت کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے جہاں کھیتی باڑی کا کام معاش کا محور ہوتا ہے۔ بہرحال خلاصہ مطلب یہ کہ سامری نام نہیں ہے یعنی کسی شخص کا بلکہ ایک قبیلے سے نسبت کا اظہار کرتا ہے یہ بنو اسرائیل ہی کی ایک شاخ ہے اور غالباً ایک ایسی شاخ ہے جس کے افراد کاہن اور شعبدہ گر تھے[۱]۔

سربن: ہمالیہ پہاڑ کا جو سلسلہ ایبٹ آباد تک پھیلا ہوا ہے اس کی ایک چھوٹی سی کڑی سربن پہاڑ ہے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ مرحوم ایبٹ آباد گئے ہیں اور سربن پر کالی کالی گھٹائیں چھائی ہوئی دیکھی ہیں تو یہ شعر کہے ہیں۔

سروش: سروش دراصل اوستا کا کلمہ ہے اور اس کے معنی ہیں اطاعت و فرمانبرداری خاص طور پر فرمانِ الٰہی کی اطاعت، اس کا مادہ سرو ہے، اسی سے سرود مشتق ہے۔

---

[۱] قصص القرآن۔ حفظ الرحمان۔
قصص قرآن، سید صدرالدین بلاغی۔
قدیم تہذیبیں، عبدالمجید سالک لاہور۔
ترجمان القرآن۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔
تمدن عتیق۔ عبدالواحد، حیدرآباد۔
تاریخ مللِ قدیمہ۔ انجمن ترقی اردو۔

شنیدن اور سرائیدن اسی مادہ کے مصدر ہیں اصطلاحی معنی میں سروش ایک فرشتہ ہے جو حساب اور میزان پر مامور ہے لیکن ایران کی ادبی روایت میں اس کے معنی میں خدا کا قاصد اور حامل وحی ہو گئے چنانچہ ابوریحان نے اس معنی کی طرف اشارہ کیا ہے اور برہان قاطع کا مؤلف کہتا ہے کہ سروش بضم اول بروزن خروش فرشتے کو کہتے ہیں اور جبرائیل کا نام ہے[۵]

سکندر: سکندر جو مقدونی کہلاتا ہے فلپ کا بیٹا تھا اس کی ولادت ۳۵۶ ق م میں ہوئی۔ اس کی تربیت کے لئے اپنے زمانے کا سب سے ذہین شخص منتخب کیا گیا یعنی ارسطو لیکن ڈیورانٹ کا خیال ہے کہ سکندر کو ارسطو کی تربیت سے چنداں فائدہ نہیں پہنچا کہ اس کے وجود باطنی میں جو وحشت مخفی تھی اس کا ہمیشہ اظہار ہوتا رہا۔

سکندر نے پہلے ایران کو مسخر کیا جو دارا ثالث کے زیر نگیں تھا پھر ہندوستان پر بڑھا۔ دریائے جہلم پار کیا پورس سے مقابلہ ہوا۔ راجہ کو شکست ہوئی لیکن اس مرحلہ پر سکندر کی فوج نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا معلوم نہیں اگر یہ واقعہ نہ ہوتا تو اس وقت تاریخ کی کیا صورت ہوتی۔ بہرحال سکندر لوٹ گیا اور یونان پہنچنے سے پہلے ہی مر گیا اس نے کم عمری ہی میں دنیا کا اتنا حصہ مسخر کر لیا تھا کہ وہ گنتی کے اس فاتحین جلیل میں شمار کیا جاتا ہے جنھیں اعظم کہتے ہیں۔ ایران میں اس کی وجہ سے جو غارت گری ہوئی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اس واقعہ کے متعلق بھی روایتوں کا بیان ہے کہ سکندر کو اس کی محبوبہ نے ترغیب دلائی تھی کہ وہ ایران کے دارالسلطنت کو غارت کر دے روایت میں اس محبوبہ کا نام تائیس بھی بتایا جاتا ہے بہرحال سکندر کے حملہ کی وجہ سے

---

[۵] مزدیسنا۔ محمد معین، ۲۔ برہان قاطع۔ محمد حسین، ۳۔ غیاث، ۴۔ فرہنگ آنند راج

ایران اور ہندوستان میں یونانی آرٹ کو پہنچنے اور پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ سنگ تراشی کا وہ دبستان قائم ہوا جسے گندھارا دبستان یا قندھار دبستاں کہتے ہیں۔ یونانی مجسمہ سازوں کا اثر دیر تک قائم رہا چنانچہ بدھ کے اکثر مجسموں میں یہ اثر اب بھی عیاں دکھائی دیتا ہے۔[۱]

سلجوق: یہ ایک ترک قبیلے کا نام ہے۔ جو اپنے مورثِ اعلیٰ سلجوق ہی کے نام سے منسوب ہے تحقیق یہ ہے کہ ترکانِ سلجوق ترکانِ غز ہی کی ایک شاخ ہیں جو دشتِ قرقیز میں رہتے تھے اتفاق کی بات ہے کہ سلجوق جب اپنے قبیلے سمیت پہلے جند آیا اور پھر بخارا تو اس نے اسلام قبول کرلیا اور اُس کے بیٹے پوتے آہستہ آہستہ با اختیار ہوتے چلے گئے۔ کچھ عرصے کے بعد انھوں نے غزنویوں کو مغلوب کرلیا۔ اور پھر رفتہ رفتہ بلخ، خوارزم رے، ہمدان اور اصفہان بھی ان کی مقبوضات میں شامل ہوگئے ۴۴۷ھ میں طغرل بیگ بغداد پہنچا اور اُس کا نام خطبے میں پڑھا گیا اُس سے سلجوقیوں کی طاقت بہت بڑھ گئی کہ عباسی خلفا کمزور ہوگئے تھے اور دراصل سلجوقی ہی اسلامی ممالک کے اصلی فرماں روا سمجھے جاتے تھے۔ ان لوگوں کے عہدِ حکومت میں ایران میں بڑے بڑے شعرا، علما اور انشا پرداز پیدا ہوئے، سلجوقیوں کی سب سے بڑی شاخ تو وہی ہے جو سلاجقۂ بزرگ کہلاتی ہے اور جس کا خاتمہ سلطان سنجر پہ ہوگیا لیکن اس شاخ کے علاوہ بھی سلجوقی دودمان کے بہت سے سلسلے مدتوں ایران کے مختلف حصوں اور ایشیائے کوچک میں فرماں روائی کرتے تھے۔ یہ سلسلے اپنی مقبوضات سے منسوب ہیں مثلاً:

سلاجقۂ کرمان (۴۳۳-۵۸۳ھ)　　سلاجقۂ شام (۴۸۷-۵۱۱ھ)

۱؎ تاریخِ ایران، پرسی سائکس جلد اول؛ سکندر کے نقشِ قدم پر۔ سر اوریل شٹائن؛ ایران باستان۔ حسن پیرنیا۔

سلاجقۂ عراق (۵۱۱-۵۹۰ھ)   سلاجقۂ روم (۴۷۰-۷۰۰ھ)

مولانا روم کا تعلق اسی سلسلے سے ہے۔ سلاجقۂ بزرگ کا شجرہ بہ تفصیلِ ذیل ہے:

سالِ جلوس	نام	سالِ جلوس	نام
۴۲۹ھ	طغرل	۴۸۷ھ	برکیارق
۴۵۵ھ	الپ ارسلان	۴۹۸ھ	ملک شاہ ثانی
۴۶۵ھ	ملک شاہ	۴۹۸ھ	غیاث الدین
۴۸۵ھ	محمود	۵۱۱ھ-۵۵۲ھ	سنجر

تاریخِ ادبیاتِ ایران میں سلجوقیوں کا عہد بڑا اہم سمجھا جاتا ہے۔ اس دور میں جو بڑے بڑے شاعر اور انشاپرداز پیدا ہوئے وہ یہ ہیں: ناصر خسرو، خیام، انوری، خاقانی، نظامی گنجوی، ظہیر فاریابی، باباطاہر، ابوالخیر، عطّار، مولانا روم، ان میں سے کچھ شعرا ایسے ہیں جو سلجوقیوں کے ماتحت حکمرانوں کے دربار سے منسلک تھے، سیاست دانوں میں نظام الملک طوسی اور مفکروں میں امام غزالی اسی عہد سے متعلق ہیں۔ سلجوقیوں کے عہدِ حکومت میں مسلمانوں کی عظمت کی دھاک بیٹھ گئی خلفائے عباسی کی گرتی ہوئی دیوار کو ان ہی نے سنبھالا دیا۔

سید: سر سید احمد خاں کی طرف اشارہ ہے۔ سید احمد خاں کی تاریخ ولادت ۱۷ر اکتوبر ۱۸۱۷ء ہے اور مولد دہلی۔ تاریخ وفات ۲۷ر مارچ ۱۸۹۸ء ہے اور مدفن علی گڑھ۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد جب اغیار کی حکومت نے بہ تقاضائے مصلحت

لہ تاریخِ عالمِ اسلام۔ براکلمین (انگریزی)۔ تاریخِ اسلام۔ امیر علی (انگریزی)۔
طبقاتِ سلاطینِ اسلام۔ عباس اقبال۔ تاریخِ ادبیاتِ ایران۔ سلیم تازی۔
تاریخِ ادبیاتِ ایران۔ شفق۔ تاریخِ ادبیاتِ ایران۔ براؤن (انگریزی)۔

مسلمانوں کے اثر اور نفوذ کو ملیامیٹ کرنا چاہا تو سرسید آڑے آئے۔ انھوں نے اگرچہ خالص مشرقی تہذیب کے ماحول میں پرورش پائی تھی لیکن ہوا کا رُخ پہچان کر انھوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ مغربی تعلیم سے مسلح ہو کر دوسری ہمسایہ قوموں کا مقابلہ کریں۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے مسلمانوں کے ملی، تمدنی، تعلیمی اور معاشرتی احیا کا بیڑا اُٹھایا اور اس مقصد کے لئے کچھ ہم خیال ایسے جمع کر لئے جو عالم بھی تھے اور خلوص کی نعمت سے بھی مالامال تھے۔ سرسید کے ان رفقا میں حالی اور نذیر احمد اور شبلی کا پایہ بہت بلند ہے۔

سرسید یہ بھی چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو کٹھ ملاؤں کے تعصب پرور دہ خیالات کے مذموم اثرات سے بچائیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے اسلامی تصورات اور افکار کی ایک نئی تعبیر بھی پیش کرنا چاہی تھی۔ انھیں اس بات کا بھی شعور تھا کہ مسلمانوں کو ایک علیحدہ تنظیمی ادارہ قائم کرنا چاہیئے جو ان کی زبان اور ان کے ثقافتی کوائف کی حفاظت کرے۔

سرسید نے جن کاموں کا بیڑا اٹھایا تھا علی گڑھ یونیورسٹی کا قیام بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ان کا رسالہ "تہذیب الاخلاق" اُردو صحافت میں ایک نئے دور کا موس تھا۔ ان ہی نے سب سے پہلے اُس پُر تکلف اور پُر تصنع اندازِ نگارش کو مردود قرار دیا۔ جو اس زمانے کی اردو انشاپردازی کا خاصہ تھا۔ مختصر یہ ہے کہ مسلمانوں پر سرسید احمد خاں کے اتنے احسانات ہیں کہ گنوائے نہیں جا سکتے۔ انھوں نے مخالفت اور سخت مخالفت کے باوجود اپنے مقصد کو زندگی ہی میں جزواً حاصل کر لیا تھا۔ ان کی وفات کے باوجود ان کے مسلک کے اثرات ہر دائرے میں محسوس ہوئے[۵۱]۔

---

۵۱ سیر المصنفین۔ تنہا۔ حیاتِ جاوید۔ حالی۔
داستانِ تاریخِ اُردو۔ حامد حسن قادری۔ تاریخ ادبِ اردو۔ بیکسینہ۔ ترجمہ محمد عسکری۔

ش

شالامار: لاہور کا مشہور باغ جسے شاہ جہاں نے تعمیر کروایا تھا۔ اس کے تین تختے ہیں شاہ جہاں[۱] کے وقت میں آب پاشی کے لئے پانی بڑی دور سے لایا جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس باغ کے تختے مختلف ناموں سے موسوم تھے مثلاً فرح بخش اور فیض بخش۔ یہ تحقیق نہیں ہو سکی کہ شالامار کے معنی کیا ہیں۔ لطیف کے قول کے مطابق اس باغ کی تعمیر ۱۶۳۷ء میں ہوئی ہے لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ ۱۶۳۲ء میں تعمیر شروع ہوئی بہ ۱۶۳۷ء میں ختم ہوئی (۱۰۴۷ھ) اور اسی سال شاہ جہاں نے پہلی بار اس باغ میں قدم رکھا ہے۔ آب پاشی کا بندوبست کرنے والے دو آدمی تھے ایک علی مردان خاں اور دوسرے مُلّا عبدالملک تھے۔ باغ کے لئے پانی مادھوپور سے آتا تھا (لیکن دیکھئے ڈاکٹر باقر۔ لاہور)[۱]

---

[۱] لاہور۔ لطیف؛ تاریخ پنجاب۔ لطیف۔ لاہور۔ ڈاکٹر باقر؛ عملِ صالح۔ بادشاہ نامہ۔ ملا عبدالحمید لاہوری۔

شاہسوارِ چغتائی: نورالدین جہانگیر مغل فرماں روائے ہندوستان کی طرف اشارہ ہے (جلوس ۱۶۰۵ء) غیر مورخوں کا وطیرہ ہے کہ جہانگیر کو بدنام کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عنانِ حکومت نورجہاں کے ہاتھوں میں تھی جہانگیر کٹھ پتلی تھا یہ حقیقت کے خلاف ہے۔ جہانگیر کو نورجہاں سے محبت تھی اور وہ امورِ سلطنت میں اس سے مشورہ لیتا تھا لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ جہانگیر خود صائب الرائے اور اچھا منتظم تھا اس نے ان کانٹوں کو راہ سے ہٹانے کے لئے جو استحکامِ سلطنت میں مخل ہو سکتے تھے بڑی سختی سے کام لیا لیکن جب اس کے پاؤں جم گئے تو پھر اس نے نسبتاً تحمل سے کام لیا اور عدل وانصاف سے حکومت کی۔

جہانگیر علم وادب کا شیدائی بھی تھا اور فنونِ لطیفہ کا شائق بھی تھا۔ ہمایوں جب ایران سے لوٹا ہے تو اپنے ساتھ ایرانی مصور لے آیا تھا۔ ان ہی لوگوں کے فیض سے مصوری کا وہ دبستان قائم ہوا جسے مغلیہ دبستان کہتے ہیں اور جس میں ایرانی اور ہندوستانی عناصر کے تال میل سے عجیب ڈک بلک پیدا ہو گئی ہے۔ جہانگیر فنِ مصوری میں اتنی مہارت رکھتا تھا کہ تصویر دیکھ کر بتا دیتا تھا کہ دربار کے کون سے مصور کی ہے۔
انشا پردازی میں اس کا مقام اسی سے ظاہر ہے کہ اس نے "تزکِ جہانگیری" جیسی تالیف اپنی یادگار چھوڑی ہے جس کے ترشے ہوئے فقرے بعض اوقات سعدی کی یاد دلاتے ہیں اور جس میں حقیقت نگاری کا کمال نظر آتا ہے۔ اس تالیف میں جہانگیر نے اپنے عیوب کا ذکر بھی تفصیل سے کیا ہے یہاں تک کہ شاہ جہاں کو منشی اشیاء استعمال کرنے کی ترغیب دلانے کا ذکر بھی موجود ہے۔

جہانگیر نے اکبر کی مستحکم سلطنت کی بنیادوں کو اور استوار کیا اور راجپوتوں کی

مدد سے ان تمام عناصر کا قلع قمع کر دیا جو مغلوں کی راہ میں حائل تھے، اس کی داخلی اور خارجی حکمتِ عملی کامیاب تھی۵۔

شبلی (نعمانی): شبلی نعمانی کی ولادت کا سال ۱۸۵۷ء اور مولد اعظم گڑھ ہے سال وفات ۱۹۱۴ء ہے کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ انھوں نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ظہور کیا اور جنگ فرنگ کے ہنگامے میں نگاہوں سے مخفی ہو گئے۔

سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کے احیا کے لئے جو تحریک چلائی تھی شبلی اس کے بہت مقتدر اور پرجوش رکن تھے چنانچہ وہ سرسید کے ساتھ علی گڑھ کالج میں بھی رہے پھر حیدرآباد چلے گئے اور آخر اس ادارہ کی بنیاد رکھی جسے دنیا آج کل دارالمصنفین کے نام سے پہچانتی ہے اور جس کی علمی خدمات سے ہر شخص واقف ہے۔

شبلی نے تصنیف و تالیف کا ہر میدان سر کیا ہے۔ فارسی شاعری کی تاریخ لکھی امام غزالی کے سوانح قلمبند کیے۔ علم کلام پر کتاب لکھی۔ انیس و دبیر کا موازنہ کیا۔ قومی نظمیں لکھیں سیاسی رنگ کے اشعار کہے۔ فارسی میں ایسی غزلیں لکھیں کہ ان کی زبان پر اہلِ ایران کی زبان کا دھوکا ہوتا ہے۔ آخر رسولِ پاکؐ کی سیرت لکھنے کی طرف توجہ کی لیکن صرف پہلی جلد لکھنے کی مہلت ملی اس جلد کے متعلق وہ کیا خوب کہتے ہیں:

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیمِ آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

مولانا کی زندگی ہر طرح بھرپور اور مکمل تھی، سید سلیمان ندوی نے حیاتِ شبلی میں استاد کے احترام

---

۵ تاریخِ ہندوستان (انگریزی)، مورلینڈ۔
تاریخ لاہور (انگریزی)، باقر۔
تاریخ پنجاب (انگریزی)، محمد لطیف۔
لاہور (انگریزی)، محمد لطیف۔
(چغتائی کے متعلق پہلے نوٹ دیا جا چکا ہے)۔

کی وجہ سے ان کی زندگی کے بہت سے گوشے تاریک رہنے دیے ہیں لیکن محمد امین زبیری نے اور ڈاکٹر وحید قریشی نے اُن کی حیاتِ معاشقہ پر مختصر کتابیں لکھی ہیں فیضی بہنوں کے ساتھ اُن کی خط و کتابت بھی شائع ہو چکی ہے اس سلسلے میں کچھ لکھنے والوں نے بد مذاقی سے بھی کام لیا تھا چنانچہ محترمہ عطیہ بیگم فیضی نے خود تمام واقعات اپنے نقطہ نگاہ سے بیان کر دیے ہیں۔ ان کے مکاتیب میں جستہ جستہ اشارے ملتے ہیں کہ وہ زہد کی زندگی سے بالکل مطمئن نہ تھے اور غزلوں میں تو اشارات بالکل واضح ہو گئے ہیں[۵]۔

مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ شبلی کی تصانیف کو دنی لگنی شروع ہو گئی ہے لیکن واقعات سے اس خیال کی تصدیق نہیں ہوتی۔

شرابِ طہور: قرآن مجید میں مذکور ہے کہ جنت میں نیک لوگوں کو شراب طہور ملے گی ادبی روایت میں اس سلسلے میں کافی گستاخی سے کام لیا گیا ہے طہور کے معنی تو پاکیزہ ہیں اور شراب پینے والی چیز کو بھی کہتے ہیں لیکن شعرا نے اسے بھی منشی اشیاء کی فہرست میں شامل کر کے یوں کہا کہ (غالب)

زاہد نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

اسی طرح داغ کہتا ہے:

حضرتِ ناصح ہر اک لغشے کو عادت شرط ہے
مر نہ جائیں گے شراب چشمہ کوثر سے آپ

اور حفیظ جالندھری کہتا ہے:

فردوس کی طہور بھی آخر شراب ہے
مجھ کو نہ لے چلو مری نیت خراب ہے

---

۵ شبلی نامہ۔ اکرام ۔ حیاتِ شبلی ۔ سید سلیمان ندوی ۔ مکاتیبِ شبلی۔ مرتبہ سید سلیمان ندوی ۔
شبلی کی حیاتِ معاشقہ۔ ڈاکٹر وحید قریشی ۔ عطیہ بیگم فیضی کا مضمون ۔ ادبی دنیا ۔

اس سے زیادہ شوخ مضمون خود حفیظ ہی کا ہے۔

سزائے معصیت اب اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی
الٰہی مے کشوں کو غرق کر دے حوضِ کوثر میں

ریاض خیرآبادی تو اس سلسلے میں بجا طور پر بدنام ہیں:

ارے ساقی ذرا میری شرابِ تلخ تو لانا
مئے کوثر تو بالکل انگبیں معلوم ہوتی ہے

اُتری ہے آسمان سے جو کل اُٹھا تو لا
طاقِ حرم سے شیخ وہ بوتل اٹھا تو لا

طاقِ حرم میں شیخ گلابی ہے بھول سی
اس کام کا ملے گا تجھے پھل اٹھا تو لا

ناصح کا منہ ہو بند چکھا دوں شراب خلد
ساقی ذرا ریاض کی بوتل اُٹھا تو لا[51]

شکتی۔شانتی: شکتی درحقیقت وحدت میں کثرت کے تصوّر کی ایک شکل ہے۔ جو لوگ شکتی کے مسلک کے پیرو ہیں وہ کہتے ہیں کہ برہم روحِ مطلق ہے جو شیوا اور شکتی کے روپ دھارتا ہے شیو رجال سے اور شکتی نسا سے منسوب ہے۔ شیوا اور شکتی سے مایا کے عمل کے ذریعہ کائنات وجود میں آتی ہے یعنی مظاہر کی کثرت یوں وحدت سے کثرت پیدا ہوتی ہے۔ شانتی وہ اطمینانِ قلب ہے جو عارف کو یا گنوان کو بڑی مشکل سے ریاض یا تپسیا کے بعد حاصل ہوتا ہے۔[52]

شکری (حصار درنہ، محاصرۂ درنہ) شکری پاشا ۱۸۵۸ء میں متولد ہوئے اُن کی فوجی استعداد بلا کی تھی ۱۹۱۳ء میں جب بلغاریوں سے جنگ جاری تھی تو شکری حصار درنہ میں محصور ہوگئے اور آخر میں گرفتار ہوئے بعد ازاں اُن کو لڑائی ختم ہونے پر رہا کر دیا گیا۔[53]

---

[51] ریاضِ رضواں۔ حیدرآباد ۱۹۳۸ء۔
[52] لغاتِ فلسفہ (انگریزی)، رونز۔ فلسفیکل لائبریری نیویارک۔
[53] ترکانِ احرار۔ عبدالمجید عتیقی۔

شمعِ بارگاہِ خاندانِ مرتضوی: شمس العلما مولانا سید میر حسن سیالکوٹی مراد ہیں۔ سید صاحب مرے کالج سیالکوٹ میں عربی کے استاد تھے لیکن فارسی کا ایسا صحیح ذوق رکھتے تھے کہ جو لوگ ان سے تعلیم حاصل کرتے تھے ان میں بھی یہ ذوق منتقل ہو جاتا تھا۔ سید صاحب نے ۲۵ ستمبر ۱۹۲۹ء میں وفات پائی۔ ان کو شمس العلما کا خطاب بھی علامہ مرحوم کی سفارش سے ملا۔ مولانا سالک نے ذکرِ اقبالؒ میں مولانا میر حسن اور اقبال کے روابط کے متعلق مفصل حالات قلمبند کیے ہیں۔ علامہ اقبال نے مرے کالج سیالکوٹ میں سید صاحب سے تعلیم حاصل کی تھی۔[۱]

شُودر: آریوں نے ایران میں بھی اور ہندوستان میں بھی انسانوں کو گروہوں میں بانٹ دیا تھا۔ فردوسی بھی اس گروہ بندی کا ذکر کرتا ہے۔ ہندوستان میں چار گروہ تھے۔ برہمن، کھشتری، ویش، شودر۔ شودر گویا بالکل اچھوت تھے۔ ان کا داخلہ مندروں میں ممنوع تھا۔ ہندوستان میں گاندھی جی نے ان پابندیوں کے خلاف احتجاج کیا تھا لیکن ابھی تک ملک کے مختلف حصوں میں کم و بیش گروہ بندی کے آثار نظر آتے ہیں۔

شیکسپیر (۱۵۶۴ء۔۱۶۱۶ء): مسلم ہے کہ اُس کا مولد ایک چھوٹا سا قصبہ تھا یعنی سٹریٹ فورڈ۔ کچھ عرصے کے بعد وہ قصبے کی زندگی سے بیزار ہو گیا کچھ اور واقعات بھی ایسے پیش آئے کہ وہ عملاً اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ لندن پہنچ کر اس نے اداکاری کا پیشہ اختیار کر لیا اور ساتھ ہی وہ تمثیلات لکھنی بھی شروع کیں جن کی بنا پر وہ شہرت دوام کا حقدار ہے۔ اُس نے بعض نہایت خوبصورت غنائی نظمیں بھی لکھیں جنھیں انگریزی میں سانیٹ کہتے ہیں۔

---

[۱] ذکرِ اقبال؛ سالک۔ بزمِ اقبال۔ سیرتِ اقبال: محمد طاہر فاروقی۔
ملفوظاتِ اقبال: محمود نظامی۔

یہ بات ہمیشہ معرضِ بحث میں رہی ہے کہ آیا جو ڈرامے شیکسپیر سے منسوب ہیں، وہی ان کا مصنّف تھا یا لارڈ بیکن نے یہ ڈرامے لکھے اور شیکسپیر کے نام سے کھیلے گئے۔

فطرتِ انسانی کا نبّاض جیسا شیکسپیر ہے ویسا کوئی مصنف نہیں ہے۔ انگریزی الفاظ کے ذخیرے پر اُسے بے مثال قدرت حاصل ہے۔ پرانے الفاظ کو نئے معانی عطا کرنے میں بھی وہ بے نظیر ہے۔ اُس کی تمثیلات میں ہیملٹ سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اُس کا اُردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے اور یہ ترجمہ سٹیج پر کھیلا بھی جا چکا ہے۔ آغا حشر نے بھی اُس کی تمثیلات سے فائدہ اٹھایا۔ سید امتیاز علی تاج نے اُس کے ایک طربیے کا ترجمہ کیا ہے جو "ساون رین کا سپنا" کے نام سے موسوم ہے۔

ایلیٹ کا خیال ہے کہ ابھی تک شیکسپیر جیسا جوہرِ قابل اور انشا پرداز پیدا نہیں ہوا اور مستقبل قریب میں یہ توقع بھی نہیں کہ کوئی اُس کا حریف پیدا ہو گا۔

ملہ کلاسک کیا ہے: ایلیٹ (انگریزی) — شیکسپیر کے حزنیے: بریڈلے (انگریزی)

انگریزی ادب کی مختصر تاریخ: ریونز (انگریزی) — انسائیکلو پیڈیا برٹینکا (شیکسپیر کا ذکر) انگریزی

ص

صائب: صائب تبریزی کا خاندان اصفہان میں آباد ہو گیا تھا۔ وہیں صائب سنہ ۱۰۱۰ھ میں متولد ہوا۔ سفرِ حج کرنے کے بعد ہندوستان آگیا۔ یہاں ظفر خاں کے ذریعے شاہجہاں کے دربار میں پہنچا۔ ہندوستان میں اُس کے آنے کی تاریخ سنہ ۱۰۳۶ھ ہے۔ آخر شاہ عباس ثانی نے اُسے ایران واپس بلا لیا اور اُسے اپنے دربار کا ملک الشعراء قرار دیا۔ اُس نے سنہ ۱۰۸۸ھ میں وفات پائی۔

صائب اگرچہ ہندوستان بہت عرصہ رہا ہے لیکن اُس کا کلام اُس خیال آفرینی سے خالی ہے جو دبستانِ ہندی کے شعراء سے مخصوص ہے۔ تشبیہ، تمثیل میں اُسے کمال حاصل ہے۔ سلاست روانی اور فصاحت میں اُس کا کلام سعدی کے کلام کی یاد دلاتا ہے[۱]۔

---

[۱] تاریخِ ادبیاتِ ایران: رضا زادہ شفق۔ تاریخِ ادبیاتِ ایران: سلیم بیساری۔
شعر العجم: شبلی نعمانی۔ سروِ آزاد۔ ذکرِ صائب
تاریخِ ادبیاتِ ایران (جلد چہارم): براؤن (انگریزی)۔

صقلیہ: سسلی، بحیرۂ روم کا مشہور جزیرہ ہے جہاں مسلمانوں نے بڑے ٹھاٹ سے حکومت کی اور جہاں اسلامی تمدن کے آثار اب تک پائے جاتے ہیں۔ دوسری صدی ہجری میں اٹلی کے ساحلوں پر مسلمانوں نے حملے کرنے شروع کر دیئے تھے۔ اسی زمانے میں سسلی پر بھی حملے ہوئے۔ ۲۱۲ھ کے لگ بھگ آلِ اغلب نے جو افریقہ میں خود مختاری کا دم بھرتے تھے، صقلیہ کا جزیرہ فتح کر لیا اور اس کے بعد گویا یہ جزیرہ عرب تمدن کا گہوارہ بن گیا تھا۔ ۹۰۹ء کے بعد یہاں فاطمیوں کی حکومت قائم ہو گئی۔ گیارھویں صدی عیسوی میں سسلی کے مسلمانوں اور فاطمیوں اور نارمنوں کے درمیان لڑائیاں ہوتی رہیں۔ ۱۰۷۱ء کے بعد یہ جزیرہ نارمنوں کے قبضے میں چلا گیا۔

ﮯ تاریخِ صقلیہ۔

ط

طوبیٰ: اس کے لغوی معنی ہیں خوشبودار اور پاک، بشارت اور فرحت کے معنی میں بھی آتا ہے۔ بہشت میں ایک درخت ہے جس کے میووں سے اہل جنت لطف اندوز ہوں گے۔[1]

---

[1] غیاث اللغات ۔ فرہنگِ آنند راج ۔

ع

عبدالقادر: شیخ سر عبدالقادر کہ اقبال کے رفیق قدیم تھے لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ سالِ ولادت ۱۸۷۴ء ہے۔ لاہور میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ لندن چلے گئے جہاں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں رسالہ مخزن جاری کیا اور بہت جلد اردو ادب کی خدمت کرنے والوں کی ایک جماعت ان کی ہمنوا ہو گئی۔ مخزن کے لئے جو لوگ لکھتے تھے ان میں اقبال، ظفر علی خاں، حسرت موہانی، ہادی عزیز اور داغ شامل ہیں۔ یوں کہنا چاہیئے کہ شاعر کی حیثیت سے علامہ مرحوم کو پہلے شیخ عبدالقادر ہی نے لاہور کے اور پنجاب کے لوگوں سے روشناس کروایا۔

شیخ صاحب نے اردو ادب کی جو خدمت کی ہے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۵۰ء تک کوئی اہم علمی یا ادبی محفل کم ہی ایسی منعقد ہوئی ہو گی جس میں وہ شریک نہ ہوئے ہوں۔ علامہ مرحوم کے اردو کلام ۔ کے مجموعہ پہ دیباچہ انھوں ہی نے لکھا تھا۔

انھوں نے مخزن کی ادارت کی دوران میں شگفتہ نثر میں مختلف موضوعات پر مضمون لکھے تھے ان کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ مقامِ خلافت کے نام سے ان کا سفرنامہ قسطنطنیہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ انگریزی میں بھی انھوں نے اردو ادب کے متعلق بیسیوں مضمون لکھے۔ ایک مختصر سی کتاب جو انگریزی میں ہے بہت مقبول ہے۔ اس میں حالی، سرشار، سرسید وغیرہ کی خدمات سے بحث کی گئی ہے۔ انھوں نے ۹ فروری ۱۹۵۰ء کو وفات پائی۔ وہ پنجاب ہائی کورٹ کے جج رہے، وائسرائے کی کونسل کے رکن بھی اور وکالت بھی نہایت کامیابی سے کی۔ اُردو کے تمام ادیبوں کی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے اور غالباً کسی شخص کی وفات پر اردو کے انشاپردازوں نے اتنے قلق کا اظہار نہیں کیا جتنا سر عبدالقادر کی وفات پر۔ ان کی خوش خلقی اور خوش طبعی مشہور تھی۔ انگریزی اور اردو میں نہایت شگفتہ تقریر کرتے تھے۔

عشرتِ امروز: فلسفہ کے ایک خاص دبستاں کی طرف اشارہ ہے جس کا سب سے بڑا علمبردار ابیکورس تھا (۳۴۱ تا ۲۷۰ ق م) وہ مدعی تھا کہ مسرت اور لذت زندگی کی غایات طبعی ہیں لیکن وہ کہتا تھا کہ ان کے حصول میں اعتدال سے کام لینا چاہیے۔ یہ بات اس سے غلط منسوب ہے کہ کھاؤ پیو اور مزے اُڑاؤ کل ہم مر جائیں گے۔ فلسفہ کے اس دبستان کی تشریحات کے مطابق نشاطِ لمحۂ حاضر خیر برتریں ہے۔[۱]

عمرؓ (حضرت): رسول پاکؐ کے رفیق اور صحابی خلافت راشدہ میں اِن کا مقام دوسرا ہے۔ ان کے عہد میں سلطنت کا نظم و نسق درست ہوا اور ہر صیغے میں اصلاحات رائج ہوئیں سیاسی اعتبار سے بھی مسلمانوں نے بڑی ترقی کی۔ آپ کا لقب فاروق اعظم ہے۔ خلافت کے دسویں سال میں فیروز نامی ایک پارسی غلام نے آپ کو شہید کیا۔ آپ کی خلافت کی مدت

۱؎ لغت فلسفہ (انگریزی)، ڈی رُونز۔ نیویارک ۔ داستان فلسفہ (انگریزی)، ول ڈیورانٹ ۔

۱۳ھ سے ۲۳ھ تک ہے۔[1]

عنتری: جس طرح اسداللّٰہی حق کی خاطر جہاد کرنے کی علامت ہے، عنتری حق کی مخالفت کی علامت ہے (عنتر ایک کافر جنگجو تھا)۔

(حضرت) عیسیٰ علیہ السلام: نہایت جلیل القدر پیغمبروں میں ان کا شمار ہوتا ہے عیسائی ان ہی کی نسبت سے عیسائی کہلاتے ہیں۔ قرآن مجید میں انھیں مسیح اور عبداللہ کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ ان کی ولادت منجملہ اسرارِ تخلیق ہے کہ حضرت مریم ان کی والدہ ہیں جو بنواسرائیل کے ایک معروف سردار عمران کی دختر نیک اختر تھیں ادبی روایت میں ان ہی کی عصمت وعفت ضرب المثل ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کے چار معجزات کا ذکر قرآن مجید نے کیا ہے۔ اس میں سے ایک یہ ہے کہ خدا کے حکم سے مُردوں کو زندہ کر دیتے تھے۔ ان کی تعلیمات بھی اسلام کی تعلیمات سے مشابہ ہیں خدا اور خدا کی توحید پر ایمان، انبیاء کی تصدیق، قضا وقدر پر ایمان، اخلاقِ حسنہ کی تلقین، اعمال بد سے بچنے کی ترغیب، دنیا میں منہمک رہنے سے اجتناب۔ قرآن مجید میں حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کے مستند واقعات درج ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ نے جس قوم کو راہِ راست پر لانا چاہا تھا اسی کے اصرار پر رومی فرماں رواؤں نے حکم دیا کہ انھیں دار پر چڑھا دیا جائے لیکن وہ زندہ آسمان پر اُٹھا لئے گئے۔ ادبی روایت یہ کہتی ہے کہ وہ فلک چہارم پر قیام پذیر ہیں۔[2]

---

[1] تاریخِ اسلام: امیر علی (انگریزی)۔

[2] قصص القرآن۔ جلد چہارم۔ دہلی۔ حفظ الرحمٰن۔

غ

غزالی (امام) امام ابو حامد محمدؒ بن محمدؒ بن محمدؒ بن احمد غزالی، عالم اسلام کے بزرگ ترین مفکروں میں سے تھے، ان کی ولادت کا سال ۴۵۰ھ ہے اور مولد طوس۔ پہلے نیشاپور اور طوس میں تعلیم حاصل کی، فقہ، کلام، حدیث اور علوم قرآنی میں کمال حاصل کیا یہاں تک کہ مقام اجتہاد تک پہنچ گئے۔ نیشاپور میں جن لوگوں سے انھوں نے تعلیم پائی ہے اُن میں امام الحرمین بھی شامل تھے۔ آہستہ آہستہ نظام الملک کے وسیلے سے سلطان ملک شاہ سلجوقی تک بھی اُن کے علم و فضل کا شہرہ پہنچا اور اُس نے فرمان صادر کیا کہ وہ بغداد میں مدرسہ نظامیہ میں درس دیا کریں یہ ۴۸۵ھ کا واقعہ ہے امام نے چار سال وہاں درس دیا اور کچھ تصانیف کی داغ بیل بھی ڈالی درس کا پانچواں سال تھا کہ غزالی کے باطن میں ایک انقلاب رونما ہوا اور وہ خود اپنے بھائی کو درس کی خدمت سپرد کر کے سفر حج پہ چلے گئے اس کے بعد انھوں نے

فیصل (سنوسی): پہلی جنگ عظیم کے بعد انگریزوں نے اسلامی ممالک کے حصے بخرے کر دیئے اور عرب کو بھی تقسیم کر دیا۔ امیر فیصل جو حجازی سید تھے انگریزوں کی پالیسی کی حمایت کرتے تھے۔ سنوسی جو اپنے وقت کے مجاہد اور سیاست داں تھے انگریزوں کی حکمت عملی کی مخالفت کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ اسلامی ممالک کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے۔ (شمالی افریقہ میں سایرانیکا کے والی سنوسی کہلاتے ہیں)[2]

فیضی: اکبر کے دربار کا ملک الشعرا فیضی شاہ مبارک کا نورِ نظر اور ابوالفضل کا بھائی تھا۔ سال ولادت سنہ ۹۵۴ھ اور مولد شہر آگرہ ہے۔ اہل ایران بھی اس کی نغز گوئی اور نازک خیالی کے معتقد ہیں اُس کی مثنوی نل دمن کئی اعتبار سے فارسی میں بے نظیر ہے اُس نے مہابھارت کا ترجمہ بھی فارسی میں کیا ہے۔ بعض مورخ کہتے ہیں کہ اس کام میں اُس کے ساتھ اور علما بھی شریک تھے، سال وفات سنہ ۱۰۰۴ھ ہجری۔[1]

---

[1] دربارِ اکبری۔ آزاد — تاریخ ادبیات ایران۔ جلد چہارم۔ براؤن (انگریزی)۔

[2] استدراک: دیکھیے "قاموس سیاسیاتِ عالم" (انگریزی)، معلوم ہوگا کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ادریس، والی قرار پائے ان کا بھی لقب سنوسی ہے۔

ق

(ملک) **قمی**: قم کا رہنے والا تھا۔ پہلے کاشان اور قزوین پھرتا رہا، آخر ۹۸۷ھ میں دکن آیا اور ابراہیم عادل شاہ کے دربار میں پہنچا۔ فیضی نے اس کی نازک خیالی کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس کی تاریخِ وفات کلیم نے ۱۰۲۵ھ دکھائی ہے لیکن صاحب "سروآزاد" کہتے ہیں کہ درحقیقت اس کی وفات ۱۰۲۴ھ میں ہوئی ہے۔[۱]

---

[۱] سروآزاد۔ ذکر ملک قمی۔

ک

کرزن: لارڈ کرزن جنوری ۱۸۹۹ء میں ہندوستان کے گورنر جنرل مقرر ہوئے ۱۹۰۵ء میں دوبارہ تقرر کے بعد فوجی مسئلے پر اختلاف رائے ہوا، واپس انگلستان چلے گئے۔ وہ بنگال کو تقسیم کرنا چاہتے تھے لیکن ملک اس کے خلاف تھا ان کا سالِ وفات ۱۹۲۵ء ہے [۱]

کلیم ہمدانی: ابو طالب کلیم ہمدانی (متوفی ۱۰۶۱ھ) ہندی فغانی دبستان کا مشہور شاعر ہے۔ شاہ جہاں نے اسے اپنا ملک الشعراء مقرر کیا تھا، ایرانی مورخ اور نقاد یہ کہتے ہیں کہ اس کے اشعار سبک ہندی سے متعلق ہیں۔ شفق نے اس کی نازک خیالی کی تعریف کی ہے اور کہا ہے کہ نغز و پر معنی شعر کہتا تھا۔ شبلی نے شعر العجم جلد سوم میں اس پر ایک مفصل مضمون سپرد قلم کیا ہے۔ اقبال بھی کلیم کی دقیقہ سنجی

---

[۱] انسائیکلوپیڈیا برٹینکا۔

سے متاثر تھے[۱]

کُن (گلشنِ کُن۔ آوازِ کُن) گلشن کن سے مراد یہ کائنات ہے اور کُن اور آوازِ کُن سے تخلیق کائنات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کُن کے لغوی معنی ہیں ہوجا اور یہ کلمہ قرآن مجید میں متعدد بار استعمال ہوا ہے کچھ حوالے بہ تفصیل ذیل ہیں :

$\frac{۳}{۵۹}$ ، $\frac{۱۹}{۳۵}$ ، $\frac{۲}{۱۱۷}$ ، $\frac{۶}{۷۳}$

مراد یہ ہے کہ خدا قادرِ مطلق ہے اور تمام سلسلہ ہائے اسباب کی علتِ آخری ہے محض اس کے یہ کہہ دینے سے کہ اے کائنات پیدا ہوجا، کائنات ظہور میں آجاتی ہے۔

---

[۱] شعر العجم۔ شبلی۔ جلد سوم۔ تاریخ ادبیات ایران۔ شفق۔

سروآزاد۔ غنی نے اس کی تاریخ وفات خوب نکالی :-

طورِ معنی بود روشن از کلیم

گ

گایتری: اقبال نے خود جو کچھ گایتری کے متعلق لکھا ہے۔ وہ ذیل میں درج ہے۔

"یہ اشعار رگ وید کی ایک نہایت قدیم اور مشہور دعا کا ترجمہ ہیں جس کو گایتری کہتے ہیں یہ دعا اعترافِ عبودیت کی صورت میں گویا ان تاثرات کا اظہار ہے جنھوں نے نظام عالم کے حیرتناک مظاہر کے مشاہدہ سے اول اول انسان ضعیف البنیان کے دل میں ہجوم کیا ہوگا۔ اس قسم کی قدیم تحریروں کا مطالعہ علم ملل والنحل کے عالموں کے لئے انتہا درجہ کا ضروری ہے کیونکہ ان سے انسان کے روحانی نمو کے ابتدائی مراحل کا پتہ چلتا ہے۔ یہی وہ دعا ہے جو چاروں ویدوں میں مشترک طور پر پائی جاتی ہے اور جس کو برہمن اس قدر مقدس سمجھتا ہے کہ بے طہارت اور کسی کے سامنے اس کو پڑھتا تک نہیں، جو لوگ محققین السنۂ شرقیہ کی تصانیف سے واقف ہیں ان کو معلوم ہے کہ سر ولیم جونز کو اس دعا کے معلوم

کرنے میں کس قدر تکلیف اور محنت برداشت کرنی پڑی تھی۔ مغربی زبانوں میں اس کے بہت سے ترجمے کیے گئے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ سنسکرت زبان کی نحوی پیچیدگیوں کی وجہ سے السنہ حال میں وضاحت کے ساتھ اس کا مفہوم ادا کرنا نہایت مشکل ہے۔ اس مقام پر یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصل سنسکرت میں لفظ سورۃ استعمال کیا گیا ہے جس کے لئے اردو لفظ نہ مل سکنے کے باعث ہم نے لفظ آفتاب رکھا ہے لیکن اصل میں اس لفظ سے مراد اس آفتاب کی ہے جو فوق المحسوسات ہے اور جس سے یہ مادی آفتاب کسب ضیاء کرتا ہے۔ اکثر قدیم قوموں نے نیز صوفیا نے اللہ تعالیٰ کی ہستی کو نور سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن شریف میں آیا ہے "اللہ نور السموات و الارض" اور شیخ محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک نور ہے جس سے تمام چیزیں نظر آتی ہیں لیکن وہ خود نظر نہیں آتا۔ علیٰ ہذا القیاس افلاطون الٰہی مصری پیروں اور ایران قدیم کے انبیاء کا بھی یہی مذہب تھا۔

ترجمہ کی مشکلات سے ہر شخص واقف ہے لیکن اس خاص صورت میں یہ دقت اور بھی بڑھ گئی ہے کیونکہ اصل الفاظ کی آواز کی موسیقیت اور وہ طمانیت آمیز اثر جو ان کے پڑھنے سے دل پر ہوتا ہے اُردو زبان میں منتقل نہیں ہو سکتا۔ گاتیری کے مصنف نے ملک الشعراء ٹینی سن مرحوم کی طرح اپنے اشعار میں ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جن میں حروف علت اور صحیح کی قدرتی ترتیب سے ایک ایسی لطیف موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا غیر زبان میں منتقل کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ اس مجبوری کی وجہ سے میں نے اپنے ترجمہ کی بنیاد اس سوکت (گفتار زیبا) پر رکھی ہے۔

جس کو سر یانزائن اپنشد ہیں گایتری مذکور کی شرح کے طور پر لکھا گیا ہے۔ ترجمہ کرنے کو تو میں نے کر دیا ہے مگر مجھے اندیشہ ہے کہ سنسکرت داں اصحاب اس پر وہی رائے قائم کریں گے جو جیپ سن نے پوپ کا ترجمۂ ہومر پڑھ کر قائم کی تھی یعنی شعر تو خاصے ہیں لیکن یہ گایتری نہیں ہے۔[1]

گلِ شیراز: اس تلمیح کا مخاطب دریافت کرنا ذرا مشکل ہے' اس اعتبار سے کہ غالب اصلاً غزل گو ہے۔ گلِ شیراز سے مراد حافظ ہونی چاہیئے کہ وہ بھی اصلاً غزل گو ہے۔ قصیدہ ضمناً لکھتا ہے لیکن اقبال حافظ کے کلام کو مسلمانوں کے لئے خاص طور پر مہلک تصور کرتا ہے اس لئے گمان یہی ہو سکتا ہے کہ گلِ شیراز سے مراد سعدی ہے۔ صقلیہ میں سعدی کو بلبلِ شیراز کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اس سے بات پھر مشتبہ ہو جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ سعدی کی ہمہ گیری کو دیکھتے ہوئے شاید گلِ شیراز سے مراد حافظ ہی لیا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ خاص طور پر جب اور جگہ اس کے لئے علامہ نے بلبل کا استعارہ استعمال کیا ہے۔

گنگا: ہندوستان (بھارت) کا مشہور اور مقدس دریا۔ وہ اس علاقے میں جو دریائے برہم پتر، گنگا اور معاون دریاؤں سے سیراب ہوتا ہے، ہندو تہذیب و تمدن کے زریں زمانوں کا علاقہ ہے۔ آریہ تہذیب نے، اپنا نقطۂ عروج اسی علاقے میں حاصل کیا ہے۔

گنگا کے متبرک اور مقدس ہونے کے تصور نے اُردو میں بہت سے محاورات پیدا کئے ہیں، مثلاً گنگا اٹھانا، گنگا نہانا۔ داغ کہتا ہے:

غم سے کہیں نجات ملے چین پائیں ہم
دل خون میں نہائے تو گنگا نہائیں ہم

---

[1] مخزن ماہ اگست ۱۹۰۲ء۔

اقبال بھی آغازِ عمر میں گنگا سے جو صنمیاتی روایات منسوب ہیں ان سے متاثر تھے اور ان کے اشعار سے اس کا سراغ ملتا ہے۔[۱]

گوتم (بدھ): گوتم کا نام سدھارت تھا۔ اسے ساکیا منی بھی کہتے تھے۔ جب اسے عرفان حاصل ہو چکا تو وہ بدھ کہلایا (بدھی) عقل کو کہتے ہیں۔ قیاس یہ ہے کہ اس کی زندگی کا زمانہ ۵۶۰ سے ۴۸۰ ق م تک چلتا ہے۔ یہ تحقیق ہے کہ وہ ایک راجہ کا لڑکا تھا جس کی سلطنت کی سرحد اودھ سے ملتی تھی۔ جوانی ہی میں وہ دنیا سے دل برداشتہ ہو کر نکل گیا اور بنوں بنوں پھرنے کے بعد آخر اسے گیان حاصل ہو گیا۔

اصلاً اس کا پیغام یہ ہے کہ انسان بار بار پیدا ہوتا ہے اور اس چکر سے تبھی رہائی ہو سکتی ہے کہ تمناؤں اور خواہشوں کو ترک کر دیا جائے۔ جو شخص اس چکر سے نکل جاتا ہے وہ نروان حاصل کر لیتا ہے۔ اس کی تعلیم کی بنیاد ان اصولوں پہ تھی جو مسلّمہ اخلاقی اقدار کی حامل ہیں۔ بدھ مت نے بڑی جلدی ترقی کی اور بڑی دور دور تک پھیل گیا۔ جاپان اور چین میں بھی اسی مت کی ایک صورت رائج ہے۔ انگریز مفکر بدھ کو بڑا بلند مقام دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسا ذہنِ رسا کسی کو عطا نہیں کیا گیا تھا۔ یونانیوں کے حملے کے بعد جب آرٹ کا وہ دبستان قائم ہوا جسے گندھارا دبستان کہتے ہیں (قندھار) تو بدھ کے بڑے خوبصورت مجسمے ڈھالے گئے۔ مختلف عجائب گھروں میں اب تک یہ مجسمے نظر آتے ہیں۔[۲]

گیتا: کرشن جی مہاراج کا صحیفہ جس میں عرفانی اور اخلاقی مطالب بیان کیے گئے ہیں۔

---

۱ A SHORT HISTORY OF INDIA; MORELAND.

تاریخ ہندوستان مورلینڈ (انگریزی)۔

۲ تاریخ ہندوستان (کیمبرج ہسٹری)

ل

لانگ فیلو: مشہور امریکی شاعر، اس کی تاریخ ولادت ۱۸۰۷ء ہے اسے اپنے ملک میں تو جو علمی اعزاز حاصل ہوا اس پر تعجب نہیں کرنا چاہیئے۔ آکسفورڈ اور کیمبرج کی برطانوی یونیورسٹیوں نے بھی اسے ڈی۔سی۔ایل اور ایل ایل ڈی کی ڈگری سے سرفراز فرمایا۔ اس کی نظموں کا پہلا مجموعہ آہنگِ شب کے نام سے ۱۸۳۹ء میں شائع ہوا تھا۔[۵]

لایخلف المیعاد: قرآن مجید کی آیت کی طرف اشارہ ہے۔ حوالہ یہ ہے ۳/۹

"بے شک خدا وعدہ خلافی نہیں کرتا۔"

لولاک لما خلقت الافلاک: (اگر تو نہ ہوتا تو میں آسمانوں کو پیدا نہ کرتا)۔

حدیث نبوی کی حیثیت سے مشہور ہے۔

لیس للانسان الا ما سعیٰ: قرآن مجید کی آیات کی طرف اشارہ ہے۔ ۵۳/۳۸ و ۳۹

"انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔"

---

[۵] تاریخ ادبیات انگریزی۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینکا۔

م

مازنی: یوسف مازنی، کہ ایک اطالوی محبِ وطن تھا۔ ۱۸۰۵ء میں بمقام جنیوا (GENOA) پیدا ہوا۔ اس نے اپنی ساری زندگی اٹلی میں جمہوری اقدار کو استوار کرنے کے لئے وقف کر دی اور سارے ملک میں ہنگامے کھڑے کر دئے۔ ۱۸۳۱ء میں اسے گرفتار کر کے جلا وطن کر دیا گیا۔ جلا وطنی کے عالم میں اس نے مارسیلز کے مقام پر ایک خفیہ جماعت بنائی جس کا نعرہ تھا۔ "خدا اور عوام"۔ کچھ دیر بعد مارسیلز سے بھی اسے نکال دیا گیا۔ مازنی سوئٹزرلینڈ چلا گیا اور بعد ازاں لندن میں رہ کر اپنے نصب العین کی حمایت اور اس کے حصول کے لئے کوشاں رہا۔ انقلابِ فرانس کی خبر سن کر یہ اپنے وطن کو لوٹا اور فرانسیسی افواج کے خلاف نبرد آزمائی میں شریک ہوا۔ یہاں سے پھر لندن چلا آیا اور باقی عمر، جب تک صحت نے ساتھ دیا اپنے ملک کی بہبود کے لئے کوشاں رہا۔ خرابی صحت کی بنا پر وہ جنیوا لوٹ آیا اور یہیں ۱۸۷۲ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔[۵]

---

[۵] انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا۔

ماعرفنا: ایک مشہور حدیثِ نبوی کی طرف اشارہ ہے جس کی مکمل شکل یہ ہے:

ماعبدناک حق عبادتک وماعرفناک حق معرفتک

(ہم نے اس طرح تیری عبادت نہیں کی جیسا اس کا حق تھا اور ہم نے تجھے اس طرح نہیں پہچانا جیسا پہچاننے کا حق تھا۔)

محبوبِ الٰہی: حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی ولادت کا سال ۶۳۶ھ ہجری ہے۔ مولد بدایوں ہے، جہاں ان کا خاندان بخارا سے ہجرت کرکے آباد ہوگیا تھا۔ خواجہ نے ابتدائی تعلیم بدایوں میں حاصل کی پھر دہلی چلے گئے جو ان دنوں اربابِ علم وفضل کا مرجع تھا۔ یہاں انھوں نے بڑے بڑے عالموں سے استفادہ کیا۔ ان کے مرشد شیخ العالم گنج شکر تھے جن کا قیام اجودھن میں تھا۔ بابا گنج شکر کی وفات ہوئی تو خرقۂ خلافت خواجہ صاحب کو ملا۔ اس کے بعد وہ دہلی تشریف لے آئے یہاں بڑے بڑے امرا اس کے مریدوں میں شامل ہوگئے ان ہی میں امیر خسرو کے نانا عماد الملک بھی تھے بعد میں خود امیر خسرو بھی محبوب الٰہی کی خدمت میں حاضر ہوکر فیوض سے مستفید ہوئے اور باقاعدہ بیعت کی۔ آپ کا وصال ۱۸ ربیع الاول ۷۲۵ھ کو ہوا، مزار دہلی میں ہے کہ آج بھی مرجع خواص وعوام ہے۔ روضہ کی ... رت سلطان بن محمد تغلق کی تعمیر کردہ ہے۔

حضرت محبوب الٰہی کے ملفوظات بہت مشہور ہیں۔ اس میں بہت پُرتاثیر مطالب مندرج ہیں۔ حضرت خواجہ تصوف کے سلسلہ میں منسلک ہونے کے باوصف اور سماع کے شائق ہونے کے باوجود پابندیٔ شریعت پر بہت زور دیتے تھے۔ اسلام کی تبلیغ واشاعت کا سلسلہ بھی ہمیشہ منظم طریقے سے جاری رکھتے تھے۔[۱]

---

[۱] بزمِ صوفیہ۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ دار المصنفین اعظم گڑھ۔

مہدی مجروح : (متوفی ۱۹۰۲ء) میر مہدی مجروح غالب کے نہایت محبوب اور عزیز شاگرد تھے۔ غالب نے اپنے خطوط میں اکثر ان کا ذکر بڑی محبت سے کیا ہے۔ شعر گوئی کے علاوہ ان کی نثر کی تعریف بھی کی ہے۔ شاعری گویا ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ ان کے والد میر حسین بھی شعر کہتے تھے اور فگار تخلص کرتے تھے۔ مجروح نے غدر سے پہلے کی دہلی کی رونقیں دیکھی ہیں۔ وہ تمام کرشمے اس کی نظر سے گذرے ہیں جن کا ذکر ظہیر دہلوی نے مزے لے لے کے داستانِ غدر یا طرازِ ظہیری میں کیا ہے۔ بڑے بڑے باکمال لوگوں کی صحبت پائی ہے۔ جید عالموں سے مستفیض ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ذوق بہت سلیم ہے۔ ان کا دیوان مدت سے نایاب تھا لیکن کچھ سال ہوئے ہیں وحید صاحب نے لاہور سے شائع کر دیا تھا۔ اب پھر نایاب ہوتا جا رہا ہے۔

غالب کے شاگردوں میں ان کا مقام بہت بلند ہے۔ وہ اپنے استاد کی طرح نہ فارسی تراکیب کثرت سے استعمال کرتے ہیں، نہ پیچ در پیچ استعارے کام میں لاتے ہیں لیکن اس کے باوصف ان کے کلام کی سادگی دل میں کھبی جاتی ہے۔ ایک مشہور زمین ہے "خبر کہاں"، "نظر کہاں" اس میں حالی اور مجروح دونوں نے غزلیں کہی ہیں۔ حالی کا مطلع تو گویا مطلعِ آفتاب ہے ؎

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں ‏ ‏ ‏ اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

مجروح نے اس زمین میں ایسا بانکا تیکھا شعر نکالا ہے کہ داد سے مستغنی ہے :

تھا اس کا دیکھنا ہی سراسر خلافِ عقل ‏ ‏ ‏ کمبخت جا پڑی ہے ہماری نظر کہاں[۱]

میرِ حجاز : رسول پاکؐ کی طرف اشارہ ہے۔

---

[۱] گلِ رعنا۔ عبدالحی ‏ ‏ ‏ نادراتِ غالب۔ تالیف آفاق حسین۔ کراچی ادارۂ نادرات۔

مراۃ الشعراء۔ یحییٰ تنہا۔

ن

نانک : (ولادت ۱۴۶۹ء وفات ۱۵۳۹ء) گرو بابا نانک تل ونڈی کے رہنے والے تھے جو آج کل ضلع شیخوپورہ کا ایک قصبہ ہے جسے عام طور پر ننکانہ صاحب بھی کہتے ہیں شروع ہی سے نانک غور و فکر میں غرق رہتے اور تعلیم کی طرف کم توجہ دیتے۔ ان کی شادی ہو گئی تب بھی ان کی دنیا سے بے تعلقی کی وضع قائم رہی۔ ۲۸ برس کی عمر میں وہ سیر و سیاحت کے لئے نکل کھڑے ہوئے مشہور ہے کہ اس سیر و سیاحت کے دوران ان کی ملاقات بابر سے ہوئی تھی۔ گرو نانک کی تعلیم بڑی سادہ تھی۔ وہ یہ کہتے تھے کہ خدا ایک ہے، بت پرستی بے کار ہے۔ ظاہری رسوم و قیود بے ثمر ہیں۔ ہندو مسلمان سب اسی پروردگار کے بندے ہیں جو سب کا پالنہار ہے۔[۵]

نمرود : یہ وہی فرماں روا ہے جس نے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں جھونکنے کا حکم صادر

---

[۵] مشاہیر، غلام رسول مہر

کیا تھا۔ یہ آگ بقضائے الٰہی سرد ہو گئی تھی اور حضرت ابراہیم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا[۱]

(حضرت) **نوح**: نوح نبی کا آکر ٹھہرا جہاں سفینا

طوفانِ نوح مشہور ہے اور کبھی یہ روایت مشہور تھی کہ حضرت نوح کی کشتی اس طوفان کی لہروں سے صحیح وسلامت گذر کر ہندوستان آپہونچی تھی اور یہیں کسی پہاڑ سے لگ گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ روایت بالکل غلط ہے حقیقت یہ ہے کہ حضرت نوح کی کشتی طوفان کے بعد جبل جودی پر آکر ٹھہری تھی۔ یہ پہاڑ اس علاقہ میں واقعہ ہے جسے پرانی اصطلاح میں جزیرہ کہتے تھے[۲]

نیکر (دریا): ہائڈل برگ، جرمنی کے مشہور شہر ہائڈل برگ کا مشہور دریا نیکر ہے۔ علامہ جب جرمنی تشریف لے گئے تھے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس دریا کے کنارے بڑی جذب ومستی کی راتیں بسر کی ہیں۔

---

[۱] قصص القرآن۔ حفظ الرحمان۔

[۲] جغرافیہ خلافتِ مشرقی۔ جمیل الرحمان۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن)۔
قصص القرآن۔ حفظ الرحمان۔ دہلی۔

و

"وقد کنتم بہ تستعجلون": قرآن مجید کی آیات کی طرف اشارہ ہے۔ حوالہ یونس ۱۰ : ۵۱

"کہہ دو کہ بھلا دیکھو تو کہ اگر اس کا عذاب تم پر ناگہاں آجائے رات کو یا دن کو تو پھر
گنہگار کس بات کی جلدی کریں گے کیا جب وہ واقع ہوگا تب اس پر ایمان
لاؤگے (اس وقت کہا جائے گا کہ اب ایمان لائے؟) اس کے لئے تو تم جلدی کیا کرتے تھے"

ولیم کوپر: (انگریزی شاعر ۱۷۳۱ء – ۱۸۰۰ء) اس کے خطوط بھی انگریزی نثر کا نہایت عمدہ نمونہ تصور کئے جاتے ہیں۔ کوپر کی شاعری میں ایک مبہم سے خوف کا سایہ، ہر وقت، الفاظ و تراکیب پر چھایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ گویا شاعر ڈرتا ہے کہ اسے خلل دماغ کا عارضہ لاحق ہو جائیگا اخیر عمر کی نظموں میں، یہ سایہ بہت لطیف سا نقاب ہو کر رہ گیا ہے اور اسے وہ توازن و سکونِ ذہنی نصیب ہو گیا ہے۔ جو اچھے فن کار کے لئے ضروری ہے [۵]

---

۵ A Short History of English Literature
by B. Ifor. Evans (Middlesex)
اور پروفیسر حمید احمد خان کا مضمون بھی دیکھئے "نئی تحریریں" (حلقہ ارباب ذوق) اقبال اور انگریزی شعراء (دیکھو ایمرسن)

ہ

ہفتاد دو ملت: رسول پاکؐ کے وصال کے بعد فوراً سوئے اتفاق سے مسلمانوں میں اختلاف رونما ہونا شروع ہو گیا۔ شیعہ اور سنی دو بڑے گروہ تو خیر ہیں ہی لیکن ان کے علاوہ بھی یہ امت بہت سے فرقوں میں بٹی ہوئی ہے ان فرقوں کو ہفتاد دو ملت کہتے ہیں کہ بیان کیا جاتا ہے ان کی تعداد ۷۲ ہے۔ ذوق نے اس سے مضمون پیدا کیا ہے:

ہفتاد دو فریق حسد کے عدد سے ہیں   اپنا ہے یہ طریق کہ باہر حسد سے ہیں

ہمایوں: میاں محمد شاہ دین ہمایوں تخلص کرتے تھے لاہور کے رہنے والے تھے اُن کی تاریخ ولادت ۱۲ اپریل ۱۸۶۸ء ہے۔ میاں صاحب ایک ممتاز قانون داں تھے، پنجاب چیف کورٹ کے جج تھے اور مسلمانوں کے مسلمہ رہنما۔ اُن کا ادبی ذوق بھی بہت پختہ تھا۔ آزاد مرحوم سے کلام پہ اصلاح لیتے تھے، ان کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ جذباتِ ہمایوں کے نام سے چھپ گیا ہے، اُن کی یاد میں اردو کا ایک مشہور رسالہ ۳۵ برس تک ادب کی خدمت کرتا رہا۔ میاں صاحب نے

۱۹۱۸ء میں وفات پائی اور یہ نظم جو "بانگ درا" میں شامل ہے ۱۹۲۲ء میں لکھی گئی تھی اسی سال ہمایوں کے پہلے شمارے میں شائع ہوئی۔

میاں صاحب مرحوم نے مسلمانوں کی خدمت کے لئے گویا اپنے آپ کو وقف کر رکھا تھا۔ افسوس ہے کہ اب تک ان کے مستند سوانح حیات شائع نہیں ہوئے۔

ہمالہ: ہندوستان کا مشہور پہاڑ ہے۔ پنجاب اور صوبہ سرحد کے شمال سے اور ریاست کشمیر میں جنوب مشرق سے شمال مغرب کی طرف اس پہاڑ کے کئی سلسلے پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ سلسلے بھارت کے شمال میں، برما تک چلے گئے ہیں۔ اس پہاڑ کے چار خاص سلسلے ہیں (ا) پنجاب کے میدانوں سے ملحق کم بلند پہاڑی سلسلے (ب) سلسلہ ا کے شمال میں اونچے اونچے کوہسار کاغان کی وادی اسی سلسلہ کوہسار میں واقع ہے (ج) ہمالیہ اعظم، کشمیر کی مشہور وادی اسی سلسلہ میں ہے (د) سلسلہ لداخ۔ اس پہاڑ کے سلسلوں نے برعظیم ہندوپاک کی آب ہوا معین کرنے میں بہت حصہ لیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہاں کے لوگوں کے مزاج کی ساخت بھی آب وہوا اور جغرافیائی کیفیات کے مطابق ہے مختلف ملحقہ ممالک کے آرٹ میں بھی ہمالیہ کے کوہستانی سلسلوں اور دریاؤں کو اہمیت حاصل رہی ہے[۱]

ہاں سُنو نے از نیستان خود حکایت می کنم ۔ بشنوا ے گل از جدائیہا شکایت می کنم

یہ مولانا رومی کے مشہور شعر پر مبنی ہے یعنی:

بشنو از نے چوں حکایت می کند ۔ وز جدائی ہا شکایت می کند

یہ مثنوی کے اس حصے کا جزو ہے جسے مستشرقین نغمۂ نے کے نام سے یاد کرتے ہیں اور جس کے مطالب ان کی نظر میں مرکزی اہمیت کے حامل ہیں، اس حصے میں خالق و مخلوق کے پر اسرار روابط سے بحث کی گئی ہے "نے" انسان کی علامت ہے، جو دائما اس حقیقت مطلقہ کی جستجو میں سرگرداں رہتا ہے جس کا پرتو خود اس کے وجود کا نقطہ ہستی ہے۔

---

[۱] دیکھئے A Short History of India; by Moreland

ی

یاجوج ماجوج: دیکھیے تورانی اور تاتاری۔

ینسلون: قرآن مجید کی آیت کی طرف اشارہ ہے۔ حوالہ یہ ہے۔ ۹۶/۲۱

"یہاں تک کہ یاجوج اور ماجوج کھول دیے جائیں گے۔"

یہ وہی تورانی یا تاتاری ہیں جن کا ذکر آچکا ہے۔

یورش بلغاری: بیسویں صدی کے آغاز میں جب ترکوں کی سیاسی قوت بالکل زوال پذیر ہو چکی تھی تو بلقانی ریاستوں نے ترکوں سے لڑائی چھیڑ دی، اس لڑائی میں ترکوں کے ہاتھ سے بہت سے خطے نکل گئے۔ یہ جنگ عظیم سے کچھ پہلے کا واقعہ ہے۔[۱]

یورش تاتار: دیکھیے کلمہ تاتاری

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

---

[۱] تاریخ عالم اسلامی۔ بر اکلمین (انگریزی)

اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تاتاریوں کا وہ دودمان جو ایران پہ حکمران تھا اور ایل خاں کہلاتا تھا آخر مشرف بہ اسلام ہوگیا تھا۔ اس دودمان کا عہدِ حکومت سنہ ۶۵۴ھ سے ۷۵۴ھ تک چلتا ہے۔ احمد تکودار جس نے سنہ ۶۸۰ھ میں جلوس کیا تھا مسلمان ہوگیا، اس کے جانشین بھی کچھ عرصے کے بعد دائرۂ اسلام میں داخل ہوگئے۔ ان کے اقتدار کی وجہ سے اسلامی سیاست کی بڑی دھاک بیٹھ گئی اور یوں جو لوگ خلافت عباسیہ کو برباد کرنے والے تھے وہی کعبے کے پاسباں بھی ہوگئے۔[1]

یوسفِ ثانی: مراد شیخ عطا محمد ہیں کہ علامہ مرحوم کے بڑے بھائی تھے۔ انھیں نے علامہ کی پرورش کی اور اپنے ذاتی مفاد پر علامہ کے مفاد کو ترجیح دی۔

---

[1] تاریخ مفصل ایران۔ عباس اقبال۔

تاریخِ ادبیاتِ ایران۔ جلد سوئم براؤن (انگریزی)۔

طبقاتِ سلاطینِ اسلام۔ عباس اقبال۔

ضربِ کلیم

الف

ابوالہول: مصری عجیب وغریب جانوروں کے نمونے تراشتے تھے مثلاً شیر جس پر آدمی کا سر رکھا ہے لیکن خاص ابوالہول غیزہ میں ہے۔ یہ ابوالہول بہت جسیم ہے۔ اس کا بدن اتنا بڑا ہے کہ کسی جانور سے مشابہت کا تصور قریب قریب ناممکن ہے۔ سر البتہ انسانی ہے۔ اور اپنی جسامت کے باوجود اس کی تعمیر میں کمال دقت و نفاست سے کام لیا گیا ہے۔ ابوالہول کی تعمیر میں مسئلہ صرف تناسب کا تھا اور تناسب کا کمال اس میں اس درجہ کا ہے کہ تمام دنیا کے مصوروں، سنگ تراشوں اور مجسمہ سازوں نے اس کی تعریف کی ہے۔ یہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ مجسمہ کسی دیوتا کا ہے نہ یہ سراغ لگ سکا ہے کہ اس کی تعمیر کا مقصد کیا ہے۔

ابی سینیا: مشرقی افریقہ میں ایک سلطنت ہے جس کا سرکاری نام اتھوپیا ہے۔ اس کا رقبہ تین لاکھ پچاس ہزار مربع میل ہے اور باشندوں کی تعداد ایک کروڑ سے زیادہ ہے

دارالخلافہ عدیس ابابا ہے۔ جس واقعہ کی طرف علامہ اس نظم میں اشارہ کر رہے ہیں اس کا پس منظر یہ ہے کہ ابی سینیا یا حبش کا بادشاہ ہیل سلاسی جسے عرب نجاشی بھی کہتے ہیں مدت سے کچھ امرار کی نظروں میں کھٹک رہا تھا۔ ادھر اطالیہ سمالی لینڈ پر متصرف ہو جانے کے بعد للچائی ہوئی نظروں سے ابی سینیا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں جھڑپیں شروع ہوئیں ابی سینیا نے مجلس اقوام سے استمداد چاہی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ نجاشی فرار ہو کر انگلستان جا پہنچا۔ اٹلی نے ابی سینیا کو اپنی مقبوضات کا جزو بنا لیا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ علامہ کی نظروں سے مخفی رہا۔ ۱۹۴۰ء میں جب اطالیہ اور برطانیہ کی جنگ چھڑ گئی تو ہیل سلاسی بھی انگریزوں کی مدد سے پھر اپنے ملک پر متصرف ہو گیا۔ بہر حال جن دنوں یہ نظم لکھی گئی ہے، ان دنوں کیفیت یہ تھی کہ جمعیت اقوام عملاً کچھ بڑی طاقتوں کا آلۂ کار بن کر رہ گئی تھی اور ایک فعال ادارہ کی حیثیت سے گویا دم توڑ رہی تھی۔ علامہ کی دوررس نظروں نے گویا دیکھ لیا تھا کہ اٹلی اور ابی سینیا کی آویزش مجلس اقوام کی خاموشی، برطانیہ کی گومگو کی پالیسی ایک بہت بڑی جنگ کا پیش خیمہ ہے دوسری جنگ عظیم کی پیش گوئی جو اس نظم میں کی گئی ہے وہ علامہ زبانی بھی کیا کرتے تھے وہ فرمایا کرتے تھے کہ ہٹلر جس طریقہ سے اپنی مقبوضات اور دائرۂ اثر کو وسیع کرتا چلا جا رہا ہے اس سے واضح ہے کہ یورپ میں ایک دوسری جنگ عظیم برپا ہو گی جس کے اثرات بہت دوررس ہوں گے، وہ کہتے تھے کہ اس جنگ عظیم کے نتیجہ سے بہت سے پسماندہ مشرقی ممالک مغرب کے پنجۂ استعمار سے رہائی پا جائیں گے۔[۵]

ارتباطِ حرف و معنی: انتقاد کے جدید نظریات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ نکتہ بخوبی روشن

---

[۵] قاموس سیاسیات عالم: فیبر اینڈ فیبر (لندن)

ہوتا ہے کہ الفاظ اور معانی ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ یہاں تک کہ معانی دماغ میں اس وقت تک نہیں آسکتے جب تک الفاظ کا جامہ نہ پہن لیں۔ ہم معانی لبسیط یا معانی مجرّد کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ یہ بات نہیں کہ معنی رُوح ہے اور الفاظ اس کا پیراہن بلکہ جس طرح اقبال نے کہا ہے

کہ معانی رُوح ہے اور الفاظ کے بدن میں مخفی ہے اور اسی سے اس کی نمود ہوتی ہے، الفاظ معانی سے مشروط ہوتے ہیں۔ دقیق اور پیچدار معانی طبعاً دقیق الفاظ کے استعمال کا تقاضا کرتے ہیں۔

اشتراکیت: اشتراکیت کی مختلف شاخیں ہیں لیکن ایک نظامِ فکر کے اعتبار سے دو چیزیں ہر اشتراکی نظام میں ضرور موجود ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ریاست کی تمام ملکیت پر من حیث المجموع عوام متصرف ہوں اور دوسرے یہ کہ دولت کی تقسیم اس طرح کی جائے کہ حق دار کا جو حق چھین کر سرمایہ دار کو دے دیا جاتا تھا وہ اسی کے پاس رہے۔ موجودہ اشتراکیت کی ابتدا ۱۸۱۵ء میں ہوئی۔ ان دنوں اس تحریک کا مرکز فرانس تھا۔ ۱۸۴۸ء کے بعد کارل مارکس نے اور اینگلز نے اس تحریک کو بڑی تقویت بخشی۔ کارل مارکس نے ایک نئے اقتصادی نظام کا خاکہ پیش کیا اور یہ دعویٰ کیا کہ موجودہ اقتصادی نظام سرمایہ داروں کے مفاد کی حفاظت کا ایک آلہ ہے اور سرمایہ دار محض تلقین و ترغیب دولت کی منصفانہ تقسیم پر کبھی رضامند نہیں ہو سکتے۔ انھوں نے یہ تعلیم دی کہ مزدوروں کو منظم ہو کر کوشش کرنی چاہیے کہ وہ تمام جماعتیں اور گروہ مٹ جائیں جو موجودہ اقتصادی نظام کی تخلیق یا اس کے خالق ہیں۔ مختصر الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اشتراکی اس امر کے مدعی تھے کہ نیا اقتصادی نظام ارتقا سے نہیں بلکہ بغاوت سے پیدا ہوگا۔ روس میں

اس تحریک نے بہت پر پرزے نکالے، لینن اور سٹالن نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے اس کی پشت پناہی کی اور جب روس کا نظام اشتراکی ہو گیا تو اشتراکیت کا پرچار دنیا بھر میں بڑے زور سے ہونے لگا۔ برطانیہ میں بھی لیبر پارٹی کم وبیش انھیں اصولوں پر منضبط کی گئی جن پر اشتراکیت قائم تھی۔

اشتراکیت کے حامی یہ توقع رکھتے ہیں کہ اگر دنیا میں اشتراکی نظام قائم ہو جائے تو معاشرہ کی نئی تنظیم عمل میں آئے گی، افلاس دور ہو جائے گا، مزدوروں کا حق انھیں ملا کرے گا۔ فکری اور ذہنی آزادی نصیب ہوگی اور زندگی ہر طرح خوشگوار تر ہو گی۔ جو لوگ اشتراکیت کے مخالف ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی ایسا نظام قائم کر دیا جائے جس میں دولت کے تمام ذرائع املاک اور زمینوں پر تصرف عوام کا ہو تو وہ جو افراد کے اندر دوسروں سے مقابلہ کرنے کی تڑپ ہوتی ہے وہ مفقود ہو جائے گی۔ ان کے خیال میں اشتراکیت کے نتائجِ بد یہ بھی نکلیں گے کہ انفرادی، فکری اور ذہنی آزادی سلب ہو جائے گی اور اشتراکی ریاست کی رعایا کے تمام افراد جبراً ایسے سانچے میں ڈھلے جائیں گے جو ریاست کے فرماں رواؤں کا منشا پورا کرتا ہو۔ اس وقت اصل مسئلہ جو معرضِ بحث میں ہے وہ یہ ہے کہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ ریاست منصوبہ بندی بھی کر سکے اور انفرادی ملکیت کی بھی اجازت ہو۔

جوڈ اشتراکیت کے متعلق لکھتا ہے:-

"بعض اوقات انفرادیت پسند اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اشتراکیت فرد کو ریاست کا تابع بنا کر اس کو اس کی آزادی سے محروم کر دے گی۔ اگرچہ اس امر کا امکان ہے کہ اشتراکیت کی بعض شکلیں عملاً یہی نتیجہ پیدا کر دیں گی لیکن اشتراکیت کی

غرض و غایت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اشتراکیت دراصل فرد کو اس کی مادی پریشانیوں سے آزاد کرانا چاہتی ہے تاکہ وہ اپنی خواہش کے مطابق زندگی بسر کرسکے اور قطعاً آزادانہ طور پر اپنی شخصیت کی تکمیل کرسکے لیکن چونکہ اشتراکیین ریاست کو ایسا نامیاتی وجود تصور کرتے ہیں، جو ایسے واحدوں پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اس لئے ان کا خیال ہے کہ ایسی آزادی صرف ایک مفصل و مکمل معاشری نظام کے ذریعہ ہی حاصل کی جاسکتی ہے۔"

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا اشاعت یازدہم میں اشتراکیت کی تعریف یوں کی گئی ہے:

"ایک ایسی حکمت عملی یا نظریہ ہے جو ایک مرکزی جمہوری حکومت و اختیار کے ذریعہ حالت موجودہ کی نسبت بہتر طریق پر دولت کی تقسیم یا پیداوار کو عمل میں لانا چاہتا ہے۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اشتراکیت کے تمام دبستان ہائے فکر مندرجہ ذیل اصولوں پر متفق ہیں

۱۔ ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت منسوخ کردی جائے۔ اہم صنعتیں عوام کی ملکیت اور ان کے تصرف میں ہوں۔

۲۔ صنعتیں ملت کی ضرورتوں کو ملحوظ رکھیں۔ افراد کا نفع ثانوی اہمیت رکھتا ہو۔

۳۔ ذاتی منافع کے بجائے محرک عمل معاشری خدمت ہو۔

اگرچہ مذکورہ بالا اصولوں پر اتفاق رائے ہے لیکن اختلاف اس بات میں ہے کہ ان مقاصد کی تحصیل و تکمیل کے لئے کیا طریقے اختیار کئے جائیں۔

اشتراکیت ہی کی ایک شاخ اشتمالیت بھی ہے (کمیونزم)، کبھی کبھی اشتمالیت اور

اشتراکیت متبادل کلمات کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اشتمالیت کا مقصد یہ ہے کہ ریاست زندگی کی تمام ضروریات، مثلاً خوراک، لباس، طبی امداد وغیرہ فرد کو مفت مہیا کرے۔ اشتمالیت کے حامی طبقاتی جنگ اور انقلاب کو ناگزیر تصور کرتے ہیں۔ اشتمالیت میں بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ تمام صنعتوں پر ریاست کا اس طرح تصرف ہوتا ہے کہ فرد ہر قسم کی ملکیت سے دستبردار ہونے پر مجبور ہوتا ہے۔

جوڈ نے جدید سیاسی نظریہ کے آخر میں کچھ سوال اس طرح کیے ہیں جن میں سے اہم ترین سوال یہ ہے کہ کیا اشتراکیت میں ایسے محرکات موجود ہیں کہ عوام دنیا کے کاموں کی انجام دہی پر آمادہ ہوں اور ذاتی منفعت کا خیال ترک کر دیں۔ جوڈ کا نقطۂ نظر ہمدردانہ ہے اور اس کا خیال ہے کہ دنیا میں سرمایہ داری کا جو نظام قائم ہے آخر کار کوئی اور نظام اس کی جگہ ضرور لے گا اور قیاس یہی چاہتا ہے کہ وہ اشتراکیت ہی کی ایک شکل ہو۔

علامہ کا خیال ہے کہ اشتراکیت میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو اسلام کے اصولوں سے مشابہت رکھتی ہیں۔ اشتراکیت میں البتہ یہ بہت بڑی خرابی ہے کہ اس نظام میں لادینی گویا مسلک کا ایک جزو ہے کہ خدا کے وجود کی ضرورت بھی نہیں محسوس کی جاتی بلکہ بعض اشتراکی تو اس بات کی مدعی ہیں کہ مذہبی عقائد کی بنا پر طرح طرح کے فتنے اور فساد برپا ہوتے ہیں۔ اس لئے اشتراکی نظام کو بہرحال مذہب اور خدا سے دور رہنا چاہیے۔ علامہ نے ایک مکتوب میں بھی اس خیال کا اظہار کیا ہے۔ روس کے اشتراکی نظام میں اگر خدا کے وجود پر ایمان لانا بھی شامل ہوتا تو اسلام میں اور اشتراکیت میں کچھ بہت زیادہ فرق نہ ہوتا۔ ظاہر ہے کہ یہ بات لکھتے وقت علامہ صرف اشتراکیت کے ان مسلمات کو نگاہ میں رکھ رہے تھے جو اسلام کی تعلیمات سے متصادم نہیں ہیں۔[۱]

۱؎ حوالے صفحہ ۸۷ پر ملاحظہ ہوں۔

اشراق (قوتِ اشراق) اشراق کا مادہ شرق ہے اور شرق کے معنی ہیں طلوع ہونا اور پھوٹنا اور ظاہر ہونا۔ فلسفۂ اشراق کے معتقد اس بات کے مدعی ہیں کہ کشف حقیقت کی ایک یہ صورت بھی ہے کہ ایک انسان ہزارہا میل کے فاصلے پر بیٹھ کر کسی دوسرے شخص کو اپنی معلومات اور اپنے عرفان سے مستفید کر سکے۔ اس حکمت کا تعلق نو فلاطونی مسلک سے ظاہر ہے۔ اس عقیدہ کے بہت بڑے حامی شیخ شہاب الدین یحییٰ بن حبش سہروردی تھے جو شیخ اشراق کہلاتے تھے۔ ان کی تاریخ ولادت ۵۴۹ھ ہے اور تاریخ شہادت ۵۸۷ھ ہوا یہ کہ حلب میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے اشارہ سے انھیں شہید کر دیا گیا اور ان کا جرم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ حکیم تھے اور اپنے فلسفیانہ افکار کی تبلیغ میں بیباک تھے۔

صاحبِ غیاث لکھتے ہیں کہ اشراقیان فلسفیوں کے اس گروہ کو کہتے ہیں کہ روشنی باطن کی وجہ سے اپنے مقلدوں سے ملاقات کے محتاج نہیں ہوتے بلکہ مکاشفہ کے ذریعہ اپنی بات ان تک پہنچا سکتے ہیں[1]۔

اہرامِ مصر: مورخین نے قدیم مصر کے حکمراں خاندانوں کو تیس دودمانوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ پہلا اور دوسرا خانوادہ ۳۱۸۸ء ق م سے ۲۸۱۵ء ق م تک حکومت

(حاشیہ صفحہ ۸۶) حوالے: جدید سیاسی نظریہ۔ جوڈ مجلس ترجمہ لاہور۔
قاموس سیاسیات عالم: (انگریزی) ٹیبر اینڈ فیبر لندن۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا اشاعت یازدہم
کارل مارکس: سرمایہ۔ اینگلز کے مکاتیب (انگریزی)

[1] حوالے: تاریخ تصوف در اسلام: قاسم غنی۔ غیاث اللغات۔ تاریخ مفصل ایران: عباس اقبال
ثقافت اسلامی کا خاکہ: شوستری، بنگلور، (انگریزی)
استدراک: شوستری نے بتخصیص کہا ہے کہ شہاب الدین کے نظریات نو فلاطونی تصورات و افکار سے بہت متاثر نظر آتے ہیں۔ روشنی اور نور کو اس مسلک میں جو اہمیت حاصل ہے اس سے بھی شوستری نے بحث کی ہے
میراث اسلام۔ میراث ایران

کرتا ہے اور ستائیسویں سے اکتیسویں دودمانوں کا عہد حکومت ۵۲۵ ق م سے ۳۲۵ ق م تک ہے۔ تیسرے اور چوتھے خانوادے کے سنین یہ ہیں ۲۸۱۵ ق م سے ۲۲۹۴ ق م۔ عام طور پر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ تیسرے اور چوتھے خانوادے کے عہد حکومت میں مصری فرماں رواؤں اور شاہزادیوں نے اپنے قبرستان یا مقبرے تعمیر کئے اور ان قبرستانوں پر بڑے بڑے اہرام بنا دئے گئے، جن کی بنیاد وسیع اور عریض ہوتی ہے لیکن اوپر کا حصہ لمبائی اور چوڑائی میں بتدریج کم تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ مصر میں اس وقت اسی کے قریب اہرام دریافت ہو چکے ہیں۔

عام طور پر یہ اہرام دریائے نیل کے مغربی کنارہ پر قدیم شہر میمفس کے گرد و نواح میں تعمیر کئے گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان اہرام کی تعمیر کا مقصد یہ تھا کہ عام لوگ شاہی حنوط شدہ لاشوں کی بے حرمتی نہ کر سکیں۔ اس کی بے حرمتی کا امکان اس لئے تھا کہ مصری اپنے مذہبی عقائد کے مطابق جہاں بادشاہ کے ساتھ اس کے لونڈی غلام بھی دفن کر دیتے تھے وہاں اس کی ذاتی املاک بھی مقبروں میں رکھی جاتی تھی۔ مذہباً قدیم فرماں روا اس عقیدہ پر سختی سے قائم تھے کہ اگر لاش اپنی اصلی حالت پر قائم نہ رہی تو ثواب اخروی سے محروم رہے گی۔ علاوہ ازیں ان کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ مرنے کے بعد بھی لاش کے ہمزاد یا 'کا' کو مادی اسباب و ذرائع کی ضرورت پڑتی ہے یعنی اسباب خورد و نوش اور ملبوس و جواہرات کی۔

مصری فرماں روا صرف اسی بات سے خوف زدہ نہیں تھے کہ لوگ ان کے مقبروں کو لوٹ لیں گے اور لاشوں کی بے حرمتی کریں گے بلکہ اہرام کی تعمیر میں یہ خدشہ بھی پنہاں تھا کہ مقبرے آندھی یا بارش سے خراب ہو جائیں گے۔

اہرام کی اندرونی دیواروں پر یعنی مقبروں میں تصاویر نقش کی جاتی تھیں مذہبی احکام قلمبند کیے جاتے تھے۔ یہ بھی ضروری تھا کہ لاش کے کا تک اسبابِ خورد و نوش پہنچانے کے لئے ایک راستہ کھلا رہے۔ اس راستہ کی بڑی سختی سے حفاظت کی جاتی تھی۔ صرف بادشاہ کے اقارب یا بڑے بڑے پروہت اس سے آگاہ ہوتے تھے۔ اب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکا کہ اتنے بڑے بڑے پتھر اہرام کی چوٹیوں تک کیسے پہونچائے جاتے تھے البتہ قیاس سے کام لے کر کہا گیا ہے کہ قدیم مصری معمار آلاتِ جرِ ثقیل سے آگاہ تھے اور ان سے کام لیتے تھے۔ بہت عرصے تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اہرام کی رمز کیا ہے آہستہ آہستہ انکشافات کے ذریعہ یہ معلوم ہو گیا کہ اہرام جلیل القدر فرماں رواؤں کے مقابر ہیں کچھ باتیں ایسی تھیں جن کا اہرام کی تعمیر میں خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا تھا۔ مثلاً یہ کہ عمارت دریا کے مغرب کی طرف واقع ہو، دریا کی سطح سے کافی بلند ہو اور اس کا رُخ مغرب کی طرف ہو تاکہ ڈوبتے ہوئے سورج سے مستفید ہو سکے۔

اہرام کی تعمیر کا کام دراصل اس وقت شروع ہوتا تھا جب سطح کی ریت کو ہٹا کر بنیادیں پختہ زمین تک پہونچائی جاتی تھیں۔ بعض مورخوں نے یہ لکھا ہے کہ اہرام میں جن بڑے بڑے پتھروں کا استعمال کیا گیا ہے وہ پاس کی گری پڑی عمارتوں کے اجزا تھے لیکن زیادہ تر رجحان یہی ہے کہ مصر کے صنعت گر خارہ تراشی میں کمال رکھتے تھے اور انھیں پتھروں کو بلندی تک پہنچانے کا فن بھی آتا تھا۔ ہیروڈوٹس یونانی مورخ کہتا ہے کہ قدیم مصری پتھروں کو چوٹیوں تک پہنچانے کے لئے مشینوں کا استعمال کرتے تھے۔

اس میں کو [illegible] ہے کہ جو اہرام اب تک مکشوف ہوئے ہیں انھیں دیکھ کر دل پر فرماں رواؤں کی ہیبت اور جلال کا تاثر پیدا ہوتا ہے، غالباً یہ مقصود بھی تھا۔[1]

---

[1] مصر کے اہرام: ایڈورڈز (انگریزی) ۱۹۵۲ء لندن

ایجادِ معانی (محنتِ پیہم) ایجاد معانی کے لئے دیکھئے کلمۂ سرود۔ سرود کے سلسلہ میں گذارش کی گئی تھی کہ ریاض اور محنت کے متعلق علیحدہ بحث ہوگی۔

تخلیق ایک پر اسرار عمل ہے اور خلاّق معانی (سب فنون لطیفہ ملحوظ خاطر ہیں) اپنی فکر کو پیراہن مادی عطا کرنے تک جن مرحلوں سے گزرتا ہے ان کی تفصیلات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ مرکزی خیال یا فکر کا نکتہ روشن اپنی تمام دلالت ہائے التزامی کے ساتھ

۲۔ فکر یا خیال کا تجزیہ اور اس کی تحلیل۔

۳۔ علامات، تشبیہات، استعارات اور بیان و معانی کے مختلف رموز سے کام لے کر فکر کا ابلاغ یعنی سننے یا دیکھنے والوں تک اپنا مطلب پہونچانا۔

تیسری منزل سب سے مشکل ہے اور جب تک صنعت گر یا خلاق بتسلسل و تواتر محنت نہ کرے اور اپنے وسائل مادی کے کیف وکم سے کما حقہٗ آگاہ نہ ہو اپنا مطلب دوسروں تک بالکل نہیں پہنچا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ پروفیسر رچرڈ نے اپنی مشہور تصنیف "اصول انتقاد ادبیات" میں شعر کی دو قسمیں کی ہیں۔ ایک ناقص اور ایک کامل۔ شعر کا اچھا ہونا وہ فرض کرتے ہیں، اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ جہاں ابلاغ ناقص ہوتا ہے اور ابہام پیدا ہو جاتا ہے وہاں شعر ناقص وجود میں آتا ہے ہو سکتا ہے کہ شعر عظیم المرتبت ہو لیکن ابلاغ کے اعتبار سے ناقص ہو اسے شعر کے دائرہ سے خارج نہیں کر سکتے مگر کہہ سکتے ہیں کہ شاعر اظہار معانی کی منزلیں بخوبی طے نہیں کر پایا۔ انھیں منزلوں کو طے کرنے کی مشق، کوشش، محنت، ریاض اور "خونِ جگر خوردن" کہلاتی ہے[۱]۔

---

[۱] اصولِ انتقادِ ادبیات: رچرڈز (انگریزی)۔
آرٹ: کولنگ وڈ (انگریزی)۔
معانی کے معانی: آگڈن (انگریزی)۔
چہار مقالہ: نظامی عروضی سمرقندی (فارسی)۔
شعر کی تفہیم: الزبتھ ڈریو (انگریزی)۔
نظریۂ شعر: ایبر کرومبی (انگریزی)۔
اِدھر اُدھر سے: سنتیانا کی تصنیف اور مضامین آرٹ کے متعلق،
کتاب العمدہ: ابنِ رشیق (عربی)۔
المعجم فی معائیر اشعار العجم: شمس قیس رازی (خوبی شعر کے متعلق مباحث فارسی)۔

ب

بلشویک : روس میں اس وقت جو اشتراکی نظام قائم ہے وہ دراصل اشتمالیت کی ایک شکل ہے۔ گذارش کی جا چکی ہے کہ اس نظام میں ہر چیز من حیث المجموع ریاست کی ملکیت ہوتی ہے جو عوام اور اس کے نمایندوں سے عبارت ہوتی ہے۔ ریاست کے تمام افراد دولت کی تقسیم میں شریک ہوتے ہیں تقسیم دولت کے طریق کار کے متعلق اختلاف ہے مثلاً یہ کہ دولت اس نسبت سے تقسیم کی جائے جو پیداوار کو دولت پیدا کرنے والے سے ہے یا اس نسبت سے جس کی رعایا کو ضرورت ہے۔ بالفاظ دیگر کہ رعایا کا کوئی فرد زیادہ دولت پیدا کر کے زیادہ دولت کا مستحق ہو جاتا ہے یا دولت کی تقسیم کا مدار فرد کی ضروریات پر ہوتا ہے۔ اگر موخر الذکر اصول کے مطابق دولت تقسیم کی جائے تو ایک مزدور جس کا کنبہ سات آٹھ افراد پر مشتمل ہے اس شخص سے زیادہ دولت پانے کا مستحق ہو گا جو تنہا رہتا ہے۔ دراں حال کہ دونوں نے دولت پیدا کرنے میں یکساں کام کیا ہے۔ اشتمالیت کا پہلا داعی

افلاطون تھا جس نے اپنی تصنیف جمہوریت میں معاشرہ کی اشتمالی تنظیم کا نقشہ کھینچا ہے۔

اشتراکیت اور اشتمالیت میں فرق یوں بیان کیا گیا ہے۔

اشتراکیت	اشتمالیت
ہر فرد اتنا کام کرنے پر مجبور ہوگا جتنا وہ استعداد ذہنی وجسمانی کے مطابق کر سکتا ہے اور دولت کی تقسیم میں اپنے کام کی مقدار اور نوعیت کے اعتبار سے شریک ہوگا۔	ہر فرد اتنا کام کرنے پر مجبور ہوگا جو اس کی ذہنی اور جسمانی استعداد کے مطابق ہو لیکن دولت کی تقسیم میں اپنی ضروریات کے مطابق شریک ہوگا

بلشویک کے لغوی معنی اکثریت کے ہیں۔ ہوا یہ کہ ۱۹۰۳ء میں روسی اشتراکی لندن میں جمع ہوئے کہ اپنی پارٹی کا منشور مرتب کریں۔ ۵۸ نمائندوں نے شرکت کی۔ انقلابی گروہ کا قائد لینن تھا اور اعتدال پسندوں کا مارٹوف۔ لینن نے یہ کہا کہ تمام اختیارات مجلس مرکزیہ کے سپرد کر دینے چاہئیں۔ اسے اُنیس ووٹ ملے۔ مارٹوف نے کہا کہ مجلس مرکزیہ پر عوام کا اقتدار قائم رہنا چاہیے اسے سترہ ووٹ ملے۔ اس واقعہ کے بعد لینن کے حامی اور مقلد بلشویکی کہلائے۔ بیرونی دنیا میں بلشویک کا لفظ عزت کے مدارج سے گر گیا ہے لیکن روس میں اب تک مجلس مرکزیہ اپنا نام یوں سپرد قلم کرتی ہے:

دولتِ اشتراکیہ روس کی اشتمالی پارٹی یعنی بلشویکی۔

جب محض کلمات استعمال کیے جاتے ہیں یعنی سی پی ایس یو۔ تب بھی آخر میں بی کا حرف اضافہ کر دیا جاتا ہے۔[۵]

بو علی سینا: شیخ الرئیس ابو علی بن حسین بن عبداللہ بن سینا کی تاریخ ولادت ۳۷۰ھ ہے

۵؎ قاموس سیاسیات عالم: فیبر اینڈ فیبر لیٹڈ (لندن)

اس کا مولد بخارا کے نواح میں ایک گاؤں ہے جسے خرمیثن کہتے ہیں۔ اوائل عمر ہی سے اسے اکتسابِ فضائل کا شوق تھا پہلے اس نے منطق، فقہ، نجوم، ریاضی اور طب کی طرف توجہ کی پھر حکیم فارابی مشہور فلسفی کی تصانیف کو مورد مطالعہ قرار دیا۔ اور ان ہی تصانیف کے مطالعہ کی بنا پر اسے الٰہیات اور مابعد الطبیعیات کا ذوق پیدا ہوا۔ حسنِ اتفاق سے اس کا والد سامانیوں کے دربار میں ایک اچھے عہدہ پر ممتاز تھا چنانچہ بوعلی کو یہ سہولت میسر آئی کہ وہ عدیم المثال شاہی کتب خانہ کے تمام نوادر سے استفادہ کر سکتا تھا۔ خود بوعلی کا بیان ہے کہ اس کتب خانہ میں ایسی نایاب کتابیں تھیں جن کے نام بھی فقط علما کو معلوم تھے۔ کچھ تو یہ کہ بوعلی کا حافظہ بہت تیز تھا۔ اور کچھ یہ کہ وہ بلا کا ذہین تھا اس لئے اس نے ان کتابوں سے پورا فائدہ اٹھایا اور بتدریج اس کا شمار فلسفہ اور طب کے متخصصین میں ہونے لگا۔

پہلے بوعلی باپ کے ساتھ رہا لیکن جب اس کی شہرت نے پر پرواز نکالے تو مامون بن مامون خوارزم شاہی کے دربار سے منسلک ہو گیا ان دنوں اس خانوادہ کا پایہ تخت گرگانج تھا۔ لی سٹرینج اس شہر کو گرگنج کے نام سے پہچانتا ہے۔ یہ وہی شہر ہے جسے کچھ مورخوں نے جرجانیہ بھی لکھا ہے۔ سنجر کے عہد حکومت میں خوارزم شاہیوں کا جو خاندان ابھرا ہے ان کے دارالخلافہ یعنی خوارزم کی بنیادیں بھی اسی شہر کے خرابہ پر رکھی گئی تھیں۔ جب مغلوں نے خوارزم کو غارت کیا تو یہاں ایک شہر از سر نو تعمیر کیا گیا جسے خوارزم نو کہتے تھے بہر حال یہ واضح رہنا چاہئے کہ یہ مامون بن مامون خوارزم شاہی جس کے دربار میں بوعلی جاتا ہے محمود غزنوی کا معاصر ہے۔ اس دودمان سے اس کا کوئی تعلق نہیں جس کا آخری بادشاہ علاء الدین محمد مغلوں سے شکست کھا کر نامرادی کی موت مرا تھا۔

جب سلطان محمود نے پروفیسر براؤن کے الفاظ میں بجبر و قہر اپنے دربار میں علما

اور فضلا جمع کرنے شروع کیے تو جن لوگوں کو خاص طور پر بلایا گیا تھا ان میں بوعلی سینا بھی شامل تھا۔ البیرونی بھی انھیں مخصوص مقربین میں سے تھا۔ وہ تو محمود کے دربار میں پہنچ گیا لیکن بوعلی نے انکار کیا۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ شیخ الرئیس مذہبًا شیعہ تھا اور محمود کے دینی تعصب سے خائف۔ جب محمود کے قاصد مامون خوارزم شاہی کے دربار میں پہونچے تو بوعلی سینا چھپ کر نکل کے چلا گیا اور وہاں سے ہمدان اور اصفہان پہونچا۔ شمس الدولہ دیلمی نے اس کی بڑی قدردانی کی۔

شیخ نے منطق کے متعلق جو رسالہ لکھا ہے اس کے شروع میں اس کے خود نوشت سوانح مندرج ہیں اور اسی کے ایک شاگرد نے سوانح کی تکمیل بھی کردی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ الرئیس اپنے تمام فضائل اور کمالات کے باوصف شراب نوشی میں بے اعتدالی سے کام لیتا تھا۔ جب مرض الموت میں اس پر اسہال کا حملہ ہوا تو بھی اس نے بے اعتدالیاں ترک نہ کیں نتیجہ یہ نکلا کہ مرض پر قابو نہ پایا جا سکا۔ اس کی وفات کا سال ۴۲۸ھ ہے اور مدفن ہمدان۔

شیخ کی بیشتر تصانیف مابعدالطبیعیات، الٰہیات اور ریاضیات سے متعلق ہیں اور عربی میں ہیں، طب پر اس کی کتاب قانون صدیوں تک مشرق اور مغرب کے مدرسوں میں پڑھائی جاتی رہی اور شیخ کے فرمودات سند رہے۔ شفا اور اشارات بھی شیخ ہی کی تصانیف ہیں کہ منطق، حکمت اور طبیعیات کے متعلق مطالب بلند پر مشتمل ہیں۔

فارسی میں شیخ کا رسالہ دانش نامۂ علائی جو علاء الدولہ سے منسوب ہے بہت مشہور ہے۔ اس کتاب میں شیخ نے علمی اصطلاحات کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔

یہ تو مسلم ہے کہ شیخ عربی میں قصیدے کہتا تھا لیکن کچھ فارسی رباعیات بھی اس سے

منسوب ہیں۔ یہ نسبت میری نظر میں مشکوک ہے کہ شیخ سے منسوب رباعیات میں سے اکثر ان رباعیات میں شامل ہیں جنھیں آوارہ گرد کہا جاتا ہے۔ بہر حال اس سے ایک رباعی ایسی منسوب ہے۔ جو مطالب کے اعتبار سے گویا اندرونی شہادت مہیا کرتی ہے کہ اس کا مؤلف اعلیٰ درجہ کا عالم اور فلسفی ہے (تاہم اس بات کا امکان ہے کہ یہ رباعی خیام کی ہو)[۱]

کفر چو منی گزاف و آساں نبود
محکم تر از ایمان من ایمان نبود
در دہر چو من یکے و آں ہم کافر
پس در ہمہ دہر یک مسلماں نبود

بہزاد: مسلمانوں نے مصوری کی طرف چنداں توجہ نہیں دی کہ فقہی تعبیرات کے مطابق شرعاً ممنوع تھی (یعنی جانداروں کی تصاویر یا مرقعے) اس کے باوجود جب سلطنت عباسیہ قائم ہوئی اور ایرانی نفوذ و اقتدار سلطنت میں راسخ ہو گیا تو بتدریج ایران کے پرانے علوم و فنون کو بھی پنپنے کا موقع ملا۔ مصوری بھی انھیں میں سے ہے۔ یہ مسلّم ہے کہ ساسانیوں کو نقاشی سے شغف تھا اور یہ بھی مسلّم ہے کہ مانی جو ایرانِ قدیم کا بہت بڑا مفکر تسلیم کیا جاتا ہے اور جسے اپنے مذہبی عقائد کی بنا پر ہلاک کرا دیا گیا تھا۔ اپنی کتابوں کو مصوّر کرتا تھا۔ اس کی مشہور کتاب شاپورگاں ہے۔ جو ساسانی بادشاہ شاپور سے منسوب ہے لیکن ادبی روایت کہتی ہے

---

[۱] حوالے: لغت نامہ دہخدا: کلمہ ابو علی۔
تاریخ ادبیات ایران: براؤن جلد دوم۔
قاموس اسلام (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام)۔
تاریخ ایران: سر پرسی سائیکس۔
شہرہائے نامی ایران: حسین سعادت نوری۔
تاریخ ادبیاتِ ایران: از رضا زادہ شفق
رسالہ در منطق (دیباچہ)۔
عمر خیام: سید سلیمان ندوی۔
جغرافیہ خلافت مشرقی: ترجمہ جمیل الرحمان
جغرافیہ تاریخی ایران: ترجمہ حمزہ سردادور

کہ وہ ایک تصویری مرقع کا بھی مصنف تھا جسے ارژنگ یا ارتنگ مانی کہتے تھے (دیکھئے ارژنگ پیامِ مشرق کی تلمیحات) سلطنت عباسی کے اوائل میں پہلے تو صرف گلکاری کا کام ہوا یا مصوروں نے پھولوں کی تصویریں بنائیں لیکن بتدریج مصوری کو فروغ حاصل ہونا شروع ہوا اور اس سے ایک خاص کام لیا جانے لگا وہ یہ تھا کہ اعلیٰ درجہ کی تالیفات اور مخطوطات کو جہاں مذہب و منقش کیا جاتا تھا وہاں ان میں تصاویر بھی شامل کردی جاتی تھیں جنھیں اصطلاح میں تصاویر کتابی کہتے ہیں اس قسم کے مخطوطات، مخطوطات مصوّر کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔

تیمور کے زمانے میں مصوری کو خاص طور پر فروغ حاصل ہوا اور اس کے جانشینوں نے اپنے دربار میں جہاں علماء فضلا اور شعراء جمع کیے وہاں نقاش اور خطاط بھی موردالتفات قرار پائے۔

یورشِ تاتار کے بعد چین کا اثر مصوری پر محسوس ہونے لگا تھا اور خطوط کی نفاست اور باریکی میں خاص طور پر ایرانی مصور چینیوں کی تقلید کرتے تھے۔

سلطان ابوالحسین غازی جس کا ذکر جامی کے سلسلہ میں آچکا ہے تیموری دودمان کا آخری جلیل القدر فرماں روا تھا۔ اس کے زمانے میں ہرات ارباب علم و فن کا مرکز بن گیا تھا۔ کمال الدین بہزاد اسی بادشاہ کے دربار سے منسلک تھا۔ اس کی ولادت کا صحیح زمانہ تو متعین نہیں کیا جا سکتا ہے لیکن یہ بات مسلم ہے کہ وہ پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں پیدا ہوا تھا۔ جب صفویوں نے ایران پر تسلط قائم کر لیا تو بہزاد انھیں کے دربار سے منسلک ہو گیا اور شاہی کتب خانہ کا خازن بھی مقرر ہو گیا۔ بہزاد کی تصویروں میں خطوط کی نفاست اور خوبصورتی ہمیں چینی فن کاروں کی یاد دلاتی ہے۔ رنگ آمیزی مانوی دبستان کے اثر کا

سراغ دیتی ہے۔ البتہ جزئیات کا استقصا اور نقوش کے ذریعہ ایک ڈرامائی اثر پیدا کرنا بہزاد کا انفرادی کمال تھا۔ اس نے نظامی کی تصانیف کو مصور کیا اور خاصی لمبی عمر پاکر تبریز میں وفات پائی۔ شوستری نے بہزاد کے نقوش کی مفصل فہرست دی ہے۔ اس کے شاگردوں میں میرک بہت مشہور ہے۔ دبستانِ بہزاد ہی سے متعلق ایک میر سید علی تھا جسے ہمایوں اپنے ساتھ ہندوستان لے آیا تھا۔ اس نے بہزاد سے باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔ مغلیہ مصوری کا دبستان اسی کی کاوشوں سے قائم ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مشرقی مصوروں میں تناظر اس شکل میں نہیں پایا جاتا جو مغربی مصوروں کا خاصہ ہے لیکن بہزاد اس کمی کو اگر اسے کمی کہا جا سکتا ہے اپنی رنگ آمیزی اور جزئیات نگاری سے کام لے کر پورا کر دیتا ہے۔ پہلی بار اس کے نقوش میں انسان کا چہرہ جذبات اور کیفیات سے متاثر نظر آتا ہے بہزاد کی روایت ایران میں ہمیشہ مقبول رہی ہے اور آج بھی عبدالرحمان چغتائی تزئین و تذہیب کے سلسلہ میں اسی دبستان کی پیروی کرتے ہیں۔ بہزاد کے ہاں نقوش سے زندگی پھوٹتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کی تصویریں فقط آب و رنگ کے امتزاج کا نام نہیں بلکہ انسانی کیفیات کی ترجمان ہیں[۱]۔

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

توحید کے متعلق پہلے دوسری تلمیحات کے سلسلہ میں کچھ اشارات کیے جا چکے ہیں۔ یہاں اب بات بصراحت کہنی مقصود ہے۔ قصہ یہ ہے کہ آریائی دماغ حقیقت کو پارہ پارہ کرکے دیکھنے کا عادی ہے۔ علاوہ ازیں وہ حقیقت کا ایک مادی پیکر یا قالب بھی تلاش کرتا ہے

---

[۱] اسلام اور مصوری: آرنلڈ (انگریزی)۔
ثقافت اسلامی کا خاکہ: شوستری (انگریزی)۔
مغلیہ مصوری پر ہیول کی تصانیف دیکھیے۔
میراث ایران: (انگریزی)۔
بہزاد کے نقوش کے عکس جو اکثر کتب خانوں میں مل جاتے ہیں۔
کلمہ ارڈنگ تلمیحات پیام مشرق۔

ہندوؤں میں اگرچہ اصل حقیقت برھمہ ہے کہ تمام کائنات میں جاری وساری ہے لیکن اس کے تین بنیادی پہلو یارخ ہیں۔ ایک شیو کہ ہلاک کرتا ہے۔ دوسرے وشنو جو قائم رکھتا ہے تیسرے برھما جو تخلیق کرتا ہے۔ انہیں تینوں پہلوؤں کو اس مشہور مورتی میں اجاگر کیا گیا ہے جسے تری مورتی کہتے ہیں۔ حقیقت کو اس طرح لخت لخت کرکے دیکھنے سے وہ خوفناک ذہنی مرض پیدا ہوتا ہے جسے دوئی کہتے ہیں اصطلاح میں ثنویت بھی اسے کہتے ہیں۔ آریائی دماغ توحید کے مقام عروج تک پہنچنے کی کتنی بھی کوشش کیوں نہ کرے اسے وحدت صرف یا وحدت بسیط کا ادراک کبھی نہ ہوگا۔ زرتشت کے مسلک میں بھی ایک حقیقت اہورامزدا ہے لیکن اس حقیقت کے ماتحت یزداں (جو یزداں کی ایک صورت ہے یعنی دیوتا۔ جمع ایزد) اور اہرمن میں دائماً کشمکش جاری رہتی ہے یہی مانی اور مزدک کی تعلیمات کا حال ہے۔ مذہبی دائرہ سے دوئی نکلتی ہے تو معاشری، اقتصادی اور تہذیبی دائرہ میں اپنے کرشمے دکھاتی ہے۔ سلطنت اور مذہب میں افتراق پیدا ہو جاتا ہے۔ دین تیاگ اور تپیا کی صورت اختیار کرتا ہے، انسان طبقات میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ بہرحال کسی نہ کسی صورت میں دوئی یا وحدت کو لخت لخت کرکے دیکھنے کی عادت معاشرہ کو اپنی گرفت میں رکھتی ہے۔

اسلام نے پہلی بار وحدت بسیط یا وحدت محض اور وحدت صرف کا تصور پیش کیا تھا اور انسان کو اس بات کی تعلیم دی تھی کہ وہ بلاواسطہ راہبوں اور برہمنوں کی گرفت سے آزاد ہو کر مذہبی آزادی حاصل کرکے ساحل نجات تک پہنچ سکتا ہے۔

برعظیم ہند، پاکستان کا مسلمان اکثر و بیشتر آریائی قبیلوں سے متعلق رہا ہے یہی وجہ ہے کہ توحید کا جو تصور اسلام نے پیش کیا ہے اس کے سمجھنے میں یہاں کے لوگوں کو دقت ہوتی ہے۔ آریائی دماغ میں پہلے ہی سے بت خانہ موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وحدت بسیط کا مفہوم روشن نہیں ہوتا۔ علامہ مرحوم نے کہ خود بھی اصلاً برہمن تھے اپنی اس افتاد طبع کا یوں اظہار کیا ہے:

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

لہ مکاتیب اقبال۔ اقبال کے خطبات (انگریزی)۔ ایران اور مابعد الطبیعیات: اقبال (انگریزی)

پ

پیرس کی مسجد: فرانس کے استعمار پسند لوگوں نے مختلف اسلامی ممالک پر جو سختیاں روا رکھی ہیں اور اب تک رکھی جا رہی ہیں۔ ان کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے علامہ کہتے ہیں کہ پیرس کی مسجد نوک پلک، تراش خراش کے لحاظ سے لاکھ بے نظیر ہو لیکن مسلمانوں کو یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیے کہ فرانس کا مقصد مسجد کی تعمیر سے فقط مسلمانوں کے مذہبی جذبات کی تسکین ہے اور گویا ریاکاری سے کام لے کر فرانس نے مسلمانوں کی تالیفِ قلب کا فریضہ سرانجام دینا چاہا ہے۔

ت

تربیتِ لعلِ بدخشاں: مشرق میں یہ روایت مشہور ہے کہ ایک خاص مدت تک اگر سورج کی شعاعیں کسی پتھر کے ٹکڑے پر پڑتی رہیں اور اس ٹکڑے میں صلاحیتِ کسبِ نور ہو تو وہ جوہر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ لعل بھی جوہر ہی کی ایک قسم ہے۔ فارسی شعرانے اکثر اس عقیدہ کا اظہار کیا ہے اور سورج کو جواہرات کی علت تربیتی قرار دیا ہے۔

تقدیر: علامہ مرحوم کے کلام میں تقدیر نہایت معنی خیز اصطلاح ہے۔ تقدیر سے مراد کوئی ایسا ناگزیر حادثہ نہیں جس کا پیش آنا لازمی ہو۔ علامہ کے خیال میں کسی خاص مرحلہ پر عمل کے بے شمار امکانات موجود ہوتے ہیں، انسان کو اختیار ہے کہ وہ کوئی موقف، کوئی نہج کوئی راستہ اختیار کرے۔ مستقبل کے جتنے امکانات ہیں وہ سب انسان کی دسترس میں ہوتے ہیں، اس اعتبار سے انسان صاحب اختیار ہے، کہ وہ جس موقف کو چاہے اختیار کر سکتا ہے، ہاں جب وہ کوئی موقف اختیار کر چکتا ہے تو اس عمل کے

جتنے نتائج لازمی ہوتے ہیں۔ انسان ان سب کا پابند ہو جاتا ہے تو اس معنی میں انسان پابند نوشتۂ تقدیر ہے کہ وہ اپنے اختیار کردہ موقف کے نتائج سے گریز نہیں کر سکتا۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ اسلام کا مسلک جبر و قدر کے بین بین ہے اس کا یہی مطلب ہے موجودہ زمانے کے بعض مفکر بھی اسی نظریہ کے مؤید معلوم ہوتے ہیں۔ یوں کہنا چاہیئے کہ تقدیر اٹل قوانینِ الٰہی کا نام ہے لیکن یہ خود انسان فیصلہ کرتا ہے کہ اس پر کس قانون کا اطلاق ہو۔ یہی بات ملحوظ رکھ کر علامہ نے کہا تھا۔

یہی نشاں ہے زمانہ میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں[1]

---

[1] حوالے: قرآن اور تصوف: میر ولی الدین۔ اقبال کے خطبات (انگریزی)۔ مابعد الطبیعیات اور ایران (علامہ مرحوم کا مقالہ انگریزی میں جو پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے لکھا گیا تھا) داستانِ فلسفہ (ول ڈیورانٹ)۔ لغتِ فلسفہ (رونز نیویارک)۔

ٹ

ٹیپو: عالمگیر جسے علامہ اقبالؒ "ترکش مارا خدنگِ آخریں" کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ ایسا دبدبہ کا بادشاہ تھا کہ جب تک زندہ رہا یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کسی نے مغلیہ سلطنت کی بنیادوں کو سیسہ پلا دیا ہے۔ اس کی وفات کے بعد مغلیہ حکومت کی مرکزیت مٹ گئی۔ بہت سے صوبے خود مختار ہو گئے۔ خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ عالمگیر کے جانشین کمزور بے تدبیر ثابت ہوئے ان ہی دنوں ایسٹ انڈیا کمپنی میدانِ عمل میں اتری۔ اٹھارھویں صدی کے آخری سالوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو دکن میں تین طاقتوں سے خدشہ تھا۔ نظام حیدر آباد، مرہٹے، فرماں روایانِ میسور۔ مرہٹوں کی طاقت بہت کم ہو چکی تھی لیکن اس کے باوصف وہ دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کی کوشش میں معروف تھے۔ میسور کے فرماں روا بہت غیور، جسور اور شجاع تھے۔ وقتاً فوقتاً انھیں دکن کی تمام طاقتوں سے ٹکر لینی پڑی۔ کبھی ایسٹ انڈیا کمپنی سے برسرپیکار ہوتے تھے، کبھی مرہٹوں کے خلاف جنگ آزما، کبھی نظام

کے ساتھ ٹھن جاتی تھی۔ انگریز خوب سمجھتے تھے کہ واقعی اگر کسی طاقت سے خدشہ ہے تو وہ میسور ہے جس کا نیرِ اقبال روز بروز تاباں تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ پہلے حیدر علی نے اور پھر ٹیپو سلطان نے میسور کے لوگوں میں گویا نئی روح پھونک دی تھی۔

ٹیپو سلطان کی تاریخِ ولادت کے متعلق اختلاف ہے۔ یہ مسلّم ہے کہ اس کے آباؤ اجداد پنجابی تھے اور ہجرت کر کے گلبرگہ میں آباد ہو گئے تھے۔ ۱۷۶۱ء میں میسور پر ایک ہندو راجہ حکمران تھا اور مرہٹے اس کی حکومت کو اپنی مقبوضات کا جزو بنانے کی فکر میں تھے۔ اس موقعہ پر حیدر علی جو ٹیپو سلطان کا والد تھا سپہ سالار مقرر کیا گیا۔ اس نے مرہٹوں کو شکست دے کر میسور سے نکال دیا۔ حیدر علی کی واپسی پر حاسدوں نے چاہا کہ اسے گرفتار کرا کے ہلاک کرا دیں اور راجہ کو اس سازش میں شریک کر لیا۔ حیدر علی نے راجہ کی فوجوں کا مقابلہ کیا، انھیں شکست دی اور آخر خود میسور کے تخت پر جلوس کیا۔

ٹیپو کا سال ولادت مشتبہ ہے۔ کچھ مورخ ۱۷۵۰ء بتاتے ہیں، کچھ ۱۷۵۳ء لیکن مولانا محمد علی ایم۔ اے (کینٹب) ۱۷۵۳ء کو صحیح سال قرار دیتے ہیں۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ٹیپو دسمبر ۱۷۵۱ء میں حیدر علی کی چہیتی بیگم فخر النسا کے بطن سے پیدا ہوا۔ باپ نے بیٹے کو شاہسواری اور دیگر فنونِ جنگ کی تعلیم دلوائی۔ ساتھ ہی کوشش کی کہ دوسرے علوم و فنون کا شوق بھی اس کے جی میں جاگزیں ہو جائے۔ ٹیپو نے دسمبر ۱۷۸۲ء میں تختِ سلطنت پر جلوس کیا، اس وقت اس کی عمر تیس سال تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو ٹیپو سے جو عداوت تھی اس کی بنا بڑی گہری تھی۔ ٹیپو یہ چاہتا تھا کہ ایشیا کی تمام اسلامی سلطنتوں کو ایک مرکز پر لا کر ہمیشہ کے لئے ہندوستان میں اغیار کے نفوذ و اقتدار کو ختم کر دے۔ جب ٹیپو نے تختِ سلطنت پر جلوس کیا ہے تو انگریزوں سے چھیڑ چھاڑ شروع ہو چکی تھی۔ روایت مشہور

ہے کہ انگریزوں نے میدانِ جنگ میں ٹیپو کی ہوشیاری اور فراست سے مرعوب ہو کر ایک بلند مرتبہ افسر کو میسور میں متعین کر دیا تھا جو پیر بن کر لوگوں کو ٹیپو کے خلاف اکساتا تھا۔ اسی طرح سلطان کے اردگرد جو لوگ جمع تھے اور جن پر انھیں کامل بھروسہ تھا ان میں بھی اکثر انگریزوں نے خرید لئے تھے۔ جو لوگ غداروں کے گروہ میں شامل تھے ان کا سرغنہ میر صادق تھا۔ یہی شخص لڑائی کے موقعہ پر انگریزوں کو ہر قسم کی معلومات بہم پہونچاتا تھا۔ اس کے علاوہ میر قمر الدین، میر قاسم علی اور بدر الزماں بھی جو سلطان کے جلیل القدر امرا کے گروہ میں شامل تھے انگریزوں کے ہاتھ بک چکے تھے۔

گزارش کی جا چکی ہے کہ جب ٹیپو تخت نشین ہوا ہے تو انگریزوں سے چھیڑ چھاڑ جاری تھی۔ انگریزوں سے پہلی جنگ میں مرہٹے اور نظام حیدرآباد بھی انگریزوں کے ساتھ تھے۔ اگرچہ اس جنگ کا انجام یہ ہوا کہ متحارب فریقوں میں صلح ہو گئی لیکن شرطیں ایسی طے ہوئیں جو ٹیپو کے لئے سخت ذلت آمیز تھیں۔ آدھا ملک انگریزوں، مرہٹوں اور نظام کو دے دیا گیا اور سلطان کو مجبور کیا گیا کہ وہ بھاری تاوان جنگ ادا کرے۔ اس لڑائی کے بعد ٹیپو نے مختلف سلطنتوں کے فرمانرواؤں سے خط و کتابت شروع کی۔ ان میں ترکیہ فرانس اور دہلی کے فرمانروا شامل تھے۔ افغانی فرماں روا زماں شاہ درانی سے بھی بات چیت کی گئی تھی۔ وہ حسب وعدہ پنجاب آیا بھی لیکن اس کی عدم موجودگی میں افغانستان میں گڑبڑ ہو گئی۔ وہ کابل لوٹ گیا اور وہاں اس کی آنکھوں میں سلائی پھیر دی گئی۔ آخر ۱۷۹۹ء میں انگریزوں نے پھر مرہٹوں اور نظام کی فوجوں کو ساتھ لیکر میسور کی فوجوں پر حملہ بول دیا۔ سلطان سرنگاپٹم کے قلعہ میں محصور رہا۔ جب امرار کی غداری سے انگریز قلعہ میں در آئے تو ٹیپو سلطان اپنے وفادار ملازموں کے ساتھ

مرنے مارنے پر آمادہ ہو کر نکلا۔ ان لوگوں نے لڑائی میں بڑا ساکھا کیا۔ آخر اسی لڑائی میں سلطان شہید ہوا۔ انگریزوں نے شاہی خزانہ لوٹ لیا۔ بے نظیر شاہی کتب خانہ کی کتابیں لندن پہونچا دیں البتہ کچھ کتابیں کلکتہ میں رہ گئیں۔

ٹیپو کی سیاسی بصیرت کا مقام اتنا بلند تھا کہ علامہ اقبال نے جاوید نامہ میں ٹیپو کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور اس کی تعریف میں ایسے شعر کہے ہیں جن سے عقیدت و محبت کی خوشبو آتی ہے۔ سلطان ٹیپو کا یہ قول مشہور ہے کہ "شیر کی حیات یک روزہ گیدڑ کی صد سالہ حیات سے بہتر ہے"۔ ظفر علی خاں نے اسے یوں منظوم کیا ہے ؎

شیر اچھا ہے جسے مہلت یک روزہ ملی
یا وہ گیدڑ جسے بخشا گیا صد سالہ خلود

سچ پوچھیے تو ۱۸۵۷ء میں آزادی کی جو تحریک جاری ہوئی اس کے بیج ٹیپو سلطان ہی نے بوئے تھے۔ اس کی تیز رس نظروں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ انگریز تجارت کے پردہ میں حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ وہ انگریزی استعمار کے خلاف مختلف دول کو متحد کرنا چاہتا تھا لیکن کچھ تو انگریزوں کے تدبر نے بات نہ بننے دی اور کچھ اپنوں کی غداری نے بات بگاڑ دی۔

ل سلطنتِ خداداد میسور: محمود بنگلوری۔ مشاہیر: غلام رسول مہر۔
ٹیپو سلطان: مقالات کا مجموعہ ناشر قومی کتب خانہ لاہور۔ تاریخ ہندوستان (انگریزی) مورلینڈ۔
جاوید نامہ (اقبال): ذکرِ سلطان شہید۔

ج

جامی: (۸۱۷ھ۔ ۸۹۸ھ) نورالدین عبدالرحمٰن جامی خراسان کی ولایت جام میں پیدا ہوئے (اصل مولد ایک گاؤں خرجرد ہے) انھیں شیخ الاسلام احمد جامی سے بڑی عقیدت تھی یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنا تخلص جامی رکھا تو یہ عقیدت بھی ملحوظ خاطر رہی اور اس کا ذکر انھوں نے ایک قطعہ میں نہایت دلپذیر انداز میں کیا ہے:

مولدم جام و رشحۂ قلمم — جرعۂ جام شیخ الاسلامیست
لاجرم در جریدۂ اشعار — بدو معنی تخلصم جامیست

بچپن ہی میں اپنے باپ کے ساتھ عراق اور سمرقند تشریف لے گئے کہ ان دنوں علوم اسلامی اور ادبیاتِ ایران کے مرکز تھے۔ ان علوم میں کمال حاصل کر چکے تو سلوک و عرفان کی طرف متوجہ ہوئے اور سعدالدین محمد کاشغری اور خواجہ علی سمرقندی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔ عرفان میں ان کا مقام اتنا بلند ہوا کہ بہاءالدین نقشبندی کے سلسلہ میں

ان کا شمار خلفا میں ہونے لگا، لوگوں میں ان کی عزت اور ان کا احترام بڑھ گیا۔ وزرار اور فرماں روا ان سے ملنا باعثِ فخر سمجھنے لگے۔

جامی نے حج بھی کیا اور ۸۷۲ھ میں ہرات واپس تشریف لائے۔ سفرِ حج کے دوران میں بغدادیوں کے ہاتھوں انھیں بہت تکلیف پہونچی چنانچہ ایک غزل میں ان کی ہجو لکھی جس کا مطلع ہے ؎

بکشائے ساقیا لبِ شطِ سرِ سبوئے

وز خاطرم کدورتِ بغدادیاں بشوئے

دولت شاہ کہتا ہے کہ اواخر عمر میں انھوں نے شعر کہنا ترک کر دیا تھا۔ ان کے ممدوحِ خاص ابوالغازی سلطان حسین تھے جن کا پایۂ تخت ہرات تھا۔ انھیں کے وزیر میر علی شیر تھے کہ ترکی اور فارسی میں شعر بھی کہتے تھے اور نثر بھی لکھتے تھے۔

مسلم ہے کہ جامی قرن نہم کے سب سے بڑے ادیب اور شاعر تھے۔ براؤن کا خیال تو یہ ہے کہ وہ فارسی شعر کی کلاسیکی روایت کے آخری علمبردار ہیں۔ بیشتر مستشرقین براؤن کے ہمنوا ہیں لیکن شفق زیادہ محتاط انداز میں یہ کہتے ہیں کہ :-

"جامی اسی صف کے شاعر ہیں جس میں انوری، سعدی، رومی، حافظ، خیام اور فردوسی شامل ہیں۔ ان کے بعد ایران میں بہت کم جلیل القدر شعرا پیدا ہوئے ہیں۔"

(شفق کے الفاظ میں شعرائے بزرگ در ایران بندرت ظہور نمودہ اند) میں سمجھتا ہوں کہ شفق نے غیر معمولی احتیاط سے کام لیا ہے۔ جامی کے بعد ہم کسی بڑے فارسی شاعر کا نام لینے سے قاصر ہیں، لے دے کے قاآنی ہے اور اس کے مطالب کی پستی سب پر ظاہر ہے۔ یا پھر ملک الشعرا بہار ہے۔ ان کی عظمت مسلم لیکن انھیں اس صف میں نہیں رکھا جا سکتا جس میں جامی اور فردوسی شامل

ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ جامی صرف کلاسیکی روایت ہی کے آخری علمبردار نہ تھے بلکہ ان کے بعد اب تک کوئی بڑا شاعر پیدا ہی نہیں ہوا۔ مستقبل میں فارسی شعر کیا رُخ اختیار کرے گا اس کے متعلق پیش گوئی کرنا مخدوش بھی ہے اور خلافِ مصلحت بھی۔

نقادوں نے لطیفۂ شعری کے طور پر بیان کیا ہے کہ جامی کے عدد ۵۴ ہیں اور ان کی تصانیف کی تعداد بھی یہی ہے۔ تفصیل اس لطیفۂ شعری کی یہ ہے: ج = ۳، ا = ۱، م = ۴۰، ی = ۱۰، میزان = ۵۴۔ مجھے اس امر میں بھی شک ہے کہ جامی کی تصنیفات ۵۴ ہیں چھوٹے چھوٹے رسائل اور کتابچے بھی شامل کر لئے جائیں تو تعداد یقیناً زیادہ بنتی ہے۔

جامی کمالات کے اعتبار سے ایسے متنوع الصفات ادیب تھے کہ ان کی تالیفات کی مختلف شاخوں سے علیحدہ علیحدہ بحث کرنا مناسب ہے۔

آثارِ منظوم: جامی نے غزلیں بھی لکھی ہیں، قصیدے بھی، رباعیات بھی اور نعتیں بھی انھوں نے خود اپنے دیوان کو تین حصوں میں منقسم کر دیا ہے اور ان کے نام یہ رکھے ہیں: فاتحۃ الشباب، واسطۃ العقد، خاتمۃ الحیات۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں تک زبان کی روانی اور سادگی کا تعلق ہے جامی کا کلام اپنی نظیر آپ ہے۔ تصوف کی چاشنی نے ان کی غزلوں کو گویا بالکل شہد و شکر بنا دیا ہے۔ عشق مجازی کی بات وہ بہت کم کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر نقادوں کو ان کے کلام میں وہ خوبی نظر نہیں آتی جو سعدی اور حافظ کے ہاں ملتی ہے لیکن جامی کے ہاں معاملہ بندی، وقوع گوئی اور اس قسم کی چیزوں کی جستجو ہی بیکار ہے۔ ان کی تمام عمر تحصیلِ علم اور منازلِ سلوک و عرفان طے کرنے میں گذری۔ انھیں کوائف سے متعلقہ واردات انھوں نے اپنے اشعار میں رقم کئے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جس شخص کو تصوف سے کوئی لگاؤ نہ ہوگا، اسے ان کا کلام پھیکا پھیکا سا نظر آئے گا۔

جامی کے زورِ کلام، خلوص، صداقت اور خوش بیانی کا صحیح اندازہ کرنا ہو تو ان کے نعتیہ قصائد اور غزلیات کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ وہ عشق رسول میں اس طرح سرشار ہیں کہ کم و بیش ہر قصیدہ میں ایک خاص رنگ اور آہنگ ملتا ہے جو انھیں سے مخصوص ہے۔ ان کے ہاں نعت، منقبت یا حمد رسمی چیزیں نہیں، وہ صرف بیتی ہوئی مذہبی اور عرفانی واردات کا ذکر کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ حال و قال کی محفلوں میں جامی کا کلام دلوں کو بھاتا ہے لیکن رندانہ مجلسوں میں ان کے اشعار سے وہ چنگاریاں نہیں اڑتیں جن کی جستجو عاشق مزاجوں کو ہوتی ہے۔

جامی نے نظامی کے تتبع میں روحانی اور عرفانی مثنویاں بھی لکھی ہیں، نظامی کی مثنویاں مجموعی طور پر پنج گنج نظامی کہلاتی ہیں اور جامی کی ہفت اورنگ کے نام سے سات ہیں۔ جامی کی مثنویوں کے نام بتفصیل ذیل ہیں۔

(۱) سلسلۃ الذہب (۲) سلامان و ابسال

(۳) تحفۃ الاحرار (۴) سبحۃ الابرار

(۵) یوسف و زلیخا (۶) لیلےٰ مجنوں

(۷) خردنامہ اسکندری

اس میں کوئی شک نہیں کہ جامی نے نظامی کی پیروی کا حق ادا کر دیا ہے اگرچہ ہندوستانی نقاد یہ کہتے ہیں کہ امیر خسرو نے جو جواب لکھا ہے وہ جامی سے بہتر ہے لیکن مجھے یہ دعویٰ ہر طرح محل نظر معلوم ہوتا ہے مثلاً نظامی کی مخزن اسرار کے مقابلہ میں امیر کی مثنوی مطلع انوار ہے اور مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ امیر نظامی کے مضامین باد پا کی گرد کو بھی نہیں چھو پائے، دراں حال کہ جامی نے نہایت نفیس اخلاقی اور عرفانی مطالب کو

سلیس اور رواں زبان میں قلم بند کیا ہے۔

جامی کی نثری تصانیف میں مندرجہ ذیل بہت مشہور ہیں۔

۱۔ نفحات الانس: کہ صوفیوں کے احوال و کوائف پر مشتمل ہے

۲۔ لوائح: نہایت دقیق عرفانی اور اخلاقی مقالات پر مشتمل ہے۔

۳۔ اشعۃ اللمعات: یہ عراقی کی مشہور تصنیف لمعات کی شرح اور تفسیر ہے۔ یہ وہی مشہور کتاب ہے جس میں علامہ اقبال نے وقت کے متعلق نہایت نادر معلومات مخفی دیکھی ہیں۔ اگرچہ اصل کمال عراقی کا تھا لیکن جامی نے تشریح و تفسیر کا حق ادا کر دیا۔

۴۔ بہارستان: یہ سعدی کی مشہور کتاب گلستان کے تتبع میں لکھی گئی ہے لیکن گلستان کا مقام اتنا بلند ہے کہ بہارستان اس کے مقابلہ میں محض مجلس آرائی کا سامان معلوم ہوتی ہے۔

جامی کی تصانیف نظم و نثر نے ہندوستانی اور ترکی شعرا کو بہت متاثر کیا۔ گِب کا یہ خیال ہے کہ ترکی ادب کی روایات، ایرانی روایات پر استوار ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ترکی ادیبوں نے جامی کو اپنا ادبی رہنما تسلیم کر لیا تھا[۱]۔

جلال و جمال: خدائے کریم کے جو اسمائے حسنیٰ ہیں وہ اصلاً اس کی صفات ہیں۔ جلال اور جمال بھی تصوف کی اصطلاح میں چند مخصوص صفات الٰہی کا ظہور ہیں۔ فرہنگ مصطلحات صوفیہ میں ان دونوں کلمات کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

حوالے: تاریخ ادبیات ایران: شفق — تاریخ ادبیات ایران: نیازی

تاریخ ادبیات ایران: براؤن (جلد سوم) — ریو: فہرست مخطوطات (ذکر جامی)

جامی: تالیف علی اصغر حکمت ۔ مجمع الفصحا: ذکر جامی ۔ لغت نامہ دہخدا: کلمہ جامی

تاریخ تصوف در ایران: قاسم غنی — تصوف اور اسلام: میر ولی الدین

جامی کے متعلق متفرق مضامین جن میں تاجور مرحوم کا مقالہ جامی اور اس کی تصانیف پر بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہ رسالہ ہزار داستان میں شائع ہوا تھا۔

"جلال اوصاف قہر حضرت الوہیت است (ابن العربی)

آنچہ متعلق بہ قہر و غضب خداوندا ست" (تعریفات)

جمال اوصاف لطف و رحمت خداوندا ست" (کاشانی)

تو معلوم ہوا کہ خدائے تعالیٰ کی وہ صفات جو اس کی قدرت، جبروت اور اقتدار کا اظہار کرتی ہیں صفات جلالی کہلاتی ہیں اور جن صفات سے اس کی ربوبیت، رحمت و کرم کا اظہار ہوتا ہے وہ صفات جمالی کہلاتی ہیں۔

ان صفات کے ظہور کے مطابق صوفی ان منزلوں سے گذرتا ہے جنھیں احوال کہتے ہیں (تصوف کے مقامات اور ہیں مثلاً عشق، فنا، رضا وغیرہ)

احوال صوفی کی مختلف کیفیاتِ ذہنی سے عبارت ہے جس وقت خدا کی صفاتِ جلالی کی نمود ہو رہی ہو تو رہرو، سالک یا صوفی پر ایک قسم کا انقباض طاری ہو جاتا ہے اصطلاح میں اسے قبض کہتے ہیں۔ جب خدا کی صفاتِ جمالی کا ظہور ہو تو سالک انبساطُ نشاط کی حالت سے گذرتا ہے۔ اس حالت یا کیفیت کو اصطلاح میں بسط کہتے ہیں۔ اس بات کی تصریح اور جگہ آئے گی کہ مقامات تصوف کون کون سے ہیں اور ان کی اہمیت کیا ہے [۱۵]

جلترنگ: چینی کے چھوٹے بڑے برتنوں میں حسبِ ضرورت پانی بھر کے چوب کے ذریعہ موسیقی کی اصوات پیدا کی جاتی ہیں۔ پانی کے ان تمام پیالوں اور چوب کے مجموعہ

---

[۱۱] قاموس مذاہب و اخلاق (انگریزی)، پروفیسر نکلسن کا مقالہ تصوف پر

اقبال کے خطبات (انگریزی) — تاریخ تصوف در اسلام: تالیف قاسم غنی

فرہنگ مصطلحات صوفیہ مشمولہ کتاب تصوف در اسلام: قاسم غنی

کشف المحجوب: ہجویری — تصوف اسلام: عبدالماجد دریابادی

کو جلترنگ کہتے ہیں (جل جیسا کہ سب جانتے ہیں پانی کو کہتے ہیں اور ترنگ مزے کو، سُر کو، اور آہنگ کو) غالب نے ایک جگہ جلترنگ کے لئے عجیب اصطلاح استعمال کی ہے یعنی سازِ صدائے آب اور اس ترکیب کی وجہ سے شعر کا مطلب خاصہ پیچیدہ ہو گیا ہے۔

مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا[1]

جمعیتِ اقوام: دیکھئے جنیوا۔

جنیوا: پہلی جنگ عظیم کے بعد ۱۹۲۰ء میں انجمن اقوام قائم کی گئی جس کی غایت یہ تھی کہ دنیا کے لوگ جنگ کی غارت گری سے محفوظ ہو جائیں۔ پہلے مجلس کے ممبر کم تھے لیکن آہستہ آہستہ جرمنی اور روس بھی شامل ہو گئے۔ اس مجلس کا منشور یہ کہتا تھا کہ جب دو ملکوں میں اختلاف رونما ہو گا تو پہلے مجلس اقوام کے ذریعہ کوشش کی جائے گی کہ ثالثی سے فیصلہ ہو جائے بصورت دیگر مجلس حملہ آور کے خلاف مناسب اقدام کرے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس مجلس نے بعض چھوٹی چھوٹی لڑائیاں روک دیں لیکن جب بہت اہم موقعے آئے تو مجلس کے ارکان اپنے فرائض انجام دینے سے قاصر رہے مثلاً جب جاپان نے چین پر حملہ کیا تو مجلس کچھ بھی نہ کر سکی۔ ۱۹۳۳ء میں جنیوا میں ایک کانفرنس ہوئی جہاں یہ طے کیا گیا کہ مختلف اقوام اپنی عسکری طاقت گھٹائیں۔ ۱۹۳۵ء میں جب اطالیہ نے حبشہ پر حملہ کیا تو اس وقت بھی مجلس کچھ نہ کر پائی۔ اس واقعہ کے بعد لیگ کا رہا سہا وقار مٹ گیا چنانچہ جب ہٹلر نے دوسری جنگ عظیم کی بنا رکھی تو مجلس کے ارکان چپ چاپ دیکھتے رہے ۱۹۴۶ء میں مجلس اقوام نے فیصلہ کیا کہ اس مجلس کو برخاست ہی کر دیا جائے تو اچھا ہے۔

---

[1] دیوانِ غالب (انتخاب)، عام مطبوعہ نسخے

انہی دنوں مجلس اقوام کی جگہ اقوام متحدہ کی انجمن نے لے لی[۵۱]

جہاد: جہاد کا مسئلہ فقہ اسلامی کے متنازعہ فیہ مسائل میں شامل ہے اور مجھے تو یقیناً یہ حق حاصل نہیں کہ اس مسئلہ پر تحقیق گفتگو کر سکوں۔ شوستری نے اسلامی ثقافت کے خاکہ میں جن آیات قرآنی کا حوالہ دیا ہے وہ حسب تفصیل ذیل ہیں۔

۲۲/۳۹،۴۰ - ۱۱/۱۹۰ - ۱۱/۱۹۱ - ۱۱/۱۹۲،۱۹۳ - ۹/۷۳ - ۱۵/۲۵ - ۵۶/۹۰

ان آیات کے مطالعہ سے مستفاد ہوتا ہے کہ اگر کسی ملک میں مسلمانوں پر ظلم کیا جا رہا ہو تو دوسرے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ جہاد پر آمادہ ہو کر اپنے ہم مذہبوں کی مدد کریں۔ علاوہ ازیں جب لڑائی کی ابتدا کافروں اور مشرکوں سے ہوئی ہو تب بھی جہاد لازم ہے اس کے علاوہ جتنی صورتیں ہیں وہ شکوک سے خالی نہیں۔ جو لوگ اس سلسلہ میں تحقیق کرنا چاہیں وہ نیچے دئے ہوئے ماخذوں سے رجوع فرمائیں[۵۲]۔

---

[۵۱] قاموس سیاسیات عالم (انگریزی، لندن)

[۵۲] (۱) مولانا ابوالکلام آزاد کے مختلف مضمون جہاد کے متعلق جو ان کے مضمونوں کے مجموعہ میں ہیں۔

(۲) الجہاد فی الاسلام: سید ابوالاعلیٰ مودودی اور سید صاحب ہی کے دوسرے مقالات جو اس موضوع سے متعلق ہیں۔

(۳) استدراک: واضح رہے کہ ارباب لغت جہاد کی تعریف یوں کرتے ہیں۔ بکسر اول با کفار کارزار کردن۔ صوفیوں کی اصطلاح میں جہاد کی دو قسمیں ہیں ایک جہاد اصغر یہ وہی جہاد ہے جو مسلمانوں پر خاص صورتوں میں لازم ہے اور ایک جہاد اکبر۔ اصطلاح میں اس کے معنی ریاضت، فقر اور نفس کشی کے تھا (دیکھئے غیاث اللغات، منتخب، آنندراج، ہفت قلزم)۔

چ

چنگیز: (چنگیز خاں تموجین منگول شہنشاہ) اس کی تاریخ ولادت ۵۴۹ھ ہے۔ باپ کا نام نیسوکائی بہادر تھا جو اپنے قبیلہ کا سردار تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد چنگیر خاں نے اردگرد کے قبیلوں کو بھی مطیع کر لیا۔ ان قبیلوں میں اولیغور بھی شامل تھے جو مانی کے معتقد تھے ۶۱۲ھ میں سلطان علاء الدین محمد خوارزم شاہ اور چنگیز خاں کی مقبوضات ملحق ہو گئیں۔ چنگیز خاں یہ چاہتا تھا کہ خوارزم شاہ سے تجارتی تعلقات قائم رہیں چنانچہ اس نے خوارزم شاہ سے ایک معاہدہ کیا، جس کی رو سے دونوں ملکوں کے تاجروں کو جان اور مال کی حفاظت کا یقین دلایا گیا۔ کچھ عرصے کے بعہ مغولستان کے کچھ تاجر اترار میں مارے گئے۔ یہ وہی شہر ہے جسے مؤرخ فاراب کہہ کر بھی پکارتے ہیں۔ مشہور مؤرخ اور فلسفی یہیں کا رہنے والا تھا۔ اور اسی لئے فارابی کہلایا۔ چنگیز خاں نے خوارزم شاہ کو لکھ بھیجا کہ تاجروں کے قاتلوں کو قرار واقع سزا دی جائے۔ بے تدبیر بادشاہ نے سفارت کے آدمیوں کو قتل کرا دیا۔ ایک آدھ آدمی چنگیز خاں

تک پہنچا۔ یہ ۶۱۶ھ کا واقعہ ہے۔ اب چنگیز خاں اپنا لاؤ لشکر لے کر خوارزم شاہ کے علاقوں کی تسخیر کے لئے بڑھا۔ پہلے بخارا کو غارت کیا پھر سمرقند کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اس کے بعد اترار کا محاصرہ ہوا۔ اس شہر کے حاکم غائر خاں کو چنگیز خاں کے سرداروں نے عذاب دے کر مروا ڈالا۔

علاء الدین خوارزم شاہ کو اپنی افواج کی شکست کی خبریں ملیں تو سخت افسردہ خاطر ہوا اور کچھ عرصے کے بعد ذات الجنب میں مبتلا ہو کر مر گیا۔

چنگیز خاں برابر آگے بڑھتا رہا اور ۶۱۷ھ میں اس نے خوارزم کو بھی تسخیر کر لیا۔ علاء الدین کی والدہ ترکان خاتون اور اس کے حرم کی عورتوں کو قید کر کے مغولستان بھیج دیا گیا جہاں ترکان خاتون کے سوا سب لونڈیوں کی طرح بانٹی گئیں۔

علاء الدین کے لڑکے جلال الدین خوارزم شاہ نے چنگیز خاں کی فوجوں کا بہت ڈٹ کے مقابلہ کیا لیکن آخر مجبور ہو کر دریائے سندھ پار کر کے ہندوستان پہنچا۔

چنگیز خاں نے بہتر سال کی عمر میں ۶۲۴ھ میں رمضان کے مہینہ میں وفات پائی۔

صاحب طبقات ناصری لکھتے ہیں کہ چنگیز خاں بلند قامت، تنومند، سپید مو، گربہ چشم اور بغایت زیرک تھا۔ ساتھ ہی عادل، ضابطہ اور شجاع بھی تھا۔

چنگیز خاں نے اپنے فوج کے سرداروں اور رعایا کے لئے ایک ضابطہ اخلاق معین کیا تھا جسے "یاسائے چنگیز خانی" کہتے ہیں۔ چنگیز خاں جب پیدا ہوا ہے تو ایک معمولی سے قبیلہ کے سردار کا لڑکا تھا لیکن مرا ہے تو اس کی سلطنت کی حدود مغولستان سے لے کر خوارزم تک اور دوسری طرف چین تک پھیلی ہوئی تھیں۔ چنگیز خاں کی یورش کی وجہ سے دنیا کی تاریخ کا رخ بدل گیا۔ مغرب اور مشرق میں تجارتی اور سفارتی روابط قائم ہوئے چینی فن کاروں اور

صنعت گردں کا اثر ہر ملک میں کم و بیش ظاہر ہوا مسلمان روس سے لے کے چین کے دور افتادہ حصوں تک پھیل گئے اور آخر منگولوں کے مسلمان ہو جانے کی وجہ سے عالم اسلامی کو ایک ایسی مضبوط مرکزی حکومت حاصل ہوئی جس نے مدت تک اپنے مقبوضات کی شیرازہ بندی قائم رکھی۔ علاوہ ازیں منگول بادشاہوں کے طبعی رجحان کی وجہ سے فارسی ادب میں نہایت اعلیٰ درجہ کی تاریخوں کا اضافہ ہوا منگولوں ہی کے دودمان کا ایک فرد تیمور تھا جس کے اخلاف نے ہندوستان میں ایک تمدن کی بنیاد رکھی۔ اس تمدن میں وسط ایشیا کے اثرات بھی جھلکتے تھے۔ ہندوستانی رنگ بھی موجود تھا، ایرانی اثرات بھی موجود تھے مختصر یہ کہ مختلف تمدنوں کے تال میل سے ہندوستان کا مغلئی تمدن ایک بے نظیر ادارہ بن گیا۔

اگرچہ مغلوں کے بہت سے آثار بھارت میں ہیں تاہم جو کچھ پاکستان میں موجود ہے اس سے بھی اس دودمان کی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے[۱]۔

چوں دیدہ راہ بیں نداری　　　قاید قرشی بہ از بخاری

جیسا کہ علامہ نے تصریح کر دی ہے۔ یہ فارسی شعر خاقانی کی مثنوی تحفۃ العراقین سے منقول ہے۔ خاقانی یوں تو صرف قصائد کے لئے مشہور ہے لیکن در اصل اس کا فکری کارنامہ مثنوی تحفۃ العراقین ہی ہے جس میں اس نے اپنے پہلے سفر حج کے حالات بھی رقم کئے ہیں اور ساتھ ہی دقیق فلسفیانہ مطالب بھی بیان کئے ہیں۔

---

[۱] تاریخ مفصل ایران؛ عباس اقبال　　　تاریخ ایران؛ پرسی سائیکس
چنگیز خاں؛ ہیرلڈ لیمب (انگریزی اور اردو ترجمہ عنایت اللہ دہلوی)۔ منگولوں کی تاریخ؛ ہنری ہاڈورتھ
طبقات ناصری؛　　　تاریخ وصاف
تاریخ جہانگشائے جوینی　　　تجارب السلف؛ (تالیف ہندوشاہ مرتبہ عباس اقبال)
یورش تاتار کے متعلق مختلف مضامین جو ثقافت لاہور میں شائع ہوئے۔ سال ۱۹۵۵ء۔ (سید عابد علی)

خاقانی کے متعلق مدت سے بہت سے متنازع فیہ نظریے چلے آتے تھے لیکن جدید تحقیقات نے اب بہت سے حجابات رفع کر دیے ہیں۔

اب یہ طے ہے کہ خاقانی ایران کے سرحدی علاقہ شروان کا رہنے والا تھا (اور یہ کلمہ بتحقیق بالفتح ہے)، اس علاقہ کے فرماں روا شروان شاہ کہلاتے تھے۔ خاقانی ان ہی شروان شاہوں کا مادح تھا۔ شروان شاہوں کا جو دودمان خاقانی کا ممدوح تھا اس کا موسس محمد بن یزید تھا۔ خاقانی نے خاص طور پر جن فرماں رواؤں سے فائدہ اور تکلیف اٹھائی ہے وہ دو ہیں۔ منوچہر دوم (جلوس ۵۱۴ھ) اور اخستان اول (جلوس ۵۵۲ھ کے بعد) مسلم ہے کہ خاقانی کا نام بدیل ہے (ابراہیم نہیں جیسا کہ اکثر تذکرہ نویس لکھتے ہیں) پہلے خاقانی نے ابوالعلاء گنجوی سے استفادہ کیا۔ ساتھ ہی اپنے چچا عمر سے بھی تعلیم حاصل کی۔ نام کی مشابہت کی وجہ سے عبدالرزاق کانپوری صاحب البرامکہ کو یہ تسامح ہوا ہے کہ یہ عمر عمر خیام ہے، جو خاقانی کا چچا ہے۔ اسی چچا نے خاقانی کی تربیت کی اور پھر اسی کے بیٹے وحیدالدین نے کہ عثمان نام رکھتا تھا (وحیدالدین لقب ہے)، خاقانی کی ہر طرح دلجوئی کی عجیب اتفاق ہے کہ یہی وحیدالدین عثمان خاقانی کا داماد بھی ہوا۔ اس سے عجیب تر یہ کہ عین عالم شباب میں مرگیا اور خاقانی نے اس کا نہایت دردناک مرثیہ لکھا۔

خاقانی کی تاریخ ولادت کے متعلق خانیکوف کو، براؤن کو، شبلی کو اور دوسرے تذکرہ نگاروں کو سخت تشابہ ہوا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے لئے خاقانی پر جو میں نے مقالہ لکھا ہے اس میں میں نے خاقانی کی تاریخ ولادت ۵۲۰ھ کے لگ بھگ متعین کی ہے۔

اس بات کی شہادت موجود ہے کہ خاقانی نے کم از کم تین شادیاں کیں اور ہر تجربہ

پہلے سے تلخ تر تھا۔ چنانچہ تیسری بیوی کی ہجو میں بہت سوقیانہ اشعار ہیں۔ پہلی بیوی کی تعریف میں البتہ کافی اشعار ہیں کہ ابوالعلار گنجوی کی بیٹی تھی۔

جب خاقانی زیور علوم و فنون سے آراستہ ہو کر شروان شاہوں کے دربار میں آیا تو اس کا خیال تھا کہ میری کافی تکریم ہوگی لیکن خاقانی کو حسب منشا ماحول میسر نہ آیا ایک تو یہ کہ ابوالعلار گنجوی شاگرد کو آگے نہیں بڑھنے دیتا تھا۔ دوسرے خاقانی کا استاد بھائی فلکی شروانی نہایت شیریں کلام اور نغز بیان شاعر تھا۔ اس کی قدر دانی زیادہ ہوتی تھی تیسرے یہ کہ خاقانی نہایت پیچیدار شعر کہتا تھا کہ تلمیحات و استعارات دقیق سے لبریز ہوتے تھے۔ مرے کو مارے شاہ مدار، چوتھے یہ کہ شروان شاہ علانیہ شراب پیتے تھے اور خاقانی کو بھی اس پر مجبور کرتے تھے وہ طبعاً شراب سے متنفر تھا۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ خاقانی دل برداشتہ ہو کر شروان سے نکلا اور چاہتا تھا کہ سلطان سنجر سلجوقی کے دربار سے وابستہ ہو جائے۔ ناگہاں وہ فتنہ برپا ہوا جسے یورش ترکانِ غزہ کہتے ہیں اس فتنہ میں لاکھوں آدمی مارے گئے۔ سنجر اپنی بیگم سمیت قید ہوا کتب خانے نذر آتش کر دیے گئے۔ امام ابویحییٰ محمد کہ اتقار میں یگانہ روزگار تھے شہید ہوئے اور الوری نے وہ معرکہ کا قصیدہ لکھا جسے مستشرقین اشک ہائے خراسان کہتے ہیں اور جو یوں شروع ہوتا ہے

برسمرقند اگر بگذری اے باد سحر　　　نامہ اہل خراسان بہر خاقان بر

بارہا خاقانی مایوس اور ناکام لوٹا اس کے بعد حج کو چلا گیا۔ بہت اچھے نعتیہ قصائد لکھے اور وہ معرکہ کا قصیدہ بھی لکھا جو ایوان مدائن کے نام سے مشہور ہے اور جو یوں شروع ہوتا ہے۔

ہاں اے دل عبرت بیں از دیدہ نظر کن ہاں　　　ایوان مدائن را آئینہ عبرت داں

ان دنوں خاقانی کو محبوس بھی کیا گیا میری تحقیق یہ ہے کہ خاقانی کی مدت حبس ایک سال سے زیادہ نہیں اسے رہائی معزالدولہ قیصر روم کی سفارش پر ملتی ہے اور اس کے بعد وہ پھر حج کے لئے چلا جاتا ہے

اور آخر عمر میں خاقانی کو بہت سی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جوان بیٹا مر گیا۔ داماد مر گیا، بیوی مر گئی (ابوالعلاء گنجوی کی لڑکی) معاش کی طرف سے کچھ بے اطمینانی سی ہو گئی۔ مسلم ہے کہ اس نے ۵۹۵ھ میں وفات پائی۔

خاقانی کی مثنوی تحفۃ العراقین میں بہت سے سودمند اخلاقی اور فلسفیانہ مطالب مندرج ہیں۔ ایک پتہ کی بات اس نے یہ کہی ہے کہ اگر چشم بصیرت روشن نہ ہو تو فلسفہ انسان کو سخت گمراہ کرتا ہے۔ وہ شعر جو علامہ نے نقل کیا ہے یعنی

گر دیدہ راہ بیں نداری　　　قائد قرشی بہ از بخاری

یہاں بخاری سے مراد بوعلی سینا ہیں کہ بخارا کے رہنے والے تھے اور قیاس چاہتا ہے کہ قائد قرشی سے مراد رسول پاک کی ذات گرامی ہو کہ اس سے پہلے یہ شعر آچکا ہے ؎

دل در سخن محمدی بند　　　اے پور علی ز بوعلی چند

ماخذ: انسائیکلوپیڈیا آف اسلام: خاقانی پر مقالہ از عابد علی (اردو)

خاقانی شروانی: مطبوعہ اقبال اکتوبر ۱۹۵۵ء اور اپریل ۱۹۵۶ء۔ ان دونوں مضمونوں میں خاقانی کے سوانح حیات کے متعلق بیشتر ماخذ گنوا دیے گئے ہیں بہر حال بنیادی کتابوں کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔

(۱) سخن و سخن وران بدیع الزمان: فروزانفر　　(۲) دیوان خاقانی: علی عبدالرسولی

(۳) تاریخ ادبیات ایران: رضا زادہ شفق　　(۴) تاریخ ادبیات ایران: سلیم نیساری

(۵) تحفۃ العراقین: آگرہ کالج ایڈیشن　　(۶) برہان قاطع: مرتبہ محمد امین۔

(۷) مجلہ آموزش و پرورش، سال بیست و چہارم سال۔ ل، نفلکی شروانی: بادی آسن

(۸) براؤن: تاریخ ادبیات ایران جلد دوم　　(۹) لسٹ: مضمون خاقانی در آئین مسیح

(۱۰) منارسکی: بی۔ ایس۔ او۔ اے۔ ایس ۱۹۴۲ء　　(۱۱) دانش مندان آذربائیجان: محمد علی تربیت

(۱۲) شروان اور ملحقہ علاقے: اورینٹل کالج میگزین ماہ نومبر ۱۹۵۲ء و فروری ۱۹۵۳ء (از عابد علی)

(۱۳) کلیات خاقانی: مطبوعہ نول کشور لکھنؤ　　(۱۴) طبقات سلاطین اسلام: سٹینلے لین پول

(۱۵) تنقید شعر العجم: محمود شیرانی

ح

حُر (بندۂ حُر): لغت میں مرد آزاد کو کہتے ہیں اور برگزیدہ ہر چیز بھی اس کے معنی ہیں۔ واضح رہے کہ تحریر اسی مادہ سے ہے اور اس کے معنی ہیں غلام یا لونڈی کو آزاد کر دینا۔ اس کی توجیہ یہ ہے کہ اکثر لوگ غلاموں یا لونڈیوں کو آزاد کرنے کے بعد اپنے فعل سے منکر ہو جاتے تھے تو قاعدہ ہو گیا کہ غلاموں کو آزاد کرتے وقت یہ تحریر لکھی جائے کہ فلاں لونڈی یا غلام کو آزاد کر دیا گیا۔ اسی معنی سے تحریر کے معنی لکھنے کے ہیں۔ فارسی کا مشہور شعر ہے ؎

رسم است کہ صاحبان تحریر   آزاد کنند بندۂ پیر

علامہ کے کلام میں بندۂ حر وہ بندۂ مومن ہے جو ہر قسم کے خوف سے آزاد ہو کر ہر معنی میں صرف احکام الٰہی کا پابند ہو جائے۔ کلمۂ توحید پڑھنا اور اس کے مفہوم پر عمل کرنا صحیح ذہنی اور معنوی آزادی ہے۔ جب تک مسلمان اللہ کے سوا کسی اور طاقت کا محکوم اور

مغلوب رہتا ہے وہ بندۂ حر نہیں کہلاتا۔ جب صرف اللہ کی بندگی اختیار کر لیتا ہے تو حر بن جاتا ہے اور لطف یہ ہے کہ خود بندہ کے معنی غلام ہیں کہ یہ کلمہ بند اور ہ سے مرتب ہے۔ بند زنجیر کو کہتے ہیں اور بندہ وہ غلام ہے کہ پا بہ زنجیر ہو۔[۵]

حرف لا تدع مع اللہ الٰہاً آخر: سورۃ ۲۸ ۸۵-۸۸ ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ خوب جانتا ہے کہ کون سچا دین لے کر دنیا میں آیا ہے۔ رسول خدا سے مخاطب ہو کے کہا گیا ہے کہ جس طرح آپ آج تک شرک سے منزہ رہے ہیں آئندہ بھی اسی طریق پر عمل کیجئے اور اللہ وعدہ کرتا ہے کہ وہ آپ کو اپنے اصلی وطن یعنی مکہ میں پھر پہنچائے گا۔

حمید اللہ خاں: نواب بھوپال جو علامہ مرحوم کے ذاتی دوستوں میں شامل ہیں عجب اتفاق ہے کہ بھوپال کا فرماں روا دودمان بشیتر رجال سے محروم رہا اور اکثر اس خطہ پر بیگمات نے حکومت کی۔ نواب حمید اللہ خاں کی والدہ نہایت پڑھی لکھی اور شائستہ خاتون تھیں۔ انھوں نے اپنی تمام اولاد کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم دلوائی۔

ریاست بھوپال کے فرماں روا علم پروری اور ادب دوستی کے لئے مشہور رہے ہیں۔ چنانچہ اکثر ادیبوں کو اس ریاست سے وظیفہ ملتا تھا۔ تقسیم ملک سے پہلے تک یہاں کے فرماں رواؤں نے رفاہِ عام کے تمام کاموں میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیا۔ اس کے بعد حالات کچھ ایسے پیدا ہوئے کہ خود فرماں رواؤں کی ہستی بھی معرض خطر میں آگئی۔

ضرب کلیم علامہ مرحوم نے نواب سر حمید اللہ خاں کی خدمت میں پیش کی ہے۔ اور جو اشعار اس سلسلہ میں لکھے ہیں ان میں طالب آملی کے مشہور شعر کی شکل نہایت خوبصورت

۵۔ غیاث اللغات　　منتخب　　فرہنگ آنند راج　　ہفت قلزم

علامہ اقبال کی مختلف تصانیف (بندۂ حر کی ترکیب کا استعمال)

اندازمیں بدلی ہے۔ اصل شعر یوں تھا۔

زغارتِ چمنت بر بہار منت ہاست
کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند

علامہ نے اس شعر کی صورت یوں بدلی ہے۔

بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من
کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند

س

سپائنوزا: سپائنوزا کی ولادت ۱۶۳۲ء کے لگ بھگ ہوئی۔ اس نے ابتدائی تعلیم ایمسٹرڈم میں پائی۔ پہلے کتاب مقدس کا بغور مطالعہ کیا۔ اس کے بعد ان تفاسیر کی موشگافیوں میں اُلجھ کے رہ گیا جو قرطبہ کے ساکن موسیٰ سے منسوب ہیں۔ سپائنوزا نسلاً اور راسخاً یہودی تھا اور اس کی ابتدائی تعلیم کے فرائض یہودی علما کے سپرد تھے کہ اس کا باپ نہایت ممتاز تاجر تھا اور اس بات پر قادر تھا کہ بیٹے کو حسبِ منشا تعلیم دلوائے۔

جب سپائنوزا نے ذہنی طور پر پر پرزے نکالے تو اس نے لاطینی زبان کا مطالعہ شروع کیا۔ اس کا استاد انڈی تھا۔ یہ شخص بھی بلا کا ذہین تھا لیکن ساتھ ہی پارہ کی طرح بے قرار۔ اس نے سپائنوزا کو لاطینی زبان کے رموز سے آگاہ کیا لیکن خود خارجی دنیا میں جا نکلا اور فرانس کے شہنشاہ کے خلاف ایک سازش میں شریک ہو کر زینتِ دار ہوا۔ یہ ۱۶۷۲ء کا واقعہ ہے۔ اسی انڈی کی لڑکی سپائنوزا کی محبوبہ تھی۔ اس نے دانا عورتوں کی طرح سپائنوزا کے

علم وفضل پر ایک اور چاہنے والے کے تحائف کو ترجیح دی۔ غالباً اسی مرحلہ پر سپائنوزا نے فلسفی کا چولہ پہن لیا۔

لاطینی پر عبور حاصل کرنے کے بعد سپائنوزا نے یونانی مفکروں کی تحریروں کا بغور مطالعہ کیا۔ ڈیکارٹ کی تصانیف بہت غور سے پڑھیں اور یوں کہنا چاہئے کہ ڈیکارٹ ایک خاص مقام پر پہنچ کے رک گیا تھا۔ سپائنوزا وہیں سے مشعل علم لے کر آگے بڑھا جوں جوں سپائنوزا کے فلسفیانہ افکار کی اشاعت ہوتی گئی یہودی علماء کی وحشت بڑھتی چلی گئی آخر علماء کی ایک مجلس نے فیصلہ کیا کہ اسے کافر قرار دے کر دین کے دائرہ سے خارج قرار دے دیا جائے۔ اخراج کے بعد سپائنوزا گویا دنیا میں تن تنہا رہ گیا۔ دوستوں نے اس کی رفاقت کو خیرباد کہا۔ بہنوں نے اسے باپ کے ترکے سے محروم کرنا چاہا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ سپائنوزا کی تصانیف میں مزاح یا ظرافت کے عناصر بہت کم اور مدھم نظر آتے ہیں۔

ایک بار ایسا بھی ہوا کہ ایک مذہبی دیوانہ نے اس کی جان لینا چاہی۔ اس واقعہ کے بعد وہ شہر سے دور ایک چھوٹے سے حجرہ میں مقیم ہو گیا۔ اس کی معاش کا ذریعہ یہ تھا کہ کبھی کسی مدرسہ میں بچوں کو تعلیم دیتا تھا کبھی عینکوں کے شیشوں کو جلا دیتا تھا۔ سنہ ۱۶۶۰ء میں وہ لیڈن چلا گیا یہاں پہنچ کر اس نے کائنات کے بنیادی مسائل پر زیادہ غور کرنا شروع کیا۔ یہیں اس نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا۔ البتہ اس کی مشہور کتاب 'اخلاق' اس کی موت کے بعد شائع ہوئی۔ یہ تصنیف لاطینی زبان میں تھی۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سپائنوزا نے اپنی زندگی بہت عسرت میں بسر کی۔ یہ غلط ہے۔ کم و بیش تمام ضروریات زندگی اس کی دسترس میں تھیں۔ سنہ ۱۶۷۰ء میں اسے دق کی بیماری نے بری طرح گھیر لیا۔ ایک تو یہ کہ اس کے والدین بھی دق کے مریض تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ ایک بند کمرہ میں عینکوں کے شیشے صاف

کرتا تھا۔ بتدریج اسے ضیق النفس کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ ان دنوں اسے صرف یہی خدشہ تھا کہ اس کی شاہکار تصنیف یعنی 'اخلاق' تلف نہ ہو جائے۔

موجودہ فلسفہ کا سب سے بڑا کارنامہ سپائنوزا کی تصنیف بھی ہے یعنی 'اخلاق'۔ اس کے اختصار و ایجاز کا یہ عالم ہے کہ ہزاروں صفحات تشریح مطالب کے سلسلے میں لکھے جا چکے ہیں۔ اس تصنیف کی اصطلاحات بھی دوسری فلسفیانہ تصانیف سے مختلف ہیں کہ زبان لاطینی ہے اور مصنف عصر حاضر کے افکار کو ایک مردہ زبان کی اصطلاحات کے ذریعہ ہم تک پہنچا رہا ہے۔

تقریباً تمام فلسفی اور فلسفہ کی تاریخ کے متخصصین اس بات پر متفق ہیں کہ جیسی باریک بینی ژرف نگاہی اور دقیقہ سنجی اس کتاب میں پائی جاتی ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ سپائنوزا مدعی ہے کہ ذہن انسانی کلیتاً فنا نہیں ہوتا۔ جسم یا ذہنِ انسانی کا مادی قالب فنا ہو جاتا ہے لیکن ذہنِ انسانی کا کچھ حصہ ابداً باقی رہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سعادت خیر کا کوئی انعام نہیں بلکہ خود خیر ہی کا دوسرا نام ہے۔ اس کتاب کی فکری اور روحانی بلندی کا یہ عالم ہے کہ ڈیورانٹ لکھتا ہے:

> "نطشے نے کہیں کہا ہے کہ آخری عیسائی وہ تھا جو مصلوب ہوا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اسے سپائنوزا یاد نہ تھا۔"

سپائنوزا کا اثر مختلف ممالک میں بڑی جلدی محسوس ہوا۔ شیلے نے اس کی کتابوں سے اقتباسات نقل کیے۔ جارج ایلیٹ نے 'اخلاق' کا ترجمہ کیا۔ اگرچہ یہ ترجمہ شائع نہیں ہو سکا ۱۸۸۲ء میں جب ہیگ میں اس کا مجسمہ نصب کیا گیا تو ارنسٹ رینان نے تقریر کرتے ہوئے کہا "خدا کا صحیح ترین تعقل صرف سپائنوزا ہی کو حاصل ہو سکا" اس سے بڑھ کر کسی مفکر کی تعریف

نہیں ہو سکتی۔ عصرِ حاضر کے فلسفی بھی اسے جدید فلسفہ کا امام تصور کرتے ہیں۔ سپائنوزا کا فلسفۂ اخلاق مختصراً بیان نہیں کیا جا سکتا۔ وہ خاصہ کی چیز ہے محض پڑھنے سے بات نہیں بنتی اس کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔[۵]

سر راس مسعود: سر سید احمد خاں کے پوتے اور سید محمود کے بیٹے۔ مختلف علوم عمرانی پر گہری نظر رکھتے تھے۔ مدتوں انگلستان میں رہے۔ بھوپال میں محکمہ تعلیم کے ناظم اعلیٰ بھی رہے اور اس کے علاوہ دوسرے مناصب پر بھی فائز رہے ہیں۔ علامہ اقبال سے انھیں بڑی گہری عقیدت تھی۔ اقبال سے جو ان کی خط و کتابت ہوئی ہے اس سے کچھ اندازہ ہو گا کہ دونوں کے روابط کس قسم کے تھے۔ اقبال کی زندگی ہی میں وفات پا گئے۔[۶]

سرود: آیا کہاں سے نالۂ نے میں سرورِ مے
اصل اس کی نے نواز کا دل ہے کہ چوبِ نے

سرود کے لغوی معنی ہیں نغمہ اور سماع اور صاحبِ غیاث لکھتے ہیں یعنی راگ (راگ راگ میں فرق ہے، سماع کا راگ اور قسم کا ہے۔ ہندوستان کی کلاسیکی موسیقی اور قسم کی ہے)

بہرحال علامہ کے کلام میں سرود، نے نوازی اور متعلقہ کلمات شاعری کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔

کوئی دیکھے تو میری نے نوازی — نفسِ ہندی مقامِ نغمہ تازی
نگہ آلودۂ اندازِ افرنگ — طبیعت غزنوی قسمت ایازی

ان اشعار میں تخلیقِ ہنر کے ایک خاص نظریہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مائیکل اینجیلو کا ایک

---

[۵] تاریخِ فلسفہ: ڈیورانٹ (انگریزی)۔ تاریخِ فلسفۂ مغرب (انگریزی)، رسل۔
فلسفۂ شرق و غرب (انگریزی) رادھا کرشنن (مرتب)۔

[۶] اقبالِ کامل: عبدالسلام ندوی۔ مکاتیبِ اقبال (اقبالنامہ): عطاء اللہ۔

قول مدت سے منقول ہوتا چلا آ رہا ہے کہ "آرٹ محض کشفِ قالبِ حسین کا نام ہے"۔ یعنی پتھر کے اندر بت موجود ہوتا ہے البتہ نقابِ سنگ پہنے ہوتا ہے۔ صناع فقط اس نقابِ سنگ کو دور کر دیتا ہے۔ علامہ کا خیال یہ ہے کہ حقیقت کی دریافت اور اس کا اظہار صناع کی شخصیت کی قاہری کے عین مطابق ہوتا ہے۔ فطرت صناع کی رفتار گرم میں حائل ہوتی ہے۔ انسان بجبرِ و قہرِ فطرت کے خام مواد کو حسب منشا معنی خیز سانچوں میں ڈھال کر منشائے تخلیق پورا کرتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ نالہ نے میں یعنی شعر میں جو سرودِ یعنی کیفیت ہوتی ہے وہ چوبِ نے یعنی الفاظ کے مجموعہ کی ترتیب سے نہیں پیدا ہوتی بلکہ اس کا ماخذ نے نواز کا دل یا اس کی شخصیت ہوتا ہے۔ علامہ نے یہ بات بصراحت مرقع چغتائی کے انگریزی مقدمہ میں بیان کی ہے۔ میں مقالاتِ یوم اقبال کے مضمون "اقبال اور فنونِ لطیفہ" میں اس بات سے مفصل بحث کر چکا ہوں۔ علاوہ ازیں یوسف حسین خاں نے "اقبال اور آرٹ" میں بھی یہی بات بیان کا پیرایہ بدل کر دہرادی ہے کہ اصل چیز مقصد اور مغز اور معانی ہیں۔ ان کے اظہار کے لئے صناع اپنی شخصیت کی تمام قاہری کو بروئے کار لاکر مخلوقات ہنر پیدا کرتا ہے اور اس میں کسی فنِ لطیف کی تخصیص نہیں۔ چنانچہ خود علامہ فرماتے ہیں:

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

قطرۂ خونِ جگر سل کو بناتا ہے دل
خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

ان اشعار پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ مصوری، معماری، سنگ تراشی، مجسمہ سازی، موسیقی

شاعری۔ ان تمام فنونِ لطیفہ کی بنیاد شاعر کی شخصیت یا اس کے دل پر ہے۔ البتہ اظہارِ فن کے لئے شاعر کو ابلاغ کے جو مرحلے طے کرنا پڑتے ہیں ان سے مفر نہیں۔ اسے اقبال کبھی کوشش کہتا ہے کبھی محنت۔ موسیقار اپنی اصطلاح میں اس محنت کو ریاض یا ریاضت کہتے ہیں[۱]

سورۂ رحمٰن: اس سورت کا نمبر ۵۵ ہے اگرچہ قرآن مجید میں خدا نے اکثر مفسروں کے بیان کے مطابق صنعت گری کی کوئی شعوری کوشش نہیں کی لیکن اس کے باوجود قرآن مجید کی بعض سورتیں اور آیات اپنے آہنگ اور ترتیل کے اعتبار سے بہت دلپذیر ہیں سورۂ رحمٰن میں مطالب بھی نہایت سودمند اور بلند پایہ ہیں اور اس کا آہنگ بھی بے نظیر ہے۔ علامہ مرحوم نے اس سورت کی انہی خوبیوں کی طرف اشارہ کیا ہے کہ شعر کے پہلے مصرعہ میں "سرودِ ازلی" کے کلمات آئے ہیں۔

---

[۱] (۱) اقبال کا مقدمہ: مرقع چغتائی (انگریزی)۔ (۲) اقبال اور آرٹ: یوسف حسین خاں۔
(۳) اقبال اور فنونِ لطیفہ (مقالات یوم اقبال کا مقالہ) سید عابد علی۔ (۴) آرٹ: کالنگ ڈڈ۔
(۵) حسن اور قیمت پرکھنے کے دوسرے پیمانے: الیگزنڈر۔ (۶) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا: استھیٹکس یا جمالیات پر مقالہ۔
(۷) ہیگل کے مضامین فنونِ لطیفہ کے بارہ میں۔ (۸) سرمایہ: کارل مارکس۔

ش

شریعت اور طریقت: شریعت جیسا کہ مادہ سے ظاہر ہے راستہ کو کہتے ہیں اور اصطلاح میں ان احکام کے مجموعہ کا نام ہے جن پر عمل کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے لیکن صوفیوں کے یہاں اس کلمہ کے معنی بالکل بدل گئے ہیں اور انھوں نے شریعت کے مقابلہ میں طریقت کا کلمہ استعمال کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ طریقت کا معنی بھی راستہ ہی ہے پہلے شریعت اور طریقت میں کوئی فرق نہ تھا۔ چنانچہ قرونِ اول کے صوفیہ جہاں تزکیۂ نفس پر زور دیتے وہاں یہ بھی کہتے تھے کہ احکامِ شریعت کی پابندی لازمی ہے۔ رفتہ رفتہ شریعت اور طریقت میں بُعد ہوتا چلا گیا اور طریقت کے پیرو، صوفی، سالک، یا زاہد یہ دعویٰ کرنے لگے کہ اصل چیز تزکیۂ نفس و باطن ہے، ظواہرِ شریعت پر عمل کرنا بے معنی ہے۔ جب تک انسان کا قلب مجلّیٰ نہ ہو پرتوِ خداوندی سے محروم رہتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آہستہ آہستہ صوفیوں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جو ظواہرِ شریعت کو ترک کر دینا مستحب خیال کرتا تھا اور اس بات کا مدعی

تھا کہ عشقِ مجازی ہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ ہم عشقِ حقیقی کے رموز کو پہچان سکتے ہیں اگرچہ شریعت اور طریقت کا یہ افتراق ابوسعید ابوالخیر ہی کے وقت میں ظاہر ہوگیا تھا لیکن عطار کے زمانہ میں خلیج بہت گہری ہوگئی۔ مولانا رومی نے اس خلیج کو پاٹنا چاہا اور کہا کہ شریعت اور طریقت ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ علامہ اقبال ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ شریعت کا تعلق احکامِ الٰہی سے ہے جو اس پر عمل کرے گا پابندِ شریعت کہلائے گا لیکن تصوف اور طریقت کا مقام یہ ہے کہ انسان اپنے تہِ قلب میں شریعت کی صداقت کو محسوس کرے۔

طریقت کا راستہ عشق اور محبت کا راستہ ہے استدلال کا نہیں۔ جن صوفیوں نے شریعت اور طریقت میں تطبیق کی ہے ان کے سرگروہ ہجویری ہیں جو داتا گنج بخش کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ جو علم من اللہ ہوتا ہے (اللہ کی جانب سے) وہ علم شریعت کہلاتا ہے۔ اس علم کی رو سے ہم پہچانتے ہیں کہ فرامینِ الٰہی کیا ہیں اور ہمیں کن فرائض پر مکلف کیا گیا ہے۔ طریقت کا علم مع اللہ ہوتا ہے یعنی اللہ کے ساتھ۔ پس معلوم ہوا کہ حصولِ معرفت کا یہ طریقہ ہے کہ انسان شریعت کی پیروی کرے لیکن شریعت کی کامل پیروی تبھی ممکن ہے کہ انسان مقاماتِ طریقت سے بھی آگاہ ہو۔ ڈاکٹر قاسم غنی تاریخ تصوف در اسلام میں لکھتے ہیں کہ شریعت کا کام یہ ہے کہ وہ سالک کی رہنمائی کرے، احکاماتِ الٰہی پر مطلع کرے۔ اس کے بعد طریقت کا مرحلہ آتا ہے جو شریعت کی رہنمائی میں انسان کو معرفت اور حقیقت کے درجہ تک پہنچاتی ہے صوفیوں کی اصطلاح میں سالک کو تین منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اول شریعت، دوم طریقت اور سوم حقیقت یا معرفت، شریعت کے احکام تو ظاہر ہیں لیکن طریقت کے مراحل اور مقامات بے شمار ہیں البتہ اہم ترین مقامات یہ ہیں توبہ، ورع، زہد، فقر، صبر، توکل، رضا، ان مقامات کے طے کرنے میں صوفی مختلف ذہنی

کیفیتوں سے متاثر ہوتا ہے۔ انھیں ذہنی کیفیتوں کو احوال کہتے ہیں۔ صاحبِ کتاب اللمع فرماتے ہیں کہ احوال دس ہیں: مراقبہ، قرب، عشق، خوف، رجا، شوق، اُنس، اطمینان، مشاہدہ یقین۔ اب معلوم ہو گیا ہو گا کہ صوفی جب ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف بڑھتا ہے تو مختلف احوال سے گذرتا ہے، ہو سکتا ہے کہ ایک مقام پر وہ صرف احوال عشق یا احوالِ قرب سے متکیّف ہو اور کسی دوسرے مقام پر تمام احوال سے متاثر۔ مراد یہ ہے کہ مقامات اور احوال میں تمیز کرنا چاہیئے۔ مقاماتِ ریاضتِ روحانی کی منزلیں ہیں۔ صوفی درجہ بدرجہ ترقی کرتا ہوا آخری منزل تک پہنچتا ہے۔ بیک وقت صوفی کا مقام ایک ہی ہو سکتا ہے لیکن ایک مقام پر ٹھہر کر وہ متعدد احوال سے متاثر ہو سکتا ہے۔ بیشتر لوگ احوال و مقامات میں فرق نہیں کر سکتے اس لئے یہ بات وضاحت سے کہہ دی گئی ہے۔

صوفی کا فرض ہے کہ وہ کوئی مرشد اپنی رہبری کے لئے منتخب کرے۔ مرشد کے لئے مختلف نام آتے ہیں مثلاً شیخ، ولی، قطب، دلیلِ راہ۔ سالک کا فرض ہے کہ وہ مرشد کے احکام پر بے چون و چرا عمل کرے۔ اس مضمون پر بے شمار اشعار ملتے ہیں زہد ترک دنیا کو کہتے ہیں۔ فقر کے معنی یہ ہیں کہ سالک غنا اور ثروت کی طرف کبھی مائل نہ ہو، ورع شبہات سے اپنے آپ کو منزہ کرنا ہے۔ صبر یہ ہے کہ کوئی مکروہ بات واقع ہو تو صوفی دل پر میل نہ لائے اور حالات موافق ہوں تو بہت خوشی نہ منائے۔ توکل توحید کی اصل ہے چنانچہ غزالی نے ایک باب قائم کیا ہے "کتاب التوحید والتوکل"۔ توکل کا مفہوم یہ ہے کہ سالک سوائے خدا کے کسی کا اپنے آپ کو محتاج نہ سمجھے۔ رضا آخری اور عالی ترین مقام ہے۔ یہ تہذیب نفس کا نکتۂ منتہیٰ ہے۔ اسی مقام پر صوفی کو کشف وشہود کی نعمت نصیب ہوتی ہے۔ رضا کے معنی یہ ہیں کہ سالک کا قلب خدا کے احکام کے تحت

بالکل مطمئن ہوا اور یہ سمجھے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے ٹھیک ہو رہا ہے[1]۔

---

[1] تاریخِ تصوف در ایران۔

براؤن: تاریخ ادبیات ایران جلد اول۔

نکلسن: دیباچہ منتخبات شمس تبریزی۔

نفحات الانس: جامی۔

کشف المحجوب: ہجویری۔

حکمتِ رومی: خلیفہ عبدالحکیم۔

شعر العجم: شبلی (جلد پنجم)۔

میراثِ اسلام (انگریزی)۔

مصطلحاتِ صوفیہ مشمولہ تاریخ تصوف در ایران۔

نکلسن: متصوفین اسلام (انگریزی)۔

ونفیلڈ: دیباچہ منتخباتِ مثنوی۔

تذکرۃ الاولیا: عطار۔

نکلسن کا مقالہ تصوف پر: قاموس مذاہب و اخلاق۔

بیدل: عباد اللہ اختر (ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور)۔

ثقافتِ اسلامی کا خاکہ: شوستری (انگریزی)۔

میراثِ ایران (انگریزی)۔

ص

صاحبِ مازاغ: رسولِ پاک کی طرف اشارہ ہے اور آیت قرآنی کی تفصیل یہ ہے: ۵۳/۱۷

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ پیغمبر کی آنکھ اس وقت بہکی نہیں اور نہ حد سے بڑھی۔

جن واردات کو مکشوفات کہتے ہیں ان کا بہ تمام وکمال غایت صحت سے دوسروں تک منتقل ہو جانا بڑی بات ہے کہ اکثر صاحبِ وحی کی ذاتی استعداد مکشوفات کے انتقالِ صحیح میں مانع آتی ہے۔ یہاں یہ نکتہ بصراحت بیان کیا گیا ہے کہ رسول کریمؐ نے جو کچھ دیکھا تھا وہ بے کم وکاست بغایتِ صحت دوسرے انسانوں تک پہنچا دیا (تعبیر اور تفسیر کا مقام دوسرا ہے)۔

ط

طالب آملی : نہایت خوش فکر اور نغز گو شاعر تھا اور اس دبستانِ شعر سے تعلق رکھتا تھا جسے فغانی ہندی کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایران کے مورخ اور نقاد اس کے کلام کو موردِ اعتنا نہیں گردانتے کہ ہندی فغانی دبستان کے اکثر شعرا ان کے خیال میں صرف خیال بند اور دور از کار تشبیہات و استعارات کے رسیا ہیں۔ رضا زادہ شفق نے فقط اس کی تاریخ وفات ضبط کی ہے یعنی ۱۰۳۶ ہجری البتہ پروفیسر شبلی نے شعر العجم جلد سوم میں اس پر ایک مفصل مقالہ لکھا ہے۔ اس سے بھی طالب کی شاعرانہ عظمت پوری طرح اجاگر نہیں ہوتی کہ شبلی ہر شاعر کو کم و بیش ایک ہی طرح کے انتقادی گز سے ماپ دیتے ہیں اور خوبی استعارہ، ندرتِ تشبیہ، جوش کلام کی قسم کی تراکیب استعمال کر کے بات ختم کر دیتے ہیں۔ صاحب سروِ آزاد نے ان کے اندازِ سخن کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ صائب بھی ان کی تازہ گوئی کے معتقد تھے۔ ۱۰۲۸ ہجری میں جہانگیر نے اسے ملک الشعرا کا خطاب دیا اور ملحوظ خاطر رہے کہ جہانگیر خود سخن فہم، سخن شناس اور نکتہ سنج ادیب تھا۔

طالب آملی کی ہمشیرہ ستی النساء خانم شاہجہاں کے زمانہ میں محل بادشاہی کی مدار المہام تھی۔ اس کے اولاد نہ تھی اس لئے اس نے طالب کی دو لڑکیوں کو اپنی فرزندی میں لے لیا تھا۔ جیسا کہ شفق نے لکھا ہے طالب نے عین عالمِ جوانی میں جہانگیر کے مرنے سے ایک سال بعد وفات پائی۔ صاحبِ سروآزاد نے اس کے جو اشعار نقل کئے ہیں ان میں یہ شعر تشبیہ کے بدیع ہونے کے اعتبار سے غالباً بے نظیر ہے:

مژدہ در جہاں نمی بینم
دہر گوئی دہانِ بیمار است

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایران کے مورخ ہندی فغانی دبستان سے بالعموم اور طالب سے بالخصوص منصفانہ سلوک روا نہیں رکھتے۔ طالب میں صرف خیال بندی اور معنی آفرینی ہی نہیں ہے بلکہ زندگی کے ان دقیق واردات اور حقائق کا بیان بھی موجود ہے جن پر ایرانی شعرا کی نظر کم پڑتی ہے یا اگر پڑتی ہے تو وہ اپنے آپ کو اس قابل نہیں پاتے کہ حقیقت کی اس دقیق اور لطیف تشکل کو الفاظ میں مقید کر سکیں۔ طالب کا دیوان کمیاب ہے محبی تاثیر مرحوم کے پاس تھا اس کے بعد معلوم ہوا کہ محبِ مکرم صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اس دیوان کے سلسلہ میں کچھ کام بھی کر رہے ہیں۔ پھر نہ دیوان کا کچھ سراغ ملا نہ کام کا۔ اب وہی انتخاب ہے جو شعر العجم، سروآزاد اور دوسرے تبصروں میں ملتا ہے۔

حوالے: دیوان طالب آملی نسخہ مملوکہ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم (تاثیر؟)
سروآزاد — شبلی: شعر العجم (حصہ سوم)
براؤن: تاریخ ادبیات ایران (جلد چہارم) — رضا زادہ شفق: تاریخ ادبیات ایران
تاریخ ادبیات ایران: سلیم بنیاری

ع

علمِ کلام (الکلام): جب قرآن مجید نازل ہوا ہے اس وقت عربوں کے تعلقات دوسری قوموں سے اتنے گہرے نہ تھے کہ چقماقِ افکار کی رگڑ سے مناظرہ کی آگ نکلتی جوں جوں اسلام پھیلتا چلا گیا مختلف ممالک اسلامی مقبوضات میں شامل ہوتے چلے گئے اور ان ملکوں کی علمی اور فنی کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں توں توں مسلمانوں کو اس ضرورت کا احساس شدید تر ہوتا چلا گیا کہ اسلام کے احکام کی عقلی توجیہ کرنی ضروری ہے۔

ایک حد تک یہ بات درست ہے کہ تبلیغ تبھی کارگر ہو سکتی ہے کہ مبلّغ عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر اپنے مذہب کے مسلمات کو ثابت کر سکے لیکن یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ قرآن مجید ایک خاص قسم کا نظامِ معاشرت قائم کرنا چاہتا ہے اور اس کے قیام کے سیدھے سادھے گر بتاتا ہے فلسفیانہ موشگافیوں سے پرہیز کرتا ہے بلکہ بعض امور پر انسان کو سوچنے سے خاص طور پر روکتا ہے کہ ذہن انسانی خواہ مخواہ الجھن کا شکار نہ ہو۔

علم الکلام وہ علم ہے جو احکام قرآنی کو معیارِ عقل سے پرکھتا ہے۔ اس سلسلہ میں مشکل یہ آن پڑتی ہے کہ بعض حقائق انسان کی دسترس میں نہیں ہوتے اس لئے احکام قرآنی کی عقلی توجیہ میں اکثر انسان کو مغالطہ ہوتا ہے یا تسامح۔ بہرحال علم الکلام کا مقصد یہ ہرگز نہ تھا کہ اسلام کے احکام میں فلسفہ کو اس طرح داخل کر دے کہ قرآن مجید کے پڑھنے والے صرف بحثوں میں اُلجھ کر رہ جائیں۔ علاوہ ازیں بحث اور مناظرہ سے مخاطب کو آپ چپ کرا سکتے ہیں لیکن اس کے دل میں سچائی کا شعلہ نہیں روشن کر سکتے، علم الکلام آہستہ آہستہ مناظرہ اور مجادلہ کا آلہ کار بن گیا اور متکلمین کی وجہ سے یا ان کے عقائد کی بنا پر مختلف مرحلوں پر نظام اسلامی میں بہت انتشار رونما ہوا۔ ایک خلق قرآن کا مسئلہ ہی لے لیجئے یعنی قرآن کے حروف غیر مخلوق ہیں یا نہیں۔ اس سلسلہ میں عقلی توجیہات اور منطقی تاویلات یہاں تک جا پہنچیں کہ مخالف فریق ایک دوسرے کی جان کے پیاسے ہو گئے اور عباسی بادشاہوں نے بھی اس بحث میں حصہ لینا شروع کر دیا۔

امام غزالی نے سب سے پہلے فلسفہ اور کلام ہی کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر ان دونوں پر حملہ کیا اور یہ دعویٰ کیا کہ اگر مذہب کا مقصد قلب انسانی کی تسکین ہے تو پھر مجادلہ، مناظرہ اور منطقی موشگافیاں بالکل بے کار ہیں۔ ابن تیمیہ نے بھی اس بات پر زور دیا کہ فلسفہ کے گورکھ دھندے میں اُلجھنا بے کار ہے۔

علامہ بھی یہ خیال کرتے ہیں کہ احکامات دینی کی توجیہاتِ عقلی اسی حد تک کرنی چاہئیں جس حد تک ضرورت اور مصلحت تقاضا کرے ورنہ قرآن مجید کی تعلیمات کا مفہوم نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور انسان فلسفہ اور منطق کے چکر میں گرفتار ہو جاتا ہے مشہور ہے کہ امام رازی کی تفسیر میں سب کچھ ہے صرف قرآن کا مفہوم نہیں ملتا۔

بہرحال متکلمین نے عالمِ اسلامی کی خدمت بھی کی ہے کہ احکامات الٰہی کی عقلی توجیہ ڈھونڈھی ہے۔

حوالے: الکلام اور علم الکلام: شبلی نعمانی   غزالی: ہمائے رازی

رومی: افضل اقبال (انگریزی کے مختلف مضامین جو مجلۂ اقبال لاہور میں شائع ہوئے)

اسلامی ثقافت کا خاکہ: شوستری (بنگلور) مقالہ علم الکلام ۱۹۶۲

میراثِ اسلام (انگریزی)، اس کا فارسی ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

میراث ایران (انگریزی)

ف

فلسطینی عرب: فلسطین کے متعلق پہلے یہ بات بصراحت بیان کر دینی چاہیے کہ یہی خطہ زمین ہے جو حضرت یوسف اور یعقوب کا مسکن تھا اور اس زمانہ میں کنعان کہلاتا تھا یہودی مدت سے تاک لگائے بیٹھے تھے کہ اس خطہ میں جا کر آباد ہوں اور آخر ۱۹۱۷ء میں لارڈ بلفور نے اعلان کیا کہ برطانوی حکومت فلسطین میں بتدریج یہودیوں کی حکومت کے قیام میں معاون ہوگی۔ عربوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا لیکن آخر کار ۱۹۴۸ء میں فلسطین کا ایک حصہ کلیتاً یہودیوں کے تصرف میں دے دیا گیا۔ اس سلسلہ میں کشمکش اب تک جاری ہے[1]۔

فلسفہ: فلسفہ کا کلمہ مختلف صورتوں میں مختلف زبانوں میں پایا جاتا ہے۔ یونانی زبان میں اس کا مطلب ہے عقل و بصیرت سے عقیدت یا محبت۔ فلسفہ حقیقت میں ذہنی اعمال

---

[1] قاموس سیاسیات عالم: (انگریزی) فیبر اینڈ فیبر لندن۔

کا مطالعہ کرنے کی سعی کرتا ہے۔ مابعد الطبیعیات بھی اسی علم میں شامل ہے۔ فلسفہ اس چیز سے بھی بحث کرتا ہے کہ ادراک، فکر اور علم میں خط امتیاز کیا ہے اور ان چیزوں کا حصول کس طرح ممکن ہے۔ پہلے طبیعیات کا علم بھی فلسفہ کا جزو تھا۔ چنانچہ پرانے حکیم یا فلسفی ریاضی طبیعیات اور متعلقہ علوم سے بخوبی آگاہ ہوتے تھے۔ بتدریج طبیعیات ایک علیحدہ شاخ بن گئی اور فلسفہ کا کام محدود ہو گیا۔ فلسفہ کی ایک شاخ اس بات سے بھی بحث کرتی ہے کہ اقدار کیا ہیں، حاسۂ اخلاقی کیا ہے؟ آج کل جمالیات کو بھی فلسفہ سے علیحدہ کر دیا گیا ہے حالانکہ کچھ عرصہ پہلے جمالیاتی قدر بھی ان اقدار میں شامل تھی جن سے فلسفہ بحث کرتا تھا۔ انگریزی کے کلمہ فلاسفی، Philosophy میں .Philo پر جوڑ ہے۔ دوسرے جزو یعنی .sophy سے کلمہ ,sophist برآمد ہوا ہے جس کے معنی میں اب یہ بات بھی شامل ہو گئی ہے کہ حقائق کی تشریح و توضیح میں باطل تاویلات سے کام لیا جائے۔ عربی کلمہ سوفسطائی اسی .sopby کی ایک شکل ہے اور سفسطہ بھی جس میں شک اور ریب کا عنصر شامل ہے ,sophist سے متعلق ہے۔

بعض علما نے اس عقیدہ کا اظہار کیا ہے کہ عربی کا کلمہ صوفی اسی یونانی کلمہ .sophy کی ایک صورت ہے کہ صوفی صاحب معرفت و بصیرت ہوتا ہے لیکن یہ خیال غلط معلوم ہوتا ہے جو یونانی کلمات عربی میں آتے ہیں ان میں حرف S س کی شکل اختیار کر لیتا ہے جیسے سوفسطائی اور سفسطہ میں ص کی شکل اختیار نہیں کرتا اس لئے یہی نظریہ درست معلوم ہوتا ہے کہ صوفی کا Sophy سے کوئی تعلق نہیں اور یہ کلمہ صوف سے برآمد ہوا ہے۔

حوالے: لغت انگریزی: .Herry Ceell Wyld

لغات ماخذ الفاظ (Joseph Shiplay (New York

دیباچہ احوال عطار: سعید نفیسی (فارسی)۔ براؤن: تاریخ ادبیات ایران جلد اول تصوف کی بحث۔

نکلسن: تصوف پر مقالہ۔ قاموس مذاہب و اخلاق۔

فلسفۂ ذات و صفات: خدائے کریم نے بعض مصالح کی بنا پر انسان کو بعض چیزوں کے متعلق زیادہ غور و فکر کرنے سے منع کیا ہے۔ حقیقت خداوندی بھی انھیں چیزوں میں شامل ہے۔ جب علم کلام کا زور رہا تو مسلمانوں نے خدا کی ذات اور صفات کے متعلق بہت موشگافیاں شروع کیں اور اس قسم کی بحثیں شروع ہو گئیں کہ کیا خدا کی ذات عین صفات ہیں؛ ذاتِ الٰہی ان صفات سے علیحدہ ہے یا ذاتِ الٰہی انھیں کے مجموعہ کا نام ہے؛ علامہ بار بار مسلمانوں کو متنبہ کرتے ہیں کہ قرآن مجید زیادہ زور اس بات پر دیتا ہے کہ انسان کے اعمال نیک ہوں اور وہ ایک اچھا معاشرہ قائم کرے نہ یہ کہ وہ بے کار فلسفیانہ موشگافیوں میں اُلجھ جائے جن کا نتیجہ کچھ بھی برآمد نہیں ہوتا۔

ق

قم باذن اللہ: اس کے لغوی معنی ہیں اللہ کے حکم سے اُٹھ، قائم ہو، اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو یہ معجزہ عطا ہوا تھا کہ وہ مردوں کو زندہ کرتے تھے اس سلسلے میں کچھ آیات کا حوالہ بہ تفصیل ذیل ہے: ۵/۱۱۰ اور ۳/۴۹

استعارہ کا پیرایہ اختیار کیا جائے تو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو یہ قوت حاصل تھی کہ جو لوگ اخلاقی اعتبار سے مردہ ہو چکے تھے ان میں حقانیت کی روح پھونک دیں۔

ان اشعار میں جو یوں شروع ہوتے ہیں:

جہاں اگرچہ دگرگوں ہے قم باذن اللہ
وہی زمیں، وہی گردوں ہے قم باذن اللہ

علامہ نے استعارہ ہی کے پردہ میں بات کی ہے وہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

دل زندہ دل نہیں ہے اسے زندہ کرد دوبارہ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کا خیال تھا کہ دل کی زندگی بدن کی زندگی کی مرادف نہیں۔ دل کی موت بدنی زندگی کی ضد نہیں۔ اسی طرح ان اشعار میں بھی علامہ نے مخاطب کو یہ تلقین کی ہے کہ اخلاقی نامرادی اور موت کوئی ایسی چیز نہیں جس کا علاج نہ ہو سکے۔ اللہ اگر توفیق ارزانی فرمائے تو دل مردہ کو زندہ کیا جا سکتا ہے، وہی بات کہ انسان اپنی تقدیر کو بدل سکتا ہے۔ یہی نکتہ ایک اور شعر میں یوں بیان ہوا ہے۔

یہ ہے خلاصۂ علمِ قلندری کہ حیات
خدنگ جستہ ہے لیکن کماں سے دور نہیں

علامہ کا خیال ہے کہ مسلمانوں کی اخلاقی نامرادی اور زوال کا باعث یہ ہے کہ وہ فرنگی تہذیب و تمدن سے بہت متاثر ہو گئے ہیں چنانچہ ضرب کلیم کا عنوان ہی یہ ہے

"اعلانِ جنگ دورِ حاضر کے خلاف"

دورِ حاضر سے دراصل تین ہی قومیں مراد ہیں، انگلستان، امریکہ اور روس جہاں تک روحانیت سے انقطاع کا تعلق ہے۔ تینوں ملکوں کی تہذیب کم و بیش یکساں ہے۔ بلکہ روسی نظام کی مخالفت علامہ زیادہ کرتے ہیں کہ وہاں معاشرہ میں نہ صرف یہ کہ خدا کی ضرورت نہیں بلکہ اس کے وجود پر ایمان لانا معاذاللہ فتنہ و فساد پیدا کرنے کا موجب بن سکتا ہے
پرانے شعرا نے بھی حضرت عیسیٰ کے معجزہ کو شاعرانہ رنگ میں پیش کیا تھا مثلاً نظیری کہتا ہے۔

روئی نکو معالجۂ عمر کوتہ است
ایں نسخہ از بیاض مسیحا نوشتہ ایم

اب ظاہر ہے کہ دیدار روئے نکو اس معنی میں کوتاہی عمر کا علاج نہیں کہ انسان کی عمر بڑھ جاتی ہے بلکہ اس معنی میں عمر کی مدت قلیل کے مقابلہ میں گویا تلافی مافات کا عنصر پیش کرتا ہے کہ عمر کی کمیت متغیر ہو یا نہ ہو دیدار روئے نکو سے کیفیت عمر ضرور متاثر ہوتی ہے۔ انگریزی محاورہ کی

اصطلاح میں یہ وسعت طولاً نہیں بلکہ عرضاً ہے عمر تو مختصر رہتی ہے لیکن کیفیات کی گوناگونی کی وجہ سے بھرپور ہو جاتی ہے اسی طرح دل مردہ کے زندہ ہونے سے عمر نہیں بڑھتی البتہ کوائف و تجربات کے تنوع سے اور اخلاق کے ترفع سے مدت عمر زیادہ معلوم ہوتی ہے مردہ دل جیتے نہیں صرف سانس لیتے ہیں اور سانس لینے میں انسان صرف حیوانات ہی کا نہیں بلکہ نباتات کا بھی شریک ہے۔ البتہ انسان جب بلند اخلاقی اقدار سامنے رکھتا ہے اور اللہ اسے یہ توفیق ارزانی فرماتا ہے کہ غایت مقام انسانیت تک پہنچنے کی کوشش کرے تو وہ صحیح معنی میں زندہ ہو جاتا ہے۔ یہ وہ زندگی ہے کہ آخر انسان کو ایسی سطح پر پہنچاتی ہے جہاں موت اسے چھو بھی نہیں سکتی۔ یہی بات علامہ نے یوں بیان کی ہے:

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

قل العفو: سورۃ بقرہ آیت ۲۱۹، پوری آیت یہ ہے:

یسئلونک عن الخمر والمیسر قل فیھما اثم کبیر ومنافع للناس واثمھما اکبر من نفعھما۔ ویسئلونک ماذا ینفقون۔ قل العفو۔ کذالک یبین اللہ لکم الآیات لعلکم تتفکرون ...... ان اللہ عزیز حکیم

مفہوم اس آیت کا یہ ہے

تم سے شراب اور جوئے کے بارے میں سوال کرتے ہیں، کہہ دو ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے فائدے بھی ہیں لیکن ان کے فائدے سے ان کا گناہ زیادہ ہے اور تم سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہہ دو جو حاجت سے زیادہ ہو اسی طرح اللہ صاف صاف تم سے بیان کرتا ہے تاکہ تم دنیا میں اور آخرت میں غور کرو۔

ک

کرامات: (کرامت، معجزہ، خارقِ عادت واقعات)

علامہ مرحوم اس بات کے قائل ہیں کہ انسان جن ذرائع سے علم حاصل کرتا ہے ان میں مذہبی تجربات اور مکاشفات بہت اہم ذریعے ہیں۔ معجزہ اور کرامت نبی کی نبوت کا ثبوت نہیں لیکن ایسی چیزیں، جو عادت اور فطرت کے مخالف ہوں اکثر واقع ہوتی ہیں اور نبی ان کا موجب ہوتا ہے۔ یہی قوت نبی سے کم تر لوگوں کو حاصل ہو جائے تو اسے اصطلاح میں کرامت کہتے ہیں۔ مولانا رومی نے معجزہ کی توجیہ یہ کی ہے کہ سنتِ الٰہی یہ ہے کہ کوئی معلول بغیر علت کے واقع نہیں ہوتا لیکن علت کی دو قسمیں ہیں: علت قریب اور علت بعید۔ مثلاً کوئی شخص دق میں مبتلا ہو کر مر گیا تو موت معلول ہے اور اس کی علتِ قریب دق ہے لیکن اس سلسلہ کو آگے بڑھائیے تو معلوم ہوگا کہ علت ہائے بعید کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم ہو گیا۔ مثلاً یہ کہ دق کا مرض در اصل معلول تھا اور اس کی علت کچھ جراثیم تھے۔ پھر وہ جراثیم بھی کسی علت کے معلول ہیں۔ جوں جوں آپ اس سلسلہ

کو بڑھاتے چلے جائیں گے علت کا دریافت کرنا مشکل تر ہوتا چلا جائے گا یہاں تک کہ علم انسانی اپنی حدودِ آخر تک پہنچ جائے گا اور اسے کہنا پڑے گا کہ اب علتِ اولیٰ کا مرحلہ ہے یعنی اب علت دریافت نہیں ہوسکتی یا یوں کہہ لیجیے کہ اب وہ مرحلہ آن لگا ہے کہ کہا جائے علتِ اصلی یعنی خدا اور اس کی مشیت ۔ تو علت و معلول کے سلسلہ میں ہماری نظر علت ہائے قریب تک محدود رہتی ہے. معجزہ میں فقط یہ ہوتا ہے کہ علت ہائے قریب کے سب سلسلے منقطع کر دیئے جاتے ہیں اور علت اولیٰ یعنی خدا براہِ راست کسی معلول کو وجود میں لے آتا ہے یہی معجزہ ہے جہاں علتوں کا سلسلہ منقطع ہوگیا ہے اور تمام علتوں کی غایت نے یعنی علت العلل نے اپنا اقتدارِ اعلیٰ استعمال کیا ہے علم منطق بھی اس علت العلل کو پہچانتا ہے کہ بن اس کے علت اور معلول کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم ہو جاتا ہے کہ اسے اصطلاح میں دَور کہتے ہیں اور جو عقلاً ناممکن ہے جس طرح منطق ایک علتِ اولیٰ کے وجود کا معتقد ہے اسی طرح تمام مذاہب خدا کو علت العلل قرار دیتے ہیں اور جب معجزہ صادر ہوتا ہے تو فرض کرتے ہیں کہ علتِ اصلی نے تمام درمیانی علتوں کو ساقط کر دیا ہے ۔ کرامت کی بھی یہی صورت ہے لیکن کرامت کے متعلق شہادتیں ایسی مستند نہیں جیسی معجزہ کے متعلق ۔ یوں تمام صوفی دعویٰ کرتے ہیں کہ سالک آخر ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں اس سے کرامتیں صادر ہوتی ہیں شمس تبریزی اور مولانا روم کی پہلی ملاقات کے سلسلہ میں بھی ایک کرامت کا بیان آتا ہے ۔ بہر حال معجزہ کے ظہور سے انکار ناممکن ہے کہ خود قرآن مجید اس کا بیان کرتا ہے سب سے بین اور قاطع معجزہ حضرت عیسیٰ کا بن باپ پیدا ہونا ہے . یہاں بھی علت ہائے قریب کے سب سلسلے منقطع ہو گئے ہیں اور علت العلل نے براہ راست معلول کو پیدا کیا ہے ۔

حوالے : احوال مولانا روم : بدیع الزماں فروزانفر (فارسی)۔ حکمتِ رومی : خلیفہ عبدالحکیم

سوانح مولانا روم : شبلی نعمانی ۔ دیباچہ منتخبات غزلیات مولانا روم : نکلسن (انگریزی) ۔

منطق پر رسالے : ہر رسالہ میں علت العلل کا ذکر موجود ہوگا ۔

ل

لا الٰہ الا اللہ: کلمہ طیبہ کے متعلق دو باتیں ہمیشہ ملحوظ خاطر رہنا چاہئیں کہ یہی ہمیشہ اقبال کے پیش نظر رہتی تھیں۔ ایک تو یہ کہ اسلام تمام معبودوں کی نفی کرتا ہے۔ یہ معبود صرف لکڑی یا پتھر یا کسی اور چیز کے بت نہیں بلکہ وہ تصورات بھی ہیں جنھیں بیکن نے بت کا لقب دیا ہے۔ وطن، نسل، رنگ یہ تمام چیزیں بھی تعقلات اور تصورات بن کر آخر کار معبود بن جاتی ہیں۔ پڑھا لکھا انسان چوبین اور سنگین بتوں کے پھندے سے آزاد ہو سکتا ہے لیکن یہ معبود نہان خانۂ شعور میں ایسی جگہ چھپ کے بیٹھ جاتے ہیں کہ ان کی نفی کرنا تو درکنار ان کا شعور حاصل کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ مسلمان ہونے کی پہلی شرط تو ان تمام معبودوں کی نفی ہے لا الٰہ اسی نفی پر دلالت کرتا ہے۔ دوسرے جزو میں اللہ وہ اسم ہے جو فقط ایک ہستی کے لئے مخصوص اور منسوب ہے وہ ہستی تمام کائنات کی خالق اور ہم سے بالکل غیر ہے بدیں معنی کہ اس میں اور ہم میں ایسا تعلق قائم نہیں کہ ہم اپنے آپ کو اس کی ذات کا جزو تصور کرنے لگیں کائنات میں خدا کے سوا جو کچھ ہے وہ غیر اللہ ہے اور اللہ سے بالکل علیحدہ ہے مسئلہ وحدت الوجود کی نفی اسی تعبیر سے ہوتی ہے۔

جن لوگوں نے اللہ کا ترجمہ خدا یا (GOD) کیا ہے غلط کیا ہے۔ اللہ کی بجائے اللہ ہی کا کلمہ استعمال ہونا چاہیئے کہ اس سے جو افکار و تصورات وابستہ ہیں صرف وہی ملحوظ رہیں۔ علامہ کے خیال میں اشتراکیت کلمہ طیبہ کے فقط پہلے جزو تک پہنچتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کم و بیش اشتراکیت اسلام ہی کی ایک شکل کا نام ہے بشرطیکہ اس میں جملہ معبودوں کی نفی کے ساتھ اللہ کا اثبات بھی شامل کر لیا جائے۔

کلمہ طیبہ فقط نماز میں پڑھنے کی چیز نہیں ہے بلکہ ایک ضابطۂ حیات کا سراغ دیتا ہے۔ اس ضابطہ کے مطابق اصل حکمرانی اور فرمانروائی فقط اللہ کی ہے۔ اس کی ذات سے جو فوائد صادر ہوتے ہیں اس کے بندے اس میں برابر کے شریک ہیں۔ الارض للہ اس حقیقت کا منطقی نتیجہ ہے۔

جن دنوں کانگرس کی تحریک اپنے شباب پر تھی اور مسلمانوں کے سامنے یہ سوال تھا کہ وہ وطنیت کو اپنا مقصد بنائیں گے کہ نہیں اس وقت اقبال نے کلمہ طیبہ سے استشہاد کر کے بوضاحت کہا کہ وطنیت بھی ایک بت ہے، وہ ایک سیاسی تصور ہے جو مغرب سے آیا ہے اس کا تعلق ایک خطۂ زمین سے ہے مسلمانوں کی وحدت دینی اور فکری ہے نسلی نہیں۔ اس موضوع پر علامہ نے اپنے خطبات میں بھی بات کی ہے اور مکاتیب میں بھی اکثر اس حقیقت کا ذکر آیا ہے اس کی توضیح اس لیئے ضروری سمجھی گئی کہ جب علامہ کلمہ طیبہ کو خودی کا سرِ نہاں کہتے ہیں تو ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ خودی کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو اللہ کے احکام کی پابند نہیں وہ ابلیس کی خودی ہے آمریت اسی سے پیدا ہوئی ہے ایک وہ جو اللہ کے احکام کی پابند ہے۔ اسلام کا جمہوری نظام اور اس کی معاشرت اسی کی تخلیق ہے بعض اوقات غیر مقید خودی کو علامہ نے شیطان اور ابلیس بھی کہا ہے اور حدیث مشہور ہے کہ رسول اکرم نے فرمایا "میرے اندر جو شیطان مخفی تھا، میں نے اسے مسلمان کر دیا"۔

حوالے: اقبال کامل: عبدالسلام ندوی ٭ ذکر کامل: عبدالمجید سالک ٭ خطبات: علامہ اقبال ٭ اقبالنامہ (مکاتیب اقبال) فکر اقبال: مرتبہ غلام دستگیر (کراچی) ٭ قرآن اور تصوف: میر ولی الدین ٭ رسالہ اردو کا اقبال نمبر ٭ اسلامی ثقافت کا خاکہ (انگریزی): سوشتری، بنگلور ٭ ترجمان القرآن: آزاد ٭ تذکرہ مولوی عنایت اللہ مشرقی ٭ قصص القرآن: حفظ الرحمان سیوہاروی قصص القرآن: صدرالدین بلاغی ٭ تذکرہ: ابوالکلام آزاد۔

۴

محرابِ گل افغان: ایک فرضی کردار ہے۔

محی الدین ابن العربی: ابن العربی کا مولد ہسپانیہ ہے۔ تاریخ وفات سنہ ۱۲۴۰ء اور مدفن دمشق۔ ان کی تعلیمات دو کتابوں میں بہ تفصیل درج ہیں ایک "فتوحات المکیۃ" اور دوسرے "فصوص الحکم"

شریعت اور طریقت کے تحت لکھا جا چکا ہے کہ ان دونوں میں بُعد اور افتراق جلدی ہی شروع ہو گیا تھا۔ ساتویں صدی ہجری میں یہ افتراق ایسی صورت اختیار کر چکا تھا کہ بظاہر درمیانی خلیج کو پاٹنا ناممکن نظر آتا تھا۔

شریعت اور طریقت کے بنیادی تصورات کے درمیان ایک اختلاف تصوّرِ توحید کا بھی ہے۔ اکثر صوفیا اور محی الدین ابنِ العربی اس کے سرگروہ ہیں۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ دنیا میں ایک حقیقتِ کبریٰ اور صداقتِ مطلقہ کا ظہور ہے۔ اسی حقیقت یا صداقت نے مختلف روپ دھار رکھے ہیں۔ اس حقیقت کا اظہار صفات کے ذریعہ ہوتا ہے اور کوائف

اولیا میں تغیر غالب کے الفاظ میں "بحسب گردش پیمانۂ صفات" ہوتا ہے۔ ابن العربی کا دعویٰ یہ ہے کہ کائنات میں وجودِ اصلی صرف ایک ہے یعنی خدا۔ باقی تمام موجودات ظلّی اور اعتباری ہیں۔ بے شک موجودات خارجاً مخلوق ہیں لیکن اصلاً اور باطناً وہ معلوماتِ حق میں شامل ہیں اور اس طرح خدا کی صفتِ علم کا ایک جزوِ لازم ہیں۔ بظاہر کائنات میں مظاہر کی کثرت نظر آتی ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں۔ یہ کثرت صرف نظر کا واہمہ یا فریبِ شہود ہے۔ موجودات کی حقیقت اس طرح اعتباری ہے کہ آئینۂ عدم میں جب حقیقتِ مطلقہ کا رُخ عکس پذیر ہوتا ہے تو موجودات مخلوق نظر آتی ہیں۔ ہر چیز کی اصل وہی موجودِ حقیقی ہے۔ ہر چیز اسی کی طرف لوٹے گی۔ اس لئے ہر چیز غیر اللہ نہیں ہے بلکہ عین ذاتِ الٰہی ہے۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس طرح حقیقت مخلوقات و موجودات میں خارجاً منقسم معلوم ہوتی ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں کہ اشیا کا کوئی وجود ہے ہی نہیں اس نظریہ کو نظریۂ وحدتِ وجود بھی کہتے ہیں، وحدتِ وجود میں مخلوقات جزوِ ذاتِ خداوندی بن جاتی ہے۔ اور حقیقت مظاہر کائنات کی کلیت ہو کر رہ جاتی ہے گویا نورِ حق ہر چیز کو مستنیر رکھتا ہے اور اسی نور کی کمی یا زیادتی کے اعتبار سے مظاہرِ اشیا حقیقتِ مطلقہ سے قریب یا بعید ہوتی ہیں۔ منصور نے جو انا الحق کہا تھا تو درست کہا تھا کہ انسان ہی وہ عالم ہے جس میں خدا اپنی ذات کی کلیت کا مشاہدہ کرتا ہے کہ انسان کم و بیش تمام اوصافِ الٰہیہ سے متصف ہے۔

یہ نظریہ بظاہر بہت دلفریب نظر آتا ہے لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شنکر آچاریہ کی مایا اور ابن العربی کے فریبِ شہود میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ ویدانت میں بھی وجودِ حقیقی ایک ہی ہے۔ اس کے سوا تمام مظاہر و اشیا وہمی ہیں لیکن ذاتِ حق میں علماً متحقق ہونے کی وجہ سے وہ حقیقتِ کبریٰ کا جزوِ لازم ہیں۔ اس حقیقت کو استعارہ میں بیان کرنے کے لئے صوفیوں نے

ذرہ اور خورشید کا، قطرہ اور دریا کا سہارا لیا ہے۔ دریا قطروں کی کلیت کا نام ہے اور ذرات خود مستنیر نہیں نورِ خورشید سے روشن ہیں۔ علامہ مرحوم کے خیال میں ابن العربی کے اس نظریہ نے تصوف کو بہت متاثر کیا ہے اور اسی نظریہ کی بدولت طامات کا وہ انبار تیار ہوا ہے جس کے متعلق صوفیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ تواجد و حال کے اقوال پر مبنی ہے وحدتِ وجود کے نظریہ کے مطابق مخلوق اور خالق میں کوئی امتیاز نہیں رہتا۔ اس نظریہ کے خلاف ردِّ عمل کے طور پر وحدتِ شہود کا نظریہ پیش کیا گیا اور یہ دعویٰ کیا گیا کہ مخلوقات غیراللہ ہیں۔ خالق اور ہے مخلوق اور ہے دونوں کبھی ایک نہیں ہوسکتے۔ مصور کی ذات اپنی تخلیقات ہنر سے یا اپنے نقوش سے بالکل علیحدہ اور ماوراء ہے۔ علامہ نے ایران کے مابعد الطبیعیات اور اپنے خطبات میں ابن العربی سے استفادہ بھی کیا ہے اور اس کے خیالات کی تردید بھی کی ہے۔ اپنے مکاتیب میں وہ وحدت الوجود کے اس نظریہ کے مخالف نظر آتے ہیں جو مدّعی ہے کہ مخلوقات عین خالق ہیں اور موجودات عین وجودِ حقیقی ہیں۔ وحدتِ وجود کے متعلق فارسی اور عربی شعراء کے ہاں بڑی کثرت سے اشعار ملتے ہیں اور ان کا اثر اتنا گہرا اور دیرپا ہوتا ہے کہ وحدتِ وجود کے مقابلہ میں وحدت شہود کا اثبات قریب قریب ناممکن ہوجاتا ہے۔ غالب نے اردو میں اس سلسلہ میں تین شعر ایسے کہے ہیں جو گویا اس نظریہ کا نچوڑ ہیں:

ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و بحر و حباب میں

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے — حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

علامہ نے مکاتیب میں ابن العربی کی تصانیف مہیا کرنے کے لیے اکثر دوستوں کو لکھا ہے اور بعد میں بڑے شدومد سے نظریۂ وحدت الوجود کی تردید کی ہے۔[۵]

مرزا علی محمد باب: مرزا علی محمد اصلاً شیرازی تھا۔ سنہ ۱۲۶۰ھ میں اس نے دعویٰ کیا کہ میں مامور من اللہ ہوں۔ میرے ذمہ یہ کام ہے کہ میں لوگوں کو مطلع کر دوں کہ امام مہدی اور مسیح موعود کا ظہور ہونے والا ہے۔ میں اس اعتبار سے باب ہوں کہ جب تک آپ میرے انکار کے دروازہ سے گذر نہ لیں آپ پر یہ نکتہ روشن نہیں ہو سکتا کہ امام مہدی اور مسیحِ موعود کس طرح اور کب ظہور فرمائیں گے۔

تیرھویں صدی ہجری میں ایران کا سیاسی اور معاشرتی انتشار حد سے گذر گیا تھا۔ لوگ کسی تغیر کے خواہاں تھے اور سمجھتے تھے کہ تغیر کسی قسم کا ہو بہرحال موجودہ نظام اتنا خراب ہے کہ نیا نظام قائم ہوا تو بہرحال اس سے بہتر ہوگا۔ باب اگرچہ خود علم وفضل سے بہرہ یاب نہیں تھا اور قرآن مجید کے صحیح اعراب سے بھی بے خبر تھا۔ تاہم اسے نہایت اچھے مبلغ مل گئے جن میں بڑے بڑے انشا پرداز، شاعر اور دانشور شامل تھے۔ انھیں دانشوروں میں قرۃ العین طاہرہ بھی تھی۔ جو نہایت فطین اور ذہین تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حسن وجمال کے اعتبار سے بھی یگانۂ روزگار تھی۔ اس کی خطابت اتنی موثر تھی کہ ہزاروں لوگ محض اس کی تقریر سن کر باب کے پیرو ہو جاتے تھے۔ البتہ اس بات کی شہادت ضرور ملتی ہے کہ قرۃ العین کی نجی زندگی عیوب سے

---

۵ میراثِ اسلام: تصوف پر مقالہ (انگریزی)۔
ایرانی مابعد الطبیعیات: علامہ اقبال (انگریزی)۔
مکاتیب اقبال (اقبالنامہ)۔
سپائنوزا: اخلاق (انگریزی)۔
تاریخِ تصوف در اسلام: قاسم غنی۔
اسلامی ثقافت کا خاکہ: شوستری (بنگلور) جلد دوم (انگریزی)
خطبات: علامہ اقبال (انگریزی)۔
افکارِ غالب: خلیفہ عبدالحکیم۔
داستانِ فلسفہ: ڈیورانٹ (انگریزی)۔
تصوفِ اسلام: عبدالماجد دریابادی۔

قطعاً متراشہ تھی لیکن یہ شہادت بھی قطعی نہیں ہے۔

جب حکومت نے یہ دیکھا کہ باب کا مذہب بڑی تیزی سے پھیل رہا ہے تو اربابِ اقتدار نے بابیوں کو چن چن کے ہلاک کرنا شروع کر دیا۔ خود باب ۱۸۵۰ء میں نو جولائی کو مقتول ہوا۔ اس کے جو رفیق مقتول ہوئے ان میں قرۃ العین طاہرہ بھی شامل تھی۔

ایک بابی نے ناصر الدین شاہ قاچار کو ہلاک کرنا چاہا تھا لیکن اتفاق سے اس کا نشانہ خطا گیا۔ قاآنی نے کہ ان دنوں دربار سے منسلک تھا اس واقعہ کے متعلق بڑے زور کا قصیدہ لکھا ہے۔

باب کے مقتول ہونے کے بعد ایران میں اس مذہب کا نفوذ گھٹ گیا لیکن یورپ میں عموماً اور امریکہ میں خصوصاً بابی مذہب برابر پھولتا پھلتا رہا۔ بہاء اللہ نے باب کے مسلک کو ایک نئی تشکیل بخشی۔ ان دنوں یورپ اور امریکہ میں بہائی معابد قائم ہیں، رسالے شائع ہوتے ہیں، اصولِ دین پر کتابیں نکلتی ہیں۔

بابی مسلک کی تبلیغ کے سلسلہ میں یہ بات ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ دو تین جید شعرا نے بابی مسلک کے اصول نہایت جوشیلے انداز میں نظم کر دئیے ہیں۔ ان منظومات کی ادبی اہمیت بھی کچھ کم نہیں[۵]۔

---

[۱] قاموس مذاہب و اخلاق (انگریزی)۔ براؤن: تاریخ ادبیاتِ ایران: جلد چہارم (انگریزی)۔

بابی تحریک کی تاریخ: براؤن (انگریزی)۔

قرۃ العین طاہرہ کی غزلیات: کچھ غزلیں کتابوں میں مکمل صورت میں ملتی ہیں۔ راقم نے اس کی غزلیات کا ایک مختصر سا مجموعہ بھی دیکھا ہے کہ طہران میں شائع ہوا تھا اور عزیزی جگن ناتھ آزاد کے ذریعہ ہاتھ آیا۔ افسوس کہ وہ مجموعہ گم ہو گیا یا تلف ہو گیا۔ علامہ مرحوم نے جاوید نامہ میں قرۃ العین کی ایک غزل نقل کی ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کے زورِ کلام اور جوشِ بیان کا کیا عالم تھا۔

مسجدِ قوت الاسلام: مسجدِ قوت الاسلام قطب الدین ایبک کی تعمیر ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب قطب الدین ایبک قطب مینار کی تعمیر سے جزوًا فارغ ہو چکا تو مسجدِ قوت الاسلام کی تعمیر کی طرف متوجہ ہوا۔ شوستری کا خیال ہے کہ اس مسجد کا اندازِ تعمیر عراقی ہے۔ اس کی مرکزی محراب ۵۳ فٹ بلند ہے۔ دیواروں پر پھول اور بیل بوٹے منقش ہیں۔ اس کے علاوہ ہندسی اشکال بھی دکھائی دیتی ہیں۔ اس مسجد کی تعمیر کے بعد التمش اور علاء الدین خلجی نے بھی صحن میں اضافے کئے۔ علامہ مرحوم کو اس مسجد سے عقیدت اس لئے تھی کہ اس کی تعمیر میں ہندو کاریگروں کا ہاتھ نہ ہونے کے برابر تھا۔ اور اسلوب تعمیر بھی خالص اسلامی تھا اس میں، جو پُروقار سادگی اور ہیبت و شکوہ نظر آتا ہے وہ ہندوستان کی دوسری مساجد میں مفقود نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغلیہ زمانہ کی مساجد میں عراقی، ایرانی اور ہندو صنعت گروں نے تال میل سے ایسی عمارات تعمیر کی ہیں جن میں ہیبت اور وقار کی بجائے نفاست و نزاکت زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ تاج محل کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ خواب مرمریں ہے۔ موتی مسجد بھی موتی زیادہ ہے اور مسجد کم۔

اس کے برخلاف مسجدِ قوت الاسلام میں ستونوں کی وضع قطع اور گنبدوں کی ساخت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ معمار رب جلیل کی عبادت گاہ بنانا چاہتے تھے۔ علامہ نے کئی جگہ اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اس مسجد میں نماز پڑھنے سے جو سوز و سرور حاصل ہوتا ہے وہ اور کہیں نہیں ملا۔ ہاں مسجد قرطبہ میں علامہ کو پھر مسلمانوں کا جلال و جمال ممزوج نظر آیا[۱]۔

مقامِ شوق و سرور و نظر: دیکھئے عشق اور اس کا اصطلاحی مفہوم کہ علامہ شوق نظر

---

[۱] اسلامی ثقافت کا خاکہ، شوستری، جلد اول (انگریزی) میراثِ اسلام (انگریزی) - برصغیر ہند، پاکستان کی تعمیرات: ہیول - دیکھئے مسجدِ قرطبہ تلمیحاتِ بالِ جبریل)۔

اور سرور کے کلمات خبر اور مشاہدہ کے مقابلہ میں استعمال کرتے ہیں کبھی ان کلمات کی جگہ عشق کا کلمہ بھی استعمال کرتے ہیں اور اس سے عقل کا مقابلہ کرتے ہیں (دیکھئے نمرود اور آتشِ نمرود)۔

مکالماتِ فلاطون: افلاطون سے اس سے پہلے بحث ہو چکی ہے۔ افلاطون کے مکالمات کا بہترین ترجمہ جوودٹ کا ہے جس نے کم و بیش عمر کا بیشتر حصہ اسی کام پر صرف کردیا ہے۔ پاکٹ بک ایڈیشن میں ان مکالمات کا انتخاب شائع ہوا ہے۔ اس انتخاب میں مندرجہ ذیل تصانیف شامل ہیں:

(۱) اعتذار (۲) کرائی ٹو (۳) فیڈو

(۴) مذاکرہ (۵) جمہوریت

پہلے حصہ میں تو سقراط ان الزامات کا جواب دیتا ہے۔ جو ایتھنز کی مجلسِ عمومی میں اس پر لگائے گئے تھے۔ اس حصہ کی زبان اعتدال اور توازن کے لحاظ سے بے نظیر ہے۔ دوسرے حصہ میں کرائی ٹو سقراط کو فرار کی ترغیب دلاتا ہے۔ سقراط انکار کرتا ہے۔ یہ حصہ بھی بہت سے سودمند مطالب پر مشتمل ہے۔ تیسری تالیف یعنی فیڈو میں منظر تو سقراط کا قید خانہ ہے اور بات کرنے والا فیڈو ہے جو سقراط کے زہر پینے کے وقت شخصاً موجود تھا۔ چوتھے حصہ میں یعنی مذاکرہ میں اگاتھون کے گھر سقراط مختلف عرفانی اور اخلاقی مطالب سے بحث کرتا ہے۔ آخری تالیف یعنی جمہوریت افلاطون کا شاہکار تصوّر کی جاتی ہے۔ اس تالیف میں بھی مختلف افراد مکالمہ میں حصہ لیتے ہیں ان میں سقراط بھی شامل ہے۔ جمہوریت کے مطالب کا تجزیہ ڈیورانٹ نے "داستانِ فلسفہ" میں کردیا ہے۔[۱]

---

[۱] مکالماتِ فلاطون: (انتخاب) مرتب کاپمان (انگریزی)۔ لقیمتِ فلسفہ: روجرز (نیویارک، انگریزی)۔ داستانِ فلسفہ: ڈیورانٹ (انگریزی)۔ امام غزالی کی متعدد تصانیف جن میں افلاطون کے حوالے ملتے ہیں۔

مہدی (د ۔ ر حق): مہدی کے لغوی معنی ہیں ہدایت کردہ شدہ، اور اگر بضم ہو ہدایت کنندہ یا راہنما۔

شیعوں کے عقائد میں مہدی کے تصور کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ کہ امام آخرالزماں یا امام مہدی کہ امام حسن عسکری کے خلف الرشید ہیں نظروں سے غائب ہیں اور ایک معینہ وقت پر ظہور کریں گے۔ عام مسلمان بھی اس مسلک یا عقیدہ کی کسی نہ کسی صورت یا شکل کے معترف ہیں۔ چنانچہ تاریخ میں اکثر ایسا ہوا ہے کہ لوگوں نے مہدویت کا دعویٰ کیا ہے اور لوگوں کے سامنے یہ کہا ہے کہ انھیں دنیا کی ہدایت پر مامور کیا گیا ہے۔

جن دنوں ایران کے مختلف حصوں میں مختلف سیاسی تحریکات شیعی عقائد سے دست و گریباں تھیں ان دنوں اکثر ایسا ہوتا تھا کہ کوئی شخص کبھی سیاسی مصلحت کی بنا پر کبھی اجتہادی غلطی سے دیانتدارانہ مہدی ہونے کا دعویٰ کر دیتا تھا۔ مصر کے خلفائے فاطمی (۲۹۷ھ تا ۵۶۷ھ) یہ دعویٰ کرتے تھے کہ وہ حضرت فاطمہ کی اولاد ہیں۔ عبیداللہ نامی ایک شخص نے دعویٰ کیا کہ میں مہدی معہود ہوں اور خود خلیفہ اور امیرالمومنین کا لقب اختیار کر لیا۔ یہ ۲۹۷ھ کا واقعہ ہے۔ پہلے خلفائے فاطمی کا پایۂ تخت مہدیہ تھا جو طیونس کے قریب واقع تھا۔ اس کے بعد خلفائے فاطمی نے قاہرہ کو اپنا دارالخلافہ قرار دیا۔ ۵۶۷ھ میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے اس سلطنت کو ختم کر دیا۔ واضح رہے کہ شیعوں کے دو گروہ ہیں ایک وہ جو اثنا عشری کہلاتے ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ امامت حضرت علی سے شروع ہوئی اور حضرت محمد مہدی منتظر پر ختم ہوئی جو ۲۶۰ھ میں نظروں سے غائب ہو گئے۔ اس کے برخلاف اسماعیلی شیعوں کا عقیدہ ہے کہ جناب جعفر صادق کی وفات کے بعد (۱۴۸ھ) امامت حضرت موسیٰ کاظم تک نہیں پہنچی بلکہ حضرت اسماعیل یا محمد اس کے وارث ہوئے۔ وہ اپنے امام حضرت اسماعیل سے شروع کرتے

ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ آج تک ان اماموں کی اولاد موجود ہے چنانچہ سر آغا خان فرقہ اسماعیلیہ کے موجودہ امام ہیں اور حسن بن صباح کی اولاد میں سے ہیں۔

ہم سے قریب تر زمانوں میں بھی مختلف لوگوں نے مہدویت کا دعویٰ کیا ہے، ان میں مہدی سوڈانی بہت مشہور ہیں۔ یہ وہی بزرگ ہیں جن کی لاش کو کچنر نے گور سے نکلوا کر سپرد آب کر دیا تھا۔ علامہ نے اس سے یہ لطیفہ شعری پیدا کیا ہے کہ آسمان نے کچنر کو بھی مدفون آب کر دیا۔ کہ جب جرمنوں نے وہ جہاز غرق کیا جس میں کچنر سوار تھا تو اس کی لاش نہیں ملی۔ ہندوستان میں بھی وقتاً فوقتاً مہدی ظہور کرتے رہے ہیں۔ ان کے متعلق ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ انسان سے اجتہادی غلطی کا ارتکاب ہونا ممکن ہے اور ضروری نہیں کہ ہر مہدی گمراہ ہو یا دانستہ لوگوں کو گمراہ کرتا ہو۔ ہندوستان میں جن لوگوں نے مہدویت کا دعویٰ کیا ان کی فہرست خاصی طویل ہے (یعنی کسی نہ کسی صورت میں)، ابھی حال کی بات ہے کہ ایک صاحب نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ مسیح موعود بھی ہیں اور مہدی بھی۔[۱]

---

[۱] ائمہ تلبیس: محمد رفیق دلاوری — دربار اکبری: محمد حسین آزاد

تذکرہ مولانا ابوالکلام آزاد — طبقات سلاطین اسلام: ترجمہ عباس اقبال

غیاث اللغات — فرہنگ آنندراج۔

استدراک: آغا خان نے ۱۱ جولائی ۱۹۵۷ء کو وفات پائی۔

ن

نادر شاہ افشار: نادر شاہ افشار کی تاریخ ولادت ۱۱۰۰ھ ہے اور مولد ابی ورد۔ اس کا والد ایک معمولی تاجر تھا جو بکریوں کی کھال سے پوستین بناتا تھا۔ نادر نے بڑے ہو کر یعقوب بن لیث کی طرح اِدھر اُدھر چھاپے مارنے شروع کیے اور آخر نیشاپور پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد شاہ طہماسپ کی ملازمت میں منسلک ہو کر اس نے بہت سی بغاوتوں کو فرو کیا ۱۱۴۴ھ میں اس نے طہماسپ کو معزول کر دیا اور خود مسند حکومت پر جلوس کیا اور زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی البتہ برائے نام طہماسپ کا ایک شیر خوار بیٹا حکمرانی کرتا رہا۔ جب یہ بچہ مر گیا تو نادر نے باقاعدہ ۱۱۴۸ھ میں تخت سلطنت پر جلوس کیا اور فوراً یہ فرمان صادر کیا کہ ایران کے رہنے والے شیعیت ترک کر دیں اور اہل سنت والجماعت کے گروہ میں داخل ہو جائیں۔ ۱۱۵۱ھ میں نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ کرنال کے قریب لڑائی ہوئی اور دو گھنٹے میں فیصلہ ہو گیا۔ نادر کے سپاہیوں نے دہلی میں قتل عام کیا اور نادر

کے ہاتھ بے شمار دولت لگی۔ اندازہ ہے کہ دہلی اور اس کے گرد و نواح سے جو مالِ غنیمت نادر کے ہاتھ لگا ہے اس کی مالیت ایک ارب چار کروڑ روپے کے لگ بھگ تھی۔ محمد شاہ کی ایک لڑکی نادر کے بیٹے نصراللہ سے بیاہی گئی۔

جوں جوں نادر کی مقبوضات وسیع ہوتی چلی گئیں توں توں اس کا دماغی توازن بگڑتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ عمر کے آخری سالوں میں وہ بے حد چڑچڑا اور وہمی ہو گیا تھا۔ ان سالوں میں اس نے بے شمار آدمی ہلاک کیے۔ آخر ۱۱۶۰ھ میں اپنے ہی قبیلہ کے ایک فرد کے ہاتھوں مقتول ہوا۔ سائیکس کہتے ہیں کہ نادر شاہ نہ منتظم اچھا تھا نہ مدبر البتہ جنگی معاملات میں اس کی سوجھ بوجھ بے نظیر تھی۔[1]

نظامی: حکیم ابو محمد الیاس بن یوسف ذکی بن مؤید المتخلص بہ نظامی کی تاریخ ولادت اگرچہ مشتبہ ہے لیکن وحید دست گردی نے بڑی محنت اور کاوش کے بعد قریباً طے کر دیا ہے کہ ان کی ولادت ۵۳۵ھ کے لگ بھگ شہر گنجہ میں واقع ہوئی جو آج کل دولتِ اشتراکیہ روس کی مقبوضات میں شامل ہے۔ گنجہ، شروان اور آذربائیجان کے محل وقوع، تسمیہ اور اہمیت کے متعلق میں اورینٹل کالج میگزین میں (نومبر ۱۹۵۲ء اور فروری ۱۹۵۳ء) اور مجلہ اقبال میں (اکتوبر ۱۹۵۵ء اور اپریل ۱۹۵۶ء) مفصل بحث کر چکا ہوں جنہیں تفصیلی حالات دریافت کرنے کا اشتیاق ہو وہ ان ماخذوں سے رجوع کریں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے والدین عین اس کی نوجوانی میں وفات پا گئے تھے۔

نظامی کے زمانہ میں ایران مختلف خاندانوں میں بٹا ہوا تھا جو پروفیسر براؤن کے قول کے مطابق ادب پروری اور ہنر نوازی کے معاملہ میں ایک دوسرے کے حریف تھے۔ یہی وجہ ہے

---

[1] تاریخ ایران: پرسی سائیکس جلد دوم (انگریزی)۔

کہ اس زمانہ میں شعرا کو انعام واکرام سے بہت نوازا گیا ہے۔

نظامی کی شہرت کی بنا اس کی پانچ مثنویاں ہیں جو پنج گنج کے نام سے مشہور ہیں۔

(۱) مثنوی مخزن اسرار غالباً ۵۷۰ھ میں تالیف کی گئی اور فخرالدین بہرام شاہ سے منسوب ہے اس وقت نظامی کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہے شفق کے اس قول کے مطابق تاریخ ولادت ۵۳۵ھ مبنی ہے۔ قصہ یہ ہے کہ اشعار سے یہ مستفاد نہیں ہوتا کہ نظامی پورے چالیس سال کا ہے البتہ یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ وہ جوان ہے نوجوان نہیں۔ اور بھی قرائن ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عمر اس وقت پینتیس اور چالیس کے درمیان تھی۔

(۲) مثنوی خسرو شیریں: شمس الدین محمد جہان پہلوان (۵۶۸ھ، ۵۸۱ھ) سے منسوب ہے اور امرا کا نام بھی آتا ہے۔ خسرو شیریں کی تالیف کی تکمیل ۵۷۶ھ میں ہوتی ہے۔

(۳) لیلیٰ مجنوں: ۵۸۴ھ میں لکھی جاتی ہے اور شروان شاہ ابوالمظفر اخستان پسر منوچہر سے منسوب ہے۔

(۴) ہفت پیکر: ۵۹۳ھ میں ختم ہوتی ہے اور علاء الدین سے منسوب ہے جو مراغہ کا امیر تھا۔

(۵) سکندر نامہ: نصرت الدین ابوبکر بن محمد جہان پہلوان سے منسوب ہے۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں ایک کا نام اقبال نامہ ہے اور دوسرے کا شرف نامہ۔ اس بات کی صراحت اس لئے کی گئی کہ اگر یہ بات ملحوظ خاطر نہ رکھی گئی تو پروفیسر شبلی کی طرح بہت سے اشتباہات پیدا ہوں گے اس کتاب کا دوسرا حصہ یعنی شرف نامہ ابوالفتح بن مسعود صاحب موصل سے منسوب ملتا ہے جس کا عہد حکومت ۶۰۷ھ سے ۶۱۵ھ تک ہے۔ اس اعتبار سے جیسا کہ پروفیسر شیرانی نے تنقید شعرالعجم میں تصریح کی ہے نظامی ۶۰۷ھ تک ضرور زندہ تھا۔ شفق یہ کہتے ہیں کہ سکندر نامہ کی تالیف میں وہ اپنی عمر تریسٹھ سال کی بتا رہا ہے اور اس حساب سے اس کی تاریخ وفات ۶۳ + ۵۳۵

یعنی ۵۹۹ھ منتج ہے۔ وہ سال وفات واقعاً ۵۹۹ھ درج کرتے ہیں کہ سکندر نامہ کی تالیف کے وقت نظامی کی عمر بقول خود تریسٹھ سال سے کچھ زیادہ تھی بہرحال جیسا کہ لکھا جا چکا ہے نظامی کی وفات نہ ۵۹۸ھ میں ہوئی نہ ۵۹۹ھ میں، وہ ۶۰۲ھ تک تو ضرور زندہ رہا۔ اور یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ۶۱۵ھ تک اس کے زندہ رہنے کا احتمال باقی ہے کہ شرف نامہ کے ممدوح نے ۶۱۵ھ میں وفات پائی۔

پروفیسر شبلی کو اس معاملہ میں اشتباہ یہ ہوا کہ نظامی سکندر نامہ کے پہلے حصے یعنی اقبال نامہ کے متعلق لکھتے ہیں:

بنو بت گرشہ دو ہندوئے بام   یکے مقبل و دیگر اقبال نام
یکے عصمت مریمی یافتہ   یکے نور عیسیٰ بر و تافتہ

شبلی استدلال کرتے ہیں کہ نظامی نے سکندر نامہ اپنی لڑکی کے ہاتھ بادشاہ کی خدمت میں بھیجا اور یہ وہی لڑکی ہے جسے اللہ کی طرف سے عصمتِ مریمی عطا ہوئی ہے۔ وحید دستگردی نے شبلی کا تمسخر اُڑاتے ہوئے (اور یہ شیوہ ارباب علم کے خلاف ہے) لکھا ہے کہ شبلی نادان ہندی اتنا نہ سمجھ سکا کہ کتاب کسی لڑکی کے ہاتھ نہیں بھیجی جا رہی بلکہ خود کتاب کا نام اقبال نامہ ہے اور اگر شبلی کی توجیہ قبول کر لی جائے تو یہ بھی لازم آتا ہے کہ ہم نظامی کی لڑکی کا نام اقبال فرض کریں۔ نظامی کے زمانہ میں مشرقی روایات کی جو صورت تھی اسے ملحوظ رکھتے ہوئے یہ بات غایت مستبعد معلوم ہوتی ہے کہ نظامی اپنی کتاب کسی لڑکی کے ہاتھ ارسال کرے۔ قصہ یہ ہے کہ یہ جن دو ہندوؤں یا غلاموں کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے ایک اقبال ہے اور دوسرا ان کا فرزند محمد ہے جسے مقبل کہہ کے پکارا گیا ہے اسی بیٹے کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اس پر وہی نور جلوہ افگن ہے، جو حضرت عیسیٰ کے لئے مخصوص تھا۔ نظامی کا اپنی تصنیف کو

مریم صنعت کہنا کوئی نئی بات نہیں وہ پہلے کہہ چکے ہیں:

طبیعت نہ زن بلکہ آتش زن است

کہ مریم صفت بکر و آبستن است

تو اقبال نامہ کے متعلق عصمتِ مریمی کی ترکیب اسی لئے استعمال کی گئی کہ یہ تالیف افکارِ بکر اور نوادرِ فکر پر مشتمل تھی اور ظاہر ہے کہ بیٹے کو تو ہر شخص مقبل کہتا ہی ہے کہ فرزند کے معنی ہی ہیں صاحبِ ہوش و خرد۔ اس کلمہ میں یعنی فرزند میں فرز بر جوڑ ہے، فرز کے معنی ہیں دانائی فرزانگی فرز بھی اسی سے درآمد ہوئے ہیں اند، انت، ونت آریائی زبانوں کے لاحقے ہیں اور ان کے معانی ہیں والا، صاحب تو فرزند کے لغوی معنی ہیں صاحبِ خرد۔

بہرحال یہ مسلم ہے کہ نظامی نے اپنی کوئی تالیف اپنی کسی لڑکی کے ہاتھ کسی بادشاہ کے ہاں نہیں بھیجی۔ شبلی کے اشتباہ کا یہ موجب ہے کہ سکندر نامہ کے دو حصے ہیں۔ ایک کا نام شرف نامہ ہے اور دوسرے کا نام اقبال نامہ۔

نظامی نے ایسے ماحول میں تربیت پائی تھی کہ جوانی ہی میں اس کی پرہیزگاری، اتقا اور تورع کے افسانے مشہور ہو گئے تھے۔ اس کی پہلی تصنیف مخزن اسرار مطالبِ عرفانی سے تعلق رکھتی ہے۔

یہ امر طے شدہ ہے کہ مخزن اسرار کی تالیف کے بعد نظامی کو جو انعام ملا ہے اس میں ایک کنیز بھی شامل تھی جو دشت قبچاق کی رہنے والی تھی اور جس کا نام آفاق تھا۔ قرائن اس بات کے مؤید ہیں کہ نظامی نے اس کنیز سے شادی کر لی اور اس کا لڑکا محمد اس شادی کا نتیجہ ہے۔ اس شادی نے اور آفاق کی محبت نے نہ صرف یہ کہ نظامی کے اسلوب شعر میں تغیر پیدا کر دیا بلکہ فارسی مثنوی کے اصناف میں ایک نئی صنف کا اضافہ بھی کیا یعنی داستانہائے

رومانی۔ نظامی کی تخلیقات معنوی پر غور فرمائیے کہ پہلی کتاب جو عہد جوانی سے متعلق ہے وہ تو مخزن اسرار ہے جو مطالب عرفانی پر مشتمل ہے لیکن باقی تمام تصانیف سکندر نامہ سے قطع نظر رومانی داستانیں ہیں جن میں نظامی خوب کھل کھیلا ہے۔ خسرو شیریں کی تالیف کے وقت آفاق زندہ تھی لیکن تکمیل سے پہلے عین عالم جوانی میں وفات پا گئی۔ نظامی نے کتاب کے آخر میں اس کا نہایت دردناک مرثیہ لکھا ہے۔ یوں بھی خسرو شیریں میں ناز و نیاز کے چونچلوں کی جو خوبصورت تصویریں کھینچی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بیتی ہوئی واردات کا ذکر ہے اور آخر میں جو مرثیہ لکھا ہے اس سے تو یہ نکتہ بالکل صاف ہو جاتا ہے کہ نظامی شیریں میں اپنی بیوی آفاق کا پرتو دیکھتے تھے۔ ان دونوں عورتوں میں مشابہت وفاداری کی تھی اور اس بات کو نظامی بصراحت بیان کرتے ہیں؟ قصہ یہ ہے کہ جب خسرو پرویز اپنے لڑکے شیرویہ کے ہاتھوں ہلاک ہوا تو بیٹے نے حسب قانون ایران تمام حرم کی بیگمات پر تصرف کرنا چاہا ان میں شیریں بھی تھی۔ شیریں نے روپ متی کی طرح یہ کہا کہ میں ذرا سنگار کر لوں۔ شیرویہ نظروں سے اوجھل ہوا تو شیریں نے پہلو میں خنجر گھونپ کر خودکشی کر لی اور خسرو کے پہلو میں لیٹ گئی دشیریں اور فرہاد کی داستان کے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے کہ یہ سب خرافات ہے اور فرہاد تخلیقی فن کاروں کی ایجاد۔ کوئی تاریخ نہ اسے تسلیم کرتی ہے اور نہ شیریں اور فرہاد کی داستانیں ہائے عشق کو پہچانتی ہے۔ دیکھئے کلمۂ بے ستوں، اتفاق کی بات ہے کہ جب نظامی خسرو شیریں لکھ رہے تھے تو تکمیل سے پہلے آفاق کی موت واقع ہو گئی۔ نظامی نے اس موقع پر بہت سے اشعار کہے ہیں لیکن یہ دو شعر خصوصیت ہیں:

سبک رو چوں بت قبچاق من بود
گماں افتاد خود آفاق من بود

فلک احسنت می گفت و ملک زہ

عروساں را بداماداں چنیں دہ

آگے چل کے فرماتے ہیں کہ شیریں تو اللہ کو پیاری ہوئی خدا کرے اس سے جو اولاد ہوئی ہے وہ زندہ و سلامت رہے قیاس چاہتا ہے کہ یہ اولاد وہی محمد ہو جس کے ہاتھوں شرف نامہ بھیجا جا رہا ہے اور جسے مقبل کے خطاب سے نوازا جا رہا ہے۔

ایرانی مثنوی کی تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ ابتدائی کوششیں رودکی نے کی ہیں اور اس سلسلہ میں اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے سنسکرت کی کتاب کلیلہ دمنہ کو فارسی نظم کے قالب میں ڈھال دیا۔ اس مثنوی کے کچھ اشعار ابھی تک ملتے ہیں۔ نقادوں کا خیال ہے کہ مثنوی بالکل ایرانی دماغ کی اختراع ہے۔ اگرچہ عجب اتفاق ہے کہ اس صنفِ سخن کا نام عربی ہے یعنی وہ نظم جس کے دو مصرعے یا ایک شعر قافیہ یا ردیف کے اعتبار سے دوسرے اشعار سے مختلف ہو سکتے ہیں اور بالعموم مختلف ہوتے ہیں۔ فردوسی نے مثنوی کے شجر میں نئے برگ و بار نکالے اور ایران باستان کی داستانوں کو منظوم کیا۔ اس سلسلہ میں دقیقی نے جو ہزار شعر لکھے تھے وہ بھی بصراحت نام لے کر فردوسی نے شاہنامہ میں شامل کر لئے اس قسم کی مثنوی حماسہ ملی کہلاتی ہے اور صحیح معنی میں ملی داستان یا Epic ہے پروفیسر شبلی نے ایپک کا جو ترجمہ رزمیہ کیا ہے اس سے سخت اشتباہات پیدا ہوئے ہیں۔ ایرانی، ایپک کو مجموعۂ داستانہائے ملی کہتے ہیں۔ حماسۂ ملی اصلی کے مقابلے میں ایک چیز حماسۂ فنی بھی ہے نظامی کا سکندر نامہ اسی صنف میں محسوب ہوتا ہے یعنی فردوسی کا کارنامہ انگریزی اصطلاح میں Real and Prunlive Epic ہے نظامی کی داستان Arlislic Epic. ہے کہ سکندر ایرانیوں کی داستان کا ہیرو نہیں۔

بہر حال حماسہ ملی کے بعد جب تصوف اور علم الکلام کا زور بڑھا تو عرفانی مثنویاں بہت کثرت سے لکھی گئیں۔ ان میں سنائی کی حدیقۃ الحقیقت بہت مشہور ہے اور عطار کی بیشتر مثنویاں اسی زمرہ میں شامل ہیں۔

نظامی بھی غالباً اپنے تخلیقی کارناموں کو عرفان و اخلاق تک ہی محدود رکھتا لیکن آفاق کے عشق نے اسے ایک نئی شق ایجاد کرنے پر مجبور کیا جسے ایرانی مورخ داستان رومانی کہتے ہیں۔ مخزن اسرار سے قطع نظر کر لیجئے کہ اس کی تالیف کے وقت آفاق سے ملاقات ہی نہیں ہوئی تھی۔ نظامی کی تمام مثنویاں رومانی ہیں اور کسی عشق و محبت کے مشہور واقعہ کو قلمبند کرتی ہیں۔ سکندر نامہ میں بھی رومانی داستان کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔

نظامی کا تعلق ایران کے اس دبستانِ شعر سے ہے جسے عراقی کہتے ہیں اور جس کا پیشرو قطران تبریزی تھا۔ اس دبستان میں مطالب سے قطع نظر الفاظ کو، قالب کو، انداز کو بڑی اہمیت بخشی جاتی ہے۔ نظامی کا انداز یا باصطلاح ایرانیاں، سبک، ترنم اور موسیقی کے جمالیاتی عناصر سے لبریز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خود موسیقی کا محرم اسرار اور رازدار تھا۔ اور ساسانی عہد کی موسیقی کے متعلق ہماری جتنی معلومات ہیں وہ کم و بیش انھیں اشعار پر مبنی ہیں جو نظامی نے خسرو شیریں میں قلمبند کر دیے ہیں۔

بہر حال نظامی کا کلام پر مغز بھی ہے اور انداز اسلوب پر شکوہ بھی۔ وحید دست گردی نے بڑی محنت سے ان کی پانچوں مثنویاں مرتب کر دی ہیں چھٹی تصنیف گنجینۂ گنجوی ہے جس میں فاضل مؤلف نے نظامی کے مفصل سوانح قلمبند کئے ہیں۔ ریزہ ریزہ کر کے اشعار اور قصائد جمع کئے ہیں اور الحاقی اشعار کی یا مشتبہ اشعار کی نشان دہی کی ہے۔ کتاب کے آخر میں انتقادی حصہ، ایک فرہنگ بھی شامل ہے، جسے وحید دست گردی فرہنگ نظامی کہتے ہیں۔

نظامی کی مثنویاں تو بازار میں عام ملتی ہیں اس لئے ان سے مثالیں دینے کی ضرورت نہیں البتہ قصائد اور غزلیات نایاب ہیں اس لئے ان کا نمونہ ملاحظہ فرمایئے۔

ملک الملوک فضلم بفضیلت معانی
زمی و زماں گرفتہ بمثال آسمانی
خودم یزک فرستد بوثاق خیل تاشی
ادہم طلایہ دارد بہ یتاق پاسبانی
بکتابات نغرم شرف آرد ابن مقلہ
زمغالطات نظم غلط افتد ابن ہانی

ولہ

بدروی کز تو درمانی برآید | مکن کز بے دلی جانی برآید
گر آری کشتی ما را بساحل | نپندارم کہ طوفانی برآید
گر از تیر تو برمن زخم جویند | ز ہر مویم پیکانی برآید
برآیم با غم عشقت پیندار | کہ موری با سلیمانی برآید

نظامی را بدردِ عشق بنواز
کہ کار او بسلطانی برآید

وحید دست گردی لکھتے ہیں کہ باکو سے گنجہ کی طرف سفر کرتے ہوئے ایک بیابان نما مقام میں نظامی کا مدفن تھا۔ معتمد الدولہ نے ۱۲۹۲ھ میں یہ مدفن دیکھا ہے اور اس کی ویرانی سے متاثر ہو کر ایک کمیشن کا تقرر کیا جو کمیسیونِ نظامی کہلاتا تھا۔ ۱۹۱۳ء میں روسیوں نے نظامی کے مقبرہ میں سے اس کا جسد خاکی نکال کر گنجہ لے جانے کی کوششیں کیں پہلے مقبرہ

میں ایک قبر ظاہر ہوئی۔ اس قبر میں سفید اور نازک نازک ہڈیوں کا انبار تھا۔ روسیوں نے انھیں ہڈیوں کو نظامی کے جسد خاکی کا بقایا سمجھ کر گنجہ لے جانا چاہا۔ بعد میں غالبًا شکوک پیدا ہوئے کہ یہ ہڈیاں کسی عورت کی ہیں۔ چنانچہ مقبرہ کو بہ تمام وکمال کھودا گیا۔ اب نظامی کی ہڈیاں بھی برآمد ہوئیں۔ ان دونوں ہڈیوں کو جمع کرکے ایک نئے مقبرہ میں دفن کیا گیا۔ دولتِ روسیہ نے سنگ مزار نصب کیا۔ تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہاں کیسا جلیل القدر شاعر دفن ہے۔ یہ مدفن حوالیٔ گنجہ میں ابھی تک موجود ہے۔ البتہ جو دوسری ہڈیاں نکلی تھیں۔ ان کے متعلق طبی شہادت یہ تھی کہ وہ کسی عورت کی ہڈیاں ہیں۔ قیاس چاہتا ہے کہ یہ آفاق کی ہڈیاں ہوں وحید دست گردی کہتے ہیں کہ اس عورت کی ہڈیاں نقل مکانی کے وقت ایسے مخلوط ہوگئیں کہ جدا کرنا ناممکن ہو گیا۔ چنانچہ ان دونوں کے جسد خاکی کے بقیہ کو اکٹھا دفن کر دیا۔ یہ مدفن ابھی موجود ہے اور بقول وحید دست گردی: "زیارت گاہِ احرار است"۔

واضح رہے کہ زنانہ ہڈیوں کے متعلق یہ میرا قیاس ہے کہ آفاق کی ہیں اس سلسلہ میں کوئی مستند شہادت دستیاب نہیں ہو سکی۔

نظامی کو مثنویوں کی تالیف کے بعد مختلف بادشاہوں اور وزراء نے خوب انعام واکرام سے نوازا۔

ظہیر فاریابی ایک قصیدہ میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس قصیدہ کے مطلع کا پہلا مصرعہ ہے ع

مرا ز دستِ ہنرہاے خویشتن فریاد

اس سے آگے چل کر کہتا ہے:

کسا د تر ز ہنر در عراق چیزے نیست   خوشا فسانۂ شیریں و قصۂ فرہاد

تو معلوم ہوا کہ ظہیر بصراحت یہ بیان کر رہا ہے کہ نظامی کو رومانی داستانیں قلمبند کرنے سے دولتِ دنیا نصیب ہوئی اور ظہیر ہنرمند ہونے کے باوصف دولتِ دنیا سے محروم رہا یہ وہی ظہیر فاریابی ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے:

دیوان ظہیرِ فاریابی در مکہ بدُزد اگر بیابی

نظامی کے متعلق انتقاد میرے دائرۂ بحث سے خارج ہے لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ اسے ہندوستان اور ایران کے مورخ اور نقاد سخن سالارِ شعرائے عراق کہتے ہیں، اس کی تصانیف مدت سے داخل نصاب رہیں[۱]۔

---

[۱] تاریخِ ادبیاتِ ایران: شفق۔
تاریخِ ادبیاتِ ایران: حلیم بیناری۔
تاریخِ ایران: سائیکس جلد دوم (انگریزی)۔
تاریخ ادبیات ایران: براؤن جلد دوم (انگریزی)۔
قاموسِ اسلام: لیڈن (انگریزی)، نظامی پر مقالہ۔
شعر العجم: شبلی۔
گنجینۂ گنجوی: وحید دستگردی۔
میراث ایران (انگریزی)۔
تنقید شعر العجم: حافظ محمود شیرانی۔

و

والنجم: ستائیسواں پارہ سورت ۵۳ جو یوں شروع ہوتی ہے والنجم اذا ھویٰ ماضلّ صاحبکم وما غویٰ یعنی قسم اس ستارہ کی جب وہ جھکے کہ تمہارے رسول نہ گمراہ ہیں اور نہ بھٹکے ہوئے ہیں۔ قرآن مجید پر اس نقطۂ نظر سے ابھی تک غور نہیں کیا گیا کہ علمِ ہیئت کے کن حقائق سے کام لے کر بات کی گئی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ جتنے نظام ہیں ان میں ایک کرہ ستارہ یا سیارہ حیثیتِ مرکزی رکھتا ہے اسی کے انجذاب سے اس نظام کے تمام اجزا ٹھیک حرکت کرتے ہیں اور متصادم نہیں ہوتے۔ البتہ جب کبھی بہت بڑے بڑے نظاموں میں کسی سیارہ نے اس طرح حرکت کی ہے کہ انجذاب کے دائرہ سے ذرا نکل گیا ہے تو انقلاباتِ عظیم برپا ہوئے۔ یہاں جو ستارہ کے جھکنے کا ذکر کیا گیا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس انقلابِ عظیم کی طرف اشارہ ہے جو سیارہ زہرہ کی دم ٹوٹنے کی وجہ سے پیدا ہوا۔ یہ وہی سیارہ ہے جسے ستارۂ صبح بھی کہتے ہیں۔ ہیئت دانوں کا دعویٰ ہے کہ اصلاً یہ سیارہ دم دار تھا۔ اصطلاح میں اسے

comit کہتے ہیں جب اس کی دم ٹوٹی ہے تو دنیا کی شکل ہی بدل گئی بعض لوگ تو کہتے ہیں کہ طوفانِ نوح اسی دم ٹوٹنے کا نتیجہ تھا۔ بعض ہیئت دان بیان کرتے ہیں کہ بحیرۂ روم کا ظہور، کئی براعظموں کا غرق ہونا اور کئی پہاڑوں کا سطح زمین پر ظاہر ہونا سب اسی دمدار ستارہ کے ذرا سے جھکاؤ کا نتیجہ ہیں۔ بہر حال یہ قیاس ہی قیاس ہیں اگرچہ اس کے لئے کچھ علمی شواہد بھی موجود ہیں۔

ظاہر ہے کہ خدائے حکیم جب سیارہ کے جھکنے کی بات کرتا ہے تو کسی انقلاب آفریں حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

حوالے: کائنات جو ہم کو محیط ہے (انگریزی) JAMES JEANS

متصادم دنیائیں WORLDS IN COLLISIONS

ہ

ہیگل: فریڈرک ہیگل کی تاریخ ولادت ۲۷ راگست ۱۷۷۰ء ہے اور تاریخِ وفات ۱۸۳۱ء۔ اس کے متعلق لطیفہ مشہور ہے کہ ایک فرانسیسی نے ہیگل سے کہا کہ اپنا فلسفہ مختصراً بیان تو فرمایئے تو ہیگل نے دس جلدوں میں اس سوال کا جواب لکھا۔ اس کی فلسفیانہ تصانیف کی اشاعت کے بعد جب اس کی شہرت کو پر پرواز لگے تو وہ کہتا ہوا سنا گیا: "ایک شخص ہے جو میری بات سمجھتا ہے اور سمجھتا وہ بھی نہیں۔" ڈیورانٹ یہ کہتا ہے کہ منطق پر اس کی کتاب ابہام کا شہکار ہے۔ بہرحال ہیگل کا اپنے معاصر فلسفیوں پر بڑا گہرا اثر پڑا۔ مختصراً اس کے افکار کا خلاصہ یہ ہے کہ جتنے روابط سے ہم آگاہ ہیں ان میں سب سے عمومی ربط ضد یا تقابل کا ہے۔ ہر کیفیت فکری ہو یا جسمی اپنے متقابل کی طرف مائل ہوتی ہے اور آخر کار ایک بجیدار کلیت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ وہی تصور ہے جو اس سے پہلے ایم۔ پی ڈوکلیز دنیا کے سامنے رکھ چکا تھا۔ ہیگل کے خیال میں صداقت متضاد اجزا کی وحدت کا نام ہے۔ ارتقا متضاد تحریکات کے تسلسل کو کہتے ہیں۔ ہیگل کے دشمن یہ کہتے تھے کہ

وہ سرکاری فلسفی ہے اور سرکار دربار کی تمام نعمتوں سے بہرہ یاب ہے۔ آخر عمر میں ہیگل اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا کہ اس کا نظامِ فکر دنیا کے قوانینِ فطری کا ایک جزوِ لازم ہے۔[1]

اگرچہ ہیگل نے بہت سی فلسفیانہ تصانیف سپردِ قلم کی ہیں تاہم اس کے ہاں مغزِ فکر بہت کم ہے یہی وجہ ہے کہ علامہ کہتے ہیں:

ہیگل کا صدف گہر سے خالی
ہے اس کا طلسم سب خیالی[2]

---

[1] لغتِ فلسفہ (انگریزی، رونز) ۔ داستانِ فلسفہ: ڈیورانٹ ۔

[2] قاموسِ مذاہب واخلاق (جلد دوم صفحہ ۲۹۹ تا ۳۰۰) ۔

ارمغان حجاز

ب

برزخ: صاحبِ غیاث لکھتے ہیں:

"بالفتح چیزے کہ میانِ دو چیز متخالف حائل باشد خواہ ازاں ہر دو متخالف در خود مناسبتی داشتہ باشد یا نہ۔ چنانچہ اعراف برزخ است میان بہشت و دوزخ و بوزنہ برزخ است میانِ بہائم و انسان و درخت خرما و مردم گیاہ برزخ است میانِ حیوانات و نباتات و بسد برزخ است میانِ نباتات و جمادات و بمعنی زمانہ کہ مابین وقت مرگ و زمانِ قیامت است"۔

صاحبِ غیاث سروری کی، کنزؔ کی اور منتخب کی سند دیتے ہیں لیکن صاحب منتخب فرماتے ہیں کہ شک اور یقین کے درمیان جو منزل ہوتی ہے وہ بھی برزخ کہلاتی ہے اور وہ برزخ الایمان ہوتی ہے۔ صاحبِ غیاث نے جو کچھ لکھا ہے اس سے متبادر ہوتا ہے کہ برزخ اصطلاح میں وہ گمشدہ کڑی ہے جس کا ارتقا کے مراحل کے بیان میں اکثر ذکر آتا ہے۔

علامہ نے جس موقع پر یہ لفظ ارمغانِ حجاز میں استعمال کیا ہے اس سے گمان ہوتا ہے کہ برزخ سے ان کی مراد وہی زمانہ ہے جو موت اور روزِ حشر کے درمیان حائل ہوتا ہے[۱]۔

---

[۱] غیاث اللغات۔ منتخب اللغات۔ فرہنگ آنند راج

ج

جمہوریت: جمہوریت (سلطانیٔ جمہور) کی اصل ایک یونانی کلمہ ہے جس کے معنی ہیں ریاست پر عوام کا تصرف. تو گویا جمہوریت آزادی کے تعقل کی ایک سیاسی شکل ہے. عوام کا ریاست پر اختیار بالواسطہ بھی ہوتا ہے اور بلا واسطہ بھی. کبھی تمام رعایا سے استصواب کیا جاتا ہے اور کبھی ان کے نمائندے یہ فرض پورا کرتے ہیں. عموماً جمہوری طرزِ حکومت میں عوام اپنے نمائندوں ہی کے ذریعہ ریاست پر متصرف ہوتے ہیں. یہ مسلّم ہے کہ سب سے پہلے جمہوری طرزِ حکومت یونان کی شہری ریاستوں میں رائج ہوئی. ان ریاستوں میں بھی آزادوں اور بندوں میں تمیز قائم تھی۔

چودھویں صدی عیسوی سے یورپ میں جمہوریت کا فروغ شروع ہوا اور یہ فروغ متوسط طبقہ کے عروج سے متعلق ہے۔

ریاستیں اصلاً دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جہاں حکمراں مسلّمہ قوانین کے مطابق حکومت کریں اور ایک وہ جہاں شخصی استبداد کارفرما ہو. صاحبِ اخلاقِ جلالی ان دونوں شکلوں کو پہچانتے ہیں. پہلی صورت کو وہ مدینۂ فاضلہ کہتے ہیں اور دوسری کو مدینۂ غیر فاضلہ۔ فرق یہ ہے کہ

مغرب کے جمہوری نظام میں عوام کا ریاست پر تصرف ضروری ہے لیکن مشرق میں اگر فرمانروا ان قوانین پر عمل کرے جن کا جواز مذہب پیش کرتا ہے تب بھی مدینہ فاضلہ وجود میں آجاتا ہے بادشاہ کے ہوتے ہوئے جمہوریت انگلستان کی حکومت کی شکل میں ہمارے سامنے ہے اس لئے یہ کہنا نادرست نہ ہوگا کہ جمہوری نظام میں ضروری نہیں کہ شاہ یا فرمانروا موجود نہ ہو۔ شرط صرف یہ ہے کہ مدینہ فاضلہ میں یا جمہوری نظام حکومت میں ہر فرد کو یہ موقع ملے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق پھل پھول سکے۔ جمہوری نظام میں یہ بھی شرط ہے کہ افراد کو تحریر و تقریر کی آزادی عطا کی جاتی ہے بشرطیکہ وہ کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے ریاست کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں۔ جمہوری طرزِ حکومت میں خونی انقلاب کی ضرورت نہیں۔ نمائندوں کے بدل جانے سے عوام کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

ہر فرد کو فرمانروائی کے کاموں میں بقدر استعداد شریک کیا جاتا ہے۔ عوام کو اقتدار اعلیٰ کا سرچشمہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ وقتاً فوقتاً ریاست میں انتخاب ہوتے رہتے ہیں اور شہری ووٹ کے ذریعہ اپنے رجحان کا اظہار کرتے ہیں۔ عوام کو قانون بنانے کا پورا حق حاصل ہوتا ہے۔ جن مجلسوں میں یہ حق استعمال کیا جاتا ہے وہ قانون ساز کہلاتی ہیں یہی قانون ساز مجلسیں بجٹ منظور یا مسترد کرتی ہیں ٹیکس لگاتی ہیں۔ اخراجات کا تخمینہ لگاتی ہیں ان مجلسوں کے ارکان عوام کے سامنے جواب دہ ہوتے ہیں۔ اگرچہ انتظام اور انصرام کا محکمہ ہر قسم کے دباؤ سے آزاد ہوتا ہے لیکن وہ بھی مجالس قانون ساز کے ماتحت ہوتا ہے۔

بعض لوگ مدعی ہیں کہ جمہوری نظامِ حکومت میں کم از کم دو پارٹیاں ہونی چاہییں۔ جہاں صرف ایک پارٹی ہوتی ہے وہاں دراصل جمہوری نظام قائم نہیں ہوتا جمہوریت کی اساس اس نکتہ پر قائم ہے کہ اکثریت کا فیصلہ ناطق ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ اکثریت کو اقلیت کے

مفاد کی حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ واضح رہے کہ جمہوری نظام اس وقت تک قائم نہیں ہوتا جب تک انتظامی افسر، عدلیہ کے ارکان اور رعایا کے افراد واقعی جمہوریت کے پرستار نہ ہوں۔ بدیں معنی جمہوریت ایک رجحانِ ذہنی، ایک افتادِ طبعی ہے جمہوریت کا سیاسی نظام اسی رجحانِ ذہنی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

جمہوریت میں جو چیز ہمیشہ بحث کا موضوع رہی ہے وہ یہ ہے کہ جس وقت کسی ریاست کے افراد مل کر جمہوری نظام قائم کرتے ہیں تو وہ اپنی شخصی آزادی کا کتنا حصہ اجتماعی مفاد کی خاطر ریاست کے حوالے کر دیتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ جمہوری نظام کے ارکان اجتماعی فوائد حاصل کرنے کے لئے خود بخود بعض شخصی اور انفرادی حقوق سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ ہر جمہوری نظام میں ریاست اور رعایا کے حقوق پر مدبروں کی کڑی نگرانی رہتی ہے کہ حکومت کے ارکان آہستہ آہستہ اختیارات ایک خاص گروہ میں مرکوز نہ کرنے پائیں۔ دوسری طرف افراد کو بھی اس بات کی تربیت دی جاتی ہے کہ وہ ریاست کے بقا اور اس کے استحکام کے لئے بعض حقوق سے دست بردار ہو جائیں۔

جمہوری نظام میں ہر فرد کو یہ آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ جو مذہب چاہے اختیار کرے۔ جس سیاسی مسلک کی طرف مائل ہو اس کا پرچار کرے اور پرامن طریقوں سے کوشش کرے کہ اگر حکومت کو بدلنا مقصود ہو تو نئے نمائندے انتخاب کر کے بدل ڈالے۔ ریاست افراد کی جانی اور مالی حفاظت کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ نظری طور پر قانون میں شاہ و گدا یکساں ہوتے ہیں یعنی اس قسم کے نظام میں وہ حکومت قائم ہوتی ہے جسے اصطلاح میں قانون کی حکومت کہتے ہیں ملزموں پر کھلی عدالت میں مقدمات چلائے جاتے ہیں اور کسی کو جائز وجہ کی بنا پر نظر بند نہیں کیا جاتا۔

غیر معمولی اور ہنگامی حالات میں البتہ جمہوری نظام میں کچھ دقتیں پیش آتی ہیں۔ جب تک مجالس قانون ساز بیٹھ کر بعض اہم امور کا فیصلہ کریں کوئی زبردست حملہ آور ریاست کا تیا پانچا

کرسکتا ہے۔ ایسی صورت میں مجالس قانون ساز اکثر عاملہ کو ہنگامی اختیارات سونپ دیتی ہیں کہ ہر طرح کے معاملات سے عہدہ برآ ہو سکے۔ خاص طور سے جنگ کے دوران میں ایسا ہوتا ہے جب ہنگامی حالات ختم ہو جاتے ہیں یا جنگ رک جاتی ہے تو مجالسِ قانون ساز باطمینان قلب کام کرتی ہیں اور ہنگامی حالات میں انتظامیہ نے جو کام کئے تھے ان کو پرکھنے کے بعد فیصلہ کرتی ہیں کہ انتظامیہ کے کام صحیح تھے یا غلط۔ یہ امر بھی طے کیا جاتا ہے کہ کسی نے اختیارات غلط استعمال تو نہیں کئے۔

مغرب میں جو جمہوری نظام قائم ہے علامہ کچھ اس کے زیادہ مداح نہیں معلوم ہوتے پیامِ مشرق میں کہتے ہیں:

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کاری شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانی نمی آید

اسلام میں بھی بہت سی باتیں ایسی ہیں جو جمہوریت کے موجودہ نظام سے مشابہ ہیں البتہ یہ ضرور ہے کہ اختلاف کے موقعوں پر حکم قرآن مجید ہوتا ہے۔ جہاں نص صریح موجود نہ ہو وہاں مسلمان شوریٰ کے ذریعہ اپنی راہِ عمل متعین کر سکتے ہیں۔ اگر خلیفہ قرآنی تعلیمات پر عمل نہ کرے یا جور و ظلم پر اتر آئے تو مسلمان اسے معزول کر سکتے ہیں۔ یوں اقتدارِ اعلیٰ یا حاکمیتِ اعلیٰ یعنی SOVEREIGNTY کا سرچشمہ دراصل عوام ہی ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں البتہ حاکمیت اور اقتدار کی ایک راہ متعین ہے۔ اصطلاحی الفاظ میں یوں کہنا چاہئے کہ قرآن مجید میں اسلامی معاشرہ اور ریاست کا دستور بھی موجود ہے۔ یہ دستور بہت لچکدار ہے اور جیسا کہ گذارش کیا جا سکتا ہے صرف نصوص صریح کے علاوہ ہر معاملہ میں مسلمان اپنی راہِ عمل متعین کرنے پر قادر ہیں۔ نصوص کی تاویل بھی ایسی نہیں ہونی چاہئے جو دنیا کے بدلتے ہوئے حالات سے ٹکرائے۔ ہاں یہ بھی نہیں ہونا چاہئے کہ کھینچ تان کر قرآن مجید کے الفاظ کو وہ معنی پہنائے جائیں جو موجودہ ضروریات کے مطابق ہوں۔ اسلام کا راستہ اعتدال کا

ہے۔ وہ جمہوریت کے فوائد سے بھی رعایا کو بہرہ یاب کرنا چاہتا ہے لیکن شخصی فرماں روائی میں جو خوبیاں ہیں ان سے بھی محروم کرنا پسند نہیں کرتا۔ ضربِ کلیم میں علامہ نے جمہوریت کے متعلق اس رائے کا اظہار کیا ہے:

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں | بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

اس وقت بہت کم ملک ایسے ہیں جہاں شخصی استبداد کارفرما ہو۔ اصل اختلاف جمہوریت کی خاص خاص شکلوں میں ہے اور یہ اختلاف بھی دراصل اقتصادی ہے۔ اس اختلاف کا تذکرہ ملوکیت، اشتراکیت اور بلشویک کے سلسلہ میں کیا جا چکا ہے۔[1]

---

[1] قاموس سیاسیاتِ عالم: فیبر اینڈ فیبر۔
اصول علم السیاسیات (انگریزی) لیکوک۔
علم السیاسیات (انگریزی) گارنر۔
سیاسیات پر لاسکی کے مختلف رسالے اور مستقل تالیفات۔
جدید سیاسی نظریہ (انگریزی) جوڈ۔
ریاست (انگریزی) میکارٹنی۔
جمہوریت: افلاطون (یونانی سے انگریزی ترجمہ جووٹ)۔

چ

چلیپا: چوب چہار گوشہ، اور صلیب اسی کا معرب ہے۔[1]

---

[1] غیاث اللغات

ح

حسین احمد مدنی : برصغیر ہند و پاکستان میں تقسیم سے پہلے جو علمار کانگرس کے ہمنوا تھے ان کے قائد حسین احمد مدنی ہی تھے۔ تورّع ، زہد، اتقا اور علم و فضل کے اعتبار سے ان کا جواب نہ تھا لیکن سیاسی مسائل کے بارے میں (خاص طور پر جب مسائل مذہبی مسلک سے الجھ گئے ہوں) وہ بصیرت نہیں رکھتے تھے (یہ میری ذاتی رائے کا اظہار ہے)۔ انھوں نے بڑے نازک موقع پر یہ ارشاد فرمایا کہ ملتیں اوطان سے بنتی ہیں۔ یہ مغرب کا سیاسی نظریہ ہے۔ کانگرس اس بات پر مُصر تھی کہ ہندو مسلمان ایک قوم ہیں جن کا وطن ہندوستان ہے۔ مولانا حسین احمد مدنی کی تقریروں اور تحریروں سے کانگرس کے اس دعویٰ کو تقویت پہنچتی تھی۔ جب مولانا کا یہ بیان شائع ہوا کہ ملت وطن سے بنتی ہے تو علامہ نے شدید علالت کے دوران میں اردو میں ایک مضمون لکھوایا۔ اس میں فقہ اور مغرب کے مفکروں کے اقوال کے حوالے دے کر یہ ثابت کیا گیا تھا کہ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے وہ ملت کو وطن کا تابع نہیں گردانتا۔ ملتِ اسلامیہ مذہبی تصورات و افکار کی

ہم آہنگی سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ خالص مغربی تصوّر ہے کہ کوئی ملت کسی خاص خطۂ زمین سے منسوب ہوئے بغیر وجود میں نہیں آسکتی۔ علامہ نے اس سے پہلے بانگِ درا میں وطنیت پر نظم لکھ کر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا اور کہا تھا:

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

علامہ نے جو مضمون لکھا تھا اس میں اپنا یہ شعر بھی نقل کیا تھا:

قلندر جز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

و

دلے کہ عاشق وصابر بود مگر سنگ است　　زعشق تا بصبوری ہزار فرسنگ است

سعدی کی زندگی کے حالات پر مستند کتابیں بہت کم لکھی گئی ہیں پچھلے دنوں البتہ جب سعدی نامہ شائع ہوا تو بہت سے حجابات رفع ہو گئے۔

آقائے عباس اقبال نے سعدی کی تاریخ ولادت سے بحث کرتے ہوئے بہ قطع ویقین طے کر دیا ہے کہ ان کی ولادت ۶۰۰ھ اور ۶۱۵ھ کے درمیان ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں شفق کہتے ہیں۔ کہ سعدی کا یہ قصیدہ:

اے کہ پنجاہ رفت و در خوابی
مگر این پنج روز دریابی

سوانحی معلومات پر مشتمل ہے۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ مطلع کا مخاطب خود سعدی ہے تو سعدی کی تاریخ ولادت ۶۵۶ – ۵۰ یعنی ۶۰۶ھ بنتی ہے کہ یہ شعر گلستاں میں مندرج ہے اور گلستاں کی

تاریخ تصنیف بقطع و یقین ۶۵۶ھ ہے لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ دلیل قاطع نہیں ہے یہ مطلع ایک طویل قصیدہ کا ہے اور ہو سکتا ہے کہ سعدی نے یہ قصیدہ گلستاں کی تصنیف سے بیس سال پہلے کہا ہو البتہ عباس اقبال نے جو استدلال کیا ہے وہ درست معلوم ہوتا ہے۔

سعدی کے متعلق جو اشتباہات عام طور پر رائج ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سعدی نے اپنا تخلص اتابک سعد زنگی فرماں روائے فارس کے نام پر رکھا تھا۔ یہ دعویٰ سراسر غلط ہے کہ سعد بن زنگی ۶۲۳ھ میں وفات پاجاتا ہے۔ علاوہ ازیں سعدی کی تمام کلیات میں (اور یہ تحقیق علامہ محمد بن عبدالوہاب قزوینی کی ہے) ایک شعر بھی ایسا نہیں ملتا جو سعد بن زنگی کی مدح میں کہا گیا ہو۔ یہ بات بغایت مستبعد معلوم ہوتی ہے کہ سعدی سعد بن زنگی کے نام پر اپنا تخلص رکھے اور اس کی مدح میں ایک شعر بھی نہ کہے۔ علامہ قزوینی نے شمس قیس رازی کی مشہور کتاب المعجم پر جو دیباچہ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوبکر بن سعد زنگی کے زمانہ میں بھی سعدی کی شہرت ایسی نہ ہوئی تھی کہ شمس قیس رازی اپنی کتاب میں اس کے شعر نقل کرتا۔

قصہ یہ ہے کہ سعدی کی وفات بقطع و یقین ۶۹۱ھ یا ۶۹۴ھ میں واقع ہوئی ہے۔ اسے سعد بن زنگی کا معاصر بنانے کے لئے کوئی سو سال کے قریب یا اس سے زیادہ عمر عطا کرنی پڑتی ہے اور مورخوں نے بے تکلف سعدی کو ایک سو بیس سال کی عمر عطا کردی ہے تاکہ جو اشتباہات قائم ہو گئے تھے ان کی تردید نہ ہو سکے۔

اس میں شک نہیں کہ سعدی بچپن ہی میں یا کم از کم جوانی کے اوائل میں یتیم ہو گیا تھا اس کے باوصف اس نے شیراز میں اور مدرسہ نظامیہ بغداد میں تعلیم حاصل کی ۶۱۶ھ کے بعد ایران کے حالات بہت مخدوش ہو گئے تھے۔ سعدی نے بھی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے ملک کو خیرباد کہا کہ منگولوں کی یورش کی خبریں برابر آرہی تھیں۔ وطن سے نکلا تو سعدی ملکوں ملکوں پھرا۔ یہ مسلم ہے

کہ اس نے نہ صرف مختلف ملکوں کی سیاحت کی ہے بلکہ حج بھی کیا ہے۔

قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سعدی سنہ ۶۵۵ھ کے بعد شیراز واپس آیا۔ ان دنوں فارس پر ابوبکر بن سعد زنگی فرماں روائی کرتا تھا۔ اتابکانِ فارس نے اپنے ملک کو منگولوں کی تاخت و تاراج سے بچانے کے لئے عافیت اسی میں دیکھی تھی کہ منگولوں سے صلح کرلیں۔ چنانچہ منگولوں نے فارس کا علاقہ آتابکوں کے قبضہ ہی میں رہنے دیا۔

سنہ ۶۵۵ھ کے بعد سعدی تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہوا۔ ۶۵۵ھ میں جیسا کہ وہ خود بوستان میں بصراحت کہتا ہے اس نے یہ کتاب تالیف کی اور یہ بھی ذکر کیا کہ سعدی کا زمانہ بوبکر بن سعد کا زمانہ ہے:

کہ سعدی کہ گوئے بلاغت ربود   در ایام بوبکر بن سعد بود

۶۵۶ھ میں اس نے گلستاں تصنیف کی کہ فارسی نثر کا شاہکار ہے۔ یہ کتاب دو فرماں رواؤں سے منسوب ہے ایک تو وہی ابوبکر بن سعد بن زنگی (۶۲۳ھ ۔ ۶۶۸ھ) اور دوسرے سعد بن ابوبکر بن سعد بن زنگی۔ یہ دوسرا سعد، جو ابوبکر کا بیٹا اور سعد بن زنگی کا پوتا تھا۔ سعدی کا ممدوحِ خاص تھا اور سعدی نے اپنا تخلص اسی کے نام پر رکھا تھا۔ مؤرخوں کو پوتے پر دادے کا اشتباہ ہوا ہے یعنی صورت یہ ہے کہ سعدی کا ممدوح سعد ضرور ہے لیکن یہ سعد، سعد بن ابوبکر بن سعد بن زنگی ہے اور اس سعد بن زنگی کا پوتا ہے جسے مورخ سعدی کا ممدوح گردانتے ہیں۔

گلستاں فارسی کی ان بے نظیر نثری تخلیقات میں شامل ہے جن کا جواب آج تک نہیں لکھا جاسکا اس تصنیف میں سعدی نے کوئی نظامِ اخلاق پیش نہیں کیا بلکہ جستہ جستہ اپنے تجربات اور کوائف کا ذکر کیا ہے۔ یہی کیفیت بوستان کی ہے۔ یہ مثنوی ہے۔ اس میں بھی سعدی نے کوئی منضبط نظامِ اخلاق پیش نہیں کیا البتہ مشرقی اخلاقی اقدار کا ترشح بوستان سے ضرور ہوتا ہے۔

سعدی نے قصیدے بھی لکھے ہیں اور غزلیں بھی جہاں تک غزل نگاری کا تعلق ہے تمام مورخ

اور نقاد متفق الکلمہ ہو کر کہہ رہے ہیں کہ غزل کے تنِ مردہ میں روح سعدی ہی نے پھونکی ہے یہاں تک کہ بعض لوگ ایرانی شاعری کے دبستانوں میں ایک نیا دبستان، اضافہ کرتے ہیں یعنی دبستانِ شیرازی اور کہتے ہیں کہ سعدی، اور حافظ اسی دبستان سے تعلق رکھتے ہیں۔

سعدی کی غزل گوئی کی نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سب سے پہلے محبوبہ کو گوشت پوست کے ایک پیکر کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ سعدی کی محبوبہ نہ تو سنگ بستہ تعقل ہے جو تصوف سے مخصوص ہے نہ وہ زنانِ بازاری میں شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سعدی کی غزل گوئی میں بہت توازن اور اعتدال ہے جنسی واردات کا ذکر ہے لیکن بہت سلیقہ کے ساتھ۔ علاوہ ازیں سعدی کے کلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ سہل ممتنع ہے۔

عباس اقبال لکھتے ہیں کہ آج جو زبان ایران میں رائج ہے اور فصاحت کا معیار تصور کی جاتی ہے وہ گلستان ہی کی زبان ہے اور یہ بڑی بات ہے کہ اتنی مدت گزر جانے کے بعد بھی کوئی ادبی تصنیف اتنی موثر اور فعال رہے۔ سعدی کے ممدوحوں کی فہرست بڑی طویل ہے۔ ان میں ملوک، امراء، وزراء اور منگول سردار سبھی شامل ہیں۔ ایک مرثیہ بھی سعدی نے بے نظیر لکھا ہے۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں یہ مرثیہ مستعصم باللہ آخری عباسی خلیفہ کی ہلاکت کے موقع پر لکھا گیا ہے اور یوں شروع ہوتا ہے:

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

بر زوال ملک مستعصم امیر المومنیں

سعدی کی کلیات اور گلستاں بوستاں کے نہایت مہذب اور خوبصورت نسخے ایران سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان پر مفصل دیباچوں کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔

سعدی کا کلام اور اس کی نثر مدت سے مشرق اور مغرب کے مدرسوں میں داخل نصاب

ہے اور یہی اس کی مقبولیت اور ادبی توانائی کی دلیل قاطع ہے[1]۔

دَیر (عبادت گاہ): دیر صاحبِ فرہنگ رشیدی (منقول از غیاث) کے قول کے مطابق وہ گنبد ہے جو عبادت کے لئے بنایا جائے اور برہان قاطع کا بیان ہے کہ عبادت خانۂ ترسایاں کو کہتے ہیں لیکن اس معنی میں یہ لفظ عربی ہے جیسے کہ کنز میں تصریح کر دی گئی ہے (یہ بھی غیاث سے منقول ہے) صاحبِ منتخب اللغات لکھتے ہیں کہ دیر بالفتح کلیسہ ہائے ترسایاں اور دیرانی صاحبِ دیر کو یعنی پادری کو کہتے ہیں۔ صاحبِ بہارِ عجم کہتے ہیں کہ دیر بالفتح کافروں کی پرستش گاہ کو کہتے ہیں لیکن ایرانی ادیب گنبد کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ اقبال کی اس نظم میں یعنی ابلیس و آدم میں تین لفظ جمع ہیں یعنی مسجد و دیر و کلیسا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال دیر کا کلمہ معبد ترسایاں کے معنی میں استعمال نہیں کر رہے تھے بلکہ جو معانی ان کے ملحوظ خاطر تھے وہ کافروں کی پرستش گاہ ہیں یعنی مسلمانوں اور عیسائیوں کی عبادت گاہوں کے علاوہ کوئی اور عبادت گاہ۔ اب کافر کا لفظ بہت وسیع المعنی ہے۔ اس میں ہندو بھی شامل ہیں اور زرتشت کے پیرو بھی، بدھ مت کے مقلد بھی۔ قیاس چاہتا ہے کہ یہاں مسجد، دیر اور کلیسا تین بڑے بڑے مذہبوں کی علامتیں ہیں یعنی اسلام، برہمنیت اور کلیسائیت[2]۔

---

[1] سعدی نامہ: مرتب عباس اقبال (فارسی)۔ تاریخ ادبیاتِ ایران: شفق۔
تاریخِ مفصل ایران: عباس اقبال از حملۂ چنگیز تا تشکیلِ دولتِ تیموری، ذکر سعدی۔
تاریخِ ادبیاتِ ایران: سلیم نیساری۔ تاریخ ادبیاتِ ایران: براؤن جلد دوم (انگریزی)۔
حیاتِ سعدی: مولانا الطاف حسین حالی۔ شعر العجم: شبلی نعمانی (ذکر سعدی)۔
بی اے کے فارسی نصاب حصۂ نظم موسوم بہ بیاض میں سعدی پر سید عابد علی کا مقالہ۔ سبک شناسی: ملک الشعرا بہار۔

[2] غیاث اللغات۔ منتخب اللغات۔
برہان قاطع۔ بہارِ عجم۔
فرہنگ آنند راج۔ رشیدی۔
ہفت قلزم۔ فرہنگ فارسی انگلیسی: سلیمان حیم (طہران ۱۳۱۲ش)۔

س

سالک: تصوف کی اصطلاح میں وہ شخص ہے کہ اس کا علم عین الیقین کے درجہ تک پہنچ جائے اور کشفِ حقیقت میں وہ علم سے نہیں بلکہ وجدان اور حالات سے کام لے۔ مراد یہ ہے کہ سالک طریقت کی راہ کا رہرو ہے۔[۱]

سر اکبر حیدری: نظام حیدرآباد کے صدر اعظم تھے۔ بہت منتظم اور دور رس سیاستدان تھے لیکن اقبال کی طبیعت کا اندازہ لگانے میں انھیں غلطی ہوئی۔ جو کچھ ہوا اس کا ذکر ارمغانِ حجاز کے صفحہ ۲۷۷ پر موجود ہے۔ یہ جس یوم اقبال کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ پہلا یوم اِقبال ہے۔

سرمایہ داری: سرمایہ داری وہ اقتصادی نظام ہے جس میں دولت کی پیداوار اور اس کی تقسیم انفرادی مساوی پر مبنی ہوتی ہے۔ انیسویں صدی میں اشتراکیوں نے یہ اصطلاح وضع کی۔ انھوں نے یہ دعویٰ کیا کہ سرمایہ داری میں سرمایہ دار دراصل مزدور کا حق الخدمت اپنی جیب میں ڈال لیتا ہے

---

[۱] فرہنگِ مصطلحاتِ صوفیہ: منقول از تاریخ تصوف در ایران۔

یعنی منافع وہ حق الخدمت ہے جو مزدور کو ادا نہیں کیا گیا۔ سرمایہ دارانہ نظام میں بالعموم بڑے بڑے کارخانے، کانیں، دوکانیں، بنک، اخبارات افراد کی ملکیت ہوتے ہیں یا ان گروہوں کی ملکیت ہوتے ہیں جو سرمایہ دار ہوتے ہیں۔

اس نظام میں محرکِ اصلی انفرادی منافع ہے۔ سرمایہ داری میں کوئی منصوبہ بندی نہیں ہوتی۔ بلکہ سرمایہ دار ایک دوسرے کے حریف ہوتے ہیں اور موقع پانے پر ایک دوسرے کو سختی سے کچل دیتے ہیں اس نظام میں مختلف دور آتے ہیں جنھیں اصطلاح میں کساد بازاری، سرد بازاری اور بازار کا گرم ہونا کہا جاتا ہے۔

اشتراکی معترضین کے جواب میں سرمایہ داری کی خوبیوں کے مدعی یہ کہتے ہیں کہ جب تک انفرادی منافع کا محرک قائم نہیں رہے گا بڑے بڑے کارنامے انجام نہیں دیئے جا سکیں گے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ نظام اس طرح منضبط ہے کہ اس کے تمام عناصر میں خود بخود ایک توازن سا پیدا ہو گیا ہے اور تجزیہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ سرمایہ دار کا ذاتی مفاد اجتماعی مفاد سے مربوط ہے۔ علاوہ ازیں اس نظام کے حامی یہ بھی کہتے ہیں کہ انفرادی آزادی اور جمہوری سیاسی ادارے اسی نظام کے تحت پنپ سکتے ہیں۔ اس کے جواب میں اشتراکی یہ کہتے ہیں کہ جو لوگ بیکار رہوں یا بے در اور بے گھر ہوں ان کی سیاسی آزادی کا نام لینا یا ان کی ذہنی یا فکری آزادی کا ذکر کرنا ان تعقلات کا مذاق اڑانا ہے۔

سرمایہ داری کے مخالف یہ کہتے ہیں کہ اس نظام میں بتدریج دولت پیدا کرنے کے تمام ذرائع اور ان کی تقسیم کے تمام وسائل ایک چھوٹے سے گروہ کے تصرف میں چلے جاتے ہیں اور یہ گروہ من مانی کارروائیاں کر سکتا ہے۔

ان دنوں یہ صورت ہے کہ امریکہ میں تو یہ نظام خوب پنپ رہا ہے لیکن یورپ میں عام طور پر

ریاست نے پلان تجویز کرلئے ہیں یعنی منصوبہ بندی ہو چکی ہے۔ ان دنوں امریکہ اور دولت اشتراکیہ روس کے درمیان جو معاملات متنازع فیہ ہیں۔ ان کی اصل اقتصادی نظام کا اختلاف ہے۔ امریکہ منصوبہ بندی سے خائف ہے کہ امریکی ماہرین اقتصادیات کی نظر میں اس سے انفرادی مساعی پر زد پڑتی ہے۔[1]

سیزر (آلِ سیزر): سیزر سے مراد جولیس سیزر ہے جو قدیم روم کا مشہور فرماں روا تھا اطالیہ کے لوگ اس کی عظمت اور اس کے اقتدار کے وارث ہیں۔ علامہ کی نظر میں مسولینی نے اطالیہ کے لوگوں کو یاد دلایا کہ وہ کتنی بڑی میراث کے حامل ہیں۔ یوں علامہ نے اور مقامات پر بھی مسولینی کے ذوقِ عمل کی تعریف کی ہے۔ سیزر کے خواب سے مراد بظاہر وہ نظامِ حکومت ہے جسے قاموس سیاسیاتِ عالم قیصریت کہتا ہے۔ اس طرزِ حکومت میں کوئی رہنما جو عوام میں محبوب ہوتا ہے۔ فوج کی مدد سے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ وہ اس کا مدعی ہوتا ہے کہ اس کا اقتدار عوام کی مرضی پر منحصر ہے اور انھیں کی نمائندگی کا مدعی ہوتا ہے۔ اس نظامِ حکومت میں بظاہر جمہوری ادارے بھی موجود ہوتے ہیں مثلاً مجالسِ قانون ساز، انتخابی حلقے وغیرہ۔ بونا پارٹ کی حکومت بھی قیصریت ہی کی ایک قسم تھی۔ جرمن ماہر السیاست سپنگلر نے یہ کہا ہے کہ قیصریت موجودہ زمانہ کے لئے نہ صرف موزوں ہے بلکہ مقدر ہو چکی ہے اور جمہوریت کی جگہ یہی نظام لے گا۔ اس کا عقیدہ ہے کہ تہذیب و تمدن کے ارتقا کے کسی نہ کسی مرحلہ پر یہ نظام حکومت ضرور وجود میں آتا ہے دوسرے مؤرخ اور علم السیاسیات کے ماہران نظریات کی تردید کرتے ہیں۔[2]

---

[1] قاموس سیاسیات عالم: فیبر اینڈ فیبر (لندن)۔

[2] قاموس سیاسیاتِ عالم: فیبر اینڈ فیبر (لندن)۔ تاریخ فلسفہ: ڈیورانٹ۔

ص

صدائے تیشہ کہ بر سنگ می خورد دگر است   خبر بگیر کہ آوازِ تیشہ و جگر است

(مرزا مظہر جانجاناں)

شمس الدین جانجاناں مظہر تخلص کی ولادت ۱۱۱۱ھ میں ہوئی شروع میں والد سے فیض حاصل کیا پھر بلند رتبہ علما سے استفادہ کیا۔ تصوف اور سلوک کی منازل کے رہرو تھے اور دنیاوی معاملات میں بہت مستغنی المزاج تھے، خوش تقریر بھی بہت تھے۔ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے، اردو میں بھی۔ ۱۱۹۵ھ میں محرم کے مہینہ میں ساتویں تاریخ کو کوئی غیر معلوم شخص آیا۔ بندوق کی گولی ماری اور فرار ہوگیا۔ دسویں محرم کو آپ نے وفات پائی۔ مرزا صاحب کے اردو کلام میں ایک کیفیتِ خاص ہے جو صرف وہاں پیدا ہوتی ہے جہاں خلوصِ تصوف کے تجربات کے ساتھ ملتا ہے۔ دو شعر ان کے بہت مشہور ہیں:

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو   یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار   ہائے بس چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار[1]

---

[1] گلِ رعنا: عبدالحی۔ آبِ حیات: آزاد۔ شعر الہند: عبدالسلام۔ مراۃ الشعراء: محمد یحییٰ تنہاؔ۔

غ

غیبت صغریٰ [1]: اصطلاح میں غیبت کبریٰ امام دوازدھم یعنی حضرت امام مہدی کے غائب ہونے کو کہتے ہیں۔ غیبت صغریٰ اس کے مقابلہ میں کچھ عرصہ کے لئے امام کا لوگوں کی نظر سے غائب ہونا ہے ان دنوں نائب امام موجود ہوتا ہے اور امامت کے فرائض سر انجام دیتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ غیبت صغریٰ کے زمانہ میں اگرچہ امام بظاہر نظروں سے غائب ہوتا ہے لیکن وہ اپنے نائبوں کو برابر اپنی تعلیمات سے مستفید کرتا رہتا ہے۔ غیبت کبریٰ میں انقطاع کامل ہو جاتا ہے۔ اصطلاح میں موت کو غیبت صغریٰ کہتے ہیں [2]۔

---

[1] لغت فارسی انگلیسی: سلیمان حیم ۔ [2] نظام الملک طوسی: عبدالرزاق کانپوری (ذکر اسماعیلیاں)۔

ق

قوالی: قوالی اُردو زبان کے پراسرار کلمات میں شامل ہے اس کا مادہ قول ہے۔ قول ایرانیوں کی اصطلاح میں دوبیتی، چہار بیتی اور ترانہ کو کہتے ہیں۔ رباعی بھی قول ہی ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ابتدا میں جو اشعار اصلاً گانے کے لئے تصنیف کئے جاتے تھے وہ رباعی کے وزن پر ہوتے تھے اور ان کو قول کہتے تھے۔ آہستہ آہستہ رباعی میں اور مضامین بھی داخل ہو گئے لیکن قول کے اصطلاحی معنی بھی باقی رہے یعنی وہ رباعی جو خاص طور پر گانے کے لئے لکھی گئی ہو جب صوفیوں میں سماع کا سلسلہ رائج ہوا اور یہ دعویٰ کیا گیا کہ موسیقی سے وجد کی وہ کیفیت خاص پیدا ہوتی ہے جس کی خاصیت سے انسان معبودِ حقیقی سے جا ملتا ہے تو صوفیوں کی محفلوں میں بھی رباعیات گائی جانے لگیں۔ ان محفلوں میں رباعیاں گانے والا قوال کہلاتا تھا۔ بتدریج قوال اس شخص کو کہنے لگے جو سماع کی محفلوں میں گاتا ہو اور یہ تخصیص باقی نہ رہی کہ رباعی گاتا ہو۔ ہندوستان میں جب قوال کا لفظ پہنچا تو اس کی گائی ہوئی چیزیں یعنی محفل ہائے سماع کے گانے قوالی کہلائے حالانکہ

قول ایک لفظ پہلے موجود تھا لیکن قوال سے قوالی وضع کر لیا گیا۔

امیر خسرو نے گانے کا جو خاص طریقہ اختیار کیا تھا۔ اسے قوالی کہتے ہیں اور اس اعتبار سے یہ موسیقی کی اصطلاح ہے اس معنی میں شرط نہیں کہ قوالی کے مضامین اخلاقی اور عرفانی مطالب پر مشتمل ہوں، گویا قوالی گانے کا ایک طریقہ ہے جو امیر خسرو سے منسوب ہے۔

علامہ قوالی کے اس لئے مخالف تھے کہ ان کے خیال میں انسان کی عملی قوتیں تواجد میں گھل مل کر مٹ جاتی تھیں اور انسان بجائے اس کے کہ اپنے ذوق عمل سے تسخیر کائنات کا کام لے محض سماع کی محفلوں میں سر ہلا کر یا پاکوبی اور دست افشانی کے ذریعہ اپنے ذوق عمل کو ضائع کر دیتا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ قوالی کی پاکوبی، دست افشانی اور تواجد کے بعد انسان پر ایک اضمحلال سا ضرور طاری ہوتا ہے. علامہ کے خیال میں موسیقی کا مقصد یہ نہیں کہ سننے والے وجد میں آجائیں بلکہ یہ ہے کہ اہل سماع موسیقی کی کیفیات سے متاثر ہو کر عملی کام کر سکیں۔ علامہ ذوقِ عمل کو ابھارنا چاہتے ہیں اور قوالی ان کے خیال میں انسان کو مضمحل کرتی ہے۔

یہاں اس بات سے بحث نہیں کہ سماع جائز ہے یا ناجائز۔ فقط علامہ کا نقطۂ نگاہ بیان کرنا ملحوظ ہے۔[1]

---

[1] خیام: سید سلیمان ندوی۔ قابوس نامہ۔ مکاتیب اقبال۔

تکمیل موسیقی اور تفصیل موسیقی: محمد افضل خان۔ معارف النغمات: نواب علی خان۔

[3] نثر ظہوری۔ غیاث اللغات، کلمہ موسیقی۔

ک

کلیسا: کلیسا بکسرِ اول وثانی پرستش گاہِ کافراں، یہ صاحبِ غیاث کا قول ہے۔ صاحبِ فرہنگِ آنندراج اس پر نماز خانۂ ترسایاں کا اضافہ بھی کرتے ہیں اور سلیمان حییم بتصریح لکھتا ہے کہ یہ فقط گرجا کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔ یہی قرینِ صواب بھی معلوم ہوتا ہے اور مصرعہ کی جو صورت ہے اس کے مفہوم سے لگا کھاتا ہے[۵]۔

حوالے: غیاث اللغات۔ فرہنگِ آنندراج۔
فرہنگ فارسی انگلیسی: سلیمان حییم (طہران ۱۳۳۲ش)۔

۴

معزول شہنشاہ (ڈیوک آف ونڈسر): خاندان ونڈسر شہزادی صوفیہ کی اولاد ہے جس کا شجرۂ نسب جیمز اول تک پہنچتا ہے۔ ۱۷۰۱ء میں ایکٹ آف سٹلمنٹ کے ذریعہ برطانیہ کی حکومت قانوناً اس خانوادہ کا حق قرار دی گئی۔ ۱۹۱۷ء میں جارج پنجم نے سیاسی مصلحت کی بنا پر یہ اعلان کیا کہ اس کا دودمان، دودمانِ ونڈسر کہلائے گا۔ جب ۱۹۳۶ء میں جارج پنجم کی وفات ہوئی تو پرنس آف ویلز ایڈورڈ ہشتم کا لقب اختیار کر کے تخت نشین ہوئے۔ تخت نشینی سے پہلے ہی امریکہ کے اخباروں میں مسلسل و متواتر یہ خبریں چھپ رہی تھیں کہ بادشاہ مسز والس وارفیلڈ سمپسن سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ یہ خاتون امریکی نژاد تھی اور طلاق یافتہ بھی تھی۔ برطانیہ کے عوام نے یہ پسند نہ کیا کہ مسند نشین بادشاہ ایک ایسی عورت کو ملکہ کا رتبہ بخشے جس سے کچھ دوسرے مرد انتہائی بے تکلفی سے گفتگو کرنے کے حق دار ہوں۔ کچھ عرصہ یہ جھگڑا چلتا رہا۔ ان دنوں بالڈون انگلستان کے وزیراعظم تھے۔ انہوں نے رائے عامہ کی تائید کی اور ایڈورڈ ہشتم کو یہ سمجھانے کی

کوشش کی کہ مسز سمپسن سے ان کی شادی سلطنت کے مفادِ عمومی کے خلاف ہے۔ بادشاہ کے اقارب نے بھی اس شادی کی مخالفت کی لیکن ایڈورڈ ہشتم شادی پر تلے ہوئے تھے۔ انھوں نے دسمبر ۱۹۳۶ء میں تاج و تخت سے دست برداری کا اعلان کر دیا اور حسب منشا شادی کر لی۔ اس واقعہ کے بعد ان پر یہ پابندی عائد کی گئی کہ وہ انگلستان کی حدود سے باہر مقیم رہیں۔ انھیں ڈیوک آف ونڈسر کا خطاب دیا گیا اور ان کا معقول مشاہرہ بھی مقرر کیا گیا۔ ڈیوک آف ونڈسر کی ولادت ۱۸۹۴ء میں ہوئی تھی اس طرح آج ان کی عمر باسٹھ سال کی ہے ان کی معزولی کے بعد ان کا بھائی جارج ششم کے لقب سے تخت نشیں ہوا[۵]۔

ملا زادہ ضیغم لولابی: ایک فرضی کردار ہے جس کے ذریعہ علامہ نے کشمیر کے متعلق چند گفتنی باتیں کہلوائی ہیں۔

لولاب کشمیر میں ایک وادی ہے۔

ملوکیت: ملوکیت یا (Imperialism) اس حکمت عملی کا نام ہے جس کے مدِ نظر سلطنت کی توسیع ہوتی ہے۔ بالعموم ملوکیت میں یہ ہوتا ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں نوآبادیاں قائم کر دی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ شاہیت کا تسلسل اور تواتر بھی ملوکیت کے تصور میں شامل ہے یہ اصطلاح انگلستان میں ۱۸۹۰ء میں وضع کی گئی تھی۔ آج کل مختلف سیاسی افکار اور تصورات کی ترویج اور فروغ کی بنا پر ملوکیت میں تعزز کا عنصر کم ہو گیا ہے۔ ملوکیت کے حامی یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ وہ دراصل پسماندہ اقوام میں سیاسی شعور پیدا کرتے ہیں لیکن جو لوگ ملوکیت کے تصور کے مخالف ہیں وہ کہتے ہیں کہ ملوکیت کے ذریعہ فقط اقتصادی غارت گری وقوع میں آتی ہے یہاں تک کہ بعض ماہرین اقتصادیات پہلی اور دوسری جنگ عظیم کو حریف ملوکیتوں کی جنگ گردانتے

---

۵ قاموس سیاسیاتِ عالم: فیبر اینڈ فیبر (لندن)۔

کا نام دیتے ہیں۔

موجودہ ملوکیت کے تصور پر سب سے پہلے ہابسن نے اعتراضات کئے تھے جس کی کتاب ملوکیت (مطبوعہ ۱۹۰۲ء) اپنے موضوع پر کلاسیک کا رتبہ رکھتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ملوکیت پسند ہمیشہ جنگ کے خواہاں ہوتے ہیں اور اس لئے دنیا میں ان مقامات پر متصرف ہونا چاہتے ہیں جو حرب و ضرب کی تدابیر میں کام آسکیں۔ ہابسن کہتا ہے کہ ملوکیت اصلاً ایک اقتصادی نظام ہے جو سرمایہ داری پر مبنی ہے، چنانچہ دنیا کے مختلف حصوں میں بڑے بڑے سرمایہ دار اپنے بینک بناتے ہیں اور روپے کے ذریعہ ملکوں کی خارجہ حکمت عملی کو متاثر کرتے ہیں۔ ہابسن کے خیال میں جب تک سرمایہ دارانہ نظام قائم ہے ملوکیت قائم رہے گی۔

دولت اشتراکیہ روس نے ایک نئے اقتصادی نظام کا تصور پیدا کر کے ملوکیت کو ایک ضرب کاری پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ یوں بھی نوآبادیات کے آزاد ہو جانے کی وجہ سے ملوکیت کے تصور کو خاصہ ضعف پہنچا ہے۔[1]

---

[1] قاموس سیاسیات عالم: فیبر اینڈ فیبر (لندن)۔

ن، و

نیرنگ و سیمیا: سیمیا بالکسر۔ صاحبِ غیاث لکھتے ہیں یہ علم طلسمی ہے جس کے ذریعہ رُوح کسی دوسرے جسم میں منتقل کر دی جاتی ہے اور حسبِ خواہش اپنا چولا بدلا جا سکتا ہے علاوہ ازیں اسی علم کے ذریعہ ایسی چیزیں انسانوں کو دکھائی جا سکتی ہیں جن کا حقیقت میں کوئی وجود نہ ہو۔ صاحب منتخب فقط یہ لکھتے ہیں کہ اس علم کے ذریعہ موہوم چیزیں بھی لوگوں کو دکھائی جا سکتی ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشرق میں جس چیز کو کالا علم کہتے ہیں سیمیا بھی اسی کا ایک جزو ہے

غالب نے اپنے ایک مشہور قصیدہ میں بھی کہا ہے۔

صبح کو رازِ مہ و اختر کھُلا　　　　وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود

دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھُلا　　　　ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

نیرنگ بالکسر صاحبِ غیاث لکھتے ہیں کہ مکر و فریب اور طلسم و سحر و افسون کو کہتے ہیں اور مجازاً عجائبات کے معنی میں آتا ہے، وہ بہارِ عجم، جہانگیری اور کشف کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیرنگ و سیمیا ہمارے یہاں بالعموم جادو اور فریب کے معنوں میں مستعمل ہے[۱]

وُلر: کشمیر کی ایک مشہور جھیل ہے۔

---

[۱] غیاث اللغات۔ بہارِ عجم۔ فرہنگ آنند راج۔ لغت فارسی انگلیسی: سلیمان حیم۔

بالِ جبریل

الف

ابوالحسن : قیاس چاہتا ہے کہ مراد شیخ ابوالحسن خرقانی ہوں جو عرفان وتصوف کے رازدار تھے اور بایزید بسطامی کے سلسلے سے منسوب تھے۔

ان کی وفات ۱۰۳۳ء میں ہوئی ہے۔[1]

ابوالعلا معری : عربی کا مشہور شاعر جس کی ولادت ۹۷۳ء اور وفات ۱۰۵۷ء میں ہوئی۔ اپنے زمانے کا بہت بڑا مفکر اور فلسفی تھا اس کے اشعار میں دقیق تلمیحات اور مطالب کی کثرت نظر آتی ہے۔[2]

اسرافیل : یہی وہ فرشتہ ہے کہ صور پھونکے گا تو تمام لوگ ہلاک ہو جائیں گے۔ دوبارہ پھونکے گا تو بہ حکم کردگار جی اٹھیں گے۔ قرآن مجید میں بھی صورِ اسرافیل کا ذکر موجود ہے۔ ادبی روایت میں صور پھونکنا قیامت برپا کرنے کے معنی میں آتا ہے اور دوبارہ زندہ

---

[1] نفحات الانس۔ جامی۔

[2] تاریخ الادب العربی۔ الزیات۔

کرنے کی دلالت بھی ظاہر ہے کہ اس میں شامل ہے[۱]۔

اسماعیل (حضرت): حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے فرزندِ ارجمند جو اطاعت شعاری اور فرماں برداری کے اس مقام بلند تک جا پہنچے تھے کہ آج تک ان کی یاد عید قربان کی شکل میں سال کے سال منائی جاتی ہے۔

وہ راہِ خدا میں قربان ہونے کے لئے تیار تھے اور حضرت ابراہیمؑ ذبح کرنے کے لئے چھری تول رہے تھے کہ وحی نازل ہوئی اور حضرت اسماعیل کی بجائے مینڈھا قربان کرنے کا حکم دیا گیا۔

اقبال کے ہاں، وہ اطاعتِ حق، رضا جوئی اور قربانی کی علامت ہیں۔

غریب و سادہ و رنگین ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسین ابتدا ہے اسماعیل[۲]

اندیشۂ عجم: علامہ کا خیال ہے کہ دین اسلام کے سرچشمے کو عجمی تصورات نے گدلا کر دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تصوف کا وہ منفی پہلو جو خالص عجمی ہے۔ اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ دنیا کو تیاگ دیا جائے اس کے برخلاف اسلام اپنے موکلوں کو تسخیر کائنات کا مشورہ دیتا ہے۔ علاوہ ازیں اندیشۂ عجم میں جو دوئی ہے وہ تصورِ توحید کے برخلاف جاتی ہے۔ عجمی یا آریائی دماغ کا خاصہ ہے کہ حقیقت کو پارہ پارہ کر کے دیکھتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس حقیقت کی ایک مجازی شکل بھی مطلوب ہوتی ہے۔ تاکہ ذوقِ پرستش کی تسکین ہو سکے۔ یہ دوئی یا ثنویت مختلف روپ دھار کر معاشرے کو زہرناک کرتی ہے کہیں خیر اور نظر میں

---

[۱] غیاث۔ منتخب۔ آنند راج۔ سلیمان حیسم (کلمہ صوربھی دیکھئے)۔
[۲] قصص القرآن۔ حفظ الرحمٰن۔

اختلاف کہیں دین اور سیاست میں جدائی، کہیں پیرو اور پیر کے مدارج کہیں گروہ بندی کہیں طبقاتی تقسیم، کہیں وطنیت کا مغربی تصور، یہ تمام چیزیں دوئی ہی کے مختلف روپ ہیں۔ اسی دوئی کی وجہ سے وحدتِ بسیط کا وہ تصور سامنے نہیں آتا جو اسلام نے پیش کیا تھا۔ اللہ کا ایک ہونا آریائی دماغ کے تصور سے بالاتر ہے۔ بڑی ذہنی تربیت کے بعد انسان دوئی کے پھندے سے آزاد ہوتا ہے اور اُس کی سمجھ میں آتا ہے کہ دین اور سیاست میں کوئی جدائی نہیں، خبر اور نظر میں کوئی اختلاف نہیں۔ انسان کا گروہوں میں بٹ جانا سخت مہلک ہے۔ علامہ خود کشمیری پنڈت تھے اور دوئی کے محرم راز۔ اس لئے جہاں وہ وحدت کے دقیق نکات بیان کرتے ہیں وہاں یہ بھی کہتے ہیں

کبھی اے حقیقتِ مُنتظَر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

یہ خالص آریائی تصور ہے کہ حقیقت مجاز کا لباس پہن کر جلوہ گر ہو۔ مسلمانوں نے حقیقت کو ہر لباس، پیرہن اور رنگ سے آزاد دیکھا تھا لیکن عجمیوں نے اپنے افکار کی آمیزش سے وحدت کے تصور کو بھی دھندلا دیا۔ علامہ بار بار عجمی افکار کی زہرناکی کا ذکر کرتے ہیں اور خاص طور پر اُس زندگی کش تصوف کے خلاف احتجاج کرتے ہیں جو انسانی شخصیت کے ارتقا کی بجائے اُس کی کامل ہلاکت کا طالب ہے۔ یعنی وہ سمجھتے ہیں کہ صوفیوں کا مقام فنا بدھ کا نروان ہے حالانکہ مسلمان قائم بالحق ہوتا ہے اور ہمیشہ اعلیٰ تر زندگی کی ہمت آمادہ بہ پرواز رہتا ہے۔ علامہ نے اپنے مکاتیب میں بار بار اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ایک طرح میرا کلام تمام کا تمام عجمی تصوف کے خلاف صدائے احتجاج ہے[1]

---

[1] تاریخ تصوف در اسلام: غنی۔
اقبال نامہ: مکاتیب اقبال۔
قرآن اور تصوف: میر ولی الدین۔
تصوف اسلام: عبدالماجد۔
ذکر تصوف: براؤن۔ تاریخ ادبیات ایران جلد اول۔
اقبال: عزیز احمد۔
نکلسن کا مضمون تصوف پر: مذاہب و اخلاق کا دائرۃ المعارف (انگریزی)
کشف المحجوب: ہجویری۔

انقلاب: (چشمِ فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب)

اٹھارویں صدی عیسوی میں فرانس میں ایک عظیم الشان انقلاب رونما ہوا شہنشاہ لوئی شانزدہم ہلاک کردیا گیا اور جمہوریت کی ایک صورت قائم ہوئی۔ اس انقلاب نے دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا اور سب بادشاہوں کو خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ ان کے عوام بھی اسی طرح بغاوت کرکے انھیں ہلاک نہ کرڈالیں۔

انوری: (متوفی ۵۸۳ھ) اوحدالدین محمد انوری کا مولد قریہ بدنہ ہے جو دشت خاوران کے کنارے پر ولایتِ ابیورد میں واقع ہے یہی وجہ ہے کہ پہلے وہ خاوری تخلص کرتا تھا اس کے بعد انوری تخلص اختیار کیا۔

انوری سلطان سنجر کے مقربانِ خاص میں سے تھا کہ سلاجقۂ بزرگ کے دودمان کا گلِ سرسبد تھا جب ترکانِ غز نے سنجر کی افواج کو شکست دی اور اسے مع بادشاہ بیگم کے قید کرلیا تو انوری نے ایک معرکے کا قصیدہ لکھا جس کا مطلع ہے:

برسمرقند اگر بگذری اے بادِ سحر
نامۂ اہلِ خراسان بہ بر خاقان بر

اس قصیدے میں اس نے نہایت دلپذیر انداز میں ایران کی تباہی کا نقشہ کھینچا ہے مستشرقین اس منظومے کو "اشک ہائے خراسان" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

سنجر کی امارت کے بعد انوری ادھر ادھر پھرتا رہا۔ آخر بلخ میں مقیم ہو گیا۔ سوئے اتفاق دیکھئے کہ کسی نے بلخ کی ہجو کہی اور انوری کے ذمے لگا دی بلخ کے لوگ ایسے چراغ پا ہوئے کہ انوری کو ایک گدھے پر سوار کرا کے اسے ہر طرح ذلیل و خوار کیا۔ اس موقع پر قاضی حمید الدین صاحبِ مقاماتِ حمیدی اس کے آڑے آئے۔ یہ وہی بزرگ ہیں جن کے متعلق انوری خود کہتا ہے

به مدح و ثنا اگر کنم رائے نظمے

نه دشوار گویم نه آسان فرستم

ولیکن به مدح جناب حمیدی

اگر وحی باشد ہراسان فرستم

بلخ کے لوگوں کی تالیفِ قلب کے لئے اور بہ تصریح بیان کرنے کے لئے کہ میں نے ہجو بلخ نہیں لکھی۔ انوری نے ایک اور معرکے کا قصیدہ لکھا جو سوگند نامہ کہلاتا ہے اور جس کا مطلع ہے۔

اے مسلمانان فغاں از دورِ چرخِ چنبری

وز نفاقِ تیر و قصدِ ماہ وکید مشتری

اسی قصیدے میں وہ کہتا ہے۔ (اور جور فلک کی شکایت ہو رہی ہے)

گر بہ خندم (واں پس از عمرے ست) گوید زہر خند

ور بگریم (واں بہر روزے ست) گوید خوں گری

انوری ہی نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ ۵۸۲ھ میں اقترانِ سیارگان کی بنا پر ایک ہولناک طوفان آئے گا۔ لیکن جس دن سے لوگوں کو ڈرایا جا رہا تھا اُس دن زور سے ہوا بھی نہیں چلی۔ (بعض مورخ بیان کرتے ہیں کہ یہ پیشین گوئی کرنے والا انوری نہ تھا)

انوری کو قصیدہ گوئی میں ایسا کمال حاصل ہے کہ اصناف شعر کے تین پیمبروں میں اس کا شمار کیا گیا ہے۔

در شعر سہ تن پیمبران اند — ہر چند کہ لا نبی بعدی

ابیات و قصیدہ و غزل را — فردوسی و انوری و سعدی

وہ عراقی دبستاں کا سب سے جلیل القدر سخن گو ہے۔ اس کے کلام میں علمی اور فنی تلمیحات کی کثرت ہے۔ مطالب دقیق کی بہتات ہے جہاں مدح میں مبالغہ ہے وہاں تشبیب میں فلسفیانہ خیال آرائی بھی ہے۔ فارسی اور عربی الفاظ کی آمیزش سے انوری جیسی گھلی ملی تراکیب وضع کرتا ہے وہ خاص اسی کا حصہ ہے۔

قصائد وغزلیات کے علاوہ اس نے نہایت اچھے قطعات بھی لکھے ہیں جو عرفانی اور اخلاقی مطالب پر مشتمل ہیں [۵]۔

---

[۱] تاریخ ادبیات ایران : سلیم بیناری۔
شعر العجم : شبلی۔
تاریخ ادبیات ایران : رضا زادہ شفق۔
تنقید شعر العجم : حافظ محمود شیرانی۔

ب

بدر و حنین: غزوہ بدر کا قصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا ایک لشکر قریش کے ایک تجارتی قافلے کا سراغ پاکر مدینے سے نکلا۔ اس لشکر کے افراد کی تعداد تین سو تیرہ تھی کمک ملی تو دشمن کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی لیکن مسلمان نہ گھبرائے۔ فتح و نصرت انہی کو حاصل ہوئی۔ صرف بائیس مسلمان شہید ہوئے۔ اس جنگ نے قریش مکہ کی قوت ہمیشہ کے لئے توڑ دی جنین کا قصہ یوں ہے کہ دو قبیلوں یعنی ہوازن اور ثقیف نے مل کے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں پر حملہ کر کے ان کی طاقت قلع قمع کر دیں رسول پاک ۸ھ میں مجاہدین اسلام کا لشکر لے کر حنین پہنچے اس وقت مسلمانوں کی تعداد دس ہزار سے زیادہ تھی۔ اس معرکے میں بھی رسول پاک کو فتح حاصل ہوئی اور بہت سا مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ لگا۔ سورۂ توبہ میں اس معرکے کا ذکر ہے[1]

بسطامی: (بایزید) جیسا کہ پورے نام سے ظاہر ہے بسطام کے رہنے والے تھے۔

---

[1] قصص القرآن: حفظ الرحمن

(متوفی سنہ [illegible])

بیان کیا جاتا ہے کہ امام غزالی نے ان کی تصانیف سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن آج کل ان کی تالیفات نہیں ملتیں۔ ابتدائی دور کے صوفیہ میں ان کا مقام بہت بلند ہے۔ وہ بھی وحدت وجود کے علمبردار ہیں[۱]۔

---

[۱] ثقافت اسلامی کا خاکہ (دو جلدیں)، شوستری (انگریزی)۔
تاریخ تصوف در اسلام: غنی۔ تصوف اسلام: عبدالماجد۔
تاریخ ادبیات ایران: براؤن۔ جلد اول (انگریزی)۔

پ

پازند: زرتشت (ایرانی مفکر) کا صحیفہ جس خاص زبان میں مرقوم ہے اسے اَوِستا کہتے ہیں۔ اس زبان کا نمونہ زرتشت کے صحائف کے سوا اور کہیں نہیں ملتا۔ (ان صحائف کو بھی اَوِستا کہتے ہیں) جب اَوِستا کے متن کی تشریح، پہلوی زبان میں کی جائے تو اسے زند کہتے ہیں۔ جب اسی تشریح کو دوبارہ آسان عبارت میں لکھا جائے تو دو صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر رسم الخط اوستائی استعمال کیا جائے تو اس تفسیر مکرر کو پازند کہیں گے اگر فارسی کلمات استعمال کئے جائیں تو اس تفسیر کو "پارسی" کہتے ہیں۔

(پازند کے متعلق مزید تحقیقات کے لئے دیکھئے سبک شناسی دبہار) اور مزدیسنا (معین)[1]

---

[1] تاریخ ادبیات ایران۔ براؤن۔ جلد اول (ترجمہ انگریزی)

ت

تبریز: ایران کے شمال مغربی حصے کا نہایت آباد اور بارونق شہر ہے۔ خلفائے عباسی کے زمانے میں یہ شہر آذربائیجان کا صدر مقام تھا۔ تاتاریوں کی یورش کے بعد یہ مقام مراغہ کو حاصل ہو گیا۔ اس کے بعد اردبیل کو اہمیت حاصل ہوئی لیکن صفویوں کے زمانے میں پھر یہی شہر آذربائیجان کا مستقر حکومت قرار پایا۔

ابن بطوطہ نے اس شہر کی رونق اور آبادی کی بہت تعریف کی ہے۔ اس شہر نے بہت بڑے بڑے انشا پرداز اور شاعر پیدا کئے ہیں۔ علامہ کو یہ شہر اس لئے عزیز ہے کہ شمس تبریز جو گویا کشف و نظر کی علامت تھے یہیں کے رہنے والے تھے۔[۵]

---

[۵] جغرافیۂ خلافت مشرقی: جمیل الرحمٰن۔

ج

جاوید: علامہ مرحوم کا فرزندِ اصغر یعنی ڈاکٹر جاوید اقبال ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی
سالِ ولادت ۱۹۲۴ء (آخر)[۱]۔

جنید: (متوفی ۹۱۰ء)۔ آپ نہاوند کے رہنے والے تھے۔ فقہ اور منطق سے بھی آگاہ تھے اور مفکر بھی تھے۔ ابتدائی عہد کے صوفیہ میں ان کا مقام بہت بلند ہے۔

آپ بغدادی بھی کہلاتے ہیں اور سید الطائفہ کے لقب سے مشہور ہیں۔ سب سے پہلے انہیں کے مقولات اور ملفوظات میں، وحدتِ وجود کا وہ تصور نمایاں دکھائی دیتا ہے جس کو بعد کے اکابر نے چمکایا[۲]۔

---

[۱] مکاتیب بنام اقبال۔ صفحہ ۱۶۵، منقول از اقبالِ کامل۔ مؤلفہ عبدالسلام ندوی۔

[۲] ثقافت اسلامی کا خاکہ (دو جلدیں) شوسنتری (انگریزی)۔
تاریخِ ادبیاتِ ایران، براؤن۔ جلد اول (انگریزی)۔
تاریخ تصوف در اسلام: غنی (فارسی)۔ تصوف اسلام: عبدالماجد۔

جنیدی و اردشیری: یہ دونوں کلمات علامہ مرحوم کے کلام میں علایم کے طور پر استعمال ہوتے ہیں: (دیکھیے جنید) ۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ہمیشہ سے بڑے بڑے فرماں روا مذہبی رہنماؤں کی تسلیم کرتے رہے ہیں تاکہ دونوں مل کر عوام پر اپنا تسلط جما سکیں مثال کے طور پر فراعنہ مصر اور ایران کے ساسانی فرماں روا ہمیشہ کاہنوں اور موبدوں کی مدد سے حکومت کرتے تھے۔ جب نصرانیوں کو عروج ہوا تو پاپائے روم نے بھی آہستہ آہستہ ہاتھ پاؤں نکالے اور بتدریج ملکی اور سیاسی معاملات میں دخل دینے لگا۔ کچھ عرصہ یورپ کے فرماں رواؤں نے یہ بات برداشت کی آخر دین اور سیاست میں افتراق کا مرحلہ آن لگا اور رفتہ رفتہ یہ صورت پیدا ہو گئی کہ یورپ کے سلاطین یہ دعویٰ کرنے لگے کہ آئینِ مملکت داری کے مطابق مذہبی رہنماؤں کو سیاست میں بالکل دخیل نہیں ہونا چاہیے۔ اس افتراق کا نتیجہ یہ نکلا کہ دوئی یا ثنویت طرح طرح کے روپ دھار کر معاشرے کو زہرناک بنانے لگی۔ اسلام یہ کہتا ہے کہ دین اور سیاست میں کوئی جدائی نہیں بلکہ جو نظام اخلاق اسلام قائم کرنا چاہتا ہے اس کی اساس ہی دین پر ہے، بالفاظ دیگر اسلام سلطنت اور مذہب کو ایک ہی حقیقت کے دو رخ بنا کر پیش کرتا ہے تو جنیدی مذہبی رہنمائی ہے اور اردشیری سیاسی اور ملکی فرماں روائی، اسلام جنیدی اور اردشیری کو جمع کرنا چاہتا ہے۔

اردشیر اس عالی منزلت ساسانی دودمان کا مؤسس تھا جو ۲۲۶ء میں قائم ہوا اور ۶۵۱ء تک بڑے جاہ و جلال اور طمطراق سے حکومت کرتا رہا۔[1]

---

[1] ایران بعہدِ ساسانیان: محمد اقبال۔ انجمن ترقی اردو دہلی۔

اقبال نامہ یعنی مکاتیب اقبال۔ لاہور۔

تاریخ ایران: سر پرسی سائکس، جلد اول (انگریزی)۔

خ

خانقہی سلسلہ: صوفیہ مختلف سلسلوں میں منقسم ہیں۔ ہر سلسلے کی مختلف شاخیں ہیں لیکن ہر شاخ اصلاً ایک سلسلے سے منسوب ہوتی ہے

خانقہی، علامہ کے ہاں ترک دنیا اور ترک عمل کی علامت ہے جو ہندو مت کے تیاگ اور تپسیا کی یاد دلاتی ہے۔

تصوف کا وہ منفی پہلو جس میں دنیا کی تسخیر کی بجائے دنیا کو تیاگ دینے کا مشورہ دیا جاتا ہے خالص عجمی ہے اور اسی کو علامہ "خانقہی" کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

نکل خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری

رسم شبیری، تصوف کے مثبت اور زندگی بخش پہلوؤں کی علامت ہے کہ عمل از... کی جان ہے

خبر و نظر: علامہ کے کلام میں خبر علمی مشاہدے اور سائنسی تجربے کی علامت ہے۔ خبر کے ذریعے حقیقت کا ادراک اور تعقل کیا جاتا ہے۔ نظر کشف و شہود کی علامت ہے۔ بعض اوقات

سینہ فیض ربانی سے اس طرح منور ہوتا ہے کہ حقیقت کا ملاً مکشوف ہوتی ہے۔ اس طریقے پر کشفِ حقیقت کو نظر کہتے ہیں۔ علامہ نے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ انسانی شخصیت مکمل طور پر اپنی استعداد کا اظہار تبھی کر سکتی ہے کہ یہ دونوں قوتیں نمو پائیں یعنی انسان علم منطق اور فلسفے سے بھی کام لے لیکن مذہبی واردات اور کشف والہام کی اہمیت بھی پہچانے۔ اسی حقیقت کو علامہ نے یوں بیان کیا ہے

ہے ذوق تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں

غافل تو نرا صاحب ادراک نہیں ہے

کبھی کبھی علامہ خبر کے لئے علم اور نظر کے لئے عشق اور دل کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ خبر ہی کو وہ عقل بھی کہتے ہیں۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق

عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

عقل اور عشق، خبر اور نظر، علم اور وجدان ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں جہاں خبر پہ زیادہ زور دیا جاتا ہے اور علم کا بول بالا ہوتا ہے وہاں مادہ پرستی اور مادیت کا زور ہوتا ہے۔ جہاں نظر پہ بہت زور دیا جاتا ہے اور روحانیت کو بہت اہمیت بخشی جاتی ہے وہاں تمام مکشوفات رفتہ رفتہ زندگی سے بیگانہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ وجدان کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہئے اور علم کو وجدان کے ذریعے زیادہ یقینی بنانا چاہئے۔

ر

رشی: گاندھی جی کی طرف اشارہ ہے. شودر کے سلسلے میں لکھا جا چکا ہے کہ ہندوؤں میں گروہ بندی اور انسانوں کو طبقات میں بانٹ دینے کی وضع ایسی متعین تھی کہ برہمن اور شودر کے درمیان بعد المشرقین تھا اور تو اور شودر کے لئے یہ بھی ممکن نہ تھا کہ وہ مندروں میں داخل ہوں کہ کہیں دیوتا ان کے آنے سے خفا نہ ہو جائیں. جوں جوں بھارت میں موجودہ زمانے کی تحریکات کے ماتحت اس گروہ بندی کے خلاف نفرت کے جذبات بڑھتے گئے توں توں یہ خدشہ بھی برابر بڑھتا گیا کہ ہندو جاتی اس گروہ بندی کی وجہ سے نقصان بھی اٹھائے گی اور دنیا کی نظروں میں ذلیل بھی ہوگی. شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کے اثرات اتنے گہرے تھے کہ یہ گروہ بندی عملاً ختم ہو چکی تھی لیکن جنوبی ہندوستان کے دور افتادہ علاقوں میں شودر (اچھوت) ابھی تک بے اطمینانی کی زندگی بسر کر رہے تھے. گاندھی جی نے ایک مرحلے پر، جب ہند پاکستان کی سیاست نئی کروٹ لے رہی تھی، یہی مناسب سمجھا کہ اچھوتوں کو مندروں میں داخلے کی اجازت مل جائے

اور ان کے دلوں میں جو بیگانگی ہے وہ دور ہو جائے۔ ان کے مقابلے میں پنڈت مدن موہن مالویہ کہ برہمنی اقتدار و نفوذ کے بہت بڑے حامی تھے۔ اچھوتوں کو کسی قسم کی رعایت دینے کے لیے تیار نہ تھے چنانچہ گاندھی جی نے برت رکھا لیکن پنڈت مالویہ کے دل پر کوئی اثر نہ ہوا آخر کار مہاتما کو اپنے مشن میں ناکامیابی ہوئی اور ان کو اپنا برت توڑنا پڑا۔

یہ پنڈت مدن موہن مالوی وہی بزرگ ہیں جن کے متعلق مولانا ظفر علی خاں نے کہا ہے۔

دیکھ کے حال ملک کا، آگئے یاد مالوی

جاں عنادِ مالوی، روحِ فسادِ مالوی

پوجیہ پادِ مالوی، پوجیہ پادِ مالوی

(میں نے اس سلسلے میں حافظے پر بھروسہ کیا ہے ممکن ہے اشعار کی اصل صورت ذرا مختلف ہو)

یہ کہنا مشکل ہے کہ اس مصرعے میں۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

علامہ کی مراد عصا سے کیا ہے حضرت موسیٰ کے ہاتھ میں تو یہ عصا معجزے کی علامت تھا۔ سانپ بن کر جادوگروں کے سانپوں کو نگل لیتا تھا۔ یہاں غالباً مراد یہ ہے کہ توفیق ایزدی گاندھی جی کے شاملِ حال نہ تھی یا پھر یہ کہ برت رکھنا ایک قسم کا منفی سائل ہے۔ کلیمی تو یہ ہے کہ آدمی سراپا عمل ہو جائے اور فرعونی طاقتوں کا پوری طرح مقابلہ کرے۔ برت رکھنا۔ عدم تعاون، اہنسا وغیرہ ان باتوں میں وہ شانِ عمل نہیں جو مجاہدوں سے مخصوص ہوتی ہے۔

ل قصص القرآن : حفظ الرحمن ۔ تاریخِ کانگرس ۔ ۔

ز

زہرا (جنابِ فاطمہ رضہ): جناب فاطمہ زہرا رسول پاکؐ کی نورِ نظر تھیں علامہ نے ان کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ مسلمانوں کو تین نسبتوں سے عزیز ہیں۔ ایک رسول پاکؐ کی صاحبزادی ہیں۔ دوسرے حضرت علی کی زوجہ محترمہ ہیں تیسرے حسنین کی والدہ ہیں۔ عزیزداری کا یہ مقام اور کس کو حاصل ہوا ہے۔

سلہ میں مدینے میں آپ کا نکاح حضرت علیؓ سے ہوا۔ نکاح کی رسم بڑی سادگی سے ادا کی گئی حضرت علیؓ نے اپنی زرہ بیچ کر عروسی کا سامان کیا اور رسول پاکؐ نے جہیز میں بان کی ایک چارپائی، چمڑے کا ایک گدا، ایک چھاگل، مٹی کے دو گھڑے، ایک مشکیزہ اور دو چکیاں عطا فرمائیں۔ یہی سامان عمر بھر کام آیا۔ دولتِ دنیا کی انھوں نے کبھی ہوس نہ کی، نہ کبھی بیت المال پر اپنا حق جتایا۔

ان کا شرف اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ خاتونِ جنت کہلاتی ہیں اور ان کی گود

ہیں۔ ان دو اماموں نے پرورش پائی جن کے ناموں سے اب تک جبین اسلام روشن ہے۔

آپ نے رسول پاک کی وفات کے چھ مہینے بعد انتیس برس کی عمر میں وفات پائی۔ حضور نے پیش گوئی کی تھی کہ میرے خاندان میں سب سے پہلے تم مجھ سے آ کر ملو گی۔ یہ بات پوری ہوئی۔ سب سے پہلے انہی کا جنازہ پردے کا اہتمام کر کے اٹھایا گیا۔ انہی سے رسول پاک کی نسل چلی، وہی عورتوں کے لئے سیرت کے اعتبار سے نمونہ ہیں اور مریم ثانی کہلاتی ہیں۔[۵]

---

[۵] الزہرا: راشد الخیری۔

جنابِ فاطمہ زہرا: مضمون مشاہیر تصنیف غلام رسول مہر۔

تجاربِ السلف۔ ہندو شاہ مرتبہ عباس اقبال۔

س

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

تازہ ترین تحقیقات یہ ہے کہ کہکشاں دراصل ان گنت ستاروں کا مجموعہ ہے اور نئے ستارے اور سیارے بھی اسی سوادِ عظیم میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہ دعویٰ بھی کیا گیا ہے کروڑوں ستارے ایسے ہیں جو ہمیں نظر نہیں آتے، اُن کے اپنے نظام ہیں۔ ان نظاموں میں سورج بھی ہیں چاند بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ قرآن مجید میں سورجوں کا ذکر کرتا ہے۔ سورجوں کی تعداد بھی کروڑوں تک پہنچتی ہے اور ظاہر ہے کہ ہر سورج ایک نظام کا محور ہے۔ جس نظام کا جزو ہم ہیں وہ بہرحال نہایت حقیر ہے۔ ستارے اتنی دور بھی واقع ہیں کہ اُن کی روشنی ہم تک ہزاروں سالوں میں پہنچتی ہے۔ دراں حالیکہ روشنی لاکھوں میل فی منٹ کی رفتار سے سفر کرتی ہے۔

اب کوشش کی جارہی ہے کہ انسان ایسے سیاروں یا ستاروں تک پہنچ جائے جہاں جاندار اور ذہین مخلوق آباد ہے۔ علامہ ان تمام باتوں کی طرف اشارہ کررہے ہیں[۱]۔

---

[۱] کائنات، جو ہمارے گرد و پیش ہے۔ سرجیمز جینز ۔

سلمان : (۴۴۰ھ تا ۵۱۵ھ) مسعود سعد سلمان لاہوری۔ فارسی زبان کا وہ نغز گو شاعر ہے جس کی حیات کا جواب آج تک کسی سے بن نہ آیا۔ اس کے آبا و اجداد ہمدان کے رہنے والے تھے لیکن اس کی ولادت لاہور میں ہوئی اور وہ اپنے اشعار میں اکثر اپنے وطن کو یاد کرتا ہے۔

سلطان ابراہیم غزنوی نے، اپنے بیٹے سیف الدولہ محمود کو ہندوستان کا امیر بنا کے بھیجا تو مسعود سعد بھی اس کے ہم رکاب آیا۔ سوءِ اتفاق سے باپ بیٹے میں کبیدگی پیدا ہوئی اور اس حد تک بڑھی کہ سیف الدولہ کو اور اس کے ندیموں کو قید کر دیا گیا۔ مسعود سعد کو بھی اس سلسلے میں اسیری کا رنج برداشت کرنا پڑا۔ چنانچہ دس سال تو "دہک" اور "سو" نامی قلعوں میں مقید رہا۔ اس کے بعد تین سال تک قلعہ نائے میں محبوس رکھا گیا۔

جب سلطان ابراہیم نے وفات پائی (اس کی زندگی ہی میں مسعود سعد رہا ہو چکا تھا) تو امیر شیرزاد حاکم ہندوستان نے ابونصر کی سفارش پر مسعود کو لاہور کا حاکم مقرر کر دیا۔ بدقسمتی دیکھیے کہ اب کے ابونصر پر مسعود غزنوی کا عتاب نازل ہوا چنانچہ پھر مسعود سعد کو اسیر کر لیا گیا۔ اب کے اسے قلعہ "مرنج" میں محبوس کیا گیا۔ اور آٹھ سال اس نے مصیبت میں کاٹے۔ یوں گویا اس بدنصیب شاعر نے زندگی کے اٹھارہ سال قید میں گزارے۔ جب مرنج سے رہا ہوا تو بہرام شاہ غزنوی کا دور حکومت تھا۔ اس نے مسعود کی تعظیم و تکریم میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا لیکن وہ بے چارہ اس قدر ضعیف اور شکستہ دل ہو چکا تھا کہ اس کے بعد جلد ہی قیدِ ہستی سے بھی رہائی پا گیا۔ حافظ محمود شیرانی نے اس کے متعلق یہ کہہ کر کہ اس نے تین زبانوں میں دیوان مرتب کئے تھے، ہندی عربی اور فارسی لکھتے ہیں کہ ہندی سے مراد مورخوں کی دراصل اردو ہے۔ اگر ان کا یہ دعویٰ سچ ہے (اور قرینِ صواب ہی معلوم ہوتا ہے) تو مسعود سعد، اردو کے قدیم ترین شعرا کی صف میں شامل ہو جائے گا۔

صاحبِ چہار مقالہ نے اس کے کلام کی بہت تعریف کی ہے۔ آج کل کے نقاد اور مورخ بھی بہ اتفاق رائے اس کے کلام کی عذوبت اور سلاست کے مداح ہیں۔[1]

سلیم: سلطان سلیم عثمانی جس کا نام تاریخ میں بہادری کے لئے ضرب المثل ہے۔ ۱۶ اپریل ۱۵۱۲ء کو تخت نشین ہوا اور ۲۱ ستمبر ۱۵۲۰ء کے دن فوت ہوا۔[2]

حکیم سنائی (غزنوی) متوفی ۵۴۵ھ ابوالمجد مجدود بن آدم سنائی جوانی ہی میں غزنوی سلطانوں کے دربار سے منسلک ہو گئے تھے چنانچہ انھوں نے بہرام شاہ غزنوی کی تعریف میں بہت قصیدے لکھے ہیں، یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ سنائی کی زندگی میں انقلاب کب آیا۔ شبلی نعمانی نے ایک افسانہ بہت چمکا کے لکھا ہے لیکن اس کی تاریخی حیثیت مشکوک ہے بہرحال اس میں شک نہیں کہ زندگی کے ایک خاص مرحلے پر سنائی کی طبیعت میں ویسا ہی انقلاب آیا جیسا غزالی کی طبیعت میں آیا تھا۔ تصوف کے دائرے میں داخل ہو گئے۔ درباداری ترک کر دی اور صرف عرفانی اور اخلاقی مطالب پر مشتمل شعر کہنے لگے۔

سنائی کی تصانیف میں مثنوی "حدیقہ" بہت مشہور رہی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ فارسی زبان میں پہلی مثنوی ہے جو تصوف کے اہم مطالب کو محیط ہے۔

سنائی کے دیوان میں غزلیں بھی ہیں۔ قصیدے بھی ہیں اس کا اسلوب فرخی سے ملتا جلتا ہے۔ اُسے مسعود سعد سلمان سے بہت عقیدت تھی۔ چنانچہ اُس کا دیوان بھی سنائی ہی نے جمع کیا سنائی نے اپنے کلام میں تصوف اور عرفان کے دقیق ترین مطالب قلمبند کئے ہیں۔ علاوہ ازیں وحدت وجود کے مضامین سب سے پہلے دلپذیر صورت میں سنائی کے ہاں ہی ملتے ہیں۔

---

[1] پنجاب میں اُردو: حافظ محمود شیرانی۔ تاریخ ادبیات ایران: خلیق۔ (رضا زادہ)۔

تاریخ ادبیات ایران: سلیم نیساری۔ تاریخ ادبیات ایران: (انگریزی)، براؤن (جلد اول)۔

[2] طبقات سلاطین اسلام: عباس اقبال۔

مولانا روم نے اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے سنائی اور عطار کے کلام سے فیض اٹھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

عطار روح بود و سنائی دو چشم او

ما از پس سنائی و عطار آمدیم[۵]

سنجر: (دیکھیے سلجوق) سلاجقہ بزرگ کے عالی منزلت دودمان کا آخری فرماں روا ہے۔ ۴۹۰ھ سے ۵۱۱ھ تک وہ خراسان اور ماوراء النہر کا امیر کہلاتا تھا۔ لیکن اس کے بعد وہ سلطان کہلانے لگا۔ اس کے عہد حکومت کے بہت سے واقعات سیاسی اعتبار سے اہم ہیں اس کے زمانے میں قراختائی اور خوارزم شاہی دودمان وجود میں آئے۔ یہ خوارزم شاہی سلسلہ وہی ہے جس کا آخری بادشاہ سلطان محمد چنگیز کے حملے کا موجب بنا۔

خوارزم شاہیوں سے سنجر کم وبیش دائماً برسرپیکار رہا۔ ان کی یہ خواہش تھی کہ خود مختار کہلائیں اور سنجر یہ چاہتا تھا کہ اس کی سیادت تسلیم کی جائے۔ خوارزم شاہیوں سے تو خیر سنجر کی لڑائیاں ملک کے لئے اتنی منحوس نہیں ثابت ہوئیں لیکن اس کی ایک غلطی کی وجہ سے تو ایران میں ایسی تباہی پھیلی کہ اس کی نظیر صرف منگولوں کے حملے ہی میں مل سکتی ہے۔ یہ ترکانِ غز کا حملہ ہے۔ ترکانِ غز سلطان سنجر کے ماتحت تھے معمولی سی بات پر لڑائی ٹھن گئی اور سنجر نے غلطی یہ کی کہ خود فوج لے کر مقابلے پر آیا۔ یہ ۵۴۸ھ کا واقعہ ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سلطان اپنی بیگم کے ساتھ قید کر لیا گیا۔ تین سال کے قریب اسیر رہا۔ آخر ۵۵۲ھ میں وفات پائی اس کے مرتے ہی سلاجقۂ بزرگ کی میراث گویا ہاتھوں ہاتھ بٹ گئی۔

---

[۵] تاریخِ ادبیاتِ ایران: سلیم نیساری۔ تاریخِ ادبیاتِ ایران: رضا زادہ شفق۔

تاریخِ ادبیاتِ ایران: براؤن۔ جلد دوم (انگریزی)۔ شعر العجم: شبلی نعمانی۔

تمام مورخ بہ اتفاق آرا لکھ رہے ہیں کہ سنجر ایران کے بہترین، بزرگ ترین بادشاہوں میں شمار کیا جانا چاہیے۔ وہ شجاع، کریم، رعیت نواز اور ہنر پرور تھا۔ بہت سے فضلا، شعرا اور علما، اس کے دربار سے منسلک تھے۔ عباس اقبال لکھتے ہیں کہ جتنے قصیدے اس کی تعریف میں کہے گئے ہیں کسی کی تعریف میں نہیں کہے گئے۔ مورخوں کا بیان ہے کہ اس کے دربار سے ایک شاعرہ بھی منسلک تھی جس کا نام (یا تخلص) مہستی تھا۔ اس کی ایک رباعی بہت مشہور ہے:

شاہا فلکت اسپ سعادت زیں کرد   وز جملہ خسرواں ترا تحسیں کرد
تا در حرکت کمند زریں نعلت   بر گل نہند پائے زمیں سیمیں کرد

(برف باری کا موقع ہے)

جن شعرا کا تعلق سنجر کے دربار سے رہا ہے ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ ان میں مشہور ترین شعراء و ادبا یہ ہیں:

امیر معزی۔ ادیب صابر۔ انوری (جس کا یہ شعر سنجر کی تعریف میں ضرب المثل ہو چکا ہے):

در جہانی و از جہاں بیشی   ہم چوں معنی کہ در بیاں باشد)

خاقانی بھی سنجر کے دربار میں پہنچنے کا آرزومند تھا لیکن فتنۂ غز نے یہ آرزو پوری نہ ہونے دی۔[۵]

---

[۵] تذکرۃ الشعراء: دولت شاہ۔   تاریخ مفصل ایران: عباس اقبال۔
تاریخ ادبیات ایران: شفق۔   تاریخ ادبیات ایران: یسارری۔
تاریخ ایران: سائکس (انگریزی)۔   تاریخ ادبیات ایران: (براؤن: جلد دوم (انگریزی)۔
تاریخ عالم اسلام: براکلمین (انگریزی)۔

ش

شورش (اصلاحِ دین):

دیکھ چکا المنی شورشِ اصلاح دین)

سولھویں صدی عیسوی تک پاپائے روم کا اقتدار برابر بڑھتا گیا۔ صرف یہی نہیں کہ پوپ، اپنے نائبوں اور پادریوں کے ذریعے عوام کے قلوب پر حکمرانی کرتا تھا بلکہ اس کے احکام کی تعمیل فرماں رواؤں اور سلطانوں کو بھی کرنا پڑتی تھی۔ پوپ نے آہستہ آہستہ کلیسا کو ایک ایسا خود مختار، مقتدر، بانفوذ اور خوفناک ادارہ بنا دیا تھا کہ عوام و خواص سبھی اس ادارے سے ڈرتے تھے۔

پاپائیت میں ایک بنیادی نقص یہ تھا کہ انفرادی سوچ بچار یا تفکر و تعقل کی گنجائش کم رہ گئی تھی۔ علم صرف اربابِ کلیسا کی میراث تھا۔ وہی عالمانِ دین تھے اور وہی ہادیانِ دنیا۔ ان کے بغیر کوئی کام سرانجام نہ دیا جا سکتا تھا۔ پوپ کے نائب یا پادری، اسقف، کارڈینل

لوگوں کی نجات کا پروانہ جاری کرتے تھے کہ آتش دوزخ ان پر حرام ہو جاتی تھی۔ اگر کسی پر عتاب نازل ہوتا تھا تو اس کی یہ شکل ہوتی تھی کہ پھر کوئی شخص معتوب کی کسی طرح مدد نہ کر سکتا تھا۔

سولھویں صدی میں، ایک جرمن مفکر اور عالم لوتھر نے اس مسلک کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ گویا پاپائیت کے اقتدار کے خلاف احتجاج کیا اور دعویٰ کیا کہ انسان اپنی ضمیر کی آواز سن کر حضرت عیسیٰ پر ایمان کامل لا کر راہِ نجات پر گامزن ہو سکتا ہے۔ اس کے احتجاج کی بنا پر اس کے مقلد احتجاجی یا پروٹسٹنٹ کہلانے لگے۔ آج اس مسلک کے پیرو زیادہ ہیں اور رومن کیتھولک، جو پاپائے روم کو محورِ عقیدت گردانتے تھے کم ہیں[۵]۔

شعیبؑ (حضرت): قرآن مجید میں حضرت شعیب اور ان کی قوم کا تذکرہ سورۂ اعراف اور ہود میں نسبتاً تفصیل سے کیا گیا ہے۔

آپ مدین یا مدیان میں مبعوث ہوئے تھے۔ مدین ایک قبیلے کا نام ہے جو علامہ عبدالوہاب نجار کے قول کے مطابق حجاز میں آباد تھا۔ بعض مورخ لکھتے ہیں کہ شام کے متصل عمان کے قریب آباد تھا۔ حفظ الرحمٰن صاحب کی تحقیقات یہ ہے کہ یہ قبیلہ بحرِ قلزم کے مشرقی کنارے اور عرب کے شمال مغرب میں ایسی جگہ آباد تھا جسے شام کے متصل حجاز کا آخری حصہ کہا جا سکتا ہے۔

حضرت شعیب کی قوم بہت بداعمال تھی۔ آپ نے تبلیغ حق کا کام شروع کیا تو لوگوں نے ان کی باتوں کو درخورِ اعتنا ہی نہ گردانا۔ آخر اس قوم پر عذابِ الٰہی نازل ہوا۔ ایک خوفناک زلزلہ آیا اور یہ بداعمال قوم برباد ہو گئی[۶]۔

---

[۵] لغت فلسفہ: رونز، نیویارک (انگریزی)۔

[۶] قصص القرآن: حفظ الرحمان۔

ص

صفاہاں (اصفہان): ایران کا مشہور شہر جسے "نصف جہاں" کہتے ہیں۔ صوبہ جبال کے جنوب مشرقی گوشے تک اور ایران کے صحرائے اعظم کے سرحد کے قریب یہ شہر واقع ہے۔ پرانے وقتوں سے یہ شہر اپنی زرخیزی کی وجہ سے مشہور رہا ہے۔ زمانہ وسطیٰ میں شہر کے آباد حصے دریا کے کنارے واقع تھے (زایندہ دریا) یہاں پہلو بہ پہلو دو شہر آباد تھے اور دونوں بڑے آباد اور پُر رونق تھے۔ مقدسی نے لکھا ہے کہ اس شہر کے ریشمی پارچے خاص طور پر عنابی زعفران اور طرح طرح کے پھل بہت مشہور تھے اور دساور کو بھیجے جاتے تھے۔

صفویوں کے زمانے میں یہ شہر ایران کا دارالسلطنت ہو گیا۔ اب تک یہ شہر بہت بارونق اور آباد ہے۔[1]

---

[1] جغرافیہ خلافت مشرقی: جمیل الرحمان۔

ط

طاہا: قرآن مجید کی بیسویں سورۃ کی ابتدائی کلمے کی طرف اشارہ ہے۔ اس کلمے کے معنٰی کی بھی تحقیق نہیں ہو سکی۔

طغرل: (دیکھئے سلجوق) طغرل نے ۴۲۹ھ میں جلوس کیا اور فوراً تسخیر ممالک کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پہلے طبرستان اور گرگان کو مسخر کیا۔ پھر اصفہان کا محاصرہ کیا۔ لیکن ابو منصور (حاکم اصفہان) نے ایسی سخت مقاومت کی کہ طغرل اس پر مجبور ہو گیا کہ اس کے نام کا خطبہ پڑھا جائے اور کچھ مال و جنس خراج کے طور پر ادا کیا جائے۔ آخر ۴۴۳ھ میں اس نے اس شہر کو بھی کاملاً مسخر کر لیا۔ بہت طمطراق سے حکومت کرنے کے بعد اس نے ۴۵۵ھ میں وفات پائی۔[1، 2]

---

[1] تاریخِ مفصل ایران، عباس اقبال۔ [2] تاریخِ عالمِ اسلام: براکلمین۔ (انگریزی)۔

ع

عبدالرحمٰن : (دیکھئے اندلس)

غ

غزنی: افغانستان کا مشہور شہر ہے سلطان محمود کے زمانے میں اپنے عروج پر تھا لیکن جب غوریوں سے غزنویوں کی ٹھن گئی تو علاؤالدین غوری نے اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور جلاکر راکھ کر دیا۔ اس بنا پر یہ علاءالدین جہاں سوز کہلاتا ہے۔ معزالدین سام یا شہاب الدین غوری اسی جہاں سوز کے دودمان سے تعلق رکھتا ہے۔[1]

غوری: مراد ہے شہاب الدین غوری۔

غزنی اور ہرات کے درمیان، دشوار گذار اور سنگلاخ کوہستانی سلسلوں میں ایک علاقہ واقع ہے جسے غور یا غورستان کہتے ہیں۔ جب محمود غزنوی کا ستارۂ اقبال اُبھرا تو اس نے اس علاقے کے سرداروں کو اپنی فوج میں لے لیا۔ جوں جوں غزنوی کمزور ہوتے گئے۔ یہی غوری سردار ان کی مقبوضات پر قابض ہوتے چلے گئے۔ انھیں غوری سرداروں میں علاؤالدین

---

[1] جغرافیہ خلافتِ مشرقی: جمیل الرحمٰن۔

بھی شامل تھا جس نے غزنی کے آباد شہر کو جلا کر راکھ کر دیا اور خود اس بنا پر جہاں سوز کہلایا،
معزالدین سام یا شہاب الدین محمد غوری اسی خاندان کا ایک نامور فرد تھا۔ اس نے لاہور تک کے علاقے مسخر کرنے کے بعد اجمیر کا رُخ کیا جہاں پرتھوی راج عرف رائے پتھورا حکمراں تھا۔ پہلے اسے راجپوتوں کے مقابلے میں شکست ہوئی لیکن آخر ترائن کی دوسری لڑائی کے بعد راجپوتوں کا زور بالکل ٹوٹ گیا۔ رائے پتھورا (پرتھوی راج) گرفتار ہو کر مارا گیا۔ غوری ملحقہ علاقوں کو مسخر کرنے کے بعد، ایبک کو اپنا نائب بنا کر، لوٹ گیا۔ اس طرف خوارزم شاہیوں کا ستارۂ اقبال طلوع ہو چکا تھا۔ اب غوریوں کو ان کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ایک لڑائی کانٹے کی تول ہوئی اور مشہور ہو گیا کہ غوری شہید ہو گیا۔ اس کی شہادت کی خبر سن کر پنجاب اور ملحقہ علاقوں میں شورش رونما ہو گئی۔ غوری پنجاب آیا، باغیوں کی سرکوبی کی (کھوکھر زیادہ بدمست ہو گئے تھے)، اور واپس جا رہا تھا کہ جہلم کے آس پاس کہیں ایک شاداب سا مقام دیکھ کر خیمہ زن ہوا۔ سنہ ۶۰۲ھ تھا۔ شعبان کے مہینے کی تیسری تاریخ تھی کہ چند آدمی بہ جبر و قہر خیمے میں داخل ہو گئے۔ سلطان نماز میں مشغول تھا جب تک سلطان کو خبر ہو، ان نابکاروں نے سلطان کا کام تمام کر دیا۔ اس مسئلے پر شدید اختلاف رائے ہے کہ قاتل کون لوگ تھے۔ بعض مورخ کہتے ہیں کہ یہ لوگ حسن بن صباح کے پیرو چھری بند فدائی تھے۔ کچھ لوگوں نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ قاتل کھوکھر تھے۔

بہر حال غوری نے برصغیر ہند و پاکستان میں صحیح معنی میں اسلامی سلطنت اور ثقافت کی بنیاد رکھی اور راجپوتوں کی عظمت کے کھنڈروں پر مسلمانوں کی سلطنت کی بنائے جلیل تعمیر کر دی۔[۵]

---

[۵] فرشتہ۔ طبقات ناصری۔ تاریخ ہندوستان (مور لینڈ) (انگریزی)۔

ف

فردوسی: (ولادت ۳۲۳ھ اور ۳۳۰ھ کے درمیان، وفات ۴۱۱ھ یا ۴۱۶ھ)

مسلّم ہے کہ فردوسی کی کنیت ابوالقاسم تھی۔ یہ طے ہے کہ وہ قریباً ۳۵-۳۶ سال تک اطمینان سے طوس میں بیٹھا رہا۔ پھر اپنی بیوی کی فرمائش پر جو ساسانی خاندان سے تعلق رکھتی تھی، شاہنامے کے لئے مواد جمع کرنا شروع کیا۔ گاؤں گاؤں پھرا، موبدوں سے ملا۔ مسالک زرتشت کے رازداروں سے ملاقات کی، پہلوی، شاہنامہ حاصل کیا اور آخر دقیقی کے اشعار سامنے رکھ کر شاہنامے کی داغ بیل ڈال دی۔ شاہنامے کی تالیف کا آغاز ۳۶۵ھ میں ہوتا ہے یا ۳۷۰ھ میں۔ اگر حافظ محمود شیرانی کا یہ دعوئ تسلیم کرلیا جائے کہ جب فردوسی کی بیوی نے اسے بیژن کی داستان سنائی تو شاہنامے کی داغ بیل ڈالی گئی ہے تو آغاز تالیف ۳۶۵ھ میں ہوتا ہے بصورت دیگر ۳۷۰ھ میں۔

فردوسی طوس ہی میں بیٹھا شاہنامہ لکھتا رہا اور طوس کے عامل اس کی مدد کرتے رہے۔

کچھ اور دوستوں کے نام بھی فردوسی نے گنوائے ہیں۔ مثلاً حیی قتیب۔ جب فردوسی کا لڑکا جوانی میں اُسے داغ مفارقت دے گیا تو اب یہ مسئلہ فردوسی کے سامنے آیا کہ لڑکی کا جہیز کیسے تیار ہوگا۔

شاہنامے کا مسودہ اُٹھا کے محمود غزنوی کے دربار میں پہنچا اور دہاں وعدہ ہوا کہ فردوسی کو انعام شائستہ دیا جائے گا۔ فردوسی نے شاہنامے کا نامکمل نسخہ محمود سے منسوب کر دیا۔ اس کی مدح لکھی اور پھر شاہنامے کی تکمیل کی۔ تکمیل کے بعد کیا ہوا یہ بہت اُلجھا ہوا مسئلہ ہے۔ خود فردوسی صرف یہ کہتا ہے کہ حاسدوں نے مجھے انعام سے محروم رکھا لیکن اس بات کی شہادت بھی ملتی ہے کہ ابوسہل روزنی نے محمود کو ورغلایا کہ مجوسیوں کی تعریف پر انعام دینا آپ کے شایانِ شان نہیں۔ فردوسی کو جو کچھ عطا کیا گیا، وہ اس نے بعض مورخوں کے قول کے مطابق وہیں ملازموں میں تقسیم کر دیا اور خود دربدر پھرنے کے بعد آخر طوس لوٹا۔ اس دوران میں محمود کو خیال آیا کہ فردوسی پر ظلم ہوا ہے۔ حکم دیا کہ ساٹھ ہزار کا نیل فردوسی کے لئے بھیجا جائے (بعض مورخ نقد بھی کہتے ہیں)۔ بہرحال جب قاصد انعام لے کر پہنچے تو فردوسی کا جنازہ دروازہ شہر سے باہر جا رہا تھا۔ فردوسی کی لڑکی نے انعام لینے سے انکار کر دیا۔ اس مرحلے پر بھی روایات مختلف ہیں۔ بعض مورخ کہتے ہیں کہ فردوسی کے نام پر طوس میں ایک کارواں سرا تعمیر کی گئی۔ بعض لکھتے ہیں کہ انعام کی رقم یا جنس واپس کی گئی۔

یہ تو مسلم ہے کہ فردوسی نے شاہنامہ محمود کی فرمائش پر نہیں لکھا تھا۔ متنازعہ فیہ امر یہ ہے کہ آیا فردوسی نے محمود کی ہجو بھی کی تھی کہ نہیں۔ حافظ محمود شیرانی مدعی ہیں کہ نہ فردوسی کو ہجو کرنے کا حق پہنچتا تھا نہ اُس نے ہجو کی۔ پہلی دلیل قاطع نہیں ہے۔ آدمی ہجو کرنے کے حق کے بغیر بھی ہجو کرتے ہیں دوسرا دعویٰ البتہ دعوتِ فکر دیتا ہے۔ حافظ صاحب مدعی ہیں کہ جو ہجو فردوسی سے منسوب ہے وہ اُن اشعار پر مشتمل ہے جو شاہنامے کے مختلف حصوں سے علیحدہ کر لئے گئے ہیں اور پھر اس طرح ترتیب دے گئے ہیں کہ ہجو کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے خلاف صاحب چہار مقالہ تصریح

کہتے ہیں کہ فردوسی رفض کے الزام میں محمود نے دربار سے محروم کیا اور وہ ہجو کے اشعار بھی نقل کرتے ہیں۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ محمود نے فردوسی سے کوئی وعدہ کیا ہو یا نہ کیا ہو اس نے شاہنامے کی عظمت پہچاننے سے انکار کر دیا یہی بات ہے جس کی بنا پر جامی ایسا غیر جانبدار شاعر بھی کہتا ہے۔

گزشت شوکتِ محمود در زمانہ نہ ماند
جز ایں فسانہ کہ نشناخت قدرِ فردوسی

شاہنامے کی عظمت کا یہ عالم ہے کہ دنیا کی ان کتابوں میں شمار ہوتا ہے جنہیں کلاسیک کہتے ہیں ہیں۔ ایرانی تمدن و ثقافت کی ایسی مفصل داستان شاید ہی کوئی بیان کر سکے۔ پھر یہ نہیں کہ فردوسی نے محض واقعات بیان کئے ہیں اس کا اسلوب بالکل شاعرانہ ہے اور شاہنامے کے بہت سے اشعار سخت ترین معیار پر بھی پورے اترتے ہیں۔

نظامی نے بھی فردوسی کی پیروی کرتے ہوئے شاہنامے کی طرز پر سکندر نامہ لکھا ہے مگر حق یہ ہے کہ فردوسی کا مقام نظامی سے کہیں زیادہ بلند ہے[۱]۔

فرعون: مصر کے بادشاہوں کا عام لقب ہے، ان کی عظمت اور جاہ و جلال کا یہ عالم تھا کہ خدائی کا دعویٰ کرتے تھے اور پوجے جاتے تھے۔ اب فرعون مغرور، سرکش اور مخالفِ حق انسان کے لئے علامت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

---

[۱] تاریخ ادبیات ایران: رضا زادہ شفق۔ تاریخ ادبیات ایران: سلیم فیساری۔
فردوسی پر چار مقالے: حافظ محمود شیرانی۔ تنقید شعر العجم: حافظ محمود شیرانی۔ چہار مقالہ نظامی عروضی سمرقندی
مجلہ مہر: فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر شائع ہونے والا شمارہ۔
تاریخ ادبیات ایران: براؤن (جلد اول و دوم)۔ تذکرۃ الشعراء: دولت شاہ سمرقندی۔

واضح رہے کہ جس فرعون نے حضرت موسیٰ سے خواہ مخواہ لڑائی مول لی تھی اُس کا نام رعمیس ثانی تھا۔ اس کلمے میں رع ایک دیوتا کا نام ہے اور آخر میں آمیس ایک دیوی کا۔ رع یا راسورج دیوتا کو بھی کہتے ہیں اور مصریوں کے علم الاصنام کے مطابق ہر رات اس دیوتا کو ظلمت کی دیوی کھا جاتی ہے لیکن ہر صبح دیوی آمیس کی مہربانی سے وہ پھر نمودار ہوتا ہے۔

قرآن مجید نے فرعون کے متعلق جو کہا تھا وہ پورا ہو کے رہا۔ چنانچہ اُس کی لاش حنوط شدہ ابھی تک عجائب گھر میں موجود ہے اور اہل نظر کے لئے سرمایۂ عبرت[1]۔

فرقان: قرآن مجید کی آیت کی طرف اشارہ ہے، حوالہ یہ ہے ۳/۴

"حق و باطل میں تمیز دینے والی چیز کو نازل کیا۔"

فرقان کے لغوی معنی ہیں وہ چیز جو فرق کرے یعنی حق اور باطل کے درمیان حد امتیاز قائم کرے[2]۔

---

[1] ترجمان القرآن: مولانا ابوالکلام آزاد۔ قصص القرآن: حفظ الرحمان۔
تمدن عتیق: ابو ظفر۔ قدیم تہذیبیں: عبدالمجید سالک۔
[2] قدیمہ انجمن ترقی اُردو۔
[3] غیاث۔ منتخب۔ فرہنگ آنندراج۔

ق

قاآنی: (۱۲۲۲ھ – ۱۲۷۰ھ) مرزا حبیب متخلص بہ قاآنی، شیراز کے رہنے والے تھے۔ پہلے حبیب تخلص کرتے تھے۔ حسن علی مرزا شجاع السلطنت کے بیٹے قاآن کی ملازمت میں داخل ہوئے تو قاآنی تخلص کر لیا۔ رفتہ رفتہ قاچاریوں کے دربار میں پہنچ گئے۔ قاآنی کی کلیات بیشتر مدحیہ قصائد پر مشتمل ہے غزلیں بھی ہیں مگر اچھی غزلیں گنتی کی ہیں۔[1]

---

[1] تاریخ ادبیات ایران: شفق۔ تاریخ ادبیات ایران: سلیم نیساری۔

ک

کابل: دریائے ہلمند اور دریائے قندھار کے پہاڑی علاقے کو زابلستان کہتے ہیں اس کے مقابل کابلستان جو بامیان کی سرحد پر واقع تھا. مقدسی نے لکھا ہے کہ کابل دراصل سجستان یا سیستان ہی کا جزو ہے یہی وجہ ہے کہ لوگ رستم کو کابلی بھی تصور کرتے ہیں. کبھی یہ شہر بڑا بارونق اور آباد تھا. آثار قدیمہ بہت ملتے ہیں[1].

کشاف (صاحبِ کشاف): یہ مشہور تصنیف ہے مؤلف زمخشری ہیں جن کی تاریخ ولادت ۴۶۷ھ اور تاریخ وفات ۵۳۸ھ ہے بعض مورخوں کی شہادت کی بنا پر انھیں جاراللہ بھی کہا جاتا ہے. یہ اپنے عقائد میں معتزلہ ہیں. ان کی عمر کا بہت سا حصہ مکہ میں گذرا ہے. ابن خلکان نے کہا ہے کہ یہ اپنے وقت کے امام تھے. ان کی تفسیر ادبی خوبیوں سے مملو ہے[2].

---

[1] جغرافیہ خلافت مشرقی: جمیل الرحمان -

[2] ثقافت اسلامی کا خاکہ: شوشتری (انگریزی) - تاریخ ادبیات ایران: براؤن، جلد اول (انگریزی) -

میراث اسلام (انگریزی) - میراث ایران (انگریزی) -

کوفہ: قدیم سیاح لکھتے ہیں دریائے فرات کے مغربی کنارے پر کشتیوں کے پل کے مقابل آباد تھا اور حضرت عمرؓ کے عہد مبارک میں بسایا گیا تھا۔ اس شہر کی تعمیر کا مقصد یہ تھا کہ فرات کے غربی یا ریگستانی کنارے پر ایک مستقل چھاؤنی کا کام دے۔ ۳۶ھ میں حضرت علی نے اسے اپنا دار الحکومت قرار دیا۔ ان کے زمانۂ خلافت میں یہ شہر گویا سیاست اور تمدن کا محور تھا۔ اس شہر کی جامع مسجد میں حضرت علی شہید ہوئے تھے۔ مستوفی لکھتا ہے کہ عراق میں سب سے اچھا گنا یہیں پیدا ہوتا ہے یہیں روایات کے مطابق وہ تنور بھی محفوظ تھا جہاں سے طوفان نوح کے وقت پہلے پانی اُبلنا شروع ہوا تھا۔

اتفاق کی بات ہے کہ کوفے کے رہنے والے غداری اور فریب کاری کے لئے ضرب المثل ہو گئے ہیں۔ غالباً یہ روایت اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب یہاں کے لوگوں نے امام حسینؓ کو دعوت دی اور کہا کہ ہم یزید کے خلاف آپ کے ساتھ جنگ آزما ہوں گے۔ اس کے بعد جب یزید نے، اپنے ذی اقتدار حاکم یہاں بھیجے تو کوفی حضرت امام حسین سے غداری پر آمادہ ہو گئے اور جنگ کربلا میں حضرت کے خلاف نبرد آزما بھی ہوئے۔ کوفیوں کی غداری اور فریب کاری ایسی بدنام ہے کہ اکثر ادبی روایت میں شعرا اس سے کام لیتے ہیں۔ داغ کہتا ہے۔

وہ کیا چارۂ تلخ کامی کریں گے
یہی نا کہ شیریں کلامی کریں گے
کریں آپ سے ہم دغا توبہ توبہ
یہ کوفی کریں گے یہ شامی کریں گے

علامہ مرحوم نے بھی کوفیوں کی اس روایت کو مدنظر رکھ کر، اندازِ کوفی کی ترکیب وضع کی اور ملحوظ وہی غداری، فریب کاری اور دغا تھی چنانچہ حق کی خاطر جان پر کھیل جانے کو اور

سلطانِ جابر کے آگے نہ جھکنے کو وہ مقام شبیری کہتے ہیں اور سلطان قاہر سے ڈر جانے کو اور حق کی مخالفت کرنے کو (بہ طریق غداری) وہ اندازِ کوفی و شامی کہہ کر پکارتے ہیں۔

حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیری
بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی[1]

---

[1] جغرافیہ خلافت مشرقی : جمیل الرحمان۔
تاریخ اسلام : امیر علی (انگریزی)۔
بال جبریل۔

ل

لاتذر: قرآن مجید کی آیت کی طرف اشارہ ہے۔ حوالہ یہ ہے ۷۱/۲۶

نوح نے کہا کہ اے میرے پروردگار جتنے کافر زمین پر ہیں ان میں سے ایک بھی رہنے والا باقی نہ رکھ"

یعنی کہ مسلمانوں کو ہر مقام پر فتح حاصل ہونے کی بشارت ہے۔

لاتخف: قرآن مجید کے حوالے یہ تفصیل ذیل ہیں ۱۱/۷۰ - ۲۰/۲۱ - ۲۷/۱۰

قرآن مجید میں بار بار خدا اپنے خاص بندوں سے کہتا ہے کہ خوف نہ کھائیں ایک مقام پر

ارشاد ہوا ہے: "اے موسیٰ ڈر و مت"

لاتقنطوا (تقنطوا): قرآن مجید کی آیت کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا

چاہئے۔ قرآن مجید کا حوالہ یہ ہے ۳۹/۵۳ -

لایحزنون: قرآن مجید کی آیت کی طرف اشارہ ہے (سورۂ انعام) ۶/۴۸

"پس جو کوئی ایمان لایا اور نیک کام کئے تو ان لوگوں پر آخرت میں نہ کچھ خوف ہوگا

اور نہ وہ غمگین ہوں گے"۔

م

شیخ احمد مجدد: آپ کی تاریخ ولادت ۱۴؍ شوال ۹۷۱ھ ہے اور مولد سرہند۔ شروع میں اپنے والد سے درسی کتب پڑھیں پھر اپنے زمانے کے مشہور علما سے مستفید ہوئے۔ سترہ برس کی عمر میں تحصیل علوم سے فارغ ہونے کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔

تصوف کی طرف مائل ہوئے تو حضرت خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلسلۂ نقشبندیہ میں شامل ہو گئے۔ آپ کا زمانہ مسلمانوں کے لئے سخت تشویش کا زمانہ تھا۔ غیر اسلامی اور مشرکانہ تعلیمات کا نفوذ عام ہو چکا تھا۔ مجدد نے تمام کوششیں اصلاحِ احوال کے لئے وقف کر دیں۔ اکبر کے زمانے میں تبلیغ حق کرتے رہے۔ اکبر کی وفات کے بعد جہانگیر نے معلوم نہیں کس مصلحت کی بنا پر اپنے دربار میں طلب کیا کہ آپ کے خلاف بہت سی شکایات موصول ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں مجلس منعقد ہوئی، سوال و جواب شروع ہوئے تو کسی ذلیل درباری نے کہا کہ شیخ صاحب کا غرور دیکھئے کہ بادشاہ کو سجدۂ تعظیمی بھی نہیں کرتے

جہانگیر نے ایسا کیا کہ سجدہ کرو، آپ نے انکار کیا اور نتیجے کے طور پر گوالیار کے قلعے میں قید کر دیے گئے۔ ایک سال بعد جہانگیر کو جانے کیا خیال آیا رہائی کے احکام صادر کر دیے۔ اس کے بعد جہانگیر کے دل میں ان کی عقیدت پیدا ہو گئی۔

شیخ کی تصانیف میں سب سے زیادہ مقبول تالیف ان کے مکتوبات ہیں۔ ان میں اس نظریے کا سراغ ملتا ہے جسے وحدتِ شہود کہتے ہیں اور جو وحدت الوجود کی شرح اور اسلامی صورت ہے۔[۱]

مریخ: مشہور سیارہ ہے اور اس کا لقب "جلادِ فلک" ہے۔ اس سے جنگ اور خون آشامی کے تصورات اور افکار وابستہ ہیں۔ آج کل بعض سائنس داں مدعی ہیں کہ اس بات کا امکان ہے کہ مریخ پر عقیل جاندار آباد ہوں۔

مسجدِ قرطبہ: فنونِ لطیفہ میں فنِ تعمیر کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے وہ یہ ہے کہ فنِ تعمیر کا ماہر اپنی بنا یا عمارت کی غایت یا نوعیت کے مطابق اپنے ہنر کا مظاہرہ کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ مثلاً کتب خانے کی تعمیر میں ایک بہت بڑا کمرہ اور بڑی بڑی الماریوں کے لیے جگہ ضروری ہے تو فنِ تعمیر کا ماہر ان پابندیوں کو ملحوظ رکھ کر اپنی عمارت کی نوک پلک درست کرے گا۔ یہی حال مسجد کا ہے۔ مسجد کی غایت کو ملحوظ رکھتے تو معلوم ہوگا کہ بڑا صحن ضروری ہے غسل خانے ضروری ہیں حوض ضروری ہے، منبر و محراب ضروری ہیں اور حجرے بھی کم و بیش ضروری ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ مسجد کی ساخت پہلے ہی سے متعین ہوتی ہے۔ ہنرور یا صنّاع اسی دائرے میں رہ کر اپنے کمال کا اظہار کرتا ہے۔

مسلمانوں کو مسجد سے بجا طور پر عقیدت رہی ہے۔ ایک تو یہ کہ خانہ خدا ہے۔ دوسرے

---

[۱] گنجینۂ ادب: علم الدین سالک ذکر شیخ احمد سرہندی۔

یہ کہ مختلف تقاریب پر مسلمان یہاں جمع ہو کر ہر قسم کے معاملات کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ گویا مسجد صرف جائے عبادت ہی نہیں بلکہ ایوان شوریٰ بھی ہے۔ رسول پاک نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ مسجد ہی کے قرب وجوار میں بسر کر دیا۔

اب اس کے ساتھ یہ بات بھی ملحوظ خاطر رکھئے کہ فنون لطیفہ میں غنا کی حرمت تو مسلم ہے (سماع کا معاملہ اور ہے کہ اس کا تعلق حال وقال کی محفلوں سے ہے) جانداروں کی تصویر یا کھینچنی بھی ممنوع ہیں یہی پابندی رقص پر ہے مجسمہ سازی کی بھی یہی کیفیت ہے۔ لے دے کے ایک شعر رہ جاتا ہے یا فن تعمیر۔ فنِ تعمیر کو مذہبی جواز بھی حاصل ہے اس لئے مسلمانوں نے مسجد کی تعمیر میں اپنا خاص جوہر دکھایا ہے۔ جوں جوں مسلمانوں کی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا مختلف ملکوں کے فن کار مشرف بہ اسلام ہوتے چلے گئے چنانچہ مسجد کی تعمیر میں مختلف عناصر کے تال میل نے عجب نوک پلک پیدا کی۔ مسجد نبوی سے لے کر مغلیہ عہد کی موتی مسجد تک فن تعمیر کے بڑے بڑے نادر نمونے وجود میں آئے۔ مسجدوں کی تعمیر میں کہیں افریقہ کے لوگوں کا اثر ہے کہیں ہندوستان کے فن کاروں کا جوہر دکھائی دیتا ہے کہیں یورپ کے فن تعمیر کی جھلک دکھائی دیتی ہے کہیں وسط ایشیا کے گنبد نظر آتے ہیں کہیں خالص ہندوستانی انداز کی محرابیں ہیں کہیں پچی کاری اور مینا کاری مختصر یہ کہ مسجد کی تعمیر میں مسلمانوں کا جوہر اپنے عروج پر پہنچا ہوا نظر آتا ہے۔ مسجد مسلمانوں کی قومی اور ملی وحدت کا نشان ہے۔

اسلامی مساجد کے تعمیری اسلوب کے ارتقا میں تمام مسلمانوں نے حصہ لیا ہے۔ عربی قبائل افریقہ کے باشندے۔ پرانی تہذیبوں کے وارث مصری، فنون لطیفہ کے شیدائی ایرانی، متمدن اور تہذیب یافتہ ہسپانوی۔ جہاں جہاں لوگ مسلمان ہوتے گئے وہیں مسجد کی تعمیر کی ارتقا میں حصہ لیتے گئے مسجدوں میں مختلف قومی اور ملی خصوصیات جھلکتی ہیں لیکن اس کے باوجود یہ خصوصیات اس طرح

ہم آہنگ ہوتی ہیں کہ کبھی کسی مسجد پر یہ گمان نہ گذر سکا کہ یہ کوئی اور عمارت ہے۔

مسلمانوں نے جو عالی شان مسجدیں تعمیر کی ہیں اُن میں مسجد قرطبہ کو نہایت نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس کی بنا ہسپانیہ کے اموی خلیفہ عبدالرحمٰن نے آٹھویں صدی عیسوی کے آخر میں رکھی تھی۔ اس مسجد کی تعمیر میں مشرق و مغرب کی تمدنی میراث کو نہایت خوبی اور سلیقے سے استعمال کیا گیا ہے۔ مسجد قرطبہ کی تعمیر میں ایک طرف تو وہ مسالہ استعمال کیا گیا جو چونے مٹی اور پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے مرکب تھا اور دوسری طرف گہری کھدی ہوئی اینٹیں بھی برتی گئیں تاکہ چونہ انہیں اچھی طرح پکڑ سکے۔ پھر یہ مسجد ایسی مضبوط تیار ہوئی کہ صدیاں گذر چکنے کے بعد آج بھی حیرت انگیز طور پر نئی معلوم ہوتی ہے۔ اس عظیم الشان مسجد کے اکیس دروازے مداخل ہیں، وہ بھی نہایت خوبصورت ہیں۔ اینٹوں اور گچ کا کام نہایت عمدہ ہے۔ غالباً اسی مسجد میں سب سے پہلے سنگ مرمر کی جالیوں کا کام کیا گیا۔ غالباً اسی مسجد میں سب سے پہلے وہ طاق بنائے گئے جن کی ساخت عجمی تھی اور نقش و نگار کی وضع بھی ایرانی تھی۔

اس مسجد میں پچی کاری کے کام کی کیفیت یہ ہے کہ جڑائی نہیں کی گئی بلکہ یہ صورت اختیار کی گئی ہے کہ پہلے دیوار پر رنگ لگایا گیا ہے۔ اس کے بعد چمکدار مسالے سے تناسب کے ساتھ شیشے جڑ دئے گئے ہیں۔ دور سے یہ منظر دیکھئے تو دل پر عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے، خوشنما وح، نفیس محراب، شاندار گنبد، خوبصورت پچی کاری، رنگوں کی گوناگونی اور ہم آہنگی مسالے کی چمک، گچ کی صفائی، مختصر یہ کہ ایک عالم طلسمات نظر آتا ہے۔

عجب بات یہ ہے کہ دسویں صدی میں پچی کاری کا یہ اسلوب، جو مسجد قرطبہ میں نظر آتا ہے ہسپانیہ سے دفعتاً غائب ہو گیا۔ گچ کے کام کے متعلق مغربی مورخ حیرت کا اظہار کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ معلوم نہیں گچ کن اجزا سے مرکب تھا۔ جوں جوں وقت گذرتا ہے پتھر سے بھی

زیادہ مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس گچ کی ترکیب یہ تھی ہو تو پہلے سنگ مرمر کو پیس کر سرمہ کر لیا جاتا تھا۔ پھر اس میں چونا انڈوں کی سفیدی میں گوندھتے تھے پھر لہسن ملاتے تھے۔ اور اس کے بعد سانچوں میں ڈھال لیتے تھے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس مسالے سے کیڑے مکوڑے بھاگتے تھے، مشاہدہ بتاتا ہے کہ ہسپانوی مسلمانوں کی عمارتوں کی دیواروں پر کبھی کوئی مکھی نہیں دیکھی گئی۔ اس عظیم الشان مسجد کے منبر میں خوشبودار اور قیمتی لکڑی استعمال کی گئی تھی جگہ جگہ سونے کی کیلیں جڑی گئی تھیں اور بیش قیمت جواہرات سے اس طرح مرصع کیا گیا تھا کہ اس کی ہیئت مجموعی کا تناسب اور اس کی نوک پلک دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ان دنوں سیپ کا کام ابتدائی حالت میں تھا لیکن اس کے باوجود مسلمان فن کاروں نے سیپ کا استعمال بھی بڑے سلیقے سے کیا۔

مسجد قرطبہ کی تعمیر میں جو فنی اور جمالیاتی نفاست ملحوظ رکھی گئی ہے اس کی تعریف میں مشرق و مغرب کے نقاد دفتر کے دفتر لکھ چکے ہیں مسجد کی مستطیل وضع، متناسب ستونوں کی قطاریں، محرابوں کا سلسلہ، وسط صحن میں وضو کا حوض، مسجد کی متوسط بلندی اور اس کے مقابلہ میں میناروں کا طول یہ تمام باتیں صنعت گری اور فن کاری کے کمال پر دلالت کرتی ہیں اس کے علاوہ اس عظیم الشان مسجد میں اسلامی فن کاروں نے مختلف اسلوبوں کو نہایت خوبی سے ایک نئے سانچے میں ڈھالا۔ باہر کی سجاوٹ پر اصطخر کا اثر نظر آتا ہے۔ اندرونی نوک پلک اور ریچ کا کام شام کا مرہون منت ہے۔ اشکال کی ہندسی ترتیب مصری تمدن کی یاد دلاتی ہے اور قبوں کو دیکھ کر ایران کی صنعت گری یاد آتی ہے۔ مختصر یہ کہ بہت سی ملی اور قومی خصوصیات اس مسجد کی ساخت میں نہایت خوبی سے جمع ہو گئی ہیں۔ جمالیات کے نقاد تو یہاں تک کہتے ہیں کہ مسجد قرطبہ کی محراب کا اسلوب بے نظیر ہے۔ اس کی مثال نہ کہیں

ممالک اسلامی میں ہے نہ کہیں اور۔

تاریخ شاہد ہے کہ رات کے وقت مسجد قرطبہ میں دو ہزار فانوس جگمگ جگمگ کرتے تھے۔ ان فانوسوں کی کیفیت یہ تھی کہ دو بتیاں ایک دوسرے کے اوپر جلتی تھیں ان کے پردوں پر طرح طرح کے نقش و نگار ہوتے تھے جن سے چھن چھن کر روشنی نکلتی تھی۔ زنجیروں سے فانوس لٹکے رہتے تھے۔ ان میں کنول کے پھول یا کھجور کے پتے یا انار بنے ہوتے تھے ان پر آیات قرآنی کندہ ہوتی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ قرطبہ شہر میں چمڑے کے پردے بنانے کی صنعت کمال تک پہنچی ہوئی تھی یہاں تک کہ اسی نسبت سے چمڑے کے منقش پردے کو قرطبی کہتے تھے۔ ان پردوں پر مختلف رنگ ہوتے تھے، سنہرا روپہلا کام ہوتا تھا اور یہی عجیب و غریب رنگین سونے کی طرح ڈھلک ڈھلک کرتے نقش و نگار سے مزین پردے مسجد کی دیواروں پر بھی لٹکا دیے جاتے تھے۔ دیواروں کی پچی کاری کے ساتھ ان پردوں کی زیبائش مل کر دو ہزار فانوسوں کی روشنی میں رات کو دل پر کیا اثر پیدا کرتی ہو گی اس کا اندازہ خود ہی کر لیجیے۔[۱]

مسولینی: (ولادت ۱۸۸۳ء ہلاکت ۱۹۴۵ء) مسولینی بھی ایک متوسط گھرانے کا فرد تھا مگر ۱۹۱۹ء میں اس نے ایک تحریک چلائی جس کا مقصد بظاہر یہ تھا کہ اشتراکی اثرات کو ختم کر دیا جائے۔ اس کے بعد وہ پہلے ملک کا وزیر اعظم مقرر ہوا اور پھر آمر مطلق بن بیٹھا۔ دوسری جنگ عظیم میں اس نے ہٹلر کا ساتھ دیا اور ہلاک ہوا۔[۲]

---

[۱] ثقافت اسلامی کا خاکہ: شوستری (انگریزی)۔ اخبار اندلس: سکاٹ، ترجمہ خلیل الرحمٰن۔ عبرت نامہ اندلس: ڈوزی، مترجمہ عنایت اللہ۔ میراث اسلام: (انگریزی) میراث ایران: (انگریزی)۔ تاریخ عرب: ہٹی (انگریزی)۔ تاریخ اسلام: امیر علی (انگریزی)۔

[۲] انسائیکلوپیڈیا برٹینکا۔

ن

نپولین: (ولادت ۱۵ اگست ۱۷۶۹ء وفات ۱۸۲۱ء) نپولین بونا پارٹ کا شمار دنیا کے ان جلیل فاتحین میں ہوتا ہے جو مدبر، منتظم اور سیاس بھی تھے۔ اس نے ایک متوسط گھرانے میں جنم لیا۔ فوجی اسکول میں تربیت پائی اور پھر محض اپنے زورِ بازو سے اتنی ترقی کی کہ انقلابِ فرانس کے بعد خود مسندِ سلطنت پر جلوہ افروز ہو گیا۔ اس کی اخلاقی نامرادی کی داستانیں اکثر کتابوں میں مذکور ہیں۔ جب وہ انگریزوں سے شکست کھا کر قید ہوا تو اس کی بیوی نے ایک گمشدہ عظمت کا ساتھ دینے پر ایک نوجوان کی آغوش کو ترجیح دی۔ یہ بیوی وہی شہزادی تھی جس کے بطن سے نپولین کا لڑکا پیدا ہوا تھا، القب شاہ روم[۱]۔

نطشہ: (۱۸۴۴ء تا ۱۹۰۰ء) علامہ نے خود اس جلیل القدر فلسفی کے متعلق لکھا ہے:

"جرمنی کا مشہور مجذوب فلسفی نطشہ جو اپنے وارداتِ قلبی کا صحیح اندازہ نہ کر سکا اور اس لئے

---

۱ نپولین کی سوانح: ایبٹ (انگریزی)۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔

اس کے فلسفیانہ افکار نے اسے غلط راستہ پر ڈال دیا۔"

اس مفکر کے مطابق زندگی کا اصلِ اصول اقتدار حاصل کرنے کی تمنا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ صرف وہی شخص زندہ ہے جو دنیا کے مصائب کا مقابلہ کرسکتا ہے اور ایک خیالی دنیا میں پناہ نہیں لیتا[1]۔

نوشیرواں: مشہور ساسانی بادشاہ (چھٹی صدی عیسوی) جس کے عدل وانصاف کے افسانے ادبی روایت کا جزو ہیں۔ اس نے مزدک کی تحریک کو کچل کر ایران میں ازسرِنو معاشرے کے استحکام کی صورت پیدا کی اور ہر محکمے میں اصلاحات رائج کیں۔

یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ بغداد اس کے انصاف و داد کا باغ نہیں تھا بلکہ دادہ بغ یعنی عطیۂ خدایاں تھا۔

نوشیرواں کے لغوی معنی ہیں۔ صاحبِ روانِ خوش۔ صاحبِ روانِ جاوید۔ (انوشہ = جاوید، خوش وخرم + رواں = روح، نفس[2])

---

[1] لغتِ فلسفہ: رینز: نیویارک (انگریزی)۔

[2] ایران بعہدِ ساسانیاں: اقبال۔ برہانِ قاطع

ہ

ہارون الرشید: خاندانِ عباسیہ کا مشہور فرماں روا ابو جعفر ہارون رشید جس نے ۱۷۰ھ سے ۱۹۳ھ تک حکومت کی اور زمانے کے نشیب و فراز خوب دیکھے۔ اسی کے عہد میں برمکیوں کا خاندان نقطۂ عروج پر پہنچا اور پھر برباد بھی ہوا۔ علم پرور، ہنر دوست اور عیش و عشرت کا دلدادہ تھا[1]۔

ہرات: مقدسی کہتا ہے کہ ہرات بہت بڑا شہر ہے گرداگرد ایک فصیل ہے جس کے چار دروازے ہیں۔ شہر سے دو فرسخ کے فاصلے پر پہاڑ ہیں۔ البتہ ہرات کے جنوب سے لے کر مالن والے پل تک تمام زمین ایک باغ معلوم ہوتی ہے کہ ہر طرف ہری بھری کھیتیاں ہیں اور پھلوں سے لدے پھندے درخت ہیں۔ مغلوں کی یورش سے اس شہر کو بھی نقصان پہنچا مگر جلد ہی

---

[1] تاریخ اسلام: امیر علی۔
تاریخ عرب: ہٹی۔
البرامکہ: عبدالرزاق کانپوری۔
تاریخ عالم اسلام۔ براکلمین۔
المامون: شبلی نعمانی۔
تاریخ طبری۔

یہ شہر پوری طرح آباد ہو گیا۔ ہرات کی شہرت کا زمانہ وہ تھا جب یہاں خاندان غور حکمراں تھا۔ اس وقت آبادی پانچ لاکھ کے قریب تھی۔ ہرات اور مالن وہی مشہور شہر ہیں جن کا ذکر صاحب چہار مقالہ نے کیا ہے۔ شاہ نصر سامانی یہیں برسوں مقیم رہا یہاں تک کہ رودکی نے اسے یاد دلایا۔ اس کا وطن بخارا ہے اور وہ مشہور قصیدہ کہا جس کا مطلع ہے۔

بوئے جوئے مولیاں آید ہمی

یاد یار مہرباں آید ہمی

ہرات کے اردگرد کا علاقہ ثمر آور باغات کے لئے مشہور رہے خاص طور پر یہاں کے انگور بے نظیر ہیں[۱۱]۔

---

[۱۱] جغرافیہ خلافت مشرقی: جمیل الرحمان۔ چہار مقالہ: نظامی عروضی سمرقندی۔

احوال و اشعار رودکی: سعید نفیسی۔

ی

یٰسین: قرآن مجید کی چھتیسویں سورۃ کے ابتدائی کلمے کی طرف اشارہ ہے کلمہ یٰسین کے معنی کی تحقیق نہیں ہو سکی۔

حصّهٔ فارسی

زبور عجم

الف

(۱) ابراہیمی و آزری (نے براہیمی درونے آزری) :

سیاق و سباق سے ظاہر ہوتا ہے کہ براہیمی ایک نئے اسلوبِ مصوری کی علامت ہے (جس کا ظہور ابھی تک ہند پاکستان میں نہیں ہوا) اور آزری پرانے اسلوب و روایات کے مطابق فن نقاشی یا مصوری کے احیا کی علامت ہے۔حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی بت شکنی کی داستان مشہور ہے۔نمرود (بابلی حکومت کے فرماں رواؤں کا لقب عمومی ہے) ان کی تبلیغ کو اپنے دعوائے خدائی سے متصادم ہوتے دیکھ کر،سیاسی مصالح کی بنا پر ان کو سخت سزا دینا چاہتا تھا۔حضرت ابراہیم نے بہت سے بابلی بت توڑ دیئے تو نمرود نے عوام کے جذبات سے فائدہ اُٹھا کر حضرت ابراہیم کو آگ میں جھونکنے کا حکم دیا۔لیکن آگ ٹھنڈی ہو کر گلزار خلیل بن گئی۔(اس واقعے نے اردو اور فارسی ادبیات میں بہت سی تلمیحات پیدا کی ہیں)۔

آزر کے متعلق تازہ ترین تحقیق یہ ہے کہ کالدی (کلدی) زبان میں بڑے پجاری کو کہتے ہیں

لہ قصص قرآن۔صدر الدین۔قصص القرآن۔حفظ الرحمٰن جلد اول۔قرآن مجید۔سورۂ انبیاء۔سورۂ بقر۔

(تورات کا بیان یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کے والد کا نام (آذر نہ تھا بلکہ) تارخ تھا جو بت تراش تھا اور سب سے بڑا پجاری تھا۔ بعض مفسروں نے، تورات اور قرآن مجید کے اختلافی بیانات کی ایسی تاویل کرنی چاہی ہے کہ تضاد رفع ہو جائے (کلمۂ آذر کے متعلق لغوی تحقیق بھی بہت ہوئی ہے[2])۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مصوری کا کون سا دبستانِ قدیم ایسا تھا جس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اگر اس کا احیا ہو جائے تو کم از کم آذری تو ہو گی۔ ایرانی مصوری کے تمام دبستانوں کا گل سرسبد بہزاد ہے (جس کا نام اکثر مانی کے ساتھ لیا جاتا ہے (حالانکہ مانی مصوّر نہ تھا مفکر تھا) اور اس کا تعلق ایران قدیم سے ہے)۔ بہزاد کے ہاں بھی تصاویر کے موضوع کم و بیش ایسے ہی ہیں جن کا ذکر علامہ اقبال نے غلاموں کے فنون لطیفہ کے سلسلے میں کیا ہے۔ اس کی نقاشی میں البتہ رنگ آمیزی، تراش خراش، نوک پلک، جزئیات کا استقصا، زینت و آرائش کا توازن، بے نظیر ہے۔

ہندوستانی مصوری میں اجنتا کی دیواری (غاری) تصویریں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ ہر دبستان کے ماہروں اور نقادوں نے انھیں سراہا ہے۔ ان تصویروں کا تعلق اصلاً مذہب اور زندگی کے اہم مسائل سے ہے، پھر خطوط کا حسن، اور ان کی نوک پلک جیسی اجنتا کی تصاویر میں نظر آتی ہے، غالباً وہ بھی بے نظیر ہے۔

یہ کہنا دشوار ہے کہ آذری سے اقبال کی مراد کون سا دبستان نقاشی تھا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری تمام کلاسیکی مصوری (اور کم و بیش جدید بھی) سوز یقین سے خالی ہے اور انحطاط و زوال کی آئینہ دار ہے۔ کہ زندگی کے اصلی اور ابدی مسائل کی ترجمانی کرنے کی بجائے صرف ان موضوعات کو قرطاس پر منتقل کرتی ہے جو درباری زندگی سے متعلق ہیں۔ دربار کی پرتکلف

---

[1] قصص قرآن۔ صدر الدین بلاغی (فارسی)، قصص القرآن۔ حفظ الرحمٰن۔ جلد اول۔

[2] برہان قاطع (ایرانی ایڈیشن)، مرتبہ محمد معین (فرینکل کی رائے بھی دیکھیے منقول ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ کلمہ اصلاً عبرانی ہے

اور پُر تصنع زندگی کے نقشے کھینچتی ہے[1] (یہاں اس مصوری کا ذکر ہے، جو اسلامی ممالک میں پیدا ہوئی) منگولوں کے عہد میں تمدنی تال میل کی صورت، پیدا ہوئی تو ایرانی نقاشوں پر چینی مصوری کا اثر نمایاں ہوا[2]۔ (رضا عباسی کی نقاشی کے نمونے ملاحظہ ہوں[3]) لیکن یہ تال میل کچھ سطحی سا رہا۔ ہندوستان میں مغل مصوری کے بعض نمونوں میں (خاص طور پر راجپوتی دبستان کے فروغ سے پہلے) زندگی اور حرکت کے آثار نظر آتے ہیں

کانگڑے کا دبستان اور راجپوت دبستان تو کچھ عرصے کے بعد، کم و بیش رادھا کرشن کی محبت کے مرقعے اور راگ راگنیوں کی شکلیں بنانے کے لئے گویا وقف ہو گیا تھا۔ اسی منزل سے دراصل ہند پاکستان کی مصوری کا انحطاط شروع ہوتا ہے (مانی کے مقلدوں نے جو تزئین و تہذیب کی تحریک کے علمبردار تھے، مغل مصوری کو خاصا متاثر کیا ہے آب طلا کا استعمال تو خاص مانی کے مقلد مصوروں کا فن ہے)

علامہ کا یہ کہنا کہ جہاں تک ہماری مصوری کا تعلق ہے" نے براہیمی در و نے آذری" اس سے یہ تبادر ہوتا ہے کہ ان کے خیال میں، ہماری مصوری نہ تو پرانی روایتی میراث سے بہرہ یاب ہے (آذری) نہ پرانے دبستانوں کو مردود قرار دے کر، کوئی نئی وضع یا اسلوب پیدا کرنے کی اہل ہے (براہیمی)۔ چغتائی کی مصوری میں علامہ نے ایک جدید وضع کا سراغ پایا تھا اور انھوں نے لکھا تھا کہ چغتائی ابھی گرم رفتار ہے اور مختلف منزلوں سے گذر رہا ہے۔ اسی سلسلے میں انھوں نے آرٹ کے متعلق اپنے خیالات کا تفصیل سے اظہار کیا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ آرٹ کو دلبری یا قاہری کا ترجمان ہونا چاہیے۔ یہ تبھی ممکن ہے کہ ہمارے فن کار اپنی روایتی میراث سے بھی پورا فائدہ

---

[1] اقبال کا نظریۂ فن عزیز احمد (اردو) اقبال نئی تشکیل۔ عزیز احمد [2] تاریخ مفصل ایران۔ عباس اقبال۔ جزو اول (طہران)
[3] Painting in Islam ; Arnold ; Outlines of Islamic culture ; Shustri
[4] مرقع چغتائی (دیوان غالب کا مصور ایڈیشن)، علامہ اقبال مرحوم کا انگریزی پیش لفظ۔

اُٹھائیں اور زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں اور رجحانات کو بھی ملحوظ خاطر رکھیں۔ ایسی مصوری گویا آزری وابراہیمی کا امتزاج ہوگی۔

(تحقیق لغوی) صدرالدین بلاغی لکھتے ہیں[1] کہ یہ وہی کلمہ ہے جس کے معنی آگ ہیں۔ کلدانی اور آشوری مریخ کو آزر کہتے تھے اور یہ تصور کرتے تھے کہ یہ ستارہ مخلوق آتش ہے عمود سنگ کو رمز مریخ قرار دیتے تھے۔ پرانے کتبوں میں یہ کلمہ اکثر نظر آتا ہے۔ ان لوگوں کو جو بت پرستی کے راز دار تھے یہ لقب عطا کیا جاتا تھا۔ صاحب تاج العروس لکھتے ہیں کہ عرب آزر نامی ایک بت پوجتے تھے۔

برہان قاطع کے ایرانی ایڈیشن میں (جس کی تالیف میں دہ خدا، پور داؤد، علی اصغر حکمت اور سعید نفیسی نے تعاون کیا ہے) حضرت ابراہیم کے والد آزر کے ذکر میں اس کلمے کا دوسرا حرف ذال سے دکھایا گیا ہے اور جس آزر سے آگ کا تعلق ثابت کیا گیا ہے وہ بہ ذال لکھا گیا ہے (آذر)

علامہ اقبال نے آزر، نمرود، ابراہیم، آتش نمرود سے بہت سی تلمیحات مستعار لی ہیں۔ حضرت ابراہیم کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے ان تلمیحات کے معانی میں اختلاف نظر آتا ہے، مثلاً بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق۔ یہاں حضرت ابراہیم کی وضع حیات کو وضع عشق کی علامت قرار دیا ہے۔ اسی طرح نظم میں آذر تو ہیں،

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا۔ نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا   میں ہلاک جادوئے سامری تو قتیل شیوۂ آذری

یہاں شیوۂ آذری سے مراد بت گری اور بت پرستی ہے۔ اور قرینہ خلیل، بت شکنی کی صلاحیت و استعداد ہے، جس سے مخاطب معرا ہے۔ خضر راہ میں اس سلسلہ تلمیحات سے بہت فائدہ اٹھایا گیا ہے مثلاً

آگ ہے اولاد ابراہیم ہے نمرود ہے   کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

---

[1] قصص قرآن۔ فرہنگ۔ حرف با، بت پرستی۔

(۲) ابلیس: ابلیس کی اغوائے آدم کی داستان بہت مشہور ہے، اور ہر مسلمان کم و بیش اس قصے کے بنیادی خط و خال سے آگاہ ہے۔ اس سارے قصے میں جو چیز اقبال کو بہت متاثر کرتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت آدم کو یہ سمجھا دیا گیا کہ اب (اغوائے آدم کے بعد) ابلیس اور انسان کے درمیان یہ تسلسل جنگ برپا رہے گی۔ یہ گویا خیر و شر کا معرکہ ہوگا، جو انسان اس جنگ میں فاتح ہوں گے وہی جنت کے حقدار ہوں گے تو ابلیس قوتِ شر کا مظہر بھی ہے لیکن انسان کی قوتِ خیر کی نمود کا وسیلہ بھی وہی ہے۔ اس کے ساتھ محو پیکار رہنے سے ممکنات جسم و جاں ٹٹولی جا سکتی ہیں۔

ابلیس کے دوسری قوموں میں بہت سے روپ ہیں، مثلاً سانپ، طاؤس۔ اور ہندو دیومالا میں ناگ دیوتا۔ انگریزی میں ابلیس کے لئے Devil کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اور Satan کا بھی (شیطان)۔ عبرانی میں یہ کلمہ شطان ہے (Sitan) اور اس کے معنی ہیں، مخالفت کرنے والا، دشمن۔ شیطان بنی نوع انسان کا دشمن ہے اس لئے اس کا یہ نام ہوا۔

ابلیس کے لغوی معنی ہیں ناامید از رحمت۔[۱] ظاہر ہے کہ رحمت سے رحمتِ الٰہی مراد ہے۔ شیطان کے لغوی معنی میں، ابلیس[۲] اور آدم کی جنگ باہم کی جھلک زیادہ ہے۔

بال جبریل میں جبریل و ابلیس کے مناظرے سے بہ صراحت معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس نہ ہوتا تو بنی نوع انسان نے جو خیر و شر کی مسلسل آویزش کے نتیجہ کے طور پر جو کچھ کر کے دکھایا ہے دنیا اس سے محروم رہتی۔ پیام مشرق میں ایک رباعی بھی غور طلب ہے۔

چہ پرسی نکتۂ زشت و نکو چیست ۔۔۔ زباں لرزد کہ معنی پیچ دار است
بروں شاخ بینی خار و گل را ۔۔۔ دروں شاخ گل ہست و نہ خار است

حضرت آدم اور حوا، کے متعلق مختلف کتابوں میں مفصل بحث ملتی ہے۔ اور ابلیس کا ذکر بھی ظاہر ہے

---

[۱] غیاث و منتخب۔ [۲] The Dictionary of Word Origins; Shipley

کہ ملتا ہے لیکن پچھلے پندرہ بیس سالوں میں تحقیق زیادہ ہوئی ہے[۵۱]۔

شیطان کو اقبال خودی اور تخلیق کی وہ عظیم الشان قوت سمجھتا ہے جو محبت و اطاعت کی راہ مستقیم سے بھٹک گئی ہے۔ اس اعتبار سے وہ گوئٹے کا ہم آہنگ ہے کہ وہ خودی کی تہذیب و تہذیب پر بہت زور دیتا ہے کہ شیطان[۵۲] بے قید اور بے تربیت خودی کی مثال ہے۔ اقبال کے اشعار سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ دوسرے تصورات کی طرح خودی بھی جزواً مہذب ہو سکتی ہے۔

ابلیس کے سلسلے میں خیر اور شر کی متحارب قوتوں کا ذکر علامہ مرحوم نے "ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقاء" میں کیا ہے[۵۳]۔

خلیفہ عبدالحکیم نے اقبال[۵۴] اور عشق میں ابلیس کے تصور سے بھی بحث کی ہے۔

"شیاطین یعنی خدا سے باغی ہستیوں کا بھی وجود ہے۔ جن کو خدا نے نیست و نابود کرنا نہیں چاہا بہ الفاظ دیگران کی مزاحمت و بغاوت بھی کسی نہ کسی انداز میں تکمیل حیات میں معاون ہوتی ہے ..... وہ شخص جو یہ تلقین کرتا ہے:

مزی اندر جہاں کور ذوقے | کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

اس کی جنت میں بھی کوئی سکون و اطمینان کی جامد کیفیت نہیں ہو سکتی۔

غیر متغیر بہشت کے تصور پر اقبال کی طرح غالب کو اعتراض ہے[۵۵]"

(۴۳) ابن مریم حضرت عیسیٰ جن سے مشہور مذہب نصرانیت منسوب ہے، جن پر انجیل

---

[۵۱] (الف) قصص القرآن۔ حفظ الرحمٰن جلد اول۔ (ب) ترجمان القرآن۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔
(ج) قصص قرآن یا فرہنگ، صدرالدین بلاغی (فارسی)، (د) ابلیس و آدم۔ پرویز کراچی۔
لغوی معانی کی تحقیق (Satan, Devil) کے لئے دیکھئے (wyld) Universal Dictionary

[۵۲] اقبال کا تصور خودی، ڈاکٹر عابد حسین۔

[۵۳] بہ حوالہ اقبال تشکیل جدید (عزیز احمد)۔ [۵۴] اقبال اور عشق، مجلہ اقبال لاہور، اکتوبر ۱۹۵۲ء۔

[۵۵] اقبال اور عشق۔ خلیفہ عبدالحکیم۔ اقبال۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء۔

نازل ہوئی اور جن کو یہ معجزہ عطا ہوا تھا کہ مُردوں کو زندہ کرتے تھے۔ انہی کی قوم نے رومی حاکم کو مجبور کرکے انھیں مصلوب کروانا چاہا تھا لیکن قرآنِ مجید[۱] کے مطابق انھیں زندہ آسمان پر اٹھوالیا گیا۔ ان کے سلسلے میں بھی بہت سی تلمیحات فارسی اور عربی ادبیات کا جزو بن گئی ہیں۔ مثلاً دمِ عیسیٰ، بیاضِ مسیحا، عصمتِ مریم۔ اس سلسلے میں حضرت مریم کے متعلق تلمیحات بھی ملحوظِ خاطر رہنی چاہئیں۔ ان کی عصمت و عفت، ان کی ولادتِ حضرتِ عیسیٰ سے پہلے خاموشی، ان سے جبریلِ امین کا ہم کلام ہونا ان باتوں کی طرف اکثر اُردو اور فارسی ادبیات میں اشارہ کیا جاتا ہے۔ نظامی اپنی طبیعت کی اُپج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ :-

مریم صفت بکر و آبستن است

(۴) احد: خدائے تعالیٰ۔ (ایک) اور یوں وحدت کی طرف اشارہ ہے۔ وحدتِ عددی مراد نہیں ہے، وحدت بسیط اور وحدتِ محض مراد ہے۔ (آریائی اقوام میں یہ تصورِ وحدتِ صرف اور وحدتِ محض کا کبھی پنپ ہی نہیں سکا۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ مرحوم آریائی ہونے کے باوصف رموزِ دیں (جن میں توحید کا تصور بھی شامل ہے) سے آگاہی پر نازاں تھے۔

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی   برہمن زادہ رمز آشنائے روم و تبریز است

قرآن مجید[۲] میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو احد کے لقب سے پکارا ہے۔

(۵) ارسطو: (ولادت ۳۸۴ ق۔م) بعض مورخ لکھتے ہیں کہ اس نے ۳۲۲ ق م میں شوگراں (زہر کا نام ہے۔ یہ وہی زہر ہے جو سقراط کو پلایا گیا تھا) پی کر خودکشی کر لی بعض یہ کہتے ہیں کہ اس کی موت طبعی اسباب کی بنا پر تھی۔ بہرحال اس کی زندگی کے آخری سال اضطراب اور بے چینی کے تھے۔ اسے سکندر جیسے فاتح عالم کا استاد ہونے کی سعادت حاصل ہے اور علامہ دوانی نے،

---

۱ قصص القرآن، حفظ الرحمٰن، جلد چہارم، دہلی۔   ۲ قرآن۔ سورۂ اخلاص۔ قل ہو اللہ احد۔

اخلاق جلالی میں ارسطا طالیس کے نام سے، اس کی بہت تعریف کی ہے۔

صاحبِ لغاتِ فلسفہ کا قول[۵۱] ہے کہ اس کی تصانیف کی کثرت اور تنوع پر غور کیا جائے تو یہ باور کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کام ایک ہی شخص نے کیا ہے۔

ول ڈیورانٹ (صاحبِ داستانِ دانش) نے بھی اس کے فلسفے سے بہ تفصیل بحث[۵۲] کی ہے (نسبتاً) ارسطو منطق کا موسس ہے اور یہ بڑے معرکے کی بات ہے۔ علومِ طبیعی میں بھی اس کی دلچسپی مدت العمر قائم رہی۔ مابعد الطبیعات سے بھی بحث کی آرٹ کی نوعیت اور ماہیت پر بھی اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اخلاقیات، سیاسیات، تعلیم اور متعلقہ مسائل سے بھی بحث کی مختصر یہ کہ اس زمانے میں علوم و فنون کے جتنے شعبے تھے سب اس کے ذہن رسا کے مرہونِ منت ہیں

ول ڈیورانٹ کے خیال میں، ارسطو، اس خلوص اور جوش سے معرا تھا جو افلاطون کا خاصہ[۵۳] ہے۔

(۶) **اشراق**۔ درخشیدن و روشن شدن و طلوع صبح۔ مادہ ظاہر ہے کہ شرق ہے۔ اس لفظ سے فلسفیوں کا ایک گروہ بھی منسوب ہے۔ جو اشراقی کہلاتا ہے اور کشف و الہام اور تزکیہ باطن پر زور دیتا ہے۔

اس طریق کی نسبت سے شیخ شہاب[۵۴] الدین یحییٰ بن حبش سہروردی شیخ اشراق مشہور ہیں۔ جو ۵۸۷ میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے اشارے پر جرم حکمت کی پاداش میں شہید[۵۵] ہوئے (۵۸۷-۵۴۹)

(۷) **آفتاب**۔ یہ کلمہ دو اجزا سے مرکب ہے۔ آف اور تاب سے۔ آف کے معنی ہیں روشنی اور تاب کے معنی ہیں گرمی کلمہ آف فارسی میں آب کی شکل بھی اختیار کرتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

---

۵۱ Dictionary of Philosophy ; PP 20-21

۵۲ Story of Philosophy, 1953, New York.

۵۳ Story of Philosophy ; Page 71

۵۴ تاریخ مفصل ایران عباس اقبال جز و اول۔ اور شوستری Outlines of Islamic Culture.

۵۵ ایضاً۔

آب و تاب تو آفتاب کے معنی ہیں گرم اور روشن۔

یہ جو لغات میں درج ہے کہ آفتِ آب ہے، غلط محض ہے۔

(۸) افلاطون (Plato) (۴۲۸-۲۷-۳۴۸-۷ ق م)

یونان کے عظیم ترین فلسفیوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی تعلیم و تربیت بہت اچھی ہوئی تھی۔ ۳۸۷ ق م میں اس نے ایتھنز میں اس مشہور دبستان کی بنیاد رکھی جو فلسفے اور ریاضیات سے متعلق تھا۔ یہی دبستان اکادمی کہلایا۔ یہیں افلاطون تعلیم دیتا رہا۔[۲]

افلاطون کے "مکالمات" بہت مشہور ہیں اور ان کی طرف علامہ نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے:

مکالماتِ فلاطون نہ لکھ سکی لیکن   اسی کی گود سے ٹوٹا شرارِ افلاطون

(۹) آفلین مقامِ آفلین

قرآن مجید کا حوالہ بہ تفصیل ذیل ہے۔ ۶/۷۶ (انعام) یہ وہ مقام ہے کہ حضرت ابراہیم ایک ستارے کو روشن دیکھتے ہیں تو دفعتہً پکار اُٹھتے ہیں کہ (ہائیں کیا) یہی میرا خدا ہے۔ اور جب وہ ڈوب گیا تو کہنے لگے کہ غروب ہو جانے والی چیزوں کو تو میں (خدا بنانا) پسند نہیں کرتا۔

تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان شروع میں کائنات کی طبعی قوتوں کی پرستش کرتا تھا۔ مثلاً برق و باد و باراں، سورج کی پرستش مشرق کے بہت سے ممالک میں عام تھی۔ زرطشت کی تعلیمات کو فروغ حاصل ہوا تو بھی مہرپرستی کلیتاً نہیں مٹی۔[۳] ہندوستان میں بھی ایرانیوں کی دوسری شاخ سورج کی پرستش کرتی تھی اور اسی سے ایک مشہور خانوادہ بھی منسوب

---

[۱] برہانِ قاطع، محمد معین، کلمہ آفتاب۔

[۲] Dictionary of Philosophy; D. D. Runes, New York
تفصیل کے لئے دیکھیے Elements Story of Philosophy

[۳] ایران بہ عہدِ ساسانیاں۔ محمد اقبال۔

تھا جسے سورج بنسی کہتے تھے۔ سوریہ (سورج) فارسی میں ہور اور خور بھی اسی کی شکل ہے۔

(۱۰) اقلیدس: (۳۰۰ ق م) سکندریہ کا باشندہ تھا اور ہندسہ یا اقلیدس کا ماہر۔ اس موضوع پر اس کی تصانیف اب تک نہایت وقیع گنی جاتی ہیں۔ اس کی مشہور کتاب Elements تیرہ[۱۳] مجلدات میں ہے۔ اسی نام کا ایک فلسفی بھی تھا (ق م ۴۰۰)۔

ہندسہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کلمہ اندازہ[۲] کی تعریب ہے۔

(۱۱) اِلّا: یہ ذاتِ باری تعالیٰ کا اثبات ہے۔ خدا کے وجود کا اعتراف ہے اور صرف اسی کو معبود ماننے اور اسی کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کا اقرار ہے۔ یہ لا کا منطقی نتیجہ ہے۔ جو شخص اس مقام تک پہنچ جائے گا کہ ذاتِ الٰہی کے سوا باقی چیزوں کی نفی کر دے اُسے یہ مقام ضرور حاصل ہوگا۔

(۱۲) الست۔ الستُ بربکم۔ بلیٰ۔ قالو بلیٰ: قرآن مجید کا حوالہ بہ تفصیلِ ذیل ہے[۳] ۱۷۲/۷ (اعراف)۔

"کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ تو سب کے سب بولے ہاں ہم اس کے گواہ ہیں۔"

یعنی خود انسان کی فطرت میں، اپنے خالق کو تسلیم کرنے کی حس مخفی ہے اور خدا کے وجود کا احساس دل میں ضرور پیدا ہوتا ہے بشرطیکہ دل مسخ نہ ہو گیا ہو۔

کانٹ تمام مابعد الطبیعیاتی موشگافیوں کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا تھا کہ انسان میں ایک حاسۂ اخلاقی موجود ہے جس کی بنا پر وہ اچھے اور بُرے میں تمیز کرتا ہے، اور بعض حقائق کو مسلّم گردانتا ہے۔ مولانا روم تو اس بات کے بھی قائل ہیں کہ جو منیں حق اور صداقت کا میلان رکھتی

---

[۱] آنندراج۔ برہانِ قاطع۔

اندراک: انسانی ذہن کس طرح مذاہب طبعی کی پرستش کے پھندے سے نکلا ہے، اس کی تفصیل کے لئے دیکھیے حکایتِ فلسفہ (انگریزی) دیورانٹ نیویارک۔

[۲] دیکھیے کلمات اندازہ، اندا ختن، برہان قاطع مرتبہ محمد معین، ہنداز بھی اندازے ہی کا معرب ہے۔ اصولاً اس لفظ کو بافتح حرفِ اول پڑھنا چاہیے لیکن لغات اسے بالکسر پڑھتی ہیں۔

[۳] مفصل بحث کے لئے دیکھیے قرآن اور تصوف۔ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب (دہلی)۔

ہیں وہ خدا کے بھیجے ہوئے پیامبر کو بھی پہچان لیتی ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

در دل ہر اُمتے کز حق مزہ است　　　روئے وآواز پیمبر معجزہ است

(۱۳) الوند: کوہِ الوند ایران کا مشہور پہاڑ ہے جو مغربی پہاڑوں کے سلسلے میں واقع ہے کہ آذربائیجان سے لے کر خلیج فارس تک کھچا ہوا ہے۔ اس سلسلے کے پہاڑوں کے درمیاں جو وادیاں ہیں وہ بڑی زرخیز[۵] ہیں۔

(۱۴) ۱- انا الحق ۲- منصور حلاج } ۱- میں حق ہوں۔ اکابر صوفیہ (معدودے چند بزرگوں کو چھوڑ کر) کا یہ مذہب ہے کہ منصور نے جو انا الحق کا نعرہ بلند کیا تھا تو وہ اس اعتبار سے تھا کہ حق واقعی اس کی ذات میں جھلکتا تھا کہ حق تو کائنات کی ہر چیز میں جاری وساری ہے۔ چنانچہ محمود شبستری بہ صراحت کہتے ہیں:

ہمہ ذراتِ عالم ہم چوں منصور　　　تو خواہی مست گیر و خواہ مخمور

انا الحق کشفِ اسرار است مطلق　　　بہ جز حق کیست تا گوید انا الحق

ان اشعار کا مطلب واضح ہے کہ خود حق منصور کی زبان سے گویا تھا۔ یہ وحدتِ وجود کے عقیدہ کا منطقی نتیجہ ہے اور اس سے مفر نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ وحدتِ وجود کو اسلام کی تعلیمات کے منافی قرار دیا جائے (دیکھئے مفتی انوار الحق کا نوٹ۔ دیباچہ دیوان غالب نسخہ حمیدیہ) علامہ اس نظریے کے سخت مخالف ہیں کہ ویدانت اور بدھ مت سے متاثر ہے۔ چنانچہ علامہ ایک مغ سے (مجوس کہ یہ بھی آریائی ذہن ہی کے مطابق بات کریں گے) یہ کہلاتے ہیں کہ:

ترا ایں چشم بیدارے بہ خواب است　　　ترا گفتار و کردارے بہ خواب است

(ہم خواب ہیں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں)

---

[۵] جغرافیہ خلافتِ مشرقی، جمیل الرحمٰن (ترجمہ از لی سٹرینج)۔

من، صرف وہم وگمان ہے چنانچہ مغ بچہ کہتا ہے۔

"حیات از خود فریبے خورد و من گفت"

اس صورت میں علامہ یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر حیات اور من وہم وگمان ہے تو پھر دارائے وہم و گمان کون ہے، جسے دھوکا ہوا ہے کہ میں ہوں وہ کون ہے۔ آخر دھوکا کس نے کھایا ہے؟ یہ دلیل قاطع ہے اور اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ مراد یہی ہے کہ انسان کا انا خودی ایک حقیقت ہے ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

۲۔ منصور حلاج (جس نے انا الحق کہا تھا) بہت پر اسرار شخصیت ہے، مسلم ہے کہ ۹۲۲ عیسوی میں خلیفہ عباسی المقتدر نے اسے انا الحق کہنے کی بنا پر (اور عناصر بھی شریک کار تھے) ہلاک کروا دیا تھا۔ صاحب[۱] الفہرست اس کی ۴۶ تصانیف کا ذکر کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ منصور حلاج جس طرح ماحول دیکھتا اسی طرح کی بات کرتا تھا۔ مسلم ہے کہ اس نے بہت سیر و سیاحت کی ہے۔ ہندوستان بھی آیا ہے۔ (لیکن اس کے علم کے متعلق کو مستند شہادت نہیں ہے یعنی یہ کہ وہ عالم بھی تھا) کہا جاتا ہے کہ وہ رجعت، حلول اور تناسخ کا قائل تھا۔

(علامہ اقبال اس کی ایک کتاب پر حواشی لکھنے کے ارادے کا اظہار فرماتے ہیں مکاتیب اقبال) بہر حال اسے دار پر چڑھایا گیا یا اس کی گردن مار دی گئی۔

ڈاکٹر قاسم غنی نے، تصوف در ایران میں جستہ جستہ جہاں ضرورت پڑی ہے حلاج اور اس کے عقائد سے بحث کی ہے اور بہت فاضلانہ مباحث چھیڑے ہیں۔

---

[۱] Litrary History of Persia, E. G. Brown ; 1929

[۲] تاریخ تصوف در ایران جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے دراصل حیات حافظ کا ایک حقیر سا جزو ہے جو ۷۰۰ صفحات میں حافظ کے زمانے تک تصوف اور متصوفانہ مسائل کے ارتقار سے بحث ہوگی۔ پہلی جلد میں قرن ششم تک آئے ہیں۔

فہرست میں منصور اور حلاج دونوں کلمات کے ماتحت جو صفحات ہیں ان کے مطابق مطالعہ کرنا چاہیئے۔

(۱۵) انا المسموم ما عندی بتریاقٍ ولا راقی
ادر کاساً و ناولہا الا یا ایہا الساقی

یہ یزید (خلیفہ اموی) کا شعر ہے، جس کا مطلب ہے، مجھے زہر دے دیا گیا ہے اور میرے پاس نہ تو اس کا کوئی تریاق ہے نہ توڑ۔ اے ساقی جام گردش میں لا اور ادھر مجھے دے (کہ صرف شراب ہی تلخیٔ غمِ ایام کا علاج ہے)، خواجہ حافظ نے ایک مصرع اس شعر کا یوں تظمین کیا ہے (اور مصرع کی صورت بھی بدل دی ہے)

الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا　　کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکل ہا

(۱۶) انا عرضنا: قرآن مجید کا حوالہ بہ تفصیل ذیل ہے۔ ۳۳/۲ (احزاب)

مقام یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے "اپنی امانت کو سارے آسمان اور زمین، پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے اس کے اُٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور آدمی نے اُسے اُٹھا لیا۔ بیشک انسان ظالم اور نادان ہے۔"

یہ امانت کیا تھی اس کے متعلق صاحبِ اخلاق جلالی فرماتے ہیں کہ وہی خلافت الٰہی تھی جس کا سزاوار سوائے انسان کے اور کوئی نہ تھا۔ (اس کے علاوہ بھی تعبیرات ہیں)

بہرحال اس ذکر نے فارسی اور اردو ادبیات کو بہت سی تلمیحات عطا کی ہیں۔ مثلاً خواجہ حافظ کہتے ہیں:

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ کار بنامِ منِ دیوانہ زدند

اور علامہ اقبال فرماتے ہیں

سختیاں کرتا ہوں دل پر غیر سے غافل ہوں میں
ہائے کیا اچھی کہی ظالم ہوں میں جاہل ہوں میں

ذوق نے بھی بڑا اچھا مضمون پیدا کیا ہے۔

بنایا آدمی کو ذوق ایک جزوِ ضعیف
اور اس ضعیف سے کل کام دو جہاں کے لئے

(۱۷) **اہرمن** : زرتشت کے فلسفۂ تکوین کے مطابق خیر و شر کی قوتیں دائماً برسرِ پیکار رہتی ہیں۔ خیر کے قویٰ امشاسپنداں اور ایزداں کہلاتے ہیں۔ یزداں، ایزداں ہی کی ایک صورت ہے۔ دراصل جیسا کہ ظاہر ہے ایزداں، ایزد کی جمع ہے لیکن یزداں اب واحد استعمال ہوتا ہے)
اہرمن، شر کا روپ ہے اور اس کے لغوی معنیٰ "خردِ خبیث" کے ہیں یعنی وہ عقل جو راہ سے بھٹک گئی۔ (ٹھیک، ابلیس اور شیطان کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ بھٹکی ہوئی قوتِ تخلیق اور حدود و قیود سے ماورا خودی ہے)
مقدر ہے کہ محاربۂ خیر و شر میں اہرمن کو شکست ہو۔ اس کا وجود اس لئے ضروری ہے کہ انسان ممکناتِ جسم و جاں سے آگاہ ہو اور جد و جہدِ پیہم سے خودی کی تادیب و تہذیب کرے کہ یہی اصل خیر[۱] ہے۔

(۱۸) **آہنگ** : لشکر[۲] و قصد و کشش و روش و ارادہ۔ آوازے کہ قبل از سرود کشند بہ ہندی الاپ گویند۔

---

[۱] مزدیسنا: محمد معین۔ (طہران)۔ برہان قاطع (ایرانی ایڈیشن) اقبال کا تصورِ خودی۔ عابد حسین (اُردو) اقبال نمبر اقبال اور عشق۔ خلیفہ عبدالحکیم۔ مجلہ اقبال۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء۔ اقبال۔ عزیز احمد۔
[۲] غیاث اللغات، کلمۂ آہنگ۔ فرہنگ آنندراج، کلمۂ آہنگ۔

اس تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ راگ یا راگنی گانے سے پہلے الاپ کے ذریعے راگ یا راگنی کا جو مکھڑا دکھایا جاتا ہے اُسے بھی آہنگ کہتے ہیں۔ الاپنے کا یہی مطلب ہے۔

(۱۹) **ایبک** : قطب الدین ایبک۔ خاندانِ غلاماں کا جلیل القدر فرماں روا (۱۲۰۶-۱۲۱۰ عیسوی) اس حکمراں کی فتوحات کی داستانوں سے تاریخ کے صفحات[1] بڑے جگ مگ جگ مگ کرتے ہیں لیکن اس کا اصل کارنامہ تعمیری تھا۔ مسجد قوت الاسلام (جس کی جلالت وشوکت کا علامہ اقبال کے دل پر بہت اثر تھا) کی بنیاد ایبک ہی نے رکھی تھی۔

قطب مینار بھی ایبک ہی نے بنوانا شروع کیا تھا اور التمش نے پایۂ تکمیل تک پہونچایا اس کی رفعت، اس کی جلالت اور اس کی صلابت بنانے والوں کے عزمِ آہنی، اور ان کے شوکت وجلال کی حجت ہے۔

ہندوستان (بھارت) میں جو ہمارے آثار قدیمہ موجود ہیں ان میں غالباً اس مینار کی جلالتِ شان کا حریف کوئی نہیں ہے۔ مسجد قوت[2] الاسلام اور قطب مینار کی تعریف میں مغرب کے نقاد بھی بہ اتفاق، رطب اللساں ہیں۔

---

[1] A short History of India ; Moreland.

[2] Legacy of India.

(Muslim Architecture in India) ; (Martin S. Briggs)

Oxford University Press ; 1938 (reprint) PP 223-255.

ب

(۱) **بدخشاں**: دریائے جیحون کے اُس پار ماوریٰ النہر کے علاقوں میں ایک علاقہ ہے۔ جو زرخیزی اور شادابی کے اعتبار سے مشہور ہے۔ آج کل شہر بدخشاں کا محلِ وقوع دریافت نہیں ہو سکتا۔ یہ علاقہ پرانے وقتوں سے لاجورد، لعل اور یاقوت کے لئے مشہور تھا۔

(۲) **برہمن زادہ رمز آشنائے روم و تبریز است**: یہاں روم و تبریز سے مراد دینِ اسلام کی باریکیاں ہیں۔ اور برہمن زادہ سے خود علامہ اقبال مراد ہیں جو سپرو خاندان سے متعلق تھے (کشمیری پنڈتوں کا گھرانہ ہے)

تعجب کا اظہار اس لئے کیا ہے کہ آریائی دماغ جو حقیقت کو دو لخت یا سہ لخت یا لخت لخت کر کے دیکھنے کا عادی ہے اسلام کی وحدتِ محض کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اکثر شعرانے کسی نہ کسی رنگ میں اپنی گمرہی کی یہ وجہ ظاہر کی ہے کہ رموزِ دین سے آگاہ نہیں ہو سکے۔ غالب کہتا ہے۔

۱؎ جغرافیہ خلافتِ مشرقی۔ ترجمہ جمیل الرحمٰن۔ حیدرآباد دکن، ۱۹۳۰ء۔

رموزِ دیں شناسم درست معذورم نہادِ من عجمی و طریقِ من عربی است

نظیری کہتا ہے :

شہودیت زپراگندگیم باز آورد دلیل راہِ حقیقت برہمنی است مرا

خود اقبال کہتا ہے :

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں!

یہ آریائی ذہن کا کرشمہ ہے کہ حقیقت کے لئے لباس مجازی تلاش کرتا ہے۔

تصوف کے اصول بھی دراصل اسی آریائی ذہن کی خصوصیات کے مطابق ہیں۔

(۳) بیذق } دونوں شطرنج کے مہروں کے نام ہیں۔ بیذق۔ پیادہ۔ فرزیں۔ وزیر۔
فرزین } انگریزی۔ پیادہ Pawn ۔ وزیر فرزیں Queen

اگر شطرنج کھیلتے ہوئے وزیر مارا جائے تو اسی گھر کا پیادہ وزیر بن جائے گا۔ (یعنی وزیر کے خانے میں پہونچ کر)۔

فرزیں فرز سے ہے۔ فرز کے معنی دانائی کے ہیں۔ وزیر مردِ دانا۔ بیذق پیادہ کا معرب ہے۔ خاص پیادے بھی بیذق کہلاتے ہیں۔

فرز کا کلمہ اور الفاظ کا جزو بھی ہے مثلاً فرزند۔ اس میں اند لاحقہ ہے۔ اند، ونت واند سب آریائی لاحقے ہیں جس کے معنی ہیں صاحب، آقا۔ فرزند کے معنی ہیں صاحبِ دانش اور ہر شخص اپنے لڑکے کو صاحبِ دانش تصور کرتا ہے۔ اس لئے اسے فرزند کہتا ہے۔ کلمہ Friend[۲] بھی دیکھئے جس کے آخر میں اند لاحقہ موجود ہے۔

---

[۱] غیاث۔ کلمہ بیذق۔ برہان قاطع۔ محمد معین۔

[۲] Shipley ; Dictionary of Word Origines.

دیکھئے کلمہ فری (Free)

(۴) **بے ستوں**:- ایران میں جو سلسلۂ کوہ آذر بائیجان سے خلیج فارس تک کھنچا ہوا ہے اس کا ایک جزو کوہ بے ستوں بھی ہے (الوند بھی اسی سلسلۂ کوہ میں واقع ہے) بے ستوں، خاص طور پر کرمان شاہان سے منسوب[1] ہے۔ اس پہاڑ کا نام بھی غور طلب ہے۔ حقیقت میں اس کی قدیمی اور اصلی شکل بغستاں[2] تھی یعنی بغ+ستاں۔ بغ دیوتا اور بت کو کہتے ہیں۔ ستاں، جگہ اور مقام کو تو اس کے لغوی معنی ہیں وہ کوہ کہ محل خدایاں ہے (جہاں دیوتا اترتے ہیں)۔ آہستہ آہستہ یہ کلمہ بہستان میں تبدیل ہوا۔ اور پھر لہجے کے طبعی تغیر نے الف کو نون میں تبدیل کر کے بے ستون بنا دیا۔ اس پہاڑ کی چوٹیوں پر، خاص طور پر ایرانِ قدیم میں دیوتاؤں کی پرستش کی جاتی تھی۔

بغ کا کلمہ مختلف شکلوں میں فارسی کے کئی کلمات کا جزو ہے اور ہر جگہ اس کے معانی خدا اور دیوتا کے ہیں۔ مثلاً بغداد (بغ+داد) یہ دادِ بغ (بہ طریقِ اضافتِ مقلوب) ہے۔ اور اس کے معنی ہیں عطیۂ خدایان۔ بغداد[3] میں دیوی ناہید، (اناہتہ۔ استرنی۔ زہرہ) کا مندر تھا۔ یہ شہر اسی سے منسوب ہو کر بغداد کہلاتا تھا۔ (نوشیرواں والا قصہ غلطِ محض ہے)

فغفورِ چین میں پہلا کلمہ مرکب ہے فغ+فور۔ فغ۔ بغ ہی کی ایک شکل ہے تو دراصل کلمہ بغپور ہے۔ یعنی پورِ بغ۔ پسرِ خدا۔ دیوتاؤں کا بیٹا۔ یہ چین کے بادشاہوں کا عمومی لقب ہے اور انگریزی میں بھی یہ بادشاہ Son of Heaven کہلاتے ہیں۔

یہاں ایران قدیم سے متعلق کتابات[4] بھی موجود ہیں۔ اور بہ حسبِ روایت مشہور، فرہاد سے بھی یہ پہاڑ منسوب[5] ہے۔ صاحبِ[6] فرہنگِ آنندراج کہتے ہیں کہ یہاں فرہاد، شیریں کا مجسمہ سنگی

---

[1] جغرافیہ خلافتِ مشرقی جمیل الرحمٰن (حیدرآباد) ترجمہ از (Le Strange) [2] برہانِ قاطع مرتبہ محمد معین [3] ایضاً [4] بہاؤن۔ تاریخِ ادبیاتِ ایران جلد اول [5] نظامی۔ شیریں خسرو [6] کلمہ بے ستون۔

بکوہے کرد خسرو رہ نمونش — کہ خواند ہر کس اکنوں بے ستونش
چو شیر تند از ایواں بروں شد — بداں تندی بہ کوہ بے ستوں شد

بنانا چاہتا تھا لیکن کام نہ پورا ہو سکا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ مشہور و معروف جوئے شیر اسی پہاڑ سے کاٹی گئی تھی۔

اگرچہ فارسی اور اردو ادبیات میں شیریں فرہاد کی داستانِ محبت مشہور ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ شیریں کا تو ایک تاریخی شخصیت ہونا مسلم ہے اور خسرو سے اس کی شادی کی داستان بھی تاریخوں میں بہ تفصیل بیان کی گئی ہے (شیریں مذہباً عیسائی تھی)، لیکن فرہاد کا ایک تاریخی شخصیت ہونا محل نظر ہے۔ ہاں بہت قدیم زمانے سے یہ روایت ایران میں مشہور چلی آئی ہے کہ فرہاد نامی ایک فن کار شیریں پر عاشق ہو گیا تھا۔ چنانچہ بلعمی کے ہاں یہ روایت موجود ہے وہ کہتا ہے کہ خسرو نے فرہاد کو یہ سزا دی کہ کوہِ بےستوں میں سے پتھر نکالنے کے لئے بھیج دیا۔ پتھر کا ایک ایک ٹکڑا جو وہ کھود کر نکالتا تھا اتنا وزنی ہوتا تھا کہ آج سو آدمی مل کر بھی اسے نہ اٹھا سکیں[۵۲]

علامہ اقبال نے فرہاد شیریں اور بےستوں کے سلسلہ تلمیحات سے بھی بہت کام لیا ہے۔ ایک شعر بہت معنی خیز ہے۔

عشق بدوش می کشد ایں ہمہ کوہسار را
تیشہ اگر بہ سنگ زد ایں چہ مقام گفتگو است

(۵) بیکن: فرانسس[۵۳] بیکن (۱۵۶۱-۱۶۲۶) مشہور فلسفی مفکر اور مدبر (انگریز) جس کے متعلق آج تک یہ نزاع قائم ہے کہ شیکسپیر کے ڈراموں کا مصنف وہ تو نہیں ہے۔ اس موضوع پر سینکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔

بیکن تحریک احیائے علمی کی رجائیت[۵۴] اور عزم کا ترجمان تھا۔
اس کی تصانیف اور اسلوب تحریر سے دوسرے مفکر بہت متاثر ہوئے ہیں۔

---

[۵۱] غیاث اللغات۔ [۵۲] ایران بہ عہدِ ساسانیاں۔ ترجمہ ڈاکٹر محمد اقبال۔ (دہلی ۱۹۴۱ء صفحہ ۶۲۴)۔

[۵۳] Dictionary of Philosophy [۵۴] Story of Philosophy

پ

(۱) پروانہ: پرو۔ ستارہ (اسی سے پروین ہے) مجازاً نور اور روشنی کو کہتے ہیں تو پروانہ وہ ہے جو روشنی سے منسوب ہو کہ آنہ کلمہ نسبت ہے جیسے دیو سے دیوانہ، فرز سے فرزانہ۔

پروانے کے متعلق اقبال کا فکری ارتقا غور کے قابل ہے۔ پہلے، پروانہ کا روایتی مفہوم اقبال کے کلام میں بھی نظر آتا تھا۔ مثلاً :-

محبت چوں تمام افتد رقابت از میاں خیزد به طوفِ شعلہ پروانہ با پروانہ می سازد

رفتہ رفتہ پروانہ کے روایتی مفہوم سے علامہ اجتناب کرنے لگے اور پروانہ اس فرد کی علامت ہو گیا جو، اپنی رائے نہ رکھنے کے باعث، آتش بیگانہ کا طواف کرتا ہے:

دلا نارائی پروانہ تا کے نگیری شیوۂ مردانہ تا کے
یکے خود را بہ سوزِ خویشتن سوز طوافِ آتشِ بیگانہ تا کے

لے پیام مشرق۔

اس خیال کا منطقی نتیجہ، ان اشعار میں نظر آتا ہے:

پروانہ اور جگنو[۱]

پروانہ

پروانے کی منزل سے بہت دور ہے جگنو کس آتشِ بے سوز پہ مغرور ہے جگنو

جگنو

اللہ کا سو شکر کہ پروانہ نہیں میں دریوزہ گرِ آتشِ بیگانہ نہیں میں

(۲) پرویز، خسرو پرویز: مشہور ایرانی بادشاہ (ساسانی) ۵۹۰ عیسوی میں تخت نشیں ہوا۔ اس کے عہد کا جاہ و جلال و طمطراق مشہور ہے۔ باربد، نکیسا، شیریں فرہاد کی داستانیں اسی کے عہد سے منسوب ہیں[۲]۔ غالب کہتا ہے:

حسابِ مے و رامش و رنگ و بوئی ز جمشید و بہرام و پرویز جوئی

(تفصیل کے لئے دیکھئے بے ستوں)۔

(۳) پرویں[۳]: فارسی ہے۔ عربی ثریا۔ ہندی سات سہیلیوں کا جھمکا، روشن ستارے۔ پرو بھی ستارے ہی کو کہتے ہیں۔ اور مجازاً پرو نور اور روشنی کو کہتے ہیں۔ پروانہ اسی سے ہے کہ طالبِ نور ہے۔ آنہ کلمۂ نسبت ہے۔ جیسے دیو سے دیوانہ۔ فرز (دانائی) سے فرزانہ۔

(یہ بھی تحقیق ہوا ہے کہ پروانے روشنی کی طلب میں چاند اور تاروں تک پہنچنے کی کوشش کرتے تھے)۔

(۴) پطرس: حضرت عیسیٰ کے بارہ حواریوں میں سب سے نمایاں اور ممتاز حواری۔

---

[۱] بالِ جبریل - [۲] ایران بہ عہدِ ساسانیاں۔ ترجمہ محمد اقبال دہلی ۱۹۴۱ء -

[۳] (الف) برہانِ قاطع۔ معین۔ کلمات پرو۔ پروانہ۔ پرویز (ب) سرگذشتِ الفاظ (احمد دین) کلمہ پروانہ ۷۹ (برہانِ قاطع میں کلمہ پرویز بھی اسی سلسلے میں غور و تامل کا سزاوار ہے)۔

حواری کے معنی ناصر اور مددگار کے ہیں، اور بعض عالموں نے لکھا ہے کہ حواری کے معنی ہیں جس کا قلب دھل کر صاف ہو جائے۔ پطرس[1] کے دو خط بھی نئے عہد نامے میں شامل ہیں۔ (متوفی ۶۸ عیسوی)۔

(۵) پیرِ مغاں[2]: (دیکھیے مغ) مرشدِ کامل (زرتشت کے مسلک کا پیرو) اصطلاح ہے۔ اربابِ تصوف کے نزدیک، مرشد یا شیخ کے بغیر، خدا تک رسائی ممکن نہیں ہے۔ وہی مرشد یا شیخ یہ پیرِ مغاں ہے۔ کبھی محض پیر بھی کہہ دیتے ہیں۔ جیسے:

پیرِ ما را ز فراست نظرے کامل بود
کہ مرا توبہ نہ از دیدنِ خوباں دادست

---

[1] نیا عہدنامہ۔ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور، صفحات ۳۴-۲۲۷ -

※ حضرت عیسیٰ اور ان کے حواریوں کے متعلق قصص القرآن جلد چہارم میں بھی مفصل حالات مندرج ہیں۔

[2] تاریخ تصوف در ایران۔ قاسم غنی (۱۳۶۲ طہران) صفحات ۲۳۰ تا ۲۴۰ -

ت

(۱) **تاج**: تاج محل۔ ممتاز محل ارجمند بانو بیگم کا مقبرہ جو شاہ جہاں نے تعمیر کروایا تھا اس کے متعلق شدید اختلاف ہے کہ اس کے معمار یا مہندس یا طرح افگن کون لوگ تھے۔

تاج کی تعمیر کے سلسلے میں ان صناعوں[1] کے نام لئے جاتے ہیں۔ استاد عیسیٰ، استاد احمد، استاد حا[2]

تاج محل دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتا ہے اور ہر سنجیدہ مزاج نقاد نے، اس عمارت کی روش اور خوب صورتی، جلال و جمال کی تعریف کی ہے۔

عبداللہ چغتائی نے اپنے تازہ ترین مضمون میں تاج محل کے معماروں کے متعلق بہت سے حوالے جمع کیے ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق یہ تحقیق نہیں ہو سکتا کہ تاج محل کی طرح کس نے ڈالی مشہور ہے کہ استاد عیسیٰ معمار تاج ہے۔ ترکی منابع یوسف کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ شاہ جہاں

---

[1] معمار تاج۔ محمد عبداللہ چغتائی۔ رسالہ کارواں لاہور، پہلا شمارہ و اس کے دو شمارے شائع ہوئے تھے۔ صفحات ۱۲۴۔ ۱۲۵۔ ماہ نو۔ اگست۔ ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء معمار تاج۔ عبداللہ چغتائی۔

[2] Legacy of India

کے زمانے کے مورخ ذکر کرتے ہیں کہ لال قلعہ کی تعمیر میں دو استاد شریک تھے احمد اور حامد۔ احمد کا لڑکا لطف اللہ مدعی ہے کہ اس کا باپ ہی معمار تاج ہے۔ شاہ جہاں ہی کے زمانے کے کچھ اور مورخ بیان کرتے ہیں کہ تعمیر تاج کی سعادت میر کرمت خاں اور میر عبدالکریم کے حصے میں آئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی آیات امانت خاں شیرازی نے کندہ کی تھیں (نسخ) بعض لوگوں کو امانت خاں پر معمار تاج ہونے کا اشتباہ ہوا ہے۔

بہر حال تاج میں چند تعمیری خصوصیتیں نظر آتی ہیں۔ جو غالباً دنیا کی کسی عمارت میں جمع نہیں۔ مثلاً عدیم النظیر گنبد۔ سفید سنگ مرمر پر نوک پلک رکھنے والے نقش ونگار۔ کونوں کے نازک اور نفیس مینار، اور درمیانی گنبد کے چاروں طرف چار گنبد، تاج میں اور دنیا کے تعمیری شاہکاروں میں کہیں کہیں مشابہت ضرور نظر آئے گی لیکن اس کے باوصف تاج نفاست حسن وجمال اور مختلف تعمیری خصائص کے امتزاج کی بنا پر ہمیشہ بے مثال سمجھا جائے گا۔[۱]

(۲) تجلّی: روشن وآشکار کردن۔ اور ایرانیوں کے ہاں غلبۂ نور الٰہی کا کنایہ ہے (حضرت موسیٰ اور کوہِ طور) تصوف کی اصطلاح میں، اس کے معنیٰ بہت پیچدار ہیں۔

"تاثیر انوار حق را باشند بحکم اقبال بر دل مقبلاں کہ بداں شایستۂ آں شوند کہ بدل مرحق ببینند" (ہجویری، بہ نقل از فرہنگ مصطلحات صوفیہ، ضمیمہ تاریخ تصوف در اسلام)[۲]

یہ مفہوم کہ غلبۂ نور "بہ حکم اقبال" ہوتا ہے۔ اقبال کے تصورِ الہام سے بہت قریب ہے کہ اس کے

---

[۱] عبداللہ چغتائی مجلۂ اقبال لاہور جولائی ۱۹۵۵ء۔ فاضل مقالہ نگار کا مضمون انگریزی میں ہے۔ میں نے بعض مطالب کا خلاصہ بیان کیا ہے۔ چغتائی صاحب نے بہت مستند کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔

[۲] قاسم غنی پہلے حوالہ مفصل آچکا ہے۔

لیکن اس شعر کو ملحوظ خاطر رکھیے:۔

صاحبِ ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط انداز بھی ہوتا ہے سروش

خیال میں بھی ملہم۔ الہامی کیفیت کی کلیت کو قبول کرنے پر مجبور ہے۔ وہ یہ نہیں کر سکتا کہ جو پہلو ناپسند ہوں اس کو مسترد کر دے۔

تجلّی کا قرآنی حوالہ بہ تفصیلِ ذیل ہے $\frac{۷}{۱۴۳}$ (الاعراف)۔

مقام یہ ہے کہ حضرت موسیٰ خدا کا جلوہ دیکھنے کی تمنا کا اظہار کرتے ہیں اور جواب ملتا ہے "تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے، مگر ہاں اس پہاڑ کی طرف دیکھو (ہم اس پر اپنی تجلی ڈالتے ہیں) اگر پہاڑ اپنی جگہ پر قائم رہے تو سمجھنا کہ عنقریب مجھے بھی دیکھ لوگے اور پھر جب ان کے پروردگار نے پہاڑ پر تجلی ڈالی تو اس کو ریزہ ریزہ چکنا چور کر دیا۔" (کلیم بھی دیکھیے)۔

ج

(۱) **جان**: فارسی میں مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے مثلاً، خواہشاتِ نفسانی:

جاں بود میانِ وے وجاناں حائل — فی الحال کہ جاں داد، بجاناں پیوست

اعتباری ہستی کے معنی میں:-

ایں جانِ عاریت کہ بہ حافظ سپرد دوست — روزے رُخش ببینم و تسلیم وے کنم

دل کے ساتھ:-

دل و جانم بہ تو مشغول و نظر در چپ و راست — تا نہ دانند رقیباں کہ تو منظورِ منی

مطلق زندگی:-

میازار مورے کہ دانہ کش است — کہ جاں دارد و جانِ شیریں خوش است

فکر یا فکری کوشش کے لئے، یا روحانی کاوش کے لئے:-

با کاروانِ حلہ برفتم ز سیستاں — با حلۂ تنیدہ ز دل بافتہ ز جاں

اقبال کے ہاں جان ایغو یا خودی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں ایغو یا خودی ہی کے لئے استعمال ہوا ہے۔

(۲) جبریل (امین): یہ عبرانی اور عربی زبان کا لفظ ہے (فرشتہ) انھیں کے ذریعے رسول پر وحی نازل ہوتی تھی۔ وہ امین بھی اسی لئے کہلاتے ہیں کہ کلامِ الٰہی بجنسہ رسول تک پہنچا دیتے تھے۔ عقل فعال بھی انھیں کو کہتے ہیں۔ عقلِ اوّل کے متعلق اختلاف ہے۔ عقل اول سے نورِ محمدی بھی مراد ہوتا ہے اور جبریل بھی۔ اسی طرح عقلِ کل کہہ کر جبریل اور نورِ محمدی بھی مراد لیتے ہیں اور عرشِ اعظم بھی مراد لیتے ہیں۔[۵]

جبریل امین کے متعلق کچھ قرآنی حوالے بہ تفصیلِ ذیل ہیں۔ ۶۶/۴ (تحریم)

"خدا اور جبریل اور تمام ایماندار ی میں نیک شخص ان کے مددگار ہیں"۔ ۲/۹۸ (بقر) (اور ۲/۹۷ بھی دیکھئے)۔

"جو شخص خدا اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبرئیل و میکائیل کا دشمن ہو تو بے شک خدا بھی کافروں کا دشمن ہے"۔

اقبال کے کلام میں بعض اوقات جبریل کا کلمہ اصول علم محض کی علامت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

(۳) جبر و قدر: که ایماں درمیانِ جبر و قدر است

بہ حسبِ مشہور رسول پاکؐ کی حدیث کی طرف اشارہ ہے (دیکھئے ح) کہ مسلک درست یہ ہے کہ انسان جبر و قدر کے بین بین چلے۔ نہ تو یہ خیال کرے کہ میں ہر کام میں خود مختار ہوں نہ یہ گمان کرے کہ مجبورِ محض ہوں۔ اس کی بہت سی تاویلیں کی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ جو سنتِ الٰہی

---

[۵] غیاث اللغات، کلمہ جبریل، عقلِ کل، عقلِ اول۔ آنندراج۔ کلمۂ جبریل۔ س۔ حیم، کلمہ جبرائیل۔ (لغت فارسی انگلشی)۔

ہے۔ قانون ہے وہ تو اٹل ہے۔ انسان اس کی پابندی پر مجبور ہے۔ اختیار اس میں ہے کہ انسان اپنے آپ کو کس قانون اور کس آئین کے ماتحت لے آتا ہے۔ آئین یہ ہے کہ محنت کرنے والا کامیاب ہوگا۔ اب اگر کوئی شخص محنت نہیں کرتا تو وہ ایک اور قانون کا پابند ہے جو اس کی ناکامیابی کا ضامن ہے لیکن اگر وہ محنت کرنا شروع کردے تو وہ اپنے آپ کو ایک نئے قانون کے ماتحت لے آئے گا اور اس کی تقدیر بدل جائے گی۔

تصوف میں تو تسلیم و رضا کے کرشموں نے کسی عمل و جدوجہد کا راستہ ہی کھلا نہیں رہنے دیا، ان کا قول مشہور ہے کہ :

(۱) وہ ہوتا ہے جو خدا چاہتا ہے۔

(۲) صوفی وہ چاہتا ہے جو خدا چاہتا ہے۔

(۳) اس لیے ہوتا وہ ہے جو صوفی چاہتا ہے۔

اس میں جو مغالطہ چاہنے کے لفظ سے پیدا ہوا ہے وہ مخفی نہیں ہے۔

بہرحال جبر کے عقیدے نے مشرق کے لوگوں کو بہت بڑی حد تک بے عملی کا مذہبی جواز عطا کیا ہے۔ علامہ اقبال نے اس بے عملی اور تقدیر کے اس تصور کے خلاف جہاد کیا اور کہا :

- عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں   تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

یہی نشاں ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں

جبر کے مختلف نام اور روپ ہیں۔ قسمت، تقدیر، اندھا اتفاق۔ مایا کا چکر، خدائی احکام لیکن نتیجہ کم و بیش وہی ہے یعنی ایک مرحلے پر بے عملی ضرور پیدا ہوتی ہے۔ قدر کے

مختلف پہلوؤں پر بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے یعنی کہ آدمی کس معنی میں مختار ہے، اپنی طبیعت اور ضمیر سے بھی مجبور ہے یا نہیں[۵۱]۔

خود علامہ فرماتے ہیں کہ تقدیر کوئی قوت نہیں، جو ایک قہرمان کی طرح عمل کرتی ہو دراصل تقدیر مخلوقات کی باطنی قدرت کا اظہار ہے جو اس کی فطرت کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے۔ یوں گویا مخلوقات کی قابلیت اور اقتضاآت ہی کو اختیار کیا جا سکتا ہے لہذا ذاتِ شے پر کوئی جبر واقع نہیں ہوتا[۵۲]۔

خلیفہ عبدالحکیم مولینا روم کے عقاید سے بحث کرتے ہوئے جبر و قدر کے سلسلے میں کہتے ہیں۔

"جبر سب سے زیادہ ریاضی میں ملتا ہے۔ یا ریاضی طبیعیات میں۔ اس لئے کہ ادراک فطرت مادی میں جبر ہی موزوں آلہ ہے لیکن اخلاقی اور روحی زندگی اور وجدان حیات میں۔ یہ جبر کا آلہ بالکل کام نہیں آتا۔ جیمز بھی مولینا روم کی طرح کہتا ہے کہ اختیار کے بغیر اخلاقی احساس بے معنی ہوگا لیکن چونکہ اخلاقی ایک ناگزیر حقیقت ہے اس لئے اختیار کو بھی لازماً تسلیم کرنا پڑے گا۔"

---

[۵۱] Dictionary of Philosophy) PP. 112 and 248

اور دیکھئے رضی الدین صدیقی کا مضمون "اقبال اور مسئلہ جبر و قدر" مجلہ اقبال اپریل ۱۹۵۳ء۔

[۵۲] تصوف اور قرآن۔ میر ولی الدین۔ صفحہ ۱۶۱۔ انتظامی پریس حیدرآباد۔

(مولف کا عقیدہ ہے کہ یہ قول امام جعفر صادق کا ہے:

لا جبر و لا قدر بل امر بین الامرین

نہ جبر ہے نہ قدر بلکہ حقیقت دونوں کے درمیان ہے۔ صفحہ ۱۶۲)

[۵۳] مجلہ ثقافت لاہور، مئی ۱۹۵۵ء "رومی اور مسئلہ جبر و قدر" اقبال کا تصور جبر و قدر سمجھنے میں اس مقالے کا مطالعہ بہت سودمند ثابت ہوگا۔

(۴) جیحون: مشہور دریا جسے آمو دریا بھی کہتے ہیں۔ ایران و توران کے درمیان حدِ فاصل مانا جاتا تھا۔ اس دریا کے پار شمال میں جو ممالک تھے۔ وہ ماوراالنہر کہلاتے تھے (اس دریا کو سیر دریا بھی کہتے ہیں اور دریائے بلخ بھی)۔

اس دریا کے سرچشمے تبت خورد کی ایک جھیل اور کوہستان پامیر کے اوپر سے شروع ہوتے تھے۔

مرداب کے قریب یہ دریا بحیرہ ارل میں گرتا ہے۔

جیحوں پار کے ملک عام طور پر ان علاقوں پر مشتمل سمجھے جاتے تھے۔ (۱) سغد (بخارا اور سمرقند یہیں واقع تھے) (۲) خوارزم۔ آج کل اسے خیوہ کہتے ہیں۔ (۳) صغانیاں۔ اس میں ختل (اور بدخشاں کا علاقہ بھی شامل تھا۔ (۴) فرغانہ (۵) شاش جو آج کل تاشقند کہلاتا ہے[۱]۔ جیحون اور سیحون کے درمیان کا علاقہ بھی جنت ارضی شمار ہوتا تھا اور تمدن و تہذیب کے اعتبار سے بھی اس کی بہت اہمیت تھی۔

---

[۱] جغرافیہ خلافتِ مشرقی Le Strange ترجمہ جمیل الرحمٰن۔ حیدرآباد۔ جامعہ عثمانیہ۔

ح

(۱) حجاز: عرب کا حصہ جو گویا اسلام کا گہوارہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تہذیب اسلامی کو تہذیب حجازی بھی کہتے ہیں۔

اقبال اپنی شاعری کے متعلق دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کی لے حجازی ہے۔

نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

علامہ اپنے شعر کا مقامِ تازی بھی بتاتے ہیں تو معلوم ہوا کہ حجازی اور تازی ایک ہی معانی پر دال ہیں:

کوئی دیکھے تو میری نے نوازی　　نفس ہندی مقامِ نغمہ تازی

نگہ آلودۂ اندازِ افرنگ　　طبیعت غزنوی قسمت ایازی

(۲) حرم: ایرانی ادبیات میں اس لفظ کے مختلف معنی ہیں مثلاً مکان کا وہ حصہ جہاں عورتیں اقامت پذیر ہوں لیکن یہاں اس کے معنی خانہ کعبہ ہیں۔ کسی جاندار کو وہاں ہلاک کرنا

حرام ہے (گرد اگرد خانہ کعبہ کو بھی کہتے ہیں) کعبہ کی بنا جیسا کہ سب جانتے ہیں حضرت ابراہیم نے رکھی تھی اور حضرت اسمٰعیل[۱] شریک کار تھے۔

(۳) حسن را در بوزہ از فطرت کند: آرٹ کے سلسلے میں اقبال نے بہ صراحت اس بات کا اظہار کیا ہے کہ فطرت صرف "ہے" اور جو ہونا چاہیئے اس کی راہ میں حایل ہوتی ہے۔ صناع بہ جبر و قہر فطرت کے خام مسالے کو اپنی منشا کے مطابق استعمال کرتا ہے۔ گویا صناع جو نئی خارجی دنیا پیدا کرنا چاہتا ہے۔ فطرت اپنے تمام موانع کے ساتھ اس کی کوششیں باطل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ صناع فطرت کا نقال نہیں ہے۔ اسے "ہست" "نہیں" بایست سے سروکار ہونا چاہیئے۔ اس لئے عالی مقام صناع آرٹسٹ وہ ہے جو فطرت کی دریوزہ گری کرنے کی بجائے۔ اس کی نقالی کرنے کی بجائے وہ نئی دنیا پیدا کرے جو اس دنیا سے زیادہ دلپذیر ہو۔ اقبال کے تمام نقادوں نے کم و بیش اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے اور خود غزلوں میں بھی اقبال[۲] کے اشعار اس نظریے کی تائید کرتے ہیں:

غزل آں گو کہ فطرت ساز خود را پردہ گرداند
چہ آید زاں غزل خوانے کہ با فطرت ہم آہنگ است

۱ے قصص القرآن۔ سید صدر الدین بلاغی، ۱۳۲۰ شمس چاپ تابان۔ اور قرآن مجید سورۂ بقر۔

۲ے اقبال کا آرٹ۔ یوسف حسین خان۔ جوہر اقبال۔

اقبال اور فنونِ لطیفہ۔ سید عابد علی۔ مقالاتِ یوم اقبال۔

اقبال کا نظریۂ فن۔ عزیز احمد (مفصل حوالہ آچکا ہے)۔

اقبال نئی تشکیل۔ عزیز احمد (مفصل حوالہ آچکا ہے)۔

ملفوظاتِ اقبال۔ مختلف مضامین۔ مرتبہ محمود نظامی لاہور۔

Iqbal's Theory of Art (M. M. Sharif) Iqbal Lahore, January, 1954.

(۴) سیّدنا حسین (امام مظلوم): رسول پاک کے نواسے حضرت علی کے خلف الرشید اور جناب فاطمہ زہرا کے لختِ جگر تھے۔ استقامت اور صبر میں بے نظیر تھے اور رسول پاک کے گھرانے کی تمام خوبیوں کے مالک تھے

یزید (۶۰-۶۴ھ) نے ان کو بیعت پر مجبور کرنا چاہا تو اس کے فسق و فجور کو دیکھتے ہوئے انکار کر دیا۔ ادھر کوفہ کے لوگوں نے امام کو بلوایا کہ ہم آپ کے ساتھ مل کر یزید کے خلاف جنگ کریں گے حضرت امام حسین کربلا کے مقام پر پہونچے تو عمرو بن سعد، عبیداللہ ابن زیاد کی فوج لے کر مقابلے پر آئے۔ بیعت یزید پر اصرار کیا۔ امام نے انکار کیا۔ لڑائی ہوئی اور آخر امام اپنے رفقا سمیت (سب ۷۲ تھے) شہید ہو گئے۔

یہ دس محرم ۶۱ ہجری کا واقعہ ہے (دس اکتوبر ۶۸۰ء)۔

(۵) حکیم: حکمت سے ہے۔ (صاحبِ حکمت) کلاسیکی فارسی میں اور جدید فارسی میں بھی اس کے معنی فلسفی ہیں۔ (دانش ور* مفکر) طبیب کے معنی میں معلوم نہیں اردو میں کب سے استعمال ہونا شروع ہوا لیکن وجہ تو ظاہر ہے کہ فلاسفہ قدیم طب کا بھی ذوق رکھتے تھے چنانچہ بو علی سینا کی فضیلت طب میں اور فلسفے میں مشہور ہے حکمت کے معنی ہیں "دانائی و درست کرداری و نام علمیست کہ در و بحث کردہ شود بہ احوال خارجیہ چنانکہ ہست در نفس الامر (بقدر طاقتِ بشری) و آں بر سہ گونہ است طبعی، ریاضی و الہی[1]"۔

(۶) حی الذی لا یموت ... ۲۵/۵۸ (فرقان) اس خدا پر بھروسہ رکھو جو کبھی نہیں مرے گا؛

---

[1] غیاث، کلمہ حکمت۔ میں نے ابتدائی فقرے لکھ دئے ہیں۔ صاحبِ غیاث نے کافی طویل بحث حکمت کی نوعیت سے کی ہے۔

* فلسفے کے معنی ہیں دانش پر شیفتہ ہونا۔ اس کی مختلف شاخوں کے لئے دیکھئے۔

خدائے تعالیٰ ازلی اور ابدی ہیں اور انھیں کے لئے یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کے سوا ہر چیز فانی اور حادث ہے۔

(۷) حیدر۔ خیبر: حیدر کرار حضرت علیؓ کا لقب ہے۔ حیدر کے معنی ہیں اسد و شیر درندہ۔ حضرت علی کی شجاعت کی وجہ سے ان کو یہ لقب دیا گیا۔

حضرت علی خلافت راشدہ کے سلسلے میں چوتھے فرماں روا تھے۔ ۳۵ھ میں تخت نشیں ہوئے اور ۴۰ھ میں شہید ہوئے۔ ان کا علم و فضل، تقویٰ، تدبر، دانشوری مسلم ہے۔

خیبر مدینے سے کوئی دو سو میل کے فاصلے پر، شمال میں یہودیوں کی ایک اہم بستی تھی جہاں ان کے بہت مضبوط قلعے تھے۔ آخر یہ بستی مسلمانوں کے خلاف سازش کا مرکز بن گئی تھی رسول پاک کو مدافعت کرنا پڑی۔ جنگ خیبر میں ۹۳ یہودی مارے گئے۔ قلعہ قموص کا سردار مرحب، حضرت علی کی شمشیر کا شکار ہوا۔ مسلمانوں کا بہت کم نقصان ہوا صرف ۱۵ آدمی شہید ہوئے۔

خ

(۱) **خواجہ**: خداوند[1]۔ داخلِ القاب سادات۔ بزرگی کے معانی تو اس کلمے میں شامل ہیں۔ نعت میں استعمال ہو کر تقدس کا جزو بھی شامل ہو گیا ہے کہ رسولِ پاکؐ کو بھی خواجہ کہتے ہیں۔ نظامی[2] اپنی نعتوں میں اکثر انھیں اس لقب سے یاد کرتا ہے۔

اقبال کے کلام میں خواجہ، رمز کے طور پر، سرمایہ دار کے لئے بھی آتا ہے اور خواجگی سرمایہ داری کے لئے جیسے:

خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

(۲) **خاور**: بفتحِ واو۔ اس کے معنی مشرق بھی ہیں اور مغرب بھی۔ یہ صاحب غیاث اللغات کا قول ہے لیکن فارسی ادبیات میں بالعموم مشرق ہی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ شاہ خاور آفتاب کو کہتے ہیں جو مشرق کی طرف سے طلوع ہوتا ہے، اور خاوراں جس میں الف۔ ن کلمات

---

[1] فرہنگ آنندراج۔ [2] مخزن اسرار میں نظامی رسول کو خواجۂ جہاں کے لقب سے یاد کرتا ہے۔

نسبت ہیں۔ مشرقی ممالک اور مشرق کو کہتے ہیں۔ خاوران کے متعلق ارباب لغت یہ لکھتے ہیں کہ ایران کے مشرق کی طرف ایک ملک ہے، خراسان میں، خاوران یا خابران ایک علاقے کا نام ہے۔ لی سٹرینج[۱] نے انوری کے متعلق لکھا ہے کہ وہ یہیں کا رہنے والا تھا۔

خراسان بھی وہی علاقہ ہے جو ایران سے مشرق میں واقع ہے۔ بہرحال علامہ اقبال خاوران کو مطلق مشرق کے معنی میں استعمال کرتے ہیں گلشنِ رازِ جدید کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے۔

بہ ضمیرِ تو جہانے دگر آفریدہ ام من — بہ سوادِ دیدۂ تو نظر آفریدہ ام من

بہ سرودِ زندگانی سحر آفریدہ ام من — ہمہ خاوراں بخوابے کہ نہاں ز چشمِ انجم

خراسان کے متعلق قیاس یہ چاہتا ہے کہ یہ خور + استھان ہو۔ خور = سورج، جیسے خورشید میں۔ استھان = آستان۔ مقام، جگہ۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ علاقہ مشرقی علاقہ ہے اور سورج اسی طرف سے طلوع ہوتا ہے۔ اقبال کے اس مصرع میں:

بیا کہ خاوریاں نقشِ تازہ بستند

خاوریاں سے اہلِ مشرق، مراد ہے۔

(۳) خدا خواہی بہ خود نزدیک تر شو: عرفانِ نفس خدا شناسی کے لئے ضروری ہے اور ہر دانش ور نے کم و بیش یہ بات کہی ہے۔ قدیم ترین فلسفیوں میں سقراط[۲] بھی کہا کرتا تھا اپنے آپ کو پہچان، عرفانِ ذات حاصل کر، اس کے بغیر فلسفے کی تحصیل نہیں ہو سکتی۔

---

[۱] جغرافیہ خلافتِ مشرقی۔ لی سٹرینج۔ مترجمہ جمیل احمد ۱۹۳۰ء صفحہ ۹۵-۳۹۴ -

[۲] سقراط (داستانِ دانش) -

The Story of Philosophy ; Will Durant, P. 9 (1953 Edition)

(یوں بھی خوآتاے، ختاے، خدا۔ دراصل خود یا خوت ہی سے مشتق ہے اور اس طرح نفس انسانی اور خدا کا تعلق ظاہر ہے) (۱۳۲۶ھ مزدیسنا۔ محمد معین صفحہ ۳۳۳) -

مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ، وَمَنْ عَرَفَ رَبَّہٗ کَلَّ لِسَانُہٗ

جس نے اپنے نفس کی معرفت حاصل کی اُس نے اپنے رب کو پہچان لیا اور جس نے اپنے رب کو پہچانا اُس کی گفتگو میں کمی آگئی۔

مشہور ہے کہ حدیثِ نبوی ہے۔

(۴) خسرو: بہ امیدِ آں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد

مشہور ہے کہ یہ امیر خسرو کا شعر ہے

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ بر کف بہ امیدِ آں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد

اقبال نے ایک مصرع لے لیا ہے۔

(۵) خسرو: ایران کے تمام بادشاہوں کا عمومی لقب ہے لیکن دو بادشاہوں کے نام کے ساتھ خاص طور پر استعمال ہوتا ہے، خسرو[1] پرویز اور خسرو[1] انوشیرواں (یہ دونوں ساسانی بادشاہ ہیں)۔

عرب والوں نے اس کی تعریب کی ہے کِسریٰ[2]، بہ کسرِ حرفِ اول اور اس کی جمع اکاسرہ لاتے ہیں اور اب محاورے میں اکاسرہ کہہ کر سلاطین جابرہ بھی مراد لے لیتے ہیں۔ ایرانی بادشاہوں کی تخصیص نہیں۔

(۶) خضر: ادبی روایت میں راہ نمائی کے فرائض انجام دیتے ہیں، سمندروں اور دریاؤں کے مالک بھی (روایت ہی کے مطابق) یہی ہیں۔ آبِ حیات انھیں نے پیا تھا۔ سکندر کو چشمۂ حیواں پر یہی لے جانے کے لئے تیار ہوئے تھے (لیکن وہ تشنہ کام ہی واپس آیا) یہ سب

---

[1] خسرو پرویز ۵۹۰-۶۲۸ (تاریخ ایران سائکس جلد اول) خسرو انوشیرواں ۵۳۱-۵۷۹ (ایران بہ عہدِ ساسانیاں۔ ترجمہ محمد اقبال ۱۹۴۱ء، دہلی)۔

[2] غیاث۔ منتخب۔

روایت کے خط و خال ہیں۔

قرآن مجید میں حضرت موسیٰ. جناب خضر سے کہ (عالم و دانا تھے) ملے۔ اور ان کے ساتھ مل سکے۔ یہ شرط ہوئی کہ حضرت موسیٰ جناب خضر کی کسی بات پر اعتراض نہ کریں گے لیکن تین بار حضرت موسیٰ نے جناب خضر کی باتوں پر اعتراض کیا۔

(۱) جب کشتی میں سوراخ کیا جاتا ہے۔

(۲) جب ایک بچہ ہلاک کر دیا جاتا ہے۔

(۳) جب ایک دیوار کو سیدھا کر دیا جاتا ہے۔

جناب خضر نے تینوں واقعات کی توجیہ کی اور حضرت موسیٰ سے جدا ہو گئے۔

قرآن مجید میں جناب خضر کا نام مذکور نہیں ہے۔ احادیث میں ان کا ذکر آجاتا ہے۔[۱]

(۷) **خلیل**: حضرت ابراہیم کا لقب۔ دیکھئے "نے براہیمی درونے آذری (ابراہیم و آذر)"

(۸) **خودی**: اقبال کے کلام میں خودی کا تصور، فلسفیانہ ایگو[۲] سے بھی مختلف ہے اور اکابر صوفیہ کے ان تصورات[۳] سے بھی مختلف ہے جو عجمی ذہن کی کارفرمائیوں سے اکثر و بیشتر متاثر ہوئے ہیں اور جن کے ہاں ویدانت اور مایا نے، ایسے روپ دھارے ہیں کہ بظاہر اسلامی معلوم ہوتے ہیں۔

تپسیا، ریاضت، عبادت میں ایسا شغف کہ اور کوئی کام نہ ہو سکے، تجرد، تنہائی، قطع علائق دنیوی یہ سب باتیں اس لئے اختیار کی جاتی ہیں کہ خودی کی نفی ہو سکے اور ذاتِ انسانی کا کامل

---

[۱] قصص القرآن (حصہ اول) حفظ الرحمٰن دہلی۔ مولف کا خیال ہے کہ قرآن مجید میں جس انداز سے جناب خضر کا ذکر آتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نبی تھے۔ اگرچہ ان کا رتبہ حضرت موسیٰ سے کم تھا (صفحات ۵۱۲-۵۰۲ کتاب مذکور)

[۲] The Dictionary of Philosophy ; D. Runes, New York (Ego)

[۳] تاریخ تصوف در اسلام۔ طہران ۱۳۲۲ھ۔ قاسم غنی۔

استیصال ہو جائے، اور صوفی مقامات و احوال سے گزر کر وادیٔ فنا تک جا پہونچے۔

اقبال کے کلام میں خودیٔ انسان کے انفرادی اَنا کی خودی نہیں وہ ذات واجب الوجود کی ماہیت ہے۔"

خودی کا ارتقا اور اس کی تکمیل نہ صرف ممکن ہے بلکہ ضروری ہے اور حدود شرعی ہیں، رہ کر، صوفی ممکنات جسم و جاں کو ٹوٹتا ہے۔ ثمرات دین دنیا سے بہرہ یاب ہوتا ہے اور ماحول سے برسرپیکار ہوکر اسے مسخر کرتا ہے کہ تسخیرِ نفس و آفاق ہی ارتقائے[۵] خودی کی غایت ہے۔"

"خودی یا انانیت کا لفظ اُردو میں کبر و تمرد کے معنوں میں آیا کرتا ہے مگر اقبال نے اسے ایک فلسفیانہ اصطلاح طور پر اس احساس اور عقیدے کے لیئے استعمال کیا ہے کہ فرد کا نفس یا اَنا کو ایک مخلوق اور فانی ہستی ہے لیکن یہ ہستی اپنا ایک علیحدہ وجود رکھتی ہے جو عمل سے پایدار اور لازوال ہو جاتا ہے۔ اسرار خودی کے دیباچے میں فرماتے ہیں ...... اس کا مفہوم محض احساس نفس یا تعیّن ذات ہے......"

کائنات کی اصل ایک وجود بسیط ہے جس کے اندر شعور اور ارادے کی قوتیں مضمر ہیں

---

[۵] خودی کے متعلق جو مضامین اور کتابیں لکھی گئی ہیں ان کا احصا نا ممکن ہے۔ بہ بنیادی مضامین کا ذکر کرتا ہوں:

(۱) اقبال کا فلسفۂ خودی۔ ڈاکٹر میر ولی الدین۔ (فکر اقبال) مرتبہ غلام دستگیر رشید۔ اردو اکادمی سندھ کراچی۔

(۲) مقدمہ نوشتہ خلیفہ عبدالحکیم ترجمان اسرار۔ تالیف جسٹس ایس۔ اے رحمان۔ کاروان بک ڈپو۔ لاہور (یہ اسرار خودی کا اردو ترجمہ ہے) ۱۹۵۲ء۔

(۳) اقبال کا تصور خودی۔ ڈاکٹر سید عابد حسین۔ اُردو، اقبال نمبر۔

(۴) اقبال نامہ۔ مکاتیب اقبال۔ متفرق خطوط جن میں خودی کے متعلق اشارات ملتے ہیں۔ (شیخ محمد اشرف تاجر کتب۔ لاہور)

(۵) Introduction to Iqbal Day Lectures ; Dr. M. D. Taseer.

(۶) اقبال اور برگساں۔ بشیر احمد ڈار (انگریزی) مجلہ اقبال جولائی ۱۹۵۴ء۔

(۷) دیباچہ اسرار خودی پہلا ایڈیشن

(۸) معرکۂ اسرار خودی۔ عبداللہ قریشی۔ مجلہ اقبال۔ اکتوبر ۱۹۵۳ء، اپریل ۱۹۵۴ء۔

(۹) اقبال کا تصور فقر۔ مظہر الدین صدیقی۔ مجلہ اقبال اکتوبر ۱۹۵۳ء۔

ان قوتوں کو فعل میں لانے کے لئے اس نے اپنے آپ کو خود اور غیرِ خود یا فلسفے کی اصطلاح میں موضوع اور معروض میں تقسیم کر دیا۔ خودی اپنی تکمیل اور استحکام کے لئے غیر خود سے ٹکراتی ہے اور اسی تصادم کے ذریعہ اس کی اندرونی قوتیں نشو و نما پاتی ہیں ..... اس کی ہستی مسلسل حرکت اور عمل پیہم کش مکش اور کارزار ہے۔

اس سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی انسان ہے .... خودی کے استحکام کی یہی صورت ہے کہ انسان .... اپنے ماحول سے مسلسل جنگ کرتا رہے۔

اس راہ میں ایک راہ نما کی ضرورت ہے اور یہ راہ نما عشق ہے۔ عشق اس مردِ کامل کی محبت کو کہتے ہیں، جو معرفت نفس کے مدارج سے گذر کر خودی کی معراج پر پہونچ چکا ہے ...... خودی کی تادیب و تربیت بھی ضروری ہے۔[۱]

استدراک: مکاتیب میں علامہ اقبال خود فرماتے ہیں کہ بے خودی کی دو قسمیں ہیں ایک جو Lyric Poetry کے پڑھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ اسی قسم سے ہے جو افیون اور شراب سے پیدا ہوتی ہے دوسری وہ بے خودی ہے جو بعض صوفیہ اسلامیہ اور تمام ہندو جوگیوں کے نزدیک ذاتِ انسانی کو فنا کر دینے سے پیدا ہوتی ہے اور یہ فنا ذاتِ باری میں ہے نہ احکام باری تعالیٰ میں۔ پہلی قسم کی بے خودی تو ایک حد تک مفید بھی ہو سکتی ہے مگر دوسری قسم تمام مذہب و اخلاق کے خلاف جڑ کاٹنے والی ہے لیکن ان دو قسموں کی بے خودی پر معترض ہوں اور بس۔ حقیقی اسلامی بے خودی میرے نزدیک اپنے ذاتی و شخصی میلانات، رجحانات و تخیلات کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے احکام کا پابند ہو جانا ہے۔ اس طرح پر کہ اس پابندی کے نتائج سے انسان بالکل لاپروا ہو جائے اور محض رضا و تسلیم کو اپنا شعار بنائے یہی اسلامی تصوف کے نزدیک فنا ہے۔ البتہ عجمی تصوف فنا کے کچھ اور معنی جانتا ہے جس کا ذکر اوپر کر چکا ہوں۔[۲]

---

[۱] اقبال کا تصورِ خودی، سید عابد حسین (ڈاکٹر) اردو اقبال نمبر۔ [۲] اقبال نامہ حصہ دوم یعنی مجموعہ مکاتیب اقبال، مرتبہ شیخ عطاء اللہ ایم۔ اے شعبہ معاشیات، ہیلی کالج آف کامرس شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار لاہور، ۱۹۵۱ء۔

د

(۱) دارا: شان وشوکت، جاہ وجلال اور طمطراق کے اظہار کے لئے جس دارا کا ذکر کرتے ہیں وہ دار یوش اول ہے، جو ۵۲۱ قبل مسیح میں تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنے طویل عہد حکومت کو استحکام بخشا اور کوروش کبیر (ذوالقرنین) کے کارناموں کی یاد تازہ کردی۔ یونانیوں سے اس کی آویزش البتہ، ثمرات ونتائج کے اعتبار سے بہت مہلک ثابت ہوئی اور آخر سکندر مقدونی نے، ہخامنشی سلطنت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ایران اور ملحقہ علاقوں کو مسخر کرلیا۔ یہ ۳۳۰-۳۳۱ قبل مسیح کا واقعہ ہے۔ اتفاق سے اس وقت جس ایرانی فرماں روا نے سکندر سے جنگ کی اس کا نام بھی دارا تھا۔[۱]

(۲) دانائے تبریز: محمود شبستری ہی مراد ہے۔ تبریز[۲] کا شہر جھیل ارمیہ کے کنارے واقع تھا۔ تیسری صدی تک یہ محض ایک گاؤں تھا لیکن چھٹی صدی ہجری تک خوب بارونق ہوگیا تھا اور آذربائجان

---

[۱] History of Persia by Sykes; Vol. I

[۲] جغرافیہ خلافت مشرقی۔

کا سب سے بڑا شہر کہلاتا تھا۔ یہاں کی مخمل، ریشم اور عتابی (ایک قیمتی کپڑا) مشہور تھا۔ سعدی کہتا ہے

اے ہلے صد دیبقی و دیبا گر بہ پوشد خر بیست عتابی

ابن بطوطہ نے بھی یہاں کے جواہرات اور مشک و عنبر کا ذکر کیا ہے۔ یہ شہر بھی بہت مردم خیز ہے۔ مولانا روم کے مرشد کہ شمس کے نام سے مشہور ہیں یہیں کے رہنے والے تھے۔ مشہور شاعر ہمام بھی اسی شہر کا رہنے والا تھا۔ قطران[1] جس نے گویا عراقی دبستان شعر کی بنیاد رکھی ہے، بھی اسی شہر کا باشندہ تھا۔

(۳) دانہ گندم: حضرت آدم کو، بہشت کے ایک درخت کا پھل کھانے سے منع کیا گیا تھا حسب روایت مشہور یہ گندم کا پودا تھا) جب ابلیس کے اغوا کے باعث حضرت آدم اور حضرت حوا یہ پھل کھا چکیں تو ناراضی ہوئی اور دونوں کو زمین پر قیام کرنے کا حکم ہوا[2]۔

اس قیام زمینی سے متعلق کہ (ایک مدت معین کے لئے ہے) اقبال نے بہت دلپذیر اور دقیق اشعار کہے ہیں۔ مثلاً:

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

اور دانہ گندم کے متعلق بھی اردو میں نہایت اچھے شعر موجود ہیں، مثلاً

دانہ کھائے کھائے ہوئے آدم کو زمانہ گذرا
ہنستے ہیں دیکھ کے اب تک لبِ گندم مجھ کو

---

[1] تنقید شعر العجم، حافظ محمود شیرانی۔ قطران کے بہت سے شعر رودکی سے منسوب ہیں (دیکھئے احوال و اشعار رودکی۔ سعید نفیسی)، قطران کی ملاقات ناصر خسرو سے بھی ہوئی ہے (رضا زادہ شفق، تاریخ ادبیات ایران، ص۱۲۲)۔

[2] قصص القرآن۔ حفظ الرحمٰن (جلد اول) دہلی۔

اغوائے آدم کے متعلق، انگریزی ادیب اور مفکر شاؔ[1] اور فریزرؔ[2] کی نکتہ طرازیاں بھی سزاوار مطالعہ ہیں۔

(۴) دمِ عیسیٰ: حضرت عیسیٰ کے اس معجزے کی طرف اشارہ ہے کہ وہ مردوں کو زندہ کر دیتے تھے (یہاں از سرِ نو زندگی معنوی و ذہنی پانے کا ذکر ہو رہا ہے اور دمِ عیسیٰ گویا علامت کا مفہوم رکھتا ہے[3]۔

(۵) دے: سخت سردیوں کا مہینہ۔ (مدتِ ماندنِ آفتاب در برجِ جدی)،
ہندی میں ماہ اور ماگھ کے مطابق ہوتا ہے کم و بیش۔
کبھی اس سے سردی کی نہایت بھی مراد ہوتی ہے۔

---

[1] Bernard Shaw
[2] Frazer.
[3] قصص القرآن جلد چہارم۔ حالات حضرت عیسیٰ۔ اور تقابلی مطالعہ کا شوق ہو تو نئے عہد نامے سے بھی رجوع کرنا چاہیے۔ لغت میں یہ شعر مشہور ہے۔

حسنِ یوسف، دمِ عیسیٰ، یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

ر

(۱) **رازی**: بہ ظاہر یہ گمان ہوتا ہے کہ طبیب[۵۱] مشہور مراد ہے کہ فلسفہ داں بھی تھا اور علم طبیعیات اور کیمیا کی گتھیاں بھی سلجھاتا تھا۔ لیکن سیاق و سباق پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ایسا رازی مراد ہے جس نے زمان کے متعلق غور و فکر کیا ہے۔ یہ امام فخرالدین رازی[۵۲] ہیں اور طوسی کا ذکر ان کے ساتھ اس گمان کو اور بھی تقویت پہونچاتا ہے کہ دونوں کو معاصر ہی کہنا چاہیئے، پروفیسر براؤن نے بھی ان کو فلسفیوں میں شمار کیا ہے۔ ان کی تصانیف کی کثرت اور تنوع دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ تفسیرِ قرآن مجید سے لے کر، ہیئت اور تاریخ تک، بہت علوم و فنون ان کو مستحضر تھے اور بروکلمین نے ان کی ۳۳ تصانیف کا ذکر کیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے انھوں نے سائنس کے متعلق جو دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) لکھا ہے، وہ فارسی میں[۵۳] تھا۔ یہ کتاب

---

۵۱ Rhazes; Legacy of Islam; PP 323-325

۵۲ اقبال کا تصورِ زماں۔ سید بشیرالدین احمد۔ اردو اقبال نمبر۔

۵۳ Litrary History of Persia; Brown; Vol. II (writers of Earlier Mongol Period)

علاالدین محمد[۵۱] خوارزم شاہ کے نام معنون کی گئی ہے۔ یہ وہی خوارزم شاہ ہے۔ جس کی بے تدبیری نے ۶۱۶ہجری میں چنگیز خاں کی فوجوں کو ایران پر حملہ کرنے کا بہانہ مہیا کیا؛ مرشد رومی رازی کو رازدارِ دیں شمار نہیں کرتے چنانچہ یہ تصریح کہتے ہیں۔

اندریں بحث ار خرد رہ دیں بُدے — فخر رازی رازدارِ دیں بُدے

علامہ اقبال نے مولانائے روم کو اپنا مرشد تسلیم کیا ہے اور بہ صراحت کہتے ہیں کہ

نے مہرہ باقی نے مہرہ بازی — جیتا ہے رومی ہارا ہے رازی

ان تمام باتوں سے میں یہ نتیجہ اخذ کرتا ہوں کہ زبور عجم (گلشن راز جدید) میں اس مقام پر جس رازی کا ذکر آیا ہے وہ یہی امام فخر دین رازی ہیں (بالخصوص جب بحث زمان و مکان کے متعلق ہو رہی ہے کہ الرازی (زکریا)[۵۲] طبیب مشہور نے تو زماں کے متعلق کوئی بحث غالباً نہیں چھیڑی۔

(۲) رضا: (مقام رضا) تصوف میں تہذیبِ نفس کا آخری مرحلہ ہے۔ جو صوفی شرک خفی کو ترک کرکے، موحد ہو جائے گا اور یہ احساس کرے گا کہ قدرت تمام صرف خدا کو حاصل ہے اور توکل پیدا کرے گا۔ اسے آخر مقام رضا بھی ضرور حاصل ہوگا یعنی جو کچھ دنیا میں ہوگا وہ گویا عین اس کی مرضی کے مطابق ہوگا کہ اس کا ارادہ، ارادۂ الٰہی کے تابع ہو جائے گا۔[۵۳]

(۳) راہ: بعض فرہنگ لکھتے ہیں کہ اصطلاح میں، پردہ سرود کو کہتے ہیں۔ دیکھئے مقام)

اقبال:۔ تو رہ شناس نہ از مقام بے خبری — چہ نغمہ ہاست کہ در بربطِ سلیٰمی نیست

(۴) رہرو: تصوف کی اصطلاح میں، سالک کا فارسی ترجمہ ہے اور سالک وہ ہے کہ

---

[۵۱] تاریخ مفصل ایران۔ عباس اقبال۔ جزو اول د ۱۳۱۲ شمسی طہران صفحات ۲۰ تا ۴۰۔
خود خوارزم شاہ نے ۶۱۷ہجری میں وفات پائی لیکن اس کا لڑکا جلال الدین منکرنی منگولوں کے خلاف نبرد آزما رہا۔

[۵۲] زکریا رازی، پزشک نامی ایران۔ محمود نجم آبادی ۱۳۱۵ھ چاپ خانہ علمی۔

[۵۳] تاریخ تصوف در اسلام۔ قاسم غنی۔ طہران (مقام رضا عبارت کی تلخیص کرکے مطلب پیش کیا گیا ہے۔ ترجمہ نہیں کیا گیا۔)

قوتِ علم کے ذریعے نہیں بلکہ قوتِ حال کے ذریعہ سیرِ مقامات میں مشغول ہو۔ سالک وہ ہے کہ اس کا علم عین الیقین کے درجے تک جا پہونچا ہو۔[۵]

مردِ تمام عارف ہے۔ جو سلوک کی تمام منزلیں طے کرنے کے بعد آخر فنا فی کا مقام حاصل کرتا ہے۔

اس سوال کا جواب اقبال نے یہ دیا ہے کہ (۷) مسلسل عمل اور سفرِ حیات جاودانی ہے۔

(۵) رومی: مولینا جلال رومی نے (جن سے اقبال کو بے حد عقیدت ہے اور جنھیں وہ مرشد کہہ کر یاد کرتا ہے) سنہ ۶۰۴ ہجری میں بلخ میں ظہور کیا۔ ان کے والد بہاؤالدین ولد حسب روایت مشہور علاء الدین محمد خوارزم شاہ کے اقارب میں سے تھے اور اپنے علم و فضل، تقویٰ اور دیانت کی وجہ سے مرجع خلایق تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو خوارزم شاہ سے کشیدگی ہوئی یا منگولوں کے حملے کا سیلاب بڑھتا نظر آیا۔ بہر حال، بہاء الدین نے بلخ سے ہجرت اختیار کی، اور قونیہ تشریف لے گئے کہ ایشیائے کوچک میں، سلجوقیوں کے ایک دودمان کا پایہ تخت تھا۔ ان دنوں علاء الدین کیقباد (۶۱۷-۶۳۴) مسند نشین تھا۔ اس نے اس خاندان کی بڑی قدر کی۔

مولینائے روم کی تربیت بڑے اہتمام سے ہوئی۔ پہلے والد بزرگوار سے فیض حاصل کیا۔ پھر شام کا سفر اختیار کیا کہ اصحابِ طریقت اور اربابِ دانش سے ملاقات کے مواقع میسر آئیں جب قونیہ واپس آئے تو حسن اتفاق سے، شمس الدین بن علی بن ملک زاد تبریزی بھی آدھر آنکلے ان سے مولینا روم نے بہت استفادہ کیا اور انھیں کو اپنا روحانی مرشد مان کر طریقت کے رموز پر غور کرنے لگے شفق لکھتے ہیں کہ قونیہ کے بے باک عوام نے جو شمس تبریزی کے مقام سے ناواقف تھے۔ انھیں سنہ ۶۴۵ ہجری میں شہید کر دیا۔ لیکن خود وہی یہ بھی کہتے ہیں کہ مولینا روم کی غزلوں

---

[۵] ابن العربی (ترجمہ فارسی سے) منقول از فرہنگ مصطلحات صوفیہ۔ (تاریخ تصوف در اسلام)۔

سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شمس ناپید ہو گئے۔

مولینا نے مثنوی کی تالیف ۶۰۔۱۲۵۷ء کے درمیان شروع کی۔ اس کتاب کی تالیف میں حسام الدین چلپی کی مدد اور تعاون شامل حال تھا۔

مثنوی کے علاوہ مولینا نے شمس تبریز سے ملاقات کی مسرت کا اظہار کرنے کے لئے غزلیں بھی کہنی شروع کی تھیں۔ رفتہ رفتہ ان غزلوں میں تصوف کے مطالب بہم بھی بیان ہونے لگے۔ یہ غزلیں عام طور پر غزلیات شمس تبریز کے نام سے مشہور رہیں۔ مولینا روم نے مثنوی کی تالیف کے ذریعے جو معرکے کا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس کی تعریف میں مشرق و مغرب کے عالم کتابیں[۱] لکھ کر بھی نہیں تھکے

---

[۱] مولینا کے متعلق کتابیں تو بے شمار شایع ہوئی ہیں لیکن میرے خیال میں اہم ترین کتابیں یہ ہیں:

(۱) افکار رومی۔ خلیفہ عبدالحکیم ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور۔

(۲) سوانح مولانا روم۔ شبلی۔

(۳) نکلسن کا دیباچہ دیوان شمس تبریز۔

(۴) بدیع الزماں فروزاں فرکی نامکمل تصنیف رومی کے سوانح کے متعلق (ایک جلد شائع ہوئی ہے)۔

(۵) رضازادہ شفق کا مضمون۔ تاریخ ادبیات ایران میں۔

(۶) نکلسن کی تصانیف تصوف اسلام کے بارے میں بالعموم اور رومی کے بارے میں بالخصوص۔

(۷) انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں مضمون رومی پر۔

(۸) انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجنز اینڈ ایتھکس میں نکلسن کا مضمون ایرانی تصوف پر۔

(۹) مثنوی کے بعض حصوں کا انتخاب (انگریزی) مع دیباچہ ونفلیڈ (Kegan Paul 1898)۔

(۱۰) افضل اقبال کے مضمون۔ مجلۂ اقبال میں رومی کے متعلق۔

(۱۱) اقبال، رومی اور نطشے، خلیفہ عبدالحکیم رسالہ اردو اقبال نمبر۔

(۱۲) تصانیف اقبال میں جو اشعار رومی کے متعلق ہیں ان کو جمع کیا جائے تو وہ بھی ایک استفادی مضمون کی حیثیت اختیار کریں گے۔

ز

(۱) زبورِ عجم
زبورِ
عجم
بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کے لئے اصل اور اساس توراۃ تھی لیکن حالات و واقعات اور زمانہ کے تغیرات کے پیش نظر حضرت داؤد کو بھی خدا کی جانب سے زبور عطا ہوئی۔ جو توراۃ کے قوانین و اصول کے اندر رہ کر اسرائیلی گروہ کی رشد و ہدایت کے لئے بھیجی گئی تھی۔ چنانچہ حضرت داؤد نے شریعت موسوی کو از سر نو زندہ کیا۔

زبور خدا کی حمد کے نغموں سے معمور تھی ...... (حضرت داؤد) جب زبور کی تلاوت فرماتے تھے کہ جن و انس حتیٰ کہ وحوش و طیور تک وجد میں آجاتے تھے[۱]

مختصراً زبور، حمد الہٰی، اور بصیرت و معرفت کے مطالب پر مشتمل ہے لیکن حضرت داؤد کی خوش الحانی کی وجہ سے ادبیات کی روایت میں (انجیل کے بیانات سے اس بات کو تقویت پہنچتی ہے کہ) یہ کتاب گیتوں پر مشتمل تصور کی جاتی ہے۔ قصص القرآن کا فقرہ "نغموں سے معمور تھی" بھی اس روایت کا مؤید ہے۔

---

۱ قصص القرآن۔ حفظ الرحمٰن (حصہ دوم)۔

پرانے عہد نامے کے مطابق زبور کے ۱۵۰ باب ہیں[۱]

عجم کے لغوی معنی ہیں "ملکے کہ غیر عرب[۲] باشد اور بالضم گنگ زبانان"۔

ایران کو عجم کہا جاتا تھا۔

(۲) **زمزم**: حضرت ابراہیم جب فرمان الٰہی سے حضرت اسمٰعیل اور جناب ہاجرہ کو اس مقام پر لے آئے جہاں خانہ کعبہ کو تعمیر ہونا تھا۔ اور ماں بیٹے کو وہیں چھوڑ کر واپس جانے لگے تو ہاجرہ نے بہت روکنا چاہا لیکن حضرت ابراہیم نہ رُکے اور ہاجرہ کو سمجھا دیا کہ جو کچھ ہو رہا ہے بفرمان الٰہی ہو رہا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد جب جناب ہاجرہ کے پاس کچھ نہ رہا اور اپنے بچے کو دودھ پلانے سے بھی عاجز ہو گئیں تو اس کے لئے پانی لینے کے لیے مروہ کی طرف دوڑیں کہ سراب تھا۔ اور پھر واپس صفا تشریف لائیں۔ سات بار اسی طرح ہوا (حج کے وقت اسی واقعہ کی یاد تازہ کی جاتی ہے)

بہرحال جناب ہاجرہ کو تو پانی نہ ملا لیکن جہاں حضرت اسمٰعیل لیٹے تھے۔ وہاں ان کی ایڑیوں کے نیچے سے ایک چشمہ جاری ہو گیا۔ جناب ہاجرہ نے بھی وہاں سے پانی پیا۔ یہی چشمہ زمزم ہے کہ اب تک باقی ہے[۳]۔

(۳) **زنار**: جنیو۔ ہندو دھرم کی رسوم کے مطابق بلوغت کے آغاز کا ثبوت یہی ہوتا ہے کہ ہیرو کو زنار پہنا دیتے ہیں۔ اس موقع کے لئے خاص رسوم مقرر ہیں (پنڈت آتا ہے اور منتر پڑھتا ہے)

(ریسمانے کہ نصاریٰ و مجوس[۴] و سایر کفار بر میان بندند)

ظاہر ہے کہ نصاریٰ کے متعلق یہ اطلاع غلط لیکن پیروان[۵] زرتشت ایک کمر بند باندھتے تھے۔

---

[۱] پرانا عہد نامہ۔ لندن ۱۸۸۶ء۔ [۲] فرہنگ آنندراج۔ غیاث۔ کلمہ عجم۔
[۳] قصص قرآن۔ صدرالدین بلاغی ۱۳۳۰ شمسی ص۵۶-۵۳ چاپ تابان [۴] منتخب۔ کلمہ زنار۔
[۵] مزدیسنا۔ محمد معین۔ دانش گاہ طہران۔ صفحات ۵۲-۲۳۳۔

جسے کستی کہتے تھے، چودہ، پندرہ سال کا بچہ ہوتا تھا تو کستی باندھ دیتے تھے، اس موقع پر ایک جشن برپا کرتے تھے۔ جسے جشن نوجوت کہتے ہیں۔ غالباً نوجوت[1] نوزاد کی بگڑی ہوئی شکل ہے کہ اس دن پیروِ زرتشت گویا نئی زندگی حاصل کرتا تھا اور اپنے مذہب کے رموز پر مطلع ہوتا تھا۔

تعجب ہے کہ جنیو اور کستی میں کوئی لفظی مناسبت نہیں ہے حالانکہ دونوں ایک چیز ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصطلاح[2] میں زنار علایقِ دنیوی اور ادنی تمناؤں کی علامت ہے اور زنار گسستن ہے، علایقِ دنیوی سے منہ موڑنا مراد ہوتا ہے۔

خود علامہ اقبال نے، زنار پوشی سے وہ دل بستگی مراد لی ہے جو انسان کو مختلف قسم کے ذہنی بتوں سے ہوتی ہے۔

دل طور سینا و فاراں[3] دو نیم — تجلی کا پھر منتظر ہے کلیم
مسلماں ہے توحید میں گرم جوش — مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش!

واضح رہے کہ یہ اصطلاح زنار بستن (بمعنی علائق دنیوی) ادبی روایت کا جزو معلوم ہوتی ہے۔ محمود شبستری نے گلشن راز میں جہاں سوالوں کے جواب دینے کے بعد اشارتوں کا ذکر شروع کیا ہے، وہاں وہ بصراحت یہ بیان کرتے ہیں کہ عقدِ زنار نشانِ خدمت ہے۔

نظر کردم بدیدم اصل ہر کار — نشان خدمت آمد عقد زنار
نباشد اہل دانش را معول — ز ہر چیزے مگر بر وضع اول

(۴۰) زیر و بم: زیر۔ آوازِ باریک یعنی نسبتاً اونچی آواز۔

بم۔ بھاری آواز نچلے سر، موسیقی کے ایک پردے کو بھی کہتے ہیں۔

---

[1] مزدیسنا صفحہ ۲۴۹ [2] زنار در کلمات متعلقہ۔ فرہنگ آنند راج۔ جو اشعار سند کے طور پر پیش کئے گئے ہیں۔ ان کے معانی پر بھی غور کرنا چاہیے۔ [3] ساقی نامہ۔ بال جبریل۔ صفحہ ۱۶۷ (جنوری ۱۹۳۵ء) تعجب ہے کہ فرہنگ مصطلحات صوفیہ میں کلمہ زنار نہیں ہے۔ (تاریخ تصوف در اسلام۔ قاسم غنی مفصل حوالہ پہلے آچکا ہے) شرح گلشن راز۔ لاہجی۔ اردو ترجمہ (مولوی محمد عبداللہ۔ شیخ مبارک علی بار دوم) یہ مقام یعنی اشارت زنار۔ نہایت دقیق اور غور کرنے کا سزاوار ہے۔

س

(۱) ساغرِ جم: جم اُس افسانوی دور کا کردار ہے جب ایران کے آریہ اور ہندوستان کے باسی ایک ہی خطے میں آباد تھے۔ اس کی قدیم شکل سنسکرت میں یمیہ ہے اس کے ساتھ جو کلمہ شید ملحق ہوتا ہے اُس کے معنی بزرگ، روشن اور جلیل کے ہیں۔ خورشید میں بھی یہی کلمہ ہے

جم کے متعلق اچھی طرح ذہن نشیں ہو جانا چاہیے کہ ایرانی ادبیات میں یہ کلمہ مختلف شخصیتوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

۱۔ قدیم افسانوی بادشاہ جمشید جسے ضحاک نے شکست دی تھی اور جس کا عہد حکومت عیش و عشرت کے لئے مخصوص ہے۔ جہاں جم کے ساتھ عیش و عشرت یا ثمرات کے کلمات استعمال ہوں، یہ افسانوی جمشید مراد ہوتا ہے۔ غالب کہتا ہے۔

حسابِ مے و رامش و رنگ و بوی
ز جمشید و بہرام و پرویز جوی

۲۔ ایرانی حضرت سلیمان کو بھی جم کا لقب دیتے ہیں (قدیم الایام سے ادبیات میں یہ

روایت چلی آرہی ہے) چنانچہ اگر جم کے ساتھ انگشتری، خاتم، اہرمن حکومت، تختِ سلیمان وغیرہ کا ذکر آئے تو حضرت سلیمان مراد ہوتے ہیں۔ غالب کہتا ہے:۔

سلطنت دست بدست آئی ہے — جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں

اور خواجو کہتا ہے:۔

بر باد بزم آصف جمشید مرتبت — برکف گرفتہ لالہ دل خستہ جامِ جم

مشہور ہے کہ آصف برخیا حضرت سلیمان کے وزیر تھے۔ یہاں جمشید سے مراد حضرت سلیمان ہیں

۳۔ ایرانی ادبیات میں سکندر کے ہاتھوں ایرانیوں کو جو شکست نصیب ہوئی ہے اس کی ذلت کا داغ مٹانے کے لئے اس یونانی فاتح کو بھی کہ ایک تاریخی شخصیت ہے جمشید کا لقب دے دیا گیا ہے۔ اگر جمشید کے ساتھ دارا، آئینہ وغیرہ کا لفظ آئے تو سکندر مراد ہو گی۔ حافظ کہتا ہے:۔

آئینہ سکندر جامِ جم است بنگر — تا بر تو عرضہ دارد احوال ملک دارا

جامِ جم، جمشید کے شراب پینے کا پیالہ ہے، جس کے ہفت خط مشہور ہیں۔ بہ ترتیب ذیل خطِ جور، خطِ بغداد، خط بصرہ، خطِ ازرق، خط درشکر، خط کاسہ گر، خط فرودینہ۔ جامِ جم ساغرِ جم کہہ کر جامِ جہاں بیں بھی مراد کی جاتی ہے یعنی ایک ایسا جام جس میں دنیا کے حالات نظر آتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ روایت میں ایسا جام کے خسرو کا جام تھا اور اسی لئے جامِ کے خسروی کہلاتا تھا۔ بعد میں جامِ جم کہہ کر بھی، جامِ کے خسروی ہی مراد لینے لگے۔[۲]

---

(۱) مزدیسنا، محمد معین۔ ص ۵۳۲-۵۳۴ (۲) غیاث اللغات، کلمۂ جم۔

(۳) جامِ کے خسروی، جو جامِ جہاں بیں تھا، اسی کا جامِ جم بن جانا حافظ کے کلام سے بھی عیاں ہے:

سالہا دل طلب جامِ جم از ما می کرد — آنچہ خود داشت ز بیگانہ تمنا می کرد
گفتم ایں جامِ جہاں بیں بتو کے داد حکیم — گفت آں روز کہ ایں گنبد مینا می کرد

ساغرِ جم تصوف کی اصطلاح میں دل کے لئے استعمال ہوتا ہے کہ مقام کشف و شہود ہے اسی اعتبار سے تصوف کی دوسری اصطلاحات بھی متعین ہوتی ہیں مثلاً میکدہ صوفیوں کی مجلس ذکر و فکر ہے اور خود صوفی رندِ خراباتی ہے۔ حافظ انھیں اصطلاحات کو مدِ نظر رکھ کر کہتا ہے:-

بہ سرِ جامِ جم آنگہ نظر توانی کرد   کہ خاکِ میکدہ کحلِ بصر توانی کرد

(۲) سدرہ: سدرۃ المنتہیٰ۔ سورۃ النجم[1] میں، رسول اکرم کا سفر (ملاءِ اعلیٰ تک) مذکور ہے۔ اس میں ذکر ہے کہ رسول اکرم سدرۃ تک پہنچ گئے تھے۔ جس کے پاس جنت الماویٰ ہے، مراد اس سے کمال عروج ہوتا ہے۔

ارباب لغت لکھتے ہیں کہ جناب جبریلؑ، اس درخت سے آگے نہیں جا سکتے۔ (کہ سدرہ کے لغوی معنی بیری کا درخت ہیں)

سدرہ دراصل مقاماتِ معراج میں سے ایک مقام معلوم ہوتا ہے اور اس کی اصل حقیقت صرف خدا کو معلوم ہے یا رسول اکرم کو جن کو یہ مقام حاصل ہوا۔

(۳) سلطانِ بدر: اشارہ ہے رسول پاک کی ذاتِ گرامی کی طرف۔

غزوۂ بدر کے متعلق، محدث اور مورخ بہ اتفاق آراء لکھتے ہیں کہ اس نے تاریخ عالم کا رخ بدل دیا اور قریش مکہ کی طاقت اس طرح ٹوٹی کہ پھر وہ ابھر نہ سکے۔ اس کے بعد گویا اسلام کے اصول حقہ تمام دنیا میں منتشر ہونے کے مواقع میسر آئے۔

"لیکن اگر بدر[2] میں (بارش) نہ ہوئی ہوتی تو کیا ہوتا۔ تمام کرۂ ارضی کی ہدایت و سعادت کا نقشہ الٹ جاتا"

(۴) (حضرت) سلیمان: (دیکھو جم اور جمشید، اور جام جم بھی)

---

[1] قصص القرآن (جلد چہارم) حفظ الرحمٰن صفحہ ۲۴۲۔

[2] مولانا ابوالکلام آزاد (منقول از قصص القرآن جلد چہارم صفحہ ۲۸۵۔ صاحب قصص القرآن نے ترجمان القرآن جلد دوم صفحہ ۵۶-۵۷ کا حوالہ دیا ہے)۔

حضرت داؤد کے صاحب زادے ہیں اور فطانت و عدل و انصاف کے لئے مشہور ہیں۔ ان کو جو معجزات عطا کیے گئے ہیں ان میں ایک علم منطق الطیر ہے کہ وہ جانوروں کی زبان سمجھتے تھے، دوسرے یہ کہ جن اور حیوان ان کے تابع تھے اور ہوا بھی۔

اسی اعتبار سے، تخت سلیمان کا ہوا پر اڑنا، روایت ادبی کا جزو ہے۔

ملکۂ سبا، انھیں کی خدمت میں پہنچی تھی۔ ہدہد سے انھیں کا مکالمہ مشہور ہے۔ داستانوں میں ملکۂ سبا کا نام بلقیس مشہور ہے۔[۵۱]

(۵) سمرقند: جیحون کے اُس پار اور سیحون کے ادھر دریائے سغد یا دریائے زرافشاں کے کنارے سمرقند کا شہر آباد تھا، جو پرانے زمانے میں جنت ارضی کا ایک جزو شمار ہوتا تھا۔ ہر طرف ثمرستان، چشمے، نہریں، سرو کے درخت، عظیم الشان محل، فصیلیں، بڑے بڑے بازار حمام، یہ شہر بابر کی بستیوں تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ اور یہیں منڈیاں بھی قائم تھیں۔ جہاں تمام ماوراء النہر کا مال آکر ذخیرہ ہوتا تھا۔ اس شہر کا کاغذ تمام ایشیا میں مشہور تھا (یہ صنعت چینیوں کی ایجاد ہے) منگولوں نے ۶۱۶ھ میں سمرقند کو برباد کر دیا۔ ابن بطوطہ نے جب آٹھویں صدی میں اس شہر کو دیکھا ہے تو شہر کی حالت خراب تھی لیکن اُس کے کچھ عرصہ بعد جب تیمور نے سمرقند کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا تو یہ شہر بہت بارونق ہو گیا تھا۔[۵۲]

(۶) سومنات: کاٹھیاوار گجرات کا مشہور مندر ہے، جو شیو سے منسوب ہے۔ سوم چاند کو بھی کہتے ہیں اور ناتھ[۵۳] آقا، صاحب، ماد، شیو کا لقب ہے، ہیول اپنی تاریخ ہندوستان میں اسی نتیجے پر پہنچا ہے کہ شیو کی پرستش جس طریقے سے ہوتی ہے اُسے ملحوظ رکھتے ہوئے یہ باور کرنا

---

۵۱ قصص القرآن، حفظ الرحمٰن (حصہ دوم) دہلی۔ (دنا غزجم بھی دیکھیے) ۵۲ جغرافیہ خلافت مشرقی جمیل الرحمٰن (فارسی)، احوال و اشعار رودکی، سعید نفیسی (سمرقند در زمانہ رودکی)، (فارسی)۔ تاریخ مفصل ایران، عباس اقبال طہران ۱۳۱۲ھ۔
۵۳ اس کلمے کی زیادہ معروف شکل ناتھ ہے جو ہندوؤں کے ناموں کا جزو ہوتا ہے اور ناتھ شوہر کو بھی کہتے ہیں۔ یہ مجاز ہے۔

دشوار معلوم ہوتا ہے کہ سومنات میں کوئی مجوف بت تھا۔

(۷) سہ پہلو: دنیا کو ہم تین ابعاد[1] کا پابند شمار کرتے ہیں یعنی طول، عرض، عمق۔ جب آئن سٹائن نے زمان کے متعلق دعویٰ کیا کہ وہ چوتھا بعد ہے۔ اور اب ابعاد ثلاثہ نہیں بلکہ ابعادِ چہارگانہ کا ذکر ہونا چاہیئے۔ آئن سٹائن نے اور بھی حیرت انگیز نظریات پیش کیے جو طبیعیات کی دنیا میں انقلاب کا باعث ہوئے۔ نظریہ اضافیت بھی جیسا کہ سب جانتے ہیں اسی سے منسوب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نظریہ اضافیت کے سمجھنے والے دنیا میں بہت کم ہیں۔

صاحب[2] لغاتِ فلسفہ، طبیعیات کے دائرے میں تین بُعدیں گنواتا ہے۔ کمیت (Mass) طول اور وقت[3] (یہ میکانیکی عمل کی بات ہے)

(۸) سینا: یعنی بوعلی سینا۔ ایران کا مشہور مفکر، دانش ور، طبیب، مدبر، فلسفی اور بہ قول بعضے شاعر بھی کہ کچھ رباعیات اس سے منسوب ہیں[4]۔

اس کی ولادت ۳۷۰ھ ہجری کے لگ بھگ بخارا کے حدود میں ہوئی۔ وہیں علوم و فنون پر دسترس حاصل کی۔ وہاں سے مامون خوارزم شاہ کے دربار میں پہنچا۔ محمود نے طلب کیا تو جانے سے اجتناب کیا اور دیلمیوں کے دربار میں چلا گیا۔

---

[1] مولوی عبدالحق ابعادِ ثلاثہ یوں گنواتے ہیں رقبہ، ناپ، حجم، لمبائی، چوڑائی، موٹائی یا گہرائی۔ اور تصریح کرتے ہیں کہ بُعدِ رابع آئن سٹائن کے نظریے کے مطابق وجود میں آئی ہے صفحہ ۲۹۸۔ انگریزی اردو ڈکشنری ۱۹۳۷ء

[2] Dictionary of Philosophy P. 81

استدراک: آئن سٹائن کے متعلق بہت سی کتابیں شائع ہوئی ہیں لیکن غالباً رسل کی کتاب "اضافیت کیا ہے" ان کے لئے بہت مفید ہے جو متخصصین نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ منٹار بکس (Mentor Books) کے سلسلے میں ایک کتاب "کائنات اور آئن سٹائن" شائع ہو کر فوراً مقبول ہو گئی۔ اس کتاب کا نمبر شمار ۱۷ ہے)

[3] وقت کے متعلق علامہ اقبال کے نظریات کا بیان بہ اختصار آگے آتا ہے۔

[4] دیکھیے خیام۔ سید سلیمان ندوی۔ رباعی کی تاریخ۔

۴۲۸ھ ہجری میں وفات[1] پائی۔

بوعلی سینا کی تصانیف میں مندرجہ ذیل بہت مشہور رہیں۔

(۱) شفا (۲) قانون (۳) اشارات[2]

(۴) دانش نامہ علائی (یہ فارسی میں ہے) یہ کتاب علاء الدولہ لپسر کاکویہ کے نام منسوب کی گئی ہے اور اس میں یہ کمال نظر آتا ہے کہ اصطلاحات فلسفہ کے لئے خالص فارسی زبان کے الفاظ تلاش کیے گئے ہیں[3]۔

بوعلی سینا[4] دراصل حکمت یونانی کا شارح ہے۔ خاص طور پر ارسطو اور نو افلاطونی تصورات کا۔ لیکن طب میں اس کی تصانیف کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ صدیوں یورپ کی یونیورسٹیوں میں نصاب کے طور پر رائج رہیں۔

سینا اس پہاڑ کو بھی کہتے ہیں جس کے قریب موسیٰ کلیم اللہ کو دیدار الٰہی نصیب ہوا تھا لیکن یہاں مراد بوعلی سینا ہے اس سینا یعنی تجلیٔ الٰہی کے راز دار کا مقام و محلِ وقوع بھی اب معلوم ہے۔

"یہ کوہستانی سلسلہ بحیرۂ قلزم کے دو شاخے کے درمیان، مصر کو جاتے ہوئے واقع تھا۔ اسی کی وادی، وادیٔ ایمن[5] ہے۔"

یہیں جھاڑی جل رہی تھی جس کی آگ نہ بجھتی تھی نہ جھاڑی کو جلاتی تھی۔

---

[1] تاریخ ادبیات ایران۔ رضا زادہ شفق (فارسی) بوعلی سینا۔ لغت نامہ دہ خدا۔ ابوعلی سینا۔

[2] ذوقؔ نے کیا تماشے کا مضمون باندھا ہے ؎

وصف چشم اور وصف لب اس شوخ کا کہنے کو ہیں آج ہم درس اشارات و شفا کہنے کو ہیں

[3] تاریخ ادبیات ایران۔ رضا زادہ شفق۔ بوعلی سینا

[4] Dictionary of Philosophy
بوعلی سینا کی اہمیت (بہ حیثیت فلسفی، طبیب، مفکر) کیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مختلف علوم و فنون کے سلسلے میں میراثِ اسلام (Legacy of Islam) میں اس کا ذکر ۲۰ بار سے زیادہ آیا ہے اور اسلوب یہ کہ
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

[5] قصص القرآن حصہ اول صفحہ ۳۶۰ (حفظ الرحمٰن)۔

ش

(۱) شاخ نبات[۱]**:** لغوی معانی میں استعمال ہوا ہے۔

آن چہ بہ صورت شاخ در کورہ ہائے نبات بر رشتہ ہا بستہ شود

اور ظاہر ہے کہ مجازاً شیریں مراد ہے (یہ جو مشہور ہے کہ حافظ شیرازی کی معشوقہ کا نام شاخ نبات تھا اور وہ اسی کا ذکر اپنے اشعار میں کرتے ہیں۔ وہ غلط محض ہے)[۲]

(۲) شام (Syria)**:** مشہور ملک (دارالخلافہ دمشق) یہاں کے لوگ بھی کوفیوں کے ساتھ غداری اور بے وفائی کے لئے بدنام ہیں۔ اُردو ادب اور فارسی ادب کی روایات یہی[۳] ہیں۔ (دیکھئے کوفہ)۔

(۳) شاہین: (دیکھئے قلندر اور فقر)۔

---

[۱] غیاث۔

[۲] Hafiz of Shiraz ; S. Abid Ali (Iqbal ; July, 1955)

[۳] ایک مشہور مصرع ہے:-

شامی کباب بن کے پسند اجل ہوئے

(۴) شنکراچاریہ: ویدانت کے فلسفے کا مفسر جس نے بدھ مت کا زور توڑنے میں بہت مدد دی۔ (وید + انت کے معنی ہیں[1] وید کی غایت، وید کی انتہا) اپنشدوں کے فلسفے اور متعلقہ دبستاں ہائے فکر کو بھی ویدانت کا فلسفہ کہتے ہیں۔ اس کے یوں تو بہت سے مفسر ہیں لیکن شنکر کا رتبہ کسی کو حاصل ہوا۔ شنکراچاریہ کے خیال میں روح (آتما) اور برہم میں کوئی فرق نہیں (برہم ہی غالباً برہم + آتما ہے) ویدانت کے فروغ نے مایا (فریبِ نظر) کے تصور کو مقبول بنا دیا یعنی یہ کہ اصل وجود تو برہم ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے، وہ فریب، لمحہ اور مایا ہے۔

اسی کے متعلق علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اس نظام میں۔

دلِ بیدار و عقل نکتہ بیں خواب — گمانِ فکر و تصدیق و یقین خواب
مقامِ تحت و فوق و چارسو خواب — سکون و سیر و شوق و جستجو خواب

خدا خفت و وجود ما زخوابش
وجود ما نمود ما زخوابش

یہ مسلم ہے کہ شنکر کا زمانہ نویں صدی عیسوی[2] کا ہے (اچاریہ کے معنی ہیں استاد) اس نے اپنی تبلیغ اس دل پذیر انداز میں کی کہ شنکراچاریہ جگت گرو کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

بدھ مت کے فروغ کے بعد بالخصوص اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ اشوک نے اس مذہب کی نشر و اشاعت کی منظم کوششیں کی تھیں اور یہ مسلک وسط ایشیا[3] تک پھیل گیا تھا۔

---

[1] Dictionary of Philosophy (Vedanta) (B) Maya (P. 191)

(c) رومی، اقبال اور شنکراچاریہ۔ ڈاکٹر عشرت حسین انور (معارف، اگست، ستمبر ۱۹۵۵ء)۔

[2] A Short History of India; W. H. Moreland and A. C. Chatterjee, Longman Green & Co, 1945

[3] عباسیوں کے عہد کا مشہور خاندان آل برمک پہلے بدھ مت ہی کا پیرو تھا۔ بخارا بھی وہار کی ایک شکل ہے۔

برہمنوں کو پھر ہندو مت کی گرفت مضبوط کرنے کے لیے بڑی سخت جدوجہد کرنی پڑی۔ ان برہمنوں میں شنکراچاریہ کا مقام بہت بلند ہے۔ برہمنوں نے تمام دیوی دیوتاؤں کو اپنے مذہب کا جزو بنا لیا۔ بدھ بھی پرماتما کا اوتار ہو کر پوجا جانے لگا اور ہندوستان کے تمام باشندے کسی مسلک ہی کے پیرو کیوں نہ ہوں ہندو مت کے پیرو کہلانے لگے۔

علامہ اقبال لکھتے ہیں :۔

"سری کرشن[۱] کا نام ہمیشہ ادب و احترام سے لیا جائے گا کہ اس عظیم الشان انسان نے ایک نہایت دلفریب پیرایے میں اپنی ملک و قوم کی فلسفیانہ روایات کی تنقید کی اور اس حقیقت کو آشکارا کیا کہ ترک عمل سے مراد ترک کلی نہیں ہے کیونکہ عمل اقتضائے فطرت ہے اور اس سے زندگی کا استحکام ہے۔ بلکہ ترکِ عمل سے مراد یہ ہے کہ عمل اور اس کے نتائج سے مطلق دل بستگی نہ ہو۔ مگر افسوس ہے کہ جس عروس معنی کو سری کرشن اور سری رامانج بے نقاب کرنا چاہتے تھے۔ سری شنکر (اچاریہ) کے طلسم نے اسے پھر محجوب کر دیا۔ سری کرشن کی قوم ان کی تجدید کے ثمر سے محروم ہو گئی۔"

(۵) شیر شاہ سوری (۱۵۴۵ء-۱۵۳۹ء[۲]): اس کے زمانے میں ہندپاکستان کے طول و عرض میں شاہراہوں کا جال سا بچھ گیا۔ سڑکوں کے کنارے سایہ دار درخت لگوائے گئے اور نہایت قابلیت سے حکومت کی۔ مالیے کا نظام اسی کا قائم کردہ[۳] ہے۔ اور اکبر نے اس نظام پر اضافہ کر کے اپنی مملکت میں رائج کیا تھا۔

---

[۱] دیباچہ مثنوی اسرار خودی (اشاعت اول) مضامین اقبال صفحات ۵۰-۴۹۔ بہ حوالہ اقبال نئی تشکیل عزیز احمد
[۲] طبقات سلاطین اسلام۔ عباس اقبال۔ (مفصل حوالہ دیا جا چکا ہے)۔

[۲] A Short Story of India ; Moreland

[۳] A Short Story of India ;Moreland

اس کے عہد حکومت میں امن وامان کی یہ حالت تھی کہ گویا اس کا نام معدلت گستری اور نیکی کے لئے ضرب المثل ہوگیا تھا، شیرشاہ کے عہد کی تعمیرات میں پرانے قلعے میں جو مسجد ہے وہ بہت مشہور ہے کہ اس میں جمال وجلال کے عناصر کا امتزاج نظر آتا ہے۔ شیرشاہ کے مقبرہ میں بھی اس کے جانشینوں نے اس بات کا لحاظ رکھا ہے کہ عمارت سے شوکت و جلال کا اظہار بھی ہو۔[1]

---

[1] Legacy of India

شوستری کی Outline of Islamic Culture. میں فن تعمیر پر مضمون کا مطالعہ بھی فائدے سے خالی نہیں ہے۔

ص

(۱) **صدیق**[۱] : حضرت ابوبکرؓ خلیفہ اول (خلافت راشدہ) کا لقب ہے (۱۱ تا ۱۳ ہجری) ان کا لقب صدیق (بہ غایت راست گو اور بہ غایت راست پندار زندہ سخن) اس لئے ہے کہ سچ بولنے میں شہرۂ آفاق تھے اور سچی بات ماننے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔

---

[۱] عجب اتفاق ہے کہ مانی نے (متوفی ۲۷۶-۲۷۳ء کے درمیان) جو ایران قدیم کا مشہور مفکر تھا اور جسے ادبی روایت مصور بکارنے پر مصر ہے (نقش نازبت طناز بآغوش رقیب پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے (غالب)) اپنے مقلدوں کے (خلوص کے اعتبار سے) مدارج مقرر کئے تھے۔ جو لوگ یونہی سے مرید تھے وہ سماع کہلاتے تھے اور جو ترک دنیا اور ترک خواہشات نفسانی پر آمادہ ہو جاتے تھے وہ صدیق کہلاتے تھے (جمع صدیقون) یہ کلمہ عربی ہے لیکن اس کی اصل آرامی ہے اور غالباً اس زبان میں اس کی شکل صدیقائی تھی یہی کلمہ فارسی میں زندیق بنا (بہ فتح حرف اول. عربی میں اس کلمہ نے زندیق کی شکل اختیار کی یعنی بہ کسر حرف اول. جمع زنادقہ) ان لوگوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر سزا دینے کے لئے ایک خاص افسر مقرر کیا گیا تھا جسے صاحب الزنادقہ یا عارف الزنادقہ کہتے تھے کہ مانی کے مقلدوں نے چھپ چھپ کر ملک کے طول و عرض میں اپنی جڑیں بہت گہری کرلی تھیں[۲] مراد اس نوٹ سے یہ تھی کہ کسی وقت مانی کے اس گروہ سے کلمہ صدیق کا اشتباہ نہ ہو جائے اور جن کا مطالعہ بہت وسیع نہیں ہے وہ کسی وسوسے کا شکار نہ ہوں۔

---

[۲] Browne, Litrary History of Persia V. I. PP 154-165

(۲) صور: نرسنگھے کی آواز، جو قیامت[1] برپا ہونے کا پیش خیمہ ہوگی۔

کچھ حوالے بہ تفصیل ذیل ہیں۔

(الف) ۶/۷۴ (انعام) (ب) ۱۸/۹۹ (کہف) (ج) ۲۳/۱۰۰ (مومنون)

(۳) صوفی: اس کلمے کے اشتقاق کے متعلق بہت قیاس آرائی ہوتی رہی ہے۔ پہلے تو یہی مسلم سمجھا جاتا تھا کہ اس کا مادہ صوف[2] ہے لیکن اس کے بعد کچھ فاضلوں نے Sophy یا دانش کو اس کا مادہ تصور کیا۔ اس پر یہ اعتراض ہوا کہ یونانی زبان سے اس قسم کے جتنے الفاظ عربی میں آئے ہیں ان میں ص نہیں س استعمال ہوا ہے، جیسے سوفسطائی، سفسطہ Sophist مادہ اس کا بھی وہی Sophy ہے)۔ تو بات یہی ٹھہری ہے کہ اس کا مادہ صوف ہے۔

یوں تو صوفی کی بہت سی تعریفات موجود ہیں لیکن بالعموم اس پر اتفاق رائے ہے کہ صوفی وہ ہے کہ جو بصارت کی بجائے بصیرت پر اور علم و ادراک کی بجائے کشف و شہود اور القا و الہام پر اعتماد کرے۔ صوفیہ تزکیہ قلب پر بہت زور دیتے ہیں۔ ایران میں تصوف کا جو نظام مقبول ہوا اس کے بہت سے عناصر دین اسلام کے مخالف ہیں۔ مثلاً ترک دنیا اور ترک عمل علامہ اقبال نے عجمی تصوف کے اس پہلو کو اسلام کے لیے مہلک سمجھ کر اس کے خلاف مسلسل جہاد کیا۔ چنانچہ صوفیوں کے فقر میں اور ان کے تصورِ فقر میں بعد المشرقین ہے۔ علامہ کہتے ہیں ؎

کمالِ ترک نہیں آب و گل سے مہجوری — کمالِ ترک ہے تسخیرِ خاک و نوری

---

[1] دیکھیے صدرالدین قصص قرآن۔ قیامت صفحات ۱۱۱-۱۰۸۔ غیاث۔ بہ ضم اول۔ شاخ حیواں کہ آں رانے نوازند و آنچہ اسرافیل روزِ محشر خواہد دمید۔ س۔ جیم، لغت فارسی انگلسی کلمہ صور بھی دیکھیے۔

[2] Browne; Litrary History of Persia V. I.
Dictionary of Word Origins; Shipley.

قاسم غنی۔ تاریخ تصوف در ایران۔ اور ملک الشعراء بہار سبک شناسی بھی دیکھیے۔

ط

(۱) **طوسی**: خواجہ نصیر الدین طوسی مشہور مہندس، ہیئت داں اور مفکر۔ اصلاً قم کا باشندہ تھا کہ توابع طوس میں ہے، منگولوں کی پہلی یورش سے پہلے (۶۱۶ھ) اسماعیلیوں کے محتشم ناصر الدین کے دربار سے وابستہ ہو گیا تھا۔ اسی کے نام سے کتاب اخلاق ناصری منسوب ہے۔ جب ہلاکو خاں نے اسماعیلی فرقے کے تمام قلعے مسخر کر لیے اور اس گروہ کا زور ٹوٹ گیا تو طوسی ہلاکو خاں کے درباریوں میں شامل ہو گیا۔ حادثۂ بغداد کے وقت وہ ہلاکو خاں کے ہم رکاب تھا اور عام روایت یہ ہے کہ ہلاکو خلیفہ مستعصم باللہ کو ہلاک کرنے پر راضی نہ تھا لیکن طوسی نے حوصلہ بڑھایا۔ بہر حال اب اس مسئلے کا فیصلہ بہت دشوار ہے کہ طوسی ہلاکت مستعصم باللہ میں کس حد تک دخیل تھا۔ اس نے ہلاکو کی فرمائش پر مراغہ میں، رصد قائم کی تھی اور دوسرے علما کی مدد سے آخر وہ مشہور زیج مرتب کی جسے زیج ایلخانی کہتے ہیں۔

اپنے تو خیر، طوسی کے علم وفضل اور بصیرت کے معتقد ہوں گے ہی۔ غیر بھی اس کے قصیدہ خواں ہیں چنانچہ کارادی وا[2] نے میراث اسلام میں ہیئت اور ریاضیات کے سلسلے میں طوسی کی بہت تعریف کی ہے۔

علامہ اقبال نے خود طوسی کے سلسلے میں لکھا ہے۔

کہ مسلمان ریاضی داں قرونِ وسطیٰ ہی میں اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ یہ ممکن ہے مکان کے ابعاد تین سے زیادہ ہوں اور ہمارے اسلامی صوفیہ تو ایک مدت سے تعددِ زمان ومکان کے قائل ہیں[3]۔

---

[1] تاریخ ادبیاتِ ایران۔ رضا زادہ شفق ۳۴-۳۵ -

[2] Legacy of Islam; Edited by Sir Thomas Arnold, 1952 (Oxford University Press) PP. 395-397.

[3] مکاتیبِ اقبال حصہ دوم صفحات ۲۴۴-۲۴۳ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور ۱۹۵۱ء -

ع

(۱) **عراق**: عراق عرب اور عراق عجم۔ دو خطوں پر یہ کلمہ حاوی ہے۔ ایک حصے کو کبھی جزیرہ بھی کہہ دیتے ہیں[۱]

یہی وہ علاقہ ہے جہاں بابل اور نینوا کی قدیم تہذیبوں نے پرورش پائی ہے۔ تاریخی انقلابات اور تغیرات جیسے اس علاقے نے دیکھے ہیں ان کی نظیر نہیں ملتی۔

(۲) **عرفی**: تو و رز بر درختاں ہمچو طفلاں آشیاں بینی[۲]

یہ عرفی کے مشہور قصیدے کا مصرعہ ہے جو خانخاناں کی مدح میں کہا گیا ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے

زخود گر دیدہ بندی چگویم کام جاں بینی   ہماں گز اشتیاق دیدنش نزادی ہماں بینی

(۳) **عشق**: اقبال کا تصورِ عشق، اردو شاعری کی روایت سے بالکل مختلف ہے۔ وہ

---

[۱] دیکھئے جغرافیہ خلافت مشرقی۔ مترجمہ جمیل الرحمٰن باب دوم تا باب ہشتم۔

[۲] قصائد عرفی۔ ہر ایڈیشن میں یہ قصیدہ موجود ہے۔

خود عقل اور عشق کو حریف قرار دیتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ

عاشق آں نیست کہ لب گرم فغانے دارد　　　عاشق آنست کہ برکف دو جہانے دارد
عاشق آنست کہ تعمیر کند عالم خویش　　　در نسازد بہ جہانے کہ کرانے دارد

خلیفہ عبدالحکیم کے خیال میں :-

"عشق قوتِ عمل اور جوشِ انقلاب کا ایک بے پناہ سیلان ہے۔ اس کا وظیفہ زمانے کے ساتھ موافقت اور مطابقت پیدا کرنا نہیں بلکہ ناموافق اور نا مساعد زمانے کو اپنی آرزو کے مطابق ڈھالنا ہے۔"

اقبال نے رومی کی عشق ہی کو آدم کی حقیقی خودی کا جوہر قرار دیا ہے۔

"...... انسان کا کام بنی بنائی دنیا میں محض حصولِ بقائے جسمانی کے لئے ماحول سے موافقت پیدا کرنا نہیں بلکہ اپنے اندر سے نادر عوالم کی تخلیق ہے۔"

رومی سے اقبال کی عقیدت کی بنا غالباً عشق کے متعلق اسی ہم خیالی پر استوار ہے، رومی کہتا ہے :-

آدمی دیدہ است باقی پوست است　　　دید آں باشد کہ دید دوست است
جملہ تن را در گداز اندر بصر　　　در نظر رو در نظر رو در نظر

یہاں دید بھی عشق ہی کا مظہر ہے۔

اقبال کا نظریہ ہے کہ ماہیت وجود کا عرفان محض حسی ادراک یا منطقی عقل سے نہیں

---

۵۱ اقبال کی شاعری میں عشق کا مفہوم۔ اقبال اکتوبر ۱۹۵۲ء۔

خود اقبال کہتا ہے :-

گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد　　　گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

۵۲ اقبال کی شاعری میں عشق کا مفہوم۔ خلیفہ عبدالحکیم

طرح نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم　　　ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی

ہو سکتا۔ ادراک اور عقل کعبۂ وجود کا طواف کرتے رہتے ہیں لیکن حریم ذات میں داخل نہیں ہو سکتے۔ یہ عشق ہی کی بصیرت ہے جس میں شاہد و مشہود کی وحدت کا ادراک ہوتا ہے۔ عشق ماہیتِ اشیا کے باطن سے ہم آہنگ ہوتا ہے اور محض خارج سے اس کا مشاہدہ نہیں کرتا عشق اور علم کا باہمی رابطہ بتاتے ہوئے لارلائل نے بھی کیا خوب کہا ہے کہ:

نارِ عشق سے نورِ علم اس طرح پیدا ہوتا ہے جس طرح مادی آگ سے نورِ عشق کی آگ ماسوا کے خس و خاشاک کو جلا دیتی ہے لیکن اس سے اصل حقیقت خالص ہو کر نکھر جاتی ہے۔[51]

(۴) **عطار**: شیخ فریدالدین محمد، مشہور بہ عطار، نیشاپور میں پیدا ہوئے اور یہ غالباً اواسط قرن ششم کا واقعہ ہے۔ جیسا کہ ان کے لقب سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ طبیب بھی تھے۔ تصوف میں ان کا مقام اتنا بلند ہے کہ مولانا رومی نے ان کے فیضان کا اعتراف کیا ہے۔ ان کی مثنوی منطق الطیر جو منازل و مقامات تصوف سے بحث کرتی ہے۔ نہایت دلپذیر ہے۔[52]

علامہ اقبال بھی عطار سے بہت متاثر ہیں۔ یاد رہنا چاہیے کہ عطار کے ہاں حافظ محمود[53] شیرانی کے قول کے مطابق وحدتِ وجود کا مسئلہ نہایت تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ اب عطار کا ذکر آگیا ہے تو مناسب ہے کہ تصوف کے منازل[54] و مقامات کا ذکر بھی کر دیا جائے۔

(۱) طلب و جستجو (۲) عشق (۳) معرفت (۴) استغنا (۵) توحید (۶) حیرت (۷) فنا

بعض صوفیہ فنا کے بعد ایک اور مقام کے بھی قائل ہیں یعنی بقا۔ اور اسی اعتبار سے تصوف اور نروان متخص ہوتے ہیں۔[55]

---

۵۱ اقبال کی شاعری میں عشق کا مفہوم۔ خلیفہ عبدالحکیم (مجلہ اقبال اکتوبر ۱۹۵۳ء)۔

۵۲ تاریخ ادبیات ایران۔ رضا زادہ شفق (فارسی)۔ ۵۳ تنقیدِ شعر العجم، حافظ محمود شیرانی۔

۵۴ تاریخ ادبیات ایران۔ رضا زادہ شفق۔ ۵۵ بحث در آثار و افکار و احوال حافظ۔ جلد دوم۔ قسمتِ اول۔ تاریخِ تصوف در اسلام۔ بعلاوہ فرہنگ مصطلحات صوفیہ۔ قاسم غنی۔ طہران ۱۳۲۲ شمسی۔

غ

(۱) **غزل**: جب کتے ہرن کا تعاقب کرتے ہیں اور وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو جاتا ہے تو ایک صدائے دردناک پیدا کرتا ہے۔ جسے غزل کہتے ہیں۔ غزل کی صدا پیدا کرنے والے کو غزال (ہرن) کہتے ہیں[1]۔

اصطلاح میں سخن بازناں کردن و حدیثِ عشق زناں۔

پہلے غزل میں صرف واردات عشق و محبت کا بیان ہوتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ ہر قسم کے خیالات کے اظہار کے لئے یہی وسیلہ استعمال کیا گیا۔ تصوف سے لے کر تفنن تک سبھی کچھ غزل کے پیرایے میں بیان کیا جاتا ہے۔ حکمت و فلسفہ بھی سوز سے لبریز ہو اور دیانت دارانہ اظہار ہو تو غزل کا موضوع بن سکتا ہے۔ غزل کو کسی موضوع سے پردہ نہیں ہے، فن کار اچھا چاہیے۔

---

[1] المعجم فی معائیر اشعار العجم شمس قیس رازی مرتبہ محمد بن عبد الوہاب قزوینی۔

(۲) **غزنوی**: مراد ہے محمود غزنوی کیونکہ ساتھ ہی ایاز کا تذکرہ ہے۔ اس جلیل القدر بادشاہ نے جہاں تسخیرِ ممالک کی طرف توجہ دی وہاں تربیت علم وفن کی طرف بھی متوجہ رہا۔ چنانچہ سینکڑوں نثر نگار، شاعر اور عالم اس کے دربار سے وابستہ تھے۔ جن میں ایک ابو ریحان البیرونی ہی کا جواب نہیں ہے۔ اس کا عہدِ حکومت ۳۸۷ھ سے ۴۲۱ھ تک ہے۔ اگرچہ فردوسی اس کے دربار سے محروم گیا لیکن اس نے اپنی عمر کے آخری سال اطمینان سے غزنہ ہی میں گزارے اور شہنامہ مکمل کیا۔

یہ جو مشہور ہے کہ محمود نے فردوسی سے شہنامہ لکھنے کی فرمائش کی تھی، غلط محض ہے۔ فی شعر ایک دینار والا قصہ بھی ظاہر ہے کہ غلط ہے۔ یہ بھی غلط ہے کہ فردوسی نے محمود کی ہجو کی۔ ایک تو یہ ہے کہ اُسے ہجو کرنے کا حق ہی نہیں پہنچتا تھا۔ دوسرے یہ کہ بطور واقعہ یہ بات نہیں ہوئی۔[۵]

---

۵ تاریخ ایران عباس اقبال۔
فردوسی پر چار مقالے۔ حافظ محمود شیرانی۔
تاریخ ادبیات ایران۔ براؤن جلد دوم۔

ف

(۱) فر: شان و شوکت، اور فارسی میں سعادت کو بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ قدیم بادشاہوں کے سر پر ا، و، ر   ا، کا جو نور سایہ افگن رہتا تھا وہ فرکیانی[1] کہلاتا تھا اور مورخ اس فرکیانی کا اکثر ذکر کرتے ہیں۔

(۲) فرات: مشہور دریا جس کی وادی میں دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں نے پرورش پائی ہے بابل اور نینوا کے جاہ و جلال اور سحر و اسرار کے کرشمے اسی دریا نے دیکھے ہیں تفصیلی مطالعہ کے لئے کچھ کتابوں کے نام نیچے[۲] مندرج ہیں۔

---

[1] مزید صفحات ۷۷ اور ۳۵۹ تصنیف محمد معین۔ دانش گاہ طہران۔

[2] (۱) Le Strange; Lands of the Eastern Caliphate.

(۲) تمدن عتیق۔ ابو ظفر عبد الواحد۔ ۱۹۳۶ء حیدر آباد دکن۔

صاحب تمدن عتیق کا خیال ہے کہ فرات اور دجلہ کے درمیان پہلے آباد ہونے والے باشندے دراوڑ تھے۔

(۳) تاریخ ملل قدیمہ۔ فہمی۔ انجمن ترقی اُردو۔

(۴) تاریخ کا مطالعہ۔ ماری۔ مکتبہ اُردو۔ لاہور۔

(۵) قدیم تہذیبیں۔ سالک۔ دار الاشاعت لاہور ۱۹۴۷ء۔

(۳) **فرشتہ**: اربابِ لغت لکھتے ہیں کہ یہ دراصل فرستہ[1] تھا۔ یعنی بھیجا ہوا اور یہ ملک کا ترجمہ ہے۔ قرآن مجید کی رو سے یہ ایک وجود[2] لطیف ہے۔ جو خدا کے احکام بجالاتا ہے (لیکن اس کی حقیقت سے کوئی باخبر نہیں ہے)

(۴) **فرنگ**: اس کلمے کے لغوی معنی ہیں فرانسیسی لیکن رفتہ رفتہ تمام مغربی اقوام کو فرنگی کا لقب دیدیا گیا۔ ہماری زبان میں غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلے ہم لوگ مغرب کے لوگوں میں سے فرانس کے باشندوں ہی سے آشنا ہوئے تھے۔ (یہ جنگ ہائے صلیبی کی طرف اشارہ ہے) اقوام کا جو ہجوم مسلمانوں سے لڑنے کے لئے بڑھا چلا آتا تھا۔ اس میں اہلِ فرانس قابل توجہ[3]، قابل التفات اور قابل قدر[4] تھے۔ ان حالات میں یورپ سے آنے والے سب کے سب..... اسی نام سے مشہور ہو گئے۔

(۵) **فقر**: اقبال کے کلام میں فقر بھی تصوف کی وہ اصطلاح نہیں جو سکنت، عجز، بے بسی اور افلاس سے متعلق ہے، بلکہ یہ مردِ مومن کا مال دنیا سے استغنا ہے اور ساتھ ہی زمانہ ستیزی کا معلم بھی ہے: اقبال کا صاحبِ فقر، یعنی مردِ قلندر، صرف اپنی ذات کو کثافتوں سے محفوظ نہیں کرتا بلکہ ایجاباً اپنے زمانے سے ٹکر لیتا ہے اور اقدارِ مروجہ کی جگہ بزور و قوت نئے اقدار قائم کرنے کی جد و جہد کرتا ہے

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

عزیز احمد کے خیال میں صبر ایک طرح کی سیاسی اور نفسیاتی انفعالیت ہے۔ جس کی وجہ سے ظلم

---

۱ برہانِ قاطع - غیاث۔ ۲ قصص قرآن - صدر الدین بلاغی ۱۳۳۰ھ چاپ تاباں۔
۳ سرگزشتِ الفاظ احمد دین (مطبع کریمی) لاہور۔
Wyld; Universal Dictionary of the English Language
۴ Dictionary of Word Origins, Joseph T. Shipley, New York, 1955.
۵ اقبال کے اشعار کے شواہد سے قطع نظر "اقبال کا تصور فقر" (مظہر الدین صدیقی) دیکھئے۔ مجلہ اقبال۔ اکتوبر ۱۹۵۳ء

سہنے میں نفسیاتی طور پر مزہ آنے لگتا ہے۔ صبر ایک طرح کا سیاسی افیون بن جاتا ہے[۱]

فقر کا قدیم تصور اس قسم کا صبر پیدا کرتا ہے اور اقبال لکھتا ہے:

بگذر از فقرے کہ عریانی دہد ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ اے خنک فقرے کہ سلطانی دہد

قلندر کے سلسلے میں بھی اس تلمیح سے بحث کی گئی ہے۔ وہ بھی دیکھیے۔ (انسان کامل)

(۶) فنونِ لطیفہ: ان فنون کو صنائع مستظرفہ بھی کہتے ہیں اور عام طور پر ماہرین جمالیات

ان کی دو قسمیں پہچانتے ہیں۔

جلیل القدر فنون[۲] اور کم رتبہ فنون[۳] پہلی شق میں جو فنون شامل ہیں ان پر کم و بیش اتفاق ہے۔

(۱) شعر ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ (۲) مصوری (نقاشی)

(۳) سنگ تراشی اور مجسمہ سازی ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ (۴) (الف) موسیقی (ب) رقص،

(۵) فنِ تعمیر۔

بعض ماہرین جمالیات رقص کو شامل نہیں[۴] کرتے اور صرف موسیقی کی شمولیت کافی سمجھتے ہیں

شوپن ہار کے خیال میں موسیقی گویا فنون لطیفہ کی جان ہے۔

فن تعمیر اور نغمے کے متعلق گوئٹے کا ایک فقرہ شنیدنی ہے۔

"فنِ تعمیر سنگ بستہ موسیقی ہے اور فنِ تعمیر کا تناسب گویا[۵] خاموش بے کاری ہے۔"

خطاطی۔ کاشی گری۔ ظروف سازی، قالی بافی اور اس قسم کے دوسرے فنون کو بھی اکثر مورخ

فنونِ لطیفہ ہی میں شامل کر لیتے ہیں۔ چنانچہ آرنلڈ نے میراثِ[۶] اسلام میں ایک مضمون بعنوان

---

[۱] اقبال۔ نئی تشکیل۔ عزیز احمد۔ صفحہ ۱۴۴ (تاج آفس کراچی)۔ [۲] ایضاً صفحہ ۱۴۸۔

[۲] Major Fine Arts ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ [۳] Minor Fine Arts

[۴] Dictionary of Philosophy, Fine Arts P. 110 ; D. D. Runes.

[۵] Story of Philosophy ; by W. Durant.

[۶] Legacy of Islam. Oxford University Press ; 1952 Edition P. 108

فنون اور یورپ پر ان کا اثر" شائع کیا ہے۔

پروفیسر شوستری نے بھی خطاطی وغیرہ کو فنونِ متفرقہ" میں شامل۔۔۔۔ کیا ہے اور ظاہر ہے کہ ان کی مراد بھی یہی ہے کہ یہ فنون بھی بہت اہم نہ سہی لیکن ہیں ضرور فنون لطیفہ ہی[1]۔ اور واقعی قالین کے رنگوں کے امتزاج اور دیواروں پر پچی کاری کا کام دیکھنے کے بعد کوئی شک بھی نہیں رہتا کہ یہ فنونِ لطیفہ ہیں" فلسفے کی لغت جس کا پہلے حوالہ دیا جا چکا ہے، یہ کہتی ہے کہ فنونِ لطیفہ حسن کے اصول پر مبنی ہوتے ہیں۔ یہ بات ذرا گول ہے۔ حسن کی تخلیق، فن کار کا مقصد نہیں ہوتا۔ ہاں فنِ لطیف میں حسن ضرور ہوتا ہے (مقصد نہیں ہوتا ہے سے مراد یہ ہے کہ لازم نہیں کہ فن کار کا مقصد تخلیق حسن ہو، ہو سکتا ہے کہ مقصد کچھ اور ہو کوئی پابندی نہیں ہے۔ صرف نتیجۂ عمل تخلیق کا حسین ہونا لازمی ہے) مصوّر صرف اپنے فن کے اظہار کے لئے ہی نہیں بلکہ اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے نقاشی کے اعلیٰ درجے کے نمونے پیش کرتا ہے یہاں مقصد افادی ہے۔ لیکن اگر نتیجۂ حسن پیدا ہو گیا ہے تو فن لطیف کا نمونہ وجود میں آ گیا ہے[2]۔

اقبال خود آرٹ کو فن کار کی شخصیت کا اظہار تصوّر کرتا ہے۔

آیا کہاں سے نالۂ نے میں سرورِ مے ‌ ‌ ‌ ‌ اصل اس کی نے نواز کا دل ہے کہ چوبِ نے

جس روز دل کی رمزِ مغنّی سمجھ گیا ‌ ‌ ‌ ‌ سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت[3] ‌ ‌ ‌ ‌ معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

قطرۂ خونِ جگر سل کو بناتا ہے دل ‌ ‌ ‌ ‌ خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود

---

[1] Outlines of Islamic Culture. V. I. P. 274 Bangalore

[2] Art ; A Universal Dictionary of the English Language Wyld

[3] Iqbal's Theory of Art ; M. M. Sharif, "Iqbal", Lahore V. 2, Number 3, January, 1954.

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

اقبال نے فنونِ لطیفہ کے متعلق اپنے افکار و خیالات نسبتاً شرح و بسط سے بیان کیے ہیں۔ مثلاً ضربِ کلیم کا ایک حصہ انہی باتوں سے بحث کرتا ہے۔ بالِ جبریل میں جستہ جستہ اشعار ہیں اور یہ اشعار یعنی در بیانِ فنونِ لطیفہٴ غلامان، پڑھ کر بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اقبال کے خیال میں مردانِ آزاد کے فنونِ لطیفہ کیسے ہونے چاہئیں۔

(۷) **فروردیں**: فارسی مہینے کا نام ہے (مدتِ ماندنِ آفتاب در برجِ حمل و آں سی و یک روز است) ہندی بیساط کے مطابق ہوتا ہے کم و بیش۔

(۸) **فریدوں**: روایاتِ ادبی کے اعتبار سے، ایک قدیم ایرانی بادشاہ جو شان و شوکت اور جاہ و جلال کے لئے مشہور تھا۔

جب ضحاک (اژی دہاک) کی ستم رانیاں حد سے گذر گئیں تو کاوہ لُہار نے علمِ بغاوت بلند کیا اور فریدوں نامی شاہزادے کو تختِ سلطنت پر بٹھایا۔

یہ فریدوں اور ضحاک کی آویزش، آریائی زبانوں کی نہایت قدیم آویزش ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خیر و شر کی آویزش کا ایک روپ ہے۔ سنسکرت میں فریدوں کا نام ترائی تنہ Traitana آیا ہے اور اس کی لڑائی مارسہ سر سے بتائی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مارسہ سر ضحاک (اژی دہاک) ہے۔ اس کے البتہ شانوں پر دو سانپ ہیں۔[۵]

۱۔ اقبال۔ نئی تشکیل۔ عزیز احمد صفحات ۴۲۲۔۴۴۴۔
۲۔ اقبال اور آرٹ۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔ جوہرِ اقبال۔
۳۔ اقبال اور فنونِ لطیفہ۔ سید عابد علی عابد۔ مقالاتِ یومِ اقبال۔ قومی کتب خانہ لاہور۔
۴۔ اقبال کا نظریہٴ فن۔ عزیز احمد۔ اردو۔ اکتوبر ۱۹۴۹ء۔

[۵] مزدیسنا، محمد معین۔ دانش گاہ طہران ۱۳۲۶ (فارسی)، کلمہ فریدون۔ حماسہ سرائی در ایران۔ ذبیح اللہ صفا (فارسی)، کلمہ فریدوں۔

ق

(۱) قدیم، مُحدث (حادث): قدیم اصطلاح میں وہ ہے کہ ازلی اور ابدی ہو۔ محدث یا حادث وہ ہے کہ فانی اور آنی ہو۔ مخلوقات محدث یا حادث ہیں۔ خدائے تعالیٰ قدیم ہیں۔

قدیم کی تعریف یوں کی گئی ہے:

"سابق اندر وجود آں کہ ہستی وے سابق بود بہمہ ہستی ہا۔ و ایں بجز خدا نیست۔" (ہجویری)[1]۔

بعض فلسفی عالم[2] کو قدیم لیکن مخلوق تسلیم کرتے ہیں۔

حدوث اور قدم کے متعلق قدیم فلسفیوں کے مباحث شبلی نے کم و بیش تفصیل سے قلمبند کر دیے ہیں۔

"قدیم وہ ہے جس پر کسی کو ذاتی سبقت نہ ہو اور کسی علت سے اس کا استناد نہ ہو سکے

---

[1] منقول از فرہنگ مصطلحات صوفیہ (تاریخ تصوف در اسلام)۔

[2] الکلام شبلی (جلد دوم) مکتبہ معین الادب لاہور صفحہ ۳۵ [3] ایضاً صفحات ۳۶-۶۷۔

اور محدث اس کے خلاف ہے۔

(۲) **قلندر:** دیکھئے فقر (شاہین سے بھی بحث کی گئی ہے)

مرد مومن اور انسان کامل کے لئے اقبال قلندر کا کلمہ استعمال کرتا ہے۔ شاہین کا کلمہ بھی اسی تصور کے لئے استعمال کرتا ہے۔ عزیز احمد کہتے ہیں کہ

بہ حیثیت مجموعی یوسف حسین خاں کا یہ خیال صحیح ہے کہ قلندر کی اصطلاح میں ایک روحانی پر تو کی جھلک ہے۔ قلندر انسان کامل کے روحانی پہلو کی نمود ہے۔ مرد مومن کی اصطلاح قرآنی اور اسلامی ہے.... اقبال کے انسان کامل کی نمود فقر ہی میں ممکن ہے۔[1]

ظفر احمد صاحب کے نام اپنے مشہور خط میں اقبال نے یہ صراحت کر دی ہے کہ شاہین رمز ہے اس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ (۱) خوددار اور غیرت مند ہے کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں۔ (۲) بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا (۳) بلند پرواز ہے۔ (۴) خلوت پسند ہے (۵) تیز نگاہ ہے۔[2]

شاہین، مرد مومن، قلندر اور فقر کے تصورات اس طرح شیر و شکر ہیں کہ ان کا مطالعہ بھی اس طرح کرنا چاہئے کہ ہر پہلو پر نظر رہے۔

(۳) **قیامتے کہ رست از دست چنگیز:** یہ مصرعہ چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کی غارت گری[3] کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ چنگیز خاں جس کا اصلی نام تیموجین ہے ۵۴۹ھ میں پیدا ہوا اور آہستہ آہستہ اس نے تمام منگولی قبائل کو مطیع و منقاد کر لیا ۶۱۵ھ میں چنگیز خاں اور علاؤالدین خوارزم شاہ (۵۹۶ھ-۶۱۷ھ) میں ایک تجارتی معاہدہ ہو گیا جس کی رو سے تاجر دونوں طرف

---

[1] اقبال - نئی تشکیل۔ [2] اقبال نامہ صفحہ ۲۰۲۔

[3] تاریخ مفصل ایران۔

آنے جانے لگے مسلمانوں کی بدبختی کہ اترار نے حاکم نے کچھ سنگ دل تاجر مروا ڈالے اور جب چنگیز خاں نے احتجاج کیا تو خوارزم شاہ نے چنگیز خاں کے سفیروں کو بھی ہلاک کر دیا۔ اس بے تدبیری کی بنا پر اور اس سفیہانہ حرکت کے نتیجے کے طور پر ۶۱۶ھ میں چنگیز خاں نے خوارزم شاہ پہ حملہ کر دیا اور اس کا لشکر سمرقند و بخارا کو فتح کرتا ہوا آگے بڑھا۔ علاء الدین ۶۱۷ھ میں وفات پا گیا اور اس کے لڑکے سلطان جلال الدین منکربی نے کچھ دنوں مدافعت جاری رکھی لیکن ۶۲۹ھ میں وہ بھی شہید ہو گیا اس کے بعد ۶۵۴ھ کے لگ بھگ ہلاکو خاں نے کہ چنگیز خاں کا پوتا تھا پہلے اسمٰعیلیوں[1] کے گروہ کا زور توڑا اور پھر آخری تاجدارِ عباسی مستعصم باللہ، (۶۴۰ھ-۶۵۶ھ) کی طرف متوجہ ہوا۔ اہل دربار کی منافقت اور بغداد میں خانہ جنگی کی سی فضا مہلک ثابت ہوئی اور آخر مستعصم باللہ کو ہلاکو خاں نے ہلاک کروا دیا بعض مورخ لکھتے ہیں کہ خلافت عباسیہ کے استیصال اور خلیفہ کی ہلاکت میں ابن العلقمی دخیل[2] تھا کہ اہل دربار اس کی توہین کرتے تھے اور اس نے شیعہ ہونے کی حیثیت سے مستعصم باللہ کے ولی عہد کے ہاتھوں رنج اٹھائے تھے۔ مورخوں کا ایک گروہ ابن العلقمی[3] کو بے گناہ گردانتا ہے۔ بہر حال چنگیز اور ہلاکو خاں کے حملے نے بڑے بڑے شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ بلا مبالغہ کروڑ کے لگ بھگ آدمی ہلاک ہوئے علم و فضل کا گویا نام ہی مٹ گیا۔ عربی کی سیادت ضائع ہو گئی۔ فارسی میں تصنیف و تالیف کا انداز ہی بدل گیا۔ تصوف کے افکار نے پرورش پائی اور بالعموم مایوسی کی سی ایک فضا طاری ہو گئی۔ آخر میں ہلاکو کے جانشین جو ایل خاں کہلاتے تھے مسلمان[4] ہو گئے تھے۔ انھیں کی نسبت علامہ اقبال نے کہا ہے۔

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

---

[1] جہاں کشائے جوینی تالیف عطا ملک (الف) مرتبہ محمد بن عبدالوہاب قزوینی۔ (ب) نظام الملک طوسی مصنفہ عبدالرزاق (احوال حسن بن صباح) [2] دیکھیے (الف) تاریخ ادبیات ایران۔ براؤن۔ جلد دوم۔ اور (ب) تاریخ مفصل ایران عباس اقبال۔
[3] دیکھیے الفخری، تاریخ وصاف، تجارب السلف اور دستور الوزراء۔ جن میں دونوں پہلو دکھائے گئے ہیں۔
[4] یوں تو سلطان احمد تکودار یا تکودر بھی مسلمان تھا لیکن اسلامی علوم و فنوں کی طرف زیادہ توجہ غازان خاں نے مبذول (تاریخ مفصل ایران۔ عباس اقبال)۔

ک

(۱) **کلیم:** اس کے لغوی معنی ہیں کلام کرنے والا۔ علامہ اقبال کہتے ہیں۔

شجر، حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں
خصوصیت[1] نہیں کچھ اس میں اے کلیم تری

حضرت موسیٰ کو دیدارِ الٰہی نصیب ہوا تھا اور خدا سے کلام کرنے کی سعادت بھی نصیب ہوئی تھی۔ بنو اسرائیل پر فرعون جو ظلم کرتا تھا۔ اُس سے بچنے کے لئے حضرت موسیٰ اپنی قوم کو مصر سے باہر لے گئے۔ فرعون نے تعاقب کیا تو اپنی فوج سمیت غرق ہو گیا حضرت موسیٰ کو فرعون کے جادوگروں کا مقابلہ کرنے کے لئے دو معجزے عطا ہوئے تھے۔ ایک تو یہ کہ وہ گریبان میں ہاتھ ڈال کر باہر نکالتے تھے تو روشن ہو جاتا تھا اسے معجزہ ید بیضا[3] کہتے ہیں۔ دوسرے

۱۔ بانگِ درا۔ غزلیات۔

۲۔ استدراک: فرائڈ کی کتاب Moses and Monotheism (Hogarth Press Ltd.) بھی دیکھئے۔

۳۔ یدِ بیضا کے لغوی معنی دستِ سپید ہیں۔ ید = دست۔ بیضا = سپید۔

ان کے عصا نے زمین پہ سانپ کی شکل اختیار کر کے فرعون کے جادوگروں کے سانپوں کو کھا لیا تھا حضرت موسیٰ کے متعلق اب ہماری معلومات خاصی وسیع ہوگئی ہیں۔ یہ طے ہوچکا ہے کہ جس فرعون سے حضرت موسیٰ اُلجھے تھے اس کا نام من فتاح تھا۔ فرعون بحیرۂ قلزم میں غرق ہوا ہے اور اسی سمندر نے حضرت موسیٰ کو راستہ دے دیا تھا۔ اس معجزہ کو معجزۂ[۵۱] فلق بحر کہتے ہیں

کوہِ سینا کا مشرقی گوشہ مدین سے ایک روز کے فاصلے پر، بحرِ قلزم کے دو شاخے کے درمیان مصر کو جاتے ہوئے واقع تھا۔ اسی کی وادی، وادی ایمن ہے جہاں حضرت موسیٰ نے دیکھا کہ ایک جھاڑی کو آگ لگی ہے جو نہ بجھتی ہے اور نہ جھاڑی کو جلا چکتی ہے۔ اسی جھاڑی سے آواز آئی کہ "اے موسیٰ میں ہوں اللہ پروردگار جہانوں کا"۔ یہیں حضرت موسیٰ کو خدا سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا۔ اس معاملے میں اختلاف ہے کہ آواز براہ راست ندائے الٰہی تھی یا کسی فرشتہ کی آواز تھی جو باری تعالیٰ کا ترجمان تھا۔ مولینا حفظ الرحمٰن کی رائے میں یہ براہ راست ندائے الٰہی تھی[۵۲]۔

(۲) **کم لبثتم . . . :** قرآن مجید کا حوالہ بہ تفصیل ذیل ہے۔ سورہ کہف۔ آیت ۱۹ مقام یہ ہے۔ اصحاب کہف جب اس کے متعلق بحث کرنے لگے کہ ان کی نیند کی مدت کتنی تھی تو انھوں نے خیال کیا کہ ایک یا ایک دن سے بھی کم۔

یہاں تصورِ زمان کے مختلف پہلوؤں کی طرف اشارہ ہے کہ اشعار کے سیاق و سباق

---

۵۱ (الف) قصص القرآن۔ حفظ الرحمٰن۔ حصہ اول، دہلی۔

(ب) ترجمان القرآن۔ مولینا ابوالکلام آزاد۔

(ج) فرعون کے لغوی معنی قصرِ بزرگ کے ہیں۔ اور یہ دو کلمات سے مرکب ہے۔ فارا بہ معنی قصر، اوہ بہ معنی بزرگ۔ اور فارا، اوہ کی تعریب فرعون ہے (دیکھیے قصص قرآن۔ سید صدرالدین بلاغی ۱۳۳۰ شمسی۔ چاپ تابان) سامری جس کا ذکر حضرت موسیٰ کے سلسلے میں آتا ہے، سومیری قوم کا فرد تھا۔ یہ اسم معرفہ نہیں ہے (دیکھیے ج)

۵۲ قصص القرآن۔ حفظ الرحمٰن (جلد اول) دہلی۔

سے یہ بات مترشح ہوتی ہے۔[۱]

(۳) **کہکشاں**: کاہ + کشاں۔ صورت کے اعتبار سے جیسے کوئی گھاس کھینچتا چلا گیا ہو۔ یوں کہکشاں کواکب کی کارگاہ ہے۔ یہیں ستارے بنتے ہیں اور یہیں سے وہ اپنا رخ اور اپنی حرکت متعین کرتے ہیں۔ یہاں کروڑوں ستارے ہیں کہ ابھی پوری طرح بنے نہیں۔ اقبال نے اپنی فکر کو کہکشاں سے تشبیہ دی ہے:

بنتے ہیں مری کارگہِ فکر میں انجم
لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان

(۴) **کوفہ**: دریائے فرات کے مغربی کنارے پر کشتیوں کے پل کے بالمقابل آباد تھا۔ مشہور شہر جس کے لوگوں نے حضرت امام حسینؑ سے دغا کی تھی۔

ادب میں بھی کوفہ اور اہلِ کوفہ کی دغابازی اور غداری کا ذکر ملتا ہے۔ داغ کہتا ہے:-

کریں آپ سے ہم دغا توبہ توبہ
یہ کوفی کریں گے یہ شامی کریں گے

(۵) **کے**: شہنشاہ، فردوسی ایران کے ایک قدیم حکمراں سلسلے کا نام کیانیاں بتاتا ہے یہ کے اسی کلمہ کیانی کا جزو ہے۔ بعض مستشرقین یہ تصور کرتے ہیں کہ ہخامنشی بادشاہ اور کچھ کیانی فرماں روا ایک ہی ہیں لیکن ذبیح اللہ صفا[۲] نے ثابت کیا ہے کہ یہ غلط ہے اور کیانی بادشاہوں کا سلسلہ (نیم تاریخی ہی سہی) ہخامنشیوں سے بالکل جدا ہے۔

(۶) **کے قباد**: ایرانی ادبیات[۳] کی روایت کے مطابق کیانی بادشاہ کا نام ہے۔ فریدوں

---

[۱] جغرافیہ خلافت مشرقی صفحہ ۴۷۔
[۲] حماسہ سرائی در ایران۔ ذبیح اللہ صفا دیکھیے صفحات ۴۵۰ تا ۴۶۰ (کیانی بھی دیکھیے۔)۔
[۳] حماسہ سرائی در ایران۔ ذبیح اللہ صفا۔ تہران۔

کی اولاد میں سے تھا۔

اوستا میں اس کی شکل کوات ہے (پہلوی میں بھی کوات ہے)

اسی نام کا یعنی قباد (کے تو سب بادشاہوں کے نام کا جزو ہے) ایک بادشاہ ساسانی خاندان میں بھی ہوا ہے، جس[1] کے عہد میں مزدک نے ظہور کیا تھا۔ (جلوس ۴۸۸ء عیسوی)

(۷) کیمیا: اکسیریں تو علم کیمیا یعنی الکیمیا، کیمسٹری ہے اور عربوں سے منسوب ہے لیکن بحسب روایتِ مشہور کیمیا ساز اُسے کہتے ہیں جو معمولی دھاتوں کو سونے میں تبدیل کردے۔ اکسیر بھی کیمیا ہی کو کہتے ہیں (جوہرے گداز ندہ و کامل کنندہ یعنی مس را طلا کند)

مفید، سود مند ادویہ بھی اکسیر کہلاتی ہیں۔ مجازاً مرشد[2] کامل کو بھی کہتے ہیں۔

---

[1] ایران بہ عہدِ ساسانیاں۔ محمد اقبال History of Persia; by Sykes. V. I. -

[2] فرہنگ آنند راج۔ غیاث۔ برہان۔

ل

(۱) **لا**: یہ حقیقت میں کلمہ طیبہ کا جزو ہونے کی حیثیت سے یہ معنی رکھتا ہے کہ دنیا میں خدا کے سوا کسی کو معبود نہیں ماننا چاہیئے۔ نہ کسی کے احکام کے آگے سر تسلیم خم کرنا چاہیئے گویا لا نفئ ذات غیر الٰہی ہے اور جب تک آدمی اس مقام تک نہ پہنچے اگلا مقام نہیں حاصل ہو سکتا۔

(۲) **لات و منات**: یوں تو بتوں کے نام ہیں لیکن یہاں مصوّر کے نقوش مراد ہیں جن سے نئی زندگی کا سراغ ملتا ہو۔ بت پرستی کی تاریخ بہت قدیم ہے اور عام طور پر ذہن انسانی ایک علامت کی جستجو کرتا ہے۔ جس کے ذریعے ما فوق الادراک حقیقت کی پرستش کر سکے۔

اسلام سے پہلے عربوں کے ہاں بت پرستی اور بت گری کا کام بہت زوروں پر تھا۔

ملہ فنونِ لطیفہ غلاماں کا صحیح مفہوم ذہن نشیں تبھی ہو سکتا ہے کہ ضربِ کلیم کے وہ اشعار بھی پیش نظر رہیں جو ادبیات اور فنون لطیفہ سے متعلق ہیں۔

صدر الدین لکھتے ہیں کہ منات کا بت قبائل ہذیل و خزاعہ سے متعلق تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بت بابل سے آیا تھا اور اس کا اصلی نام (بابلی زبان میں مامنا نو تھا)

لات، خاص طور پر طائف کا بت تھا اور اس کی صورت "سنگ چہار گوشہ" کی تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لات کا کلمہ اصلاً نبطی ہے۔ اور یہ بت بھی بابل سے آیا تھا۔[۵۱]

(۳) **لن ترانی:** سورۂ اعراف میں ظہورِ تجلّی اور حضرت موسیٰ کا ذکر ہے۔ مقام یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ وحی کے اشارے سے کوہ طور پر پہنچے اور اعتکاف پورا ہوگیا تو خدائے تعالیٰ نے ان سے کلام کیا۔ حضرت موسیٰ نے دیدار سے بھی شرف اندوز ہونا چاہا اُس وقت خدا نے کہا لن ترانی، تو مجھے نہیں دیکھ سکے گا۔

ظہورِ تجلی ہوا اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہوگیا۔ حضرت موسیٰ کو غش آگیا۔ اس کے بعد جناب پر توراۃ[۵۲] نازل کی گئی

لن ترانی، تجلّی، طورِ ایمن، ان الفاظ میں جو ذخیرۂ تلمیحات کا مخفی ہے اُس سے فارسی اور اردو کی ادبی روایت نے فائدہ اٹھایا ہے۔ ولی کی غزل سے لے کر تاثیر کی نظم ید بیضا تک ان تلمیحات کے آثار و نشانات ملتے ہیں۔

(۴) **لوح (و قلم):** کچھ حوالے بہ تفصیل ذیل ہیں۔ (الطارق) $\frac{۸۵}{۲۲}$ (القلم) $\frac{۶۸}{۱}$

لوح کے روایتی معنی نوشتۂ تقدیر کے ہیں (دیکھیے جبر و قدر) لغت میں تختی کو کہتے ہیں علامہ مرحوم کے خیال میں "تفکر کے وسیع تر یا لامحدود کل کے لئے قرآن پاک میں لوح محفوظ کا استعارہ استعمال ہوا ہے جس میں علم کے تمام امکانات اپنی بسیط صورت میں

---

[۵۱] قصص قرآن۔ بلاغی۔ فرہنگ۔ بت پرستی۔ لات کے متعلق جو معلوم ہوا ہے اس سے شبہ ہوتا ہے کہ شوکی علامت نہ ہو۔ کیونکہ بت کا ذکر نہیں ہے۔ سنگ چہار گوشہ کا ذکر ہے۔

[۵۲] قصص القرآن۔ حصہ اول۔ حفظ الرحمٰن دہلی۔

موجود رہتے ہیں ـــــــــــــــــــــ پھر وہی امکانات مکان و زماں .Space Time میں یکے بعد دیگرے منفرد تصورات کی حیثیت سے اس طرح ظاہر ہوتے رہتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی وحدت کی تکمیل میں مصروف ہیں جو ان کی ذات میں پہلے سے موجود ہے۔[1]

معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کے خیال کے مطابق لوح محفوظ غایت انکشافات علم کو بھی محیط ہے اور ظاہر ہے کہ خدا کے علم کو، ان انکشافات کو محیط ہونا ہی چاہیئے۔

---

[1] علم و عرفان (اقبال کے پہلے لکچر کی تلخیص) مجلہ اقبال، اپریل ۱۹۵۵ء -

،، لکچر یعنی اسلام میں مذہبی تفکر کی تشکیل جدید -

Reconstruction of Islamic Thought.

م

(۱) ماہ: از طواف او خجل کردی مرا

مسلّم ہے کہ چاند زمین کا طواف کرتا ہے۔ زمین اور چاند کی اس نزدیکی سے بہت سے اہم نتائج ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ مثلاً موجوں کا مد و جزر۔ اسی کے طلوع و غروب سے مہینوں کا حساب بھی لگایا جاتا ہے وہ قمری کہلاتے ہیں۔ اصطلاح میں چاند زمین کا Satellite ہے یعنی وہ سیارہ جو دوسرے کے گرد طواف کرتا ہے۔ سیارہ تابع، سیارہ ثانویہ۔

ادبیات میں چاند سے دیوانگی کے تصوّرات وابستہ ہیں اور مشہور ہے کہ دیوانہ چاندنی راتوں میں زیادہ آشفتہ حال ہوتا ہے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ باریک کپڑا کتان چاندنی کی شعاعوں کے اثر سے پھٹ جاتا ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں

بے نظیر شاہ:
یہ عالم جو دیکھا تو شکلِ کتاں
ہوا پارہ پارہ دلِ عاشقاں

مبرائے ہم نشیں شبہائے مہتابم بکوئے او
کہ من دیوانہ ام از سایۂ دیوار می ترسم

انگریزی میں Lunacy (دیوانگی) Lunar سے متعلق ہے (یعنی چاند اور چاندنی سے)

(۲) محمود۔ایاز: عام طور پر علامہ کے کلام میں محمود، عظمتِ سلطنت یا جلال کی علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے اور ایاز اس کے مقابلہ میں، رعایا کے لئے یا کم رتبہ لوگوں کے لئے جیسے

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

لیکن کبھی محمود، سرمایہ دارانہ نظام کے لئے، اور ایاز مغلوب و مفتوح قوموں کے افراد کی علامت بن جاتا ہے مثلاً: جادوئے محمود کی تاثیر سے چشم ایاز

کبھی ایازی سے مراد اس طرح زیست بسر کرنا ہوتا ہے کہ ماحول کو بدلنے کے لئے حالات سازگار نہ ہوں اور آدمی ہر طرح مغلوب و مفتوح رہنے کے لئے مجبور ہو، مثلاً:

طبیعت غزنوی قسمت ایازی

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر یہ بھی طے کر دیا جائے کہ ایاز تاریخی شخصیت ہے یا افسانوی اور محمود سے اس کے روابط کی نوعیت کیا ہے کہ یہ تلمیح (محمود و ایاز) اردو اور فارسی ادب میں استعمال ہوتی ہے۔

ایاز واقعی ایک تاریخی شخصیت ہے۔ شعرا نے اس کی تعریف میں قصیدے لکھے ہیں۔ نثر نگاروں نے اس کی اور سلطان محمود کی دوستی کی داستانیں قلمبند کی ہیں۔ اس کی کنیت ابوالنجم تھی اور نام ایماق اور سلطان محمود کی خدمت میں اس نے کارہائے شائستہ انجام دیے ہیں

لہ فرخی، کلیات۔ چہار مقالہ۔ تنقید شعر العجم۔ حافظ محمود شیرانی۔ انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۹۴۲ء (فردوسی اور فرخی کے حالات)۔

ایران کے ایک فاضل نے محمود و ایاز کے نام سے ایک نہایت مفصل مقالہ لکھا ہے جن کو شوق ہو اس سے رجوع کریں۔

(۳) **مشائی**: (دیکھیے ارسطو) اس کا مادہ تو مشی ہے۔ بہ فتح میم و سکون شین، زنتن بہ معنی لیکن مشّائی (بہ تشدید شین)، اصطلاح بن گئی۔ اس سے حکما کے ایسے گروہ کا فرد مراد ہے۔ جو ارسطو اور اس کے جانشینوں کا معتقد ہو اور اسی مسلک سے تعلق رکھتا ہو۔[۲]

(۴) **مشتری**: انگریزی Jupiter فارسی برجیس۔ اس کا لقب قاضی فلک ہے، اور مبارک سیاروں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ ارباب[۳] لغت لکھتے ہیں کہ جس کے طالع میں زحل اور مشتری کا قران (یکجائی) ہو وہ صاحب اقبال بادشاہ ہوتا ہے۔ اسی لئے تیمور کا لقب ہے۔ صاحب قران ثانی شاہ جہاں ہے۔

(۵) **مصر یمن۔ کنعان**: پہلے دو ملک تو مشہور ہیں۔ مصر افریقہ کا جزو ہے اور یمن عرب کا کہ ایشیا میں ہے لیکن کنعان کے متعلق غالباً یہ عام طور پر معلوم نہیں ہے کہ فلسطین[۴] کا قدیم نام ہے اور حضرت یوسف کنعانی اسی نسبت سے کہلاتے ہیں کہ وہ اور حضرت یعقوب اپنے خاندان کے ساتھ فلسطین میں قیام پذیر تھے۔

---

[۱] محمود و ایاز۔ احمد سہیلی (مجلہ یغما سال چہارم)۔

[۲] سرگذشت الفاظ۔ لاہور۔ احمد دین۔ مولف کا خیال ہے کہ اس مسلک کے پیرو ٹہلتے جاتے تھے اور ٹہلتے جاتے تھے، چلتے اور پڑھاتے تھے اور اس لئے اس کے ہم خیال مشائین (چلنے والے)، کے نام سے شہرت پا گئے۔ صفحہ ۱۴۸ کتاب مذکور۔ (دیکھیے آنندراج، غیاث)۔

[۳] غیاث۔ آنندراج۔ طغرا

داده به صاحب قراں نرگس شہلا قلم تا کند نقش در جہاں نشو و نما قلم

[۴] قصص القرآن۔ حفظ الرحمٰن۔ جلد اول۔ حالات حضرت یعقوب و یوسف۔

Moses and Monotheism by Sigmund Freud,
trans. by Catharine Jones (The Hogarth Press) P.48

(۶) **معراج:** "اسراء کے معنی شب میں لے جانے کے ہیں۔ نبی اکرم کا وہ بے نظیر شرف و مجد اور حیرت زا واقعہ جس میں خدائے برتر نے اپنے رسول کو مسجد حرام تک سے مسجد اقصیٰ بیت المقدس اور وہاں سے ملاء اعلیٰ تک بہ جسد عنصری اپنی نشانیاں دکھلانے کے لئے سیر کرائی۔ چونکہ شب کے ایک حصے میں پیش آیا تھا اس لئے اسرا کہلاتا ہے۔[۵۱]

معراج عروج سے مشتق ہے جس کے معنی چڑھنے اور بلند ہونے کے ہیں۔ نبی اکرم نے آیات اللہ کا مشاہدہ فرمایا، اور ان واقعات کے ذکر میں زبان وحی ترجمان نے "عُرِجَ بِی" کا جملہ استعمال فرمایا اس لئے اس باجبروت اور پرعظمت واقعے کو معراج سے تعبیر کیا جاتا ہے۔"[۵۲]

عام طور پر اس بات پر اتفاق ہے کہ رسول پاک کو معراج ہجرت سے ایک یا ڈیڑھ سال پہلے حاصل ہوئی ہے۔ مہینہ اور تاریخ کے متعلق قول راجح یہ ہے کہ مہینہ رجب کا تھا اور تاریخ ۲۷ تھی۔ اس واقعہ کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل میں بھی ہے اور النجم میں بھی۔[۵۳]

(اس بات پر اختلاف ہے کہ آیا معراج جسمانی تھی یا روحانی) خود علامہ اقبال نے جاوید نامہ میں معراج کے متعلق نکتہ طرازی کا حق ادا کر دیا ہے۔ روح رومی اسرار معراج کی شرح کرتے ہوئے کہتی ہے)

چیست معراج آرزوے شاہدے	امتحانے رو برو ئے شاہدے
پیکر فرسودہ را دیگر تراش	امتحان خویش کن موجود باش
بر مکان و بر زماں اسوار شو	فارغ از بیچاک ایں زنار شو
از شعور است ایں کہ گوئی نزد و دور	چیست معراج انقلاب اندر شعور

---

۵۱ قصص القرآن (جلد چہارم) حفظ الرحمٰن۔ دہلی۔ اسرا (معراج) صفحہ ۳۲۷۔

۵۲ قصص القرآن۔ حفظ الرحمٰن۔ جلد چہارم صفحہ ۳۳۹ ۵۳ ایضاً ۳۳۹۔

انقلاب، اندر شعور از جذب و ذوق[۱]

وا رہاند جذب و شوق از تحت و فوق

(جاوید نامہ میں علامہ نے اپنے "مکاشفات" کو قلمبند کیا ہے اور اس کتاب کے مندرجات نہایت دقیق اور سود مند ہیں۔ جن دنوں اس کتاب کی تصنیف میں مصروف تھے۔ دوستوں سے خط و کتابت کے ذریعہ ایسی کتابوں کا سراغ لیتے رہتے تھے جن میں مکاشفات کی قسم کی چیزیں ہوں)

عُروجِ انسانیت کی بحث میں معراجِ نبوی کی حقیقت کے متعلق حکما اور عرفا نے بڑے حکمت آموز اور دل فروز نکتے پیدا کیے ہیں۔۔۔۔۔۔ مولینا روم فرماتے ہیں کہ بھائی یہ معراج عشق ہی کا ایک کرشمہ ہے۔ مادی اور جسمانی عالم اور زمان و مکان میں سے طرفۃ العین میں ایک محبت میں نکل جانا معراجِ انسانی ہے۔۔۔۔۔۔ اس مضمون میں سرمد کی ایک لاجواب باعی ہے۔

آں را کہ سرِ حقیقتش باور شد　　خود پہن تر از سپہر پہنا در شد

ملا گوید کہ بر شد احمد بہ فلک　　سرمد گوید فلک بہ احمد در شد

عشق کے اس کرشمے کے متعلق اقبال بھی رومی اور سرمد کا ہم نوا ہے[۲]

اُردو میں بھی معراج کے متعلق علامہ کے دو شعر نہایت معنی خیز ہیں۔

اختر شام کی آتی ہے فلک سے آواز　　سجدہ کرتی ہے سحر جس کو وہ ہے آج کی رات

رہ یک گام ہے ہمت کے لئے عرش بریں　　کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

(۷) **معنی**: اقبال کا خیال ہے کہ نغمے میں معنی ہونے چاہئیں۔ اس کے لئے دیکھئے اقبال کا فن (عزیز احمد) جس کا پہلے دیا جا چکا ہے اور خود معنی[۳][۴] کا مطلب ہے "قصد کردہ شدہ"

---

۱ جاوید نامہ (جستہ جستہ اشعار انتخاب کئے گئے ہیں)، طبع دوم ۱۹۴۷ء صفحات ۲۰۱،۱۴ -

۲ اقبال اور عشق۔ خلیفہ عبدالحکیم۔ اقبال۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء -

۳ غیاث اللغات کلمۂ معنی -　　۴ فرہنگ آنندراج کلمۂ معنی -

جائے قصد کردن، وجائے خواستن:

یعنی جس چیز کے اظہار کا آپ ارادہ کریں وہ معنی ہیں ۔

صاحب لغاتِ فلسفہ نے کہا ہے کہ معنی نہایت مبہم لفظ ہے اور یہ ابہام تو کبھی اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ متکلم اور سامع کا نقطہ نظر جدا ہوتا ہے۔ کبھی سامع زبان کے اُس وصف کی طرف دھیان دیتا ہے جس سے مطلب خبط ہو جاتا ہے۔ پھر معانی کی مختلف قسمیں[۵۱] ہیں۔ مشرق کے ادب میں بھی معانی لغوی و مجازی کی بنیادی تفریق قائم ہے[۵۲]۔

(۸) مُغ بچہ: مجوسی۔ زرتشت کا پیرو۔ مغ ہی سے مجوس ہے اور[۵۳] Magic بھی اسی سے ہے۔

مغوں کے ہاں شراب پینا گناہ نہ تھا اس لئے شراب کے سلسلے میں اکثر مغ بچوں ہی کا نام لاتے ہیں۔

---

[۵۱] Dictionary of Philosophy

[۵۲]

معانی

مجازی | لغوی

جہاں قرینہ اس بات پر دلالت کرتا ہو کہ معانی مجازی مراد ہیں۔

جہاں قرینہ مجاز کا موجود نہ ہو اور معانی لغوی سے معانی مجازی لازماً مترشح ہوں
(۳) کنایہ

جہاں تعلق معانی لغوی اور مجازی میں تشبیہ کا ہو
(۱) استعارہ
تشبیہ کسی طرح مجاز میں شمار نہ ہو گی۔

جہاں تعلق بدون تشبیہ ہو
(۲) مجاز مرسل

[۵۳] دیکھئے لغت انگریزی Wylie اور او۔ ہنری کی کہانی The Gift of the Magi

(پیر مغاں تصوف کی اصطلاح مرشد کامل کو کہتے ہیں۔)

مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند ستارہ می شکنند آفتاب می سازند

(۹) مطلق: جو ہر قسم کی قید سے آزاد ہو۔ ذات باری تعالیٰ (آزاد شدہ از قید و حصر بے خصوصیت و روا کردہ شدہ و آں کہ آں را قید نباشد)[1] فلسفے کی اصطلاح ہیں۔ جو اضافی کے مقابل ہو۔ کبھی مطلق کے معنی حقیقی بھی ہوتے ہیں اور وہ ذات جو معلوم نہ ہوسکے، ماورائے علم ہو (میتھیل سپنسر)[2] منطق، اخلاقیات اور جمالیات میں بھی مطلق مستعمل ہے۔ (مثلاً حسن ایک صفت مطلق ہے کہ اس کے مدارج نہیں ہیں۔ یہ مطلق کے اور معنی ہیں جو بے قید سے جدا ہیں)۔

(۱۰) مقام: موسیقی کی اصطلاح ہے پردۂ سرود کو کہتے ہیں اور پردے بارہ ہیں۔

(۱) راست (۲) شباب (۳) بوسلیک (۴) عشاق (۵) زیر بزرگ (۶) زیر کوچک (۷) حجاز (۸) عراق (۹) زنگلہ (۱۰) حسینی (۱۱) رہادی (۱۲) نوا۔

بعض لوگ حجاز کی جگہ باخرز اور زنگلہ کی جگہ نہاوند لکھتے ہیں۔

تصوف کی اصطلاح ہیں، جب بندہ آغاز سلوک میں ایک درجہ تک پہنچ کر عبادت میں مصروف ہو جاتا ہے تو اسے مقام کہتے ہیں لیکن سالک کا فرض ہے کہ دوسرے بلند تر مقامات تک پہنچنے کی کوشش کرے۔[3]

(۱۱) مُلّا: کبھی نہایت احترام کے طور پر اور غایت عقیدت کے اظہار کے لئے کسی شخص کے نام کے ساتھ اس لقب کا اضافہ کرتے تھے جیسے ملا صدرا وغیرہ لیکن امتداد زماں سے اور علمائے سوء کے اختلافات سے اس لفظ کے معانی میں بھی تنزل فاحش رونما ہوا اور

---

[1] غیاث کلمۂ مطلق۔ س۔ جیم کلمۂ مطلق۔ آنند راج کلمۂ مطلق۔

[2] Dictionary of Philosophy; Absolute; P. 2.

[3] غیاث۔ آنند راج۔ شیریں خسرو۔ نظامی۔

ایک مرکب کٹ ملا، کٹھ ملا بھی زبان میں پیدا ہوا جس کے معنی جاہل کے ہیں (اور اس میں تعصب کا عنصر بھی شامل ہے) اب ملا اس شخص کو کہتے ہیں جو شریعت کے ظاہری پہلوؤں کی پابندی کرے اور اس میں بھی کچھ ریاکاری کا عنصر شامل ہو۔ اقبال "ملائیت" سے ایک دائرہ مراد لیتا ہے۔ جس کے افراد اسلام کو زندہ حقیقت کی بجائے، چند جامد قوانین کا مجموعہ تصور کرتے ہیں۔ دوسرے اسلامی ممالک میں بھی تنگ نظر ملائیت نے جو فتنے برپا کیے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں حاشا کسی عالم دین کی یا کسی فاضل مذہب کی تنقیص مقصود نہیں۔ مذہبیت کی بگڑی ہوئی شکل کو ملائیت کہا گیا ہے۔ اسی شکل میں اقبال ملائیت سے، اور اس کے افراد سے برسرپیکار رہے۔

اقبال نے ملا کا لفظ[۱] علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ورنہ صرف شریعت کے ظاہری رسوم و عوائد کی پابندی پر زور دینا اور روح شریعت سے بے خبر رہنا، ہر زمانے میں ہدف انتقاد بنتا رہا ہے۔ البتہ ایسے اشخاص کے علامتیں مختلف تھیں۔ جو ظواہر پر اس قدر شیفتہ ہوں کہ روح سے بے خبر ہو جائیں، ایسے لوگ عام طور سے ریاکار بھی ہوتے تھے۔ حافظ نے صوفی کا کلمہ علامت کے طور پر استعمال کیا ہے اور اس سے مرد ریاکار مراد لی ہے۔[۲]

(۱۲) **ملت**: مغرب میں ملت کا سیاسی تصور یہ ہے کہ بالعموم ایک ملت کے افراد کسی مخصوص خطۂ زمین سے متعلق ہوتے ہیں۔ بالعموم اس لئے کہا گیا کہ بعض اوقات ایسا نہیں تھا مثلاً جب تک فلسطین بہ جبر و قہر یہودیوں کا وطن قرار نہیں دیا گیا تھا۔ ملت یہود کا کوئی وطن نہ تھا۔ مملکت (State.) کے لئے البتہ ایک خطۂ زمین ضرور درکار ہے۔

۱ے تفصیل کے لئے دیکھیے۔ اقبال اور ملا۔ خلیفہ عبدالحکیم۔ مجلہ بزم اقبال ۱۹۵۳ء (اکتوبر) –

۲ے حافظ شیرازی (انگریزی) مجلۂ اقبال۔ جولائی ۱۹۵۵ء –

اقبال کے خیال کے مطابق ملتِ اسلامیہ مذہب کی بنا پر قائم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مولانا حسین احمد مدنی کی تردید میں ایک مضمون لکھا تھا جو یہ کہتے تھے کہ ملتیں اوطان سے بنتی ہیں۔ جہاں تک ملت کے جغرافیائی تصور کا تعلق ہے۔ اقبال کو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ ہم ہند میں پیدا ہوئے اس لئے ہندی ہیں اور ہمارے دل میں ہندستان کی محبت ہونی چاہیئے لیکن جب یہ تصور سیاسی شکل اختیار کر لیتا ہے تو اسلام کی وحدت سے ٹکراتا ہے۔ کیونکہ اگر خطہ مخصوص ملت کی تخلیق کا ضامن ہو تو مسلمان بے شمار ملتوں میں بٹ جائیں گے اور اس طرح مسلمانوں کی وحدت کو صدمہ پہنچے گا۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال بہت جلد (جغرافیائی حب وطن کے قائل ہونے کے باوصف) یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

تیرا سفینہ کہ ہے بحر بیکراں کے لئے — رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک

(۱۳) **ممکن واجب** } واجب الوجود اصطلاح میں خدا تعالیٰ کو کہتے ہیں اور ممکن الوجود مخلوقات کو، کہ فانی ہیں اور حادث ہیں۔ ہر شے خارجاً مخلوق ہے لیکن قبل تخلیق حق تعالےٰ کی معلوم ہے یعنی اُس کا ثبوتِ علمی ذاتِ حق میں متحقق ہے۔ اسی اعتبار سے سارے عالم کو ممکن الوجود کہا جاتا ہے۔ واجب الوجود بالذات موجود ہے۔ قائم بالذات ہے اور کسی کا محتاج نہیں۔ اس اعتبار سے ممکن میں اور واجب میں مغائرت تامہ ہے کہ حق تعالیٰ مولا ہیں اور ہم ان کے عبد، وہ حاکم ہیں اور ہم محکوم، وہ عالم ہیں اور ہم معلوم[۵۲]۔

قدیم[۵۳] اصطلاح میں ممکن الوجود، مخلوقات ہیں کہ ان کا وجود ضروری ہے نہ عدم۔

---

۵۱ جغرافیائی حدود اور مسلمان۔ مضامین اقبال۔ مطبوعہ ۱۳۶۲ھ حیدر آباد دکن۔

۵۲ اقبال کا فلسفہ خودی۔ ڈاکٹر میر ولی الدین۔ فکر اقبال۔ اُردو اکیڈمی سندھ۔ کراچی۔

۵۳ غیاث۔ کلمہ ممکن الوجود۔

واجب[1] اصطلاح میں اُس وجود کو کہتے ہیں کہ اپنی بقا کے لئے محتاج غیر نہ ہو اور وہ وجودِ حق تعالیٰ ہے اور واجب الوجود[2] وہ ہے کہ اس کی ذات ہی اس کے وجود کی مقتضی ہو

(۳۴) من : که من باشم مرا از من خبر کن
چه معنی دارد اندر خود سفر کن

صاحبِ گلشن راز جدید کے قول کے مطابق تو وحدتِ وجود کی بنا پر "میں" "تو" اور "وہ" کا مشارالیہ حقیقت میں وہی واحد مطلق ہے جسے مختلف اعتبارات کے مطابق عبارتوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ محمود شبستری کہتے ہیں۔

من و تو عارض ذات وجودیم مشبکہائے مشکوٰۃ وجودیم

جب انسان یہ سمجھ جاتا ہے کہ

تو آں جمعے کہ عین وحدت آمد تو آں واحد کہ عین کثرت آمد

تو وہ سفر شروع ہوتا ہے جس کا ذکر شعر میں آیا ہے یعنی "اندر خود سفر کن"

کسے ایں سر شناسد کو گذر کرد ز جزوی سوئے کلی یک سفر کرد

ظاہر ہے کہ علامہ اس نظریے کے مخالف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ خودی (اس کی تشریح ہو چکی ہے) باخود در ستیز است۔ اس کی ذات کا پہلا پرتو حیات ہے اور یہ جو سفر در خویش ہے۔ یہ گویا "انقلاب اندر شعور" ہے۔

اس سفر کی غایت تسخیر کائنات ہے جیسا آیاتِ قرآنی میں صراحت کر دی گئی ہے من ظاہر ہے کہ وہ انا ہے خودی ہے۔ جس کا ذکر آچکا ہے مقصد اس من کا ارتقا ہے اس کی نفی

---

[1] کلمہ واجب۔ غیاث اللغات۔ [2] کلمہ واجب الوجود۔ غیاث اللغات۔
آنندراج بھی دیکھیے کہ یہی مفہوم اس کے ہاں بھی ہے۔ واجب الوجود کے متعلق صاحبِ آنندراج نے تفصیل زیادہ دی ہے شبلی کے مقالات الکلام اور الغزالی کا مطالعہ بھی اس سلسلے میں مفید ہوگا۔

نہیں، انسان آخر ارتقائے ذات کی منزلیں طے کرکے ابدیت کا وہ مقام حاصل کرے گا جہاں اس کی خودی، واجب الوجود کی خودی میں تحلیل نہیں ہو جائے گی بلکہ علیحدہ شخصیت کی حامل رہے گی۔

من کے مختلف معانی کے لئے لغتِ فلسفہ صفحات ۱۳۶-۱۳۵ کا مطالعہ کرنا چاہیئے علامہ کا من (جیسا جواب سے نمودار ہوا ہے .Ich سے مشابہ معلوم ہوتا ہے۔

(۱۵) مَنۡ رَاٰنِیۡ فَقَدۡ رَاَءَ اللّٰہَ: جس نے مجھے دیکھا بہ تحقیق اُس نے خدا کو دیکھا۔ بحسب قول مشہور حدیث نبوی ہے اور رسول پاک اور خدائے تعالیٰ کے درمیان جو رابطہ قائم ہے۔ اس کے مختلف پہلوؤں کی طرف اشارہ ہے۔

(۱۶) موسیقی: زیوس دیوتا کی نو لڑکیوں کی روایات یونانی صنمیات میں بہت آب و تاب سے بیان کی جاتی ہیں۔ یہ لڑکیاں .Muses کہلاتی تھیں۔ یہ لڑکیاں خود بھی دیویاں تھیں اور مختلف علوم وفنون کی تربیت ان کے ذمہ تھی۔

موسیقی انہی دیویوں میں سے ایک کے ساتھ منسوب[52] ہے۔ ہندوستان کی کلاسیکی موسیقی کا تعلق اصلاً مذہب سے ہے اور صرف ہندوستان ہی سے مخصوص نہیں۔ کم وبیش[53] تمام آریائی قوموں میں موسیقی اور مذہب کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔

موسیقی مذہب سے متعلق ہوگی تو بیشتر راگ راگنیاں دیوی دیوتاؤں کے سامنے انسان کے عجز و نیاز کا اظہار کریں گی[54]۔ خداؤں کی عظمت کے گن گائیں گی اور انسان کی بے بسی کا ذکر

---

[51] Dictionary of Philosophy ; D. D. Runes.

[52] A Universal Dictionary of the English Language Wylde.

[53] زرتشت کے مذہبی صحائف کا نام گاتھا ہے، قیاس چاہتا ہے کہ یہ وہی گتھا ہو جو موسیقی سے تعلق رکھتی ہے۔ کرشن گیتا کے لفظ گیتا پر بھی غور کر لیجیے۔ [54] ہماری موسیقی۔ رفیق غزنوی۔ روح ادب، شمارہ ۱۳-۱۴، صہ۸ کراچی۔

کریں گی۔ اقبال کے خیال میں اسی قسم کی موسیقی سے انسان کی خودی کی نفی ہوتی ہے۔ کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کی کلاسیکی موسیقی آریائی تمدن اور ثقافت کی آئینہ دار ہے اور اس کے بولوں میں ہندوستان کی دیومالا بول رہی ہے۔ مسلمان فن کاروں کے دخیل ہونے کے باوصف کلاسیکی موسیقی ہندوؤں کی زندگی کی ترجمان رہی اور یہ بات اگر کلیتہً درست نہ بھی ہو تو بھی اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں دیوتاؤں کے سامنے عجز و نیاز کا اظہار زیادہ رہا۔

عزیز احمد[۵۲] نے نطشے اور اقبال کے تصورِ موسیقی میں فرق بیان کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اقبال کے نزدیک موسیقی میں معنی کا ہونا ضروری ہے۔ نغمے میں معنی کی ماہیت اور اس کی غایت کو اقبال نے بیان کیا ہے اور اس سلسلے میں مولانا روم سے استفادہ کیا ہے۔ اقبال کے خیال میں ابھی اس موسیقی کو پیدا ہونا ہے جسے فقیہانِ خودی مشروع سمجھیں۔

(۱۷) مہرگاں※: نام ماہِ خزاں، و آں مدتِ ماندنِ آفتاب است، در برج میزان اسی کو عربوں نے مہرجان کرلیا ہے اور اس سے مطلقاً خزاں مراد لیتے ہیں۔

مہرگان یا مہر فارس قدیم کا ساتواں مہینہ ہے۔ کچھ دن ستمبر کے اور کچھ دن اکتوبر کے اس میں شامل ہوتے ہیں۔ (مہینے کے سولھویں دن کو بھی مہر کہتے ہیں)۔ یہ مہینہ اسی لئے مہرگاں کہلاتا ہے کہ مہر سے منسوب ہے۔ گان کلماتِ نسبت ہیں جیسے خدایگاں ہیں۔ (مہرگاں ایک جشن[۵۳] کا نام تھا۔ جو اسی مہینے کی سولھویں تاریخ کو منایا جاتا تھا۔)

---

۵۱ الاب اور دھرپد۔ روحِ ادب۔ شمارہ ۱۶-۱۵۔ شاہد احمد کراچی۔

۵۲ اقبال کا نظریۂ فن۔ عزیز احمد، اردو، اکتوبر ۱۹۴۹ء۔

قوالی کے متعلق اقبال کا خیال یہ ہے کہ قوالی سننے والے وجد کے ذریعے اپنے جوش و جذبات کو ضائع کردیتے ہیں۔ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے ملفوظاتِ اقبال۔ مرتبہ محمود نظامی۔ صفحہ ۲۵-۲۴۔

۵۳ مزدیسنا: محمد معین صفحہ ۴۸۵ ※ غیاث اللغات۔

ن

(۱) نامۂ محمود: مرزا محمود شبستری کی کتاب "گلشن راز" ہے۔ مولف شیخ سعد الدین شبستری تبریز سے سات فرسنگ کے فاصلے پر شبستر میں پیدا ہوئے۔ یہیں تعلیم پائی۔ اولجائیتو اور ابو سعید کے زمانے میں ان کو بہت شہرت نصیب ہوئی۔ ۷۰۳ھ[1] سے ۷۱۶ھ تک اولجائیتو کا زمانہ ہے۔ ابو سعید کا زمانہ ۷۳۶ھ تک چلتا ہے لیکن محمود شبستری ۷۲۰ھ میں وفات پا چکے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ۷۱۰ھ میں خراسان کے ایک دوست امیر سید حسینی ہروی نے کچھ سوالات محمود کی خدمت میں روانہ کیے۔ یہ سوال منظوم تھے اس لیے شبستری کو بھی نظم میں جواب دینا پڑا۔ یہی جواب گلشن راز ہے جو تصوف کے نہایت اہم مطالب پر مشتمل ہے۔ اس نظم میں محمود شبستری نے نہایت دقتِ نظر سے تصوف کے نہایت پیچیدہ[2] مسائل حل کیے

---

[1] طبقاتِ سلاطینِ اسلام۔ ترجمۂ عباس اقبال۔ تالیف لین پول صفحہ ۱۹۵۔

[2] تاریخِ ادبیاتِ ایران۔ رضا زادہ شفق صفحات ۲۶۴-۶۵۔

ہیں۔ اصل کتاب اتنی مشکل ہے کہ اس کی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں۔ جن میں مولانا لاہجی کی شرح بہت مشہور ہے۔ اسی شرح کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ لاہجی نے شروع میں دیباچہ لکھا ہے وہ بھی نہایت دقیق ہے۔ علامہ اقبال نے گلشن رازِ جدید میں اسی کتاب کا تتبع کیا ہے اور پرانے سوالات کے نئے جوابات دئے ہیں۔

(۲) نورالسمٰوات : ذات باری تعالیٰ

قرآن مجید کا حوالہ بہ تفصیل ذیل ہے۔ ۲۴/۳۵ (النور)

"خدا تو سارے آسمان و زمین کا نور ہے"

(۳) نے نوازی : مجازاً شعر گوئی کے لئے استعمال ہوا ہے یا شعر گوئی کی علامت ہے۔ کوئی شک نہیں کہ اس اصطلاح کا مفہوم متعین کرتے وقت علامہ کی نظر میں مرشدِ رومی کے وہ اشعار تھے جن میں انسان کی علامت نے ہے اور جن کو مستشرقین نغمہ نے کہتے ہیں:

(بشنو از نے چوں حکایت می کند ۔۔۔ وز جدائی ہا شکایت می کند)

نے کا سینہ شگافتہ ہونا بھی شاعر کے سوزِ دروں کا اظہار ہے۔ نے نوازی کی ترکیب کئی جگہ استعمال ہوئی ہے (یعنی بہ طریق رمز) مثلاً

کوئی دیکھے تو میری نے نوازی

اور اس شعر میں نے کا ذکر صراحت سے نہیں لیکن اشارہ ہے۔

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

فن شعر کے متعلق نظریات سے بحث کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

آیا کہاں سے نالۂ نے میں سرورِ مے
اصل اس کی نے نواز کا دل ہے کہ چوبِ نے

بالِ جبریل کی ایک غزل کا مطلع ہے۔

وہی میری کم نصیبی، وہی تیری بے نیازی
میرے کام کچھ نہ آیا، یہ کمالِ نے نوازی

اور یہ شعر خصوصیت سے غور طلب ہے۔

نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں
کوئی دل کشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی

علامہ کا نے نوازی کو شعر گوئی کے لئے علامت کے طور پر استعمال کرنا کمالِ دقتِ نظر پر دال ہے۔ نے سینہ شگافتہ ہے اور اس کی موسیقی سے سوز و گداز کے تصورات وابستہ ہیں۔ علامہ اقبال بھی اپنے کلام سے سوز و حرارت سے سننے والوں کے دل میں گرمی پیدا کرنا چاہتے ہیں اور سینہ چاک تو خیر وہ ہیں ہی۔

و

(۱) وجود Being : میر ولی الدین قرآن اور تصوف میں لکھتے ہیں

وجود کے دو معنی ہیں۔ (۱) تحقیق و حصول

یہ معنی مصدری ہیں، اعتباری و ذہنی ہیں۔ ان کا شمار معقولاتِ ثانیہ میں ہوتا ہے یعنی ہمارا کسی شے کو دیکھ کر اس کو "ہے" سمجھنا، وجود خیال کرنا، ظاہر ہے کہ مصدری معنی خارج میں نہیں ذہن میں پائے جاتے ہیں۔ البتہ منشا البتہ خارج میں ہوتا ہے۔

(۲) وجود یعنی موجود بہ معنی ما بہ الموجودیت یعنی وہ چیز جس کی وجہ سے معنی اول (معنی مصدری) تحقیق و حصول کا انتزاع ہو سکتا ہے۔ اس معنی کی رو سے ظاہر ہے کہ وجود خارجی حقیقی سے ہے۔ ذہنی امر نہیں[1]۔

---

[1] قرآن اور تصوف۔ انتظامی پریس۔ حیدرآباد۔ ۱۹۴۵ء

وجود Being کے متعلق لغات فلسفہ Dictionary of Philosophy میں مختلف فلسفیوں کے تصور وجود میں امتیاز کیا گیا ہے۔ اس کا مطالعہ بھی مفید ہوگا۔

(۲) وحدت: اسلام نے جو وحدتِ محض۔ وحدتِ بسیط یا وحدتِ صرفہ کا تصور مسلمانوں کو عطا کیا ہے وہ آریائی تصور سے بالکل مختلف ہے۔ آریائی ذہن حقیقت کو پارہ پارہ کرکے کم از کم دو لخت کرکے دیکھتا ہے۔ اگر کوئی حقیقت ان پاروں سے ماورا ہو بھی تو یہ دوئی کا اسلوب ضرور باقی رہتا ہے۔ ہندوؤں میں شو، برہما اور وشنو کی تمورتی، عیسائیوں میں باپ بیٹا اور روح القدس کی تثلیث، زرتشت کے ہاں اہرمن، یزدان اور اہورا مزدا کا تصور، مزدک اور مانی کی تعلیمات میں دوئی کے عناصر سب اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اگر آریائی دماغ وحدت کو کسی طرح دیکھتا ہے تو وحدتِ تناسب کے ذریعہ دیکھتا ہے۔ جیسے مختلف سرتوں کی آمیزش سے ایک راگ پیدا ہوتا ہے وحدت وجود کا نظریہ بھی ایک طرح اس اسلوبِ نظر کی تخلیق ہے۔

خدا کی وحدتِ محض جو وحدتِ عددی اور وحدتِ تناسب سے بالکل مختلف ہے ایرانی صوفیہ نے اسی کو وہ رنگ دے لیا جس کا ان کا ذہن تقاضا کرتا تھا۔ حسنِ مجازی حسن حقیقی، مغ، پیرِ مغاں، خدا تک پہونچنے کے وسیلے، احوال و مقامات، منازل، یہ سب اسی دوئی[۵۵، ۵۶] کے اسلوب کے کرشمے ہیں۔

---

۵۵ مزدیسنا۔ محمد معین۔ دانش گاہ طہران -

۵۶ (الف) مانی۔ مزدک، تاریخ ادبیات ایران۔ جلد اول براؤن -

(ب) ایران بہ عہد ساسانیاں۔ تالیف آرتھر کرسٹن سین۔ مترجمہ ڈاکٹر محمد اقبال۔ انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۴۱ء
تحریک مزدکی ۳۸۴ - ۴۱۷ -

۵

(۱) ہلال و چلیپا: اسلام اور عیسائیت کی آویزش جس نے بہت عرصہ جنگ ہائے صلیبی کا روپ دھارے رکھا۔ ہلال امتِ مسلمہ کا نشان ہے اور چلیپا عیسائی قوموں کا۔ چلیپا وہی لفظ ہے جسے صلیب کی صورت بخشی گئی ہے۔ صلیب سے عیسائیوں کا تعلق ظاہر ہے۔

سلجوقیوں کا اقتدار شروع ہوا تو نہایت اہم واقعات رونما ہوئے ۱۰۷۱ء میں بازنطینی سلطنت کو شکست ہوئی تو مغرب میں شور مچ گیا کہ عیسائیوں کی مدد کے لئے اور بیت المقدس کی حفاظت کے لئے جنگ پر آمادہ ہو جانا چاہئے۔ پہلی جنگ ۱۰۹۶-۹۹ء میں لڑی گئی۔ ۱۱۲۷ء میں اتابک زنگی نے اور اس کے بعد نور الدین زنگی نے عیسائی فوجوں کا مقابلہ کیا۔ آخر صلاح الدین نے کام کی تکمیل کی اور ۱۱۸۷ء میں صلیبی افواج کو نہایت سخت شکست پڑی۔ بیت المقدس پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ مغلوں کے

ﻪ غیاث۔ آنند راج۔

اقتدار کے بعد عیسائیوں کا خیال تھا کہ اب شاید ہم اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جائیں لیکن مصر کے ممالیک میں سے، بیبرس نے منگولوں کو شکست دی اور انھیں شام کی طرف بڑھنے کی اجازت نہ دی۔ یہ تمام آویزشیں ترکانِ عثمانی کے برسر اقتدار آنے سے ختم ہو گئیں[۱]۔ گویا قریباً ۵۰۰ سال تک ہلال و صلیب کی یہ آویزش جاری رہی۔

(۲) ہمدان (ایران): پرانے زمانے میں یہ شہر اس صوبے کا صدر مقام رہا ہے جسے جبال کہتے تھے۔ یہ نہایت قدیم شہر ہے اور اس کا پرانا نام (Ecbatana) اکبتانا ہے۔ بہت قدیم زمانے میں یہ میڈیا کا دارالسلطنت[۲] تھا۔

---

[۱] Legacy of Islam, OxFord University Press (the Crusades)

[۲] جغرافیہ خلافت مشرقی۔ لی سٹرینج۔

ی

(۱) **یزداں:** دراصل یہ کلمہ جمع ہے اور اس کا واحد ایزد ہے۔ ایزد کی جمع ایزداں تھی اور یہی کلمہ کثرت استعمال سے یزداں ہو گیا ہے۔ سنسکرت میں اس کلمہ کی شکل یجتہ ہے اور اوستا میں یزت۔ اس کلمے کا مادہ یز ہے جس کے معنی ہیں پرستش کرنا لینا اور لیشت اسی مادے سے ہیں۔ تو ایزد کے معنی ہیں وہ جو سزاوار پرستش ہو۔ ایرانی ادبیات میں اس کے معنی خدا اور آفریدگار کل کے ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں زرتشت کی تعلیمات کے مطابق ایزد بے شمار ہیں۔ یہ حقیقت میں فرشتے ہیں اور یوں کہہ لیجئے کہ یہ قوائے خیر ہیں۔ ان فرشتوں سے بلند تر بھی فرشتوں کا ایک سلسلہ ہے جو امشا سپنداں کہلاتا ہے۔ یہ ایزد یا درجہ دوم کے فرشتے امشا سپنداں کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔ بہر حال اب ایرانی ادب میں بھی اور اُردو ادب میں بھی جیسے کہ پہلے لکھا جا چکا ہے خدا اور آفریدگار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اصلی معنی نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔[۱]

---

[۱] مزدیستا۔ محمد معین۔ دانش گاہ تہران بسنہ ۱۳۲۶ھ۔ برہان قاطع، مرتبہ محمد معین۔ تہران سنہ ۱۳۳۰ شمسی کلمہ ایزد۔

(۲) (حضرت) یوسف: حضرت یعقوب کے بیٹے تھے اور باپ کو بہت پیارے تھے۔ دوسرے بھائیوں نے یہ معاملہ دیکھا تو بہت جلے اور بھائی کو جنگل کی سیر کرانے کے لئے لے گئے اور وہاں مشورے کے مطابق حضرت کو ایک خشک کنوئیں میں ڈال دیا۔ اور واپسی پر حضرت یوسف کی قمیض کو بھیڑیے کے خون میں تر کرکے حضرت یعقوب کے پاس لے گئے۔ حضرت یعقوب نے دیکھا تو پیرہن خون میں تر ضرور تھا لیکن پھٹا ہوا نہ تھا سمجھ گئے لیکن چپ ہو رہے ادھر ایک قافلے نے حضرت یوسف کو کنوئیں سے نکالا اور مصر میں لے گئے۔ وہاں عزیز مصر نے ان کو خرید لیا۔ عزیز مصر کی بیوی زلیخا ان کی محبت میں مبتلا ہوگئی لیکن اس کی تمام ترغیبوں کے باوصف حضرت یوسف امتحان میں پورے اترے اور عزیز مصر کی بیوی کا کہا نہ مانا۔ اس نے جھنجلا کر ان پر تہمت لگائی کہ مجھ پہ دست درازی کی ہے۔ تمام عورتوں میں اس بات کا چرچا ہوا تو عزیز مصر کی بیوی نے حضرت یوسف کے سامنے ان کو بلا کر بٹھایا اور وہ ان کے حسن سے ایسی متاثر ہوئیں یا اپنی جانب مائل کرنے کے لئے بہانہ بنایا کہ اپنے ہاتھ زخمی کر لئے (چھریاں پہلے ہی سے ان کو دیدی گئی تھیں)۔ اس کے بعد حضرت یوسف کو قید خانہ بھیج دیا گیا۔ جہاں انھوں نے تبلیغ کا کام جاری رکھا۔ اس کے بعد کے واقعات مختصراً یہ ہیں کہ فرعون مصر نے ایک خواب دیکھا۔ حضرت یوسف نے اس کی تعبیر کی اور سلطنت مصر کے مختار کل مقرر ہو گئے۔ ملک میں قحط پڑا تو حضرت یوسف کے بھائی بھی ان تک پہنچے، اور آخر کار حضرت یعقوب بھی اپنے بیٹے سے جا ملے۔

حضرت یوسف حسن و جمال کے اعتبار سے مشہور ہیں۔ اگرچہ عصر حاضر کے بعض لکھنے والوں نے آیات کی ایسی تفسیر کی ہے جن سے ان کا خاص طور پر صاحب حسن و جمال ہونا نہیں پایا جاتا۔ عورتوں کے مکر کا اسی سلسلے میں ذکر آیا ہے۔ اور اس کے لئے کید کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس سلسلے میں تلمیحات کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے مثلاً حسن یوسف۔ چاہ یوسف، ماہ کنعاں، عزیز مصر

برادرانِ یوسف، خواب زلیخا۔ پیرہن یوسفی[1]۔

اردو اور فارسی ادب میں حضرت یوسف اور یعقوب کے متعلق سلسلہ تلمیحات سے شعرانے بہت نازک مضامین پیدا کئے ہیں (زلیخا[2] کا کلمہ بھی نہایت معنی خیز ہے) اچھا اشعار ملاحظہ فرمائیے:۔

نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

خدا کے فضل سے یوسف جمال کہلائے
اب اور چاہتے کیا ہو پیمبری مل جائے

گرگ دہن آلودہ و یوسف ندریدہ

حسن یوسف، دم عیسیٰ ید بیضا داری

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہ کنعاں ہو گئیں

ابھی آتی ہے بو بستر سے اس کی زلفِ مشکیں کی
ہماری دید کو خواب زلیخا عارِ بستر ہے

---

[1] قصص القرآن حصہ اول۔ حفظ الرحمٰن دہلی) اور صدر الدین بلاغی کی اس نام کی تالیف میں مفصل حالات ملیں گے۔ انجیل میں بھی یہ داستان بہ نوع دیگر بیان ہوئی ہے۔

[2] سرگزشت الفاظ۔ احمد دین۔

پیام مشرق

الف

(۱) آتشِ تبریزی: شمس تبریز کی طرف اشارہ ہے جن کے فیض سے مولینا روم کو وہ سوز عطا ہوا جس کے بغیر علم ناقص ہے۔ تبریز صوبہ آذربائیجان[1] کا نہایت مشہور شہر تھا۔ اب بھی ایران کے شمال مغربی حصے کا نہایت اہم شہر ہے۔ اس شہر کی خاک پُراسرار سے بڑے بڑے مفکروں، انشاپردازوں اور شعرا نے ظہور کیا ہے۔ بابِ عراقی یا دبستانِ عراق کا پیشرو قطران اسی شہر کا رہنے والا تھا[2]۔ (اگست ۲۶ اور ستمبر ۱۸ ۱۰۴۶ء کے درمیان ناصر خسرو کی ملاقات اس شاعر سے ہوئی ہے۔ اور اس نے ناصر سے بعض اشعار کا مطلب دریافت کیا ہے[3]۔)

شمس تبریزی کی ابتدائی زندگی کے متعلق بیشتر حالات پردۂ اخفا میں ہیں۔ یہ دعویٰ غلط معلوم ہوتا ہے کہ وہ حسن بن صباح کے جانشینوں کے سلسلے سے متعلق تھے[4]۔ قونیہ میں ان کا

---

[1] جغرافیہ خلافت مشرقی۔ ترجمہ جمیل الرحمٰن۔ [2] تنقید شعر العجم، حافظ محمود شیرانی۔

[3] براؤن۔ تاریخ ادبیات ایران۔ جلد دوم کیمبرج ۱۹۲۸ء۔

[4] رومی کی زندگی کا انقلابی تغیر، افضل اقبال، مجلہ اقبال۔ جنوری ۱۹۵۳ء۔

وردد ۶۴۲ھ ہجری میں ہوا ہے لیکن رومی سے ان کی ملاقات کا دن متعین کرنا دشوار ہے بہرحال یہ ملاقات ہوئی اور رومی نے تعلیم و تعلم کا سلسلہ ترک کر دیا۔ سماع کے سائق ہو گئے اور شمس سے محبت کا اظہار اس طرح کیا کہ اقارب و احباب کو سخت ناگوار گذرا[۱] آخر شمس اس صورت واقعہ سے متاثر ہو کر قونیہ سے چلے گئے۔ ان کی فرقت میں مولانا روم نے نہایت دل آویز اور پر اسرار غزلیں کہیں۔ یہی غزلیات شمس تبریز سے منسوب ہیں یعنی یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کی تصنیف ہیں دیوان کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ غزل کے مخاطب ضرور شمس ہیں۔ مصنف نہیں۔ مثلاً

فاش بگفتم این سخن شمس من[۲] و خدائے من

شنیدہ ام کہ بہ شام است شمس تبریزی چہ صبح ہا کہ نماید اگر بہ شام بود

مولانا روم کے اصرار پر شمس قونیہ واپس آئے یہ ۶۴۷ھ ہجری کا واقعہ[۳] ہے۔ لوگوں کی بدگمانی اور رقابت پھر بڑھی اور آخر ۶۴۸ھ میں شمس نظروں سے "محجوب" ہو گئے۔ گمان یہ ہے کہ مولانا روم کے اقارب و احبار کے ہاتھوں مقتول ہوئے[۴]۔ دیوان غزلیات میں بھی اور مثنوی میں بھی دکھ ۶۵۷ھ اور ۶۶۰ھ کے درمیان شروع ہوئی، شمس کے افکار و عقاید کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ جبر کے مقابلے میں نظر، عقل کے مقابلے میں عشق اور علم کے مقابلے میں عرفان، یہ انقلاب فکر، شمس سے ملاقات کے بعد واقع ہوتا ہے، مولینا علوم رسمی کی بے مغزی سے آگاہ ہو کر کشف و شہود، الہام و القا، اور وجدان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں[۵] اور سکون قلب حاصل کرتے ہیں۔

---

[۱] رومی کی زندگی کا انقلابی تغیر۔ افضل اقبال۔ مجلہ اقبال۔ جنوری ۱۹۵۳ء۔
[۲] انتخاب دیوان شمس تبریز (نکلسن)، دیباچہ۔ [۳] دیوان شمس تبریز نول کشور۔
[۳] رومی کی زندگی کا انقلابی تغیر۔ افضل اقبال (مفصل حوالہ پہلے آ چکا ہے۔
[۴] تاریخ ادبیات ایران، شفق (حالات مولانا روم)۔
[۵] تاریخ ادبیات ایران۔ براؤن۔ جلد دوم
(اس سلسلے میں خلیفہ عبدالحکیم کی کتاب افکار رومی کا مطالعہ بھی سود مند ہوگا)۔

(۲) اردشیر پاپکاں (بابکاں): ساسانی خاندان کا موسس اس دودمان جلیل نے بہ غایت جاہ و جلال ایران پر چار سو سال سے زیادہ تک حکومت کی، (۲۲۶-۶۵۲) اردشیر کا باپ پاپک ناہید کے معبد کا پروہت تھا۔ اور اس کے بلند ہمت بیٹے نے زورِ بازو سے ایران پر قبضہ کیا۔ جب ملکی انتظام ہو چکے تو مذہبی تنظیم کی طرف متوجہ ہوا۔ چنانچہ زرتشت کے مسالک کے احیاء کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ مغوں کی ایک مجلس مشاورت ترتیب دی گئی اور ایک نیک نفس و متقی موبد ارداوے ویراف کو منتخب کیا گیا کہ صحائف زرتشتی کی تدوین کرے۔ اس نے اپنے مکاشفات موبدوں کی خدمت میں پیش کئے۔ یہ ارداوے ویراف نامہ کہلائے۔ اس کے بعد ایران میں پھر اہورا مزدا یا ہرمزد کی پرستش ہونے لگی۔ زرتشت کی تعلیم مقبول ہو گئی۔ گویا اردشیر پاپکان کی ذات میں دو خوبیاں جمع تھیں۔ ایک تو یہ کہ ملکی اور سیاسی مسائل کی گتھیاں سلجھانے میں کمال رکھتا تھا۔ دوسرے یہ کہ مذہب کی اہمیت سے آگاہ تھا اور جانتا تھا کہ توانا اور ذوقِ عمل پیدا کرنے والے مسلک مذہبی کے بغیر، ایران کے لوگوں میں وہ بیداری پیدا نہ ہو گی جس سے قومیں زندہ رہتی ہیں اور جس سے افراد ایک مرکز پہ جمع ہوتے ہیں[۱]۔

(۳) ادریس (حضرت): قرآن مجید میں حضرت ادریس کا ذکر دو جگہ آیا ہے۔ سورہ مریم میں سورۂ انبیاء میں۔ ان کے متعلق اختلافی روایات بہت مشہور ہیں لیکن قرآن مجید سے

---

[۱] تفصیلات کے لئے دیکھئے:

(۱) ایران بہ عہد ساسانیاں۔ ترجمہ ڈاکٹر محمد اقبال۔

(۲) تاریخ ایران۔ سائیکس۔ جلد اول۔ دولت ساسانی (انگریزی)۔

(۳) (براؤن) تاریخ ادبیات ایران۔ جلد اول (انگریزی)۔

(۴) ایران باستان۔ حسن پیرنیا (فارسی)۔

ان کے متعلق جو معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کی نظر میں وہ بلند رتبہ اور صبر کرنے والے نبی ہیں۔

ان کے نام ونسب، جائے ولادت۔ وغیرہ کے متعلق بھی سخت اختلافات ہیں، رجحان یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کے واقعات کو مصر اور بابل سے مربوط تصور کیا جائے۔ ان سے بہت اقوال حکمت واخلاق بھی منسوب ہیں[1]۔

(۱۴) **ارژنگ (ارتنگ)** ادبی روایت میں مانی ایک مشہور مورخ یا نقاش ہے جس کی تصاویر کا مجموعہ ارژنگ یا ارتنگ کہلاتا ہے لیکن صاحب برہان قاطع لکھتے ہیں کہ مانی کے نگارخانے کو ارژنگ کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مانی (ولادت ۲۱۶-۲۱۵ء) ایک مفکر تھا جس نے زرتشت، حضرت عیسیٰ اور دوسرے مسالک و مذاہب کے افکار و تصورات کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اس نے آفرینش کائنات کے متعلق نہایت دقیق اور دلچسپ نظریات پیش کئے ہیں۔ شر اور خیر کی باہمی آویزش، ثنویت کی مظہر ہے لیکن مانی کے مسلک میں عیسائی تثلیث کا رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ مانی نے اپنی عمر کا ایک حصہ سیر و سیاحت میں بسر کیا۔ ہندوستان بھی دیکھا پہلے ایران میں مانی کے عقائد کو یک گونہ مقبولیت حاصل ہوئی لیکن اس کے بعد آخر کار موبدوں نے بہرام ساسانی کو شہ دی اور اس کے حکم سے مانی کو زندان میں دردناک عذاب دے کر ہلاک کردیا گیا (۲۷۷-۲۷۶ء) مانی کی تصانیف میں سب سے زیادہ مشہور شاپورگان ہے[3]۔

تورفان اور خوچو کے مقامات پر جو کھدائی ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مانی کے پیرو فن مصوری سے خاص طور پر شغف رکھتے تھے۔ یہاں دیواری تصاویر ملی ہیں اور جھنڈے

۱۔ قصص القرآن۔ (حفظ الرحمٰن دہلی ۱۹۴۶ء۔
۲۔ برہان قاطع۔ محمد معین (ایران) کلمہ ارژنگ صفحہ ۱۰۳ -
۳۔ ایران بہ عہد ساسانیاں۔ ترجمہ ڈاکٹر محمد اقبال صفحہ ۲۵۰ -
۴۔ ایران بہ عہد ساسانیاں۔ ترجمہ ڈاکٹر محمد اقبال -
براؤن۔ تاریخ ادبیات ایران جلد اول (انگریزی) سائکس تاریخ ایران۔ جلد اول (انگریزی)۔

ملے ہیں جن پر تصویریں بنی ہیں۔[1] خوبہو کی حفریات سے معلوم ہوتا ہے کہ مانی کے مقلد دراصل اپنے مذہب کی کتابوں کی تزئین کے لئے فن نقاشی کو استعمال کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کو نقاشی سے دلچسپی ہو گئی اور مصوری کا مانوی دبستان ترکستان پہونچا کہ ایران میں تو مانی کے پیرو رہ ہی سکتے تھے۔ جب چنگیز خاں نے ترکستان، چین اور ایران وماوراء النہر کے علاقے فتح کئے تو مانوی نقاشی کے نمونے اور اس فن کی روایت، دوبارہ ایران پہونچی۔ اس نقاشی میں سنہرے کام کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ مغلوں کی تصاویر میں جو سنہرا کام نظر آتا ہے، وہ مانوی دبستان مصوری ہی کا اثر ہے۔[2]

(۵) اگسٹے کومٹ (اگستے کومتے) : (۱۷۹۸ء - ۱۸۵۷ء) فرانس[3] کے اس مشہور مفکر کی زندگی کے واقعات ایسے زمانے سے مربوط ہیں جب اس کے وطن میں معاشی اور معاشرتی مدوجزر برپا تھا۔ اس نے روایتی مابعد الطبیعیاتی افکار وتصورات کے خلاف گویا بغاوت کا علم بلند کیا اور کہا کہ انسانیت کی تاریخ کے تین دور شمار کرنے چاہئیں۔

۱۔ پہلا دور وہ ہے جب انسان کا ذہن تعصبات وتوہمات کا شکار رہا۔

۲۔ دوسرے دور میں انسان نے واقعات کی مدد کے بغیر حقیقت کو سمجھنا چاہا۔

۳۔ تیسرے دور میں معتقدات کی جگہ اس علم نے لی جو واقعات کو حقایق پر مبنی سمجھتا تھا یہی وجہ ہے کہ فکر کی تاریخ میں مختلف علوم درجہ بدرجہ انسان کے سامنے آتے ہیں اور مطالعے کا موضوع بنتے ہیں۔ مثلاً ریاضیات، ہیئت، طبیعیات، کیمیا، علم الحیات، عمرانیات[4]

---

[1] ایران بہ عہد ساسانیاں (۲۶۲ - ۲۶۵)

[2] Legacy of Islam ; Arnold. Legacy of Persia ; Arberry.
Painting in Islam ; Arnold.

[3] Dictionary of Philosophy, D. Runes, New York.
Story of Philosophy, W. Durant, Augustus Co mte)

(۶) اللہ: عربی میں خدائے تعالیٰ کا نام ہے جو ازلی و ابدی غیر مخلوق، غیر حادث اور واجب الوجود ہیں۔ کلمے کی اصل کے متعلق سخت اختلاف رائے ہے۔ عربی، عبرانی، سریانی تینوں زبانوں میں اس کلمے کا سراغ ملتا ہے۔ اکثر فقہا کا قول یہ ہے کہ یہ اسم عَلَم ہے۔ بعض علما کہتے ہیں کہ یہ اسم ذات ہے۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ خاص طور پہ ذات باری تعالیٰ کے اس تصور کو کہتے ہیں، جو قرآن مجید میں پیش کیا گیا ہے۔ اللہ کا ترجمہ خدا نہیں ہے۔ انگریزی لغات بھی اس[۱] نکتے سے باخبر ہیں۔

(۷) آلِ عثمان: (ترکی) آلِ عثمان بھی ان ترکی قبیلوں میں شامل تھے جو منگولوں کے حملے کے وقت ایران تک پھیلے ہوئے تھے۔ منگولوں کی یورش کے بعد یہ شاخ یعنی آلِ عثمان مغرب کی طرف کوچ کر گئے۔ عثمان کہ اس شاخ کا مورث تھا، ۶۵۶ھ میں پیدا ہوا۔ اس نے اور اس کے بیٹے ارخان نے بروسہ اور نیقیہ، نامی شہروں پہ قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد یہ لوگ باقاعدہ دولت شرقی روم کی مقبوضات کو مسخر کرنے کے درپے ہو گئے۔ سلطان محمد خاں ثانی نے آخر قسطنطنیہ بھی فتح کر لیا۔ جزیرہ نمائے کریمیا بھی مسخر ہو گیا۔

خلیفہ عباسی کے مقتول ہونے کے بعد سلاطین عثمانی ہی کا اقتدار مسلم ہوتا چلا گیا۔ سلطان سلیم کے زمانے میں کردستان اور دیار بکر بھی، ایرانیوں کے ہاتھ سے نکل کر ترکوں کے تصرف میں چلے گئے۔

انیسویں صدی میں آلِ عثمان کا زوال شروع ہو گیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد تو گویا دولتِ ترکیہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ یورپی اقوام کا مقصد تو یہ تھا کہ ترکیہ کا کانٹا ہی سرے سے نکل جائے لیکن مصطفےٰ کمال پاشا، انور پاشا، عصمت انونو اور دوسرے محبِ وطن سیاست دانوں اور سرفروشوں نے ترکی کو نئی زندگی بخشی۔ ترکان آلِ عثمان میں بڑے بڑے جاہ و جلال کے فرمانروا

---

[۱] Wylde انگریزی لغت۔

گذرے ہیں۔ مثلاً مراد، بایزید، سلیم، محمد، سلیمان۔ آخری سلطان ترکی کی معزولی کے بعد ان کے خاندان کی دو لڑکیاں۔ نظام حیدرآباد کے لڑکوں سے بیاہی گئیں۔

ترکی سلطان خلیفۃ المومنین اور امیر المسلمین کہلاتا تھا، خلافت کے قیام کے سلسلے میں ہندی مسلمانوں نے جو کچھ کیا تھا، وہ قربانی اور ایثار کا عدیم المثال مظاہرہ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ تحریک کا رخ صحیح تھا یا نہیں۔

(۸) **امیر امان اللہ خاں :** ۱۹۱۹ء میں سردار حبیب اللہ خاں امیرِ افغانستان مقتول ہوئے تو ان کا خلف الرشید امان اللہ مسند افروز ہوا۔ اس نے انگریزوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کردیں اور آخرکار ۱۹۲۱ء میں امیر سے ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے امیر کو اختیار حاصل ہوگیا کہ ہندوستان کے وائسرائے کی وساطت سے بے نیاز ہوکر برطانوی حکومت اور دوسری حکومتوں سے سفارتی اور دوسرے روابط قائم کرسکتا تھا۔ ۱۹۲۶ء میں امیر نے شاہِ افغانستان کا لقب اختیار کرلیا۔ اس نے افغانستان میں بڑی تیزی سے معاشی اور معاشرتی اصلاحات رائج کرنی چاہیں لیکن کچھ تو یہ کہ مغرب کے بعض ممالک شاہ کی طرف سے کبیدہ خاطر تھے کچھ یہ کہ افغان خود بعض اصلاحات کے سخت مخالف تھے، ملا کچھ اپنی اغراض کو ملحوظ رکھ کر، اور کچھ دوسروں کی شہ پر، شاہ کی مخالفت پر تل گئے۔ آخر ملک میں بغاوت ہوگئی اور شاہ نے مقابلہ کرنے کی بجائے فرار ہونے کو ترجیح دی۔ غالباً اس طرز عمل کا محرک اصحابِ غرض کا مشورہ بھی تھا۔ بچہ سقہ، جو بظاہر باغیوں کا سردار تھا، حاکم بن بیٹھا اور ملک میں سخت انتشار اور بدامنی کا دور دورہ ہوگیا۔ دو سال تک یہی کیفیت رہی۔ آخر ۱۹۲۹ء میں نادر شاہ نے تمام گروہوں اور جماعتوں کو شکست دے کر افغانستان پر قبضہ کرلیا اور اسی سال تخت نشین ہوا۔

امیر امان اللہ خاں نے افغانستان کو سفارتی دائرے میں وقعت و حیثیت عطا کی اور

حکومت انگلستان سے یہ بات منوائی کہ افغانستان ایک آزاد مملکت ہے۔ تمام دوسری حکومتوں نے بھی بہ تدریج افغانستان کی اس حیثیت کو تسلیم کر لیا تھا۔ امیر امان اللہ خاں کے سامنے اصلاحات کا منصوبہ تھا۔ وہ اگر واقعی پورا ہو جاتا تو آج ملک کی حالت ہی دوسری ہوتی۔

علامہ اقبال کی نظر میں امان اللہ خاں کا یہ کارنامہ نہایت قابل تعریف ہے کہ حکومت افغانستان کو آزاد، خود مختار حکومت تسلیم کروا کے دم لیا اور ملت افغانیہ کو ایک نیا شعور بخشا کہ ہم ایک آزاد قوم کے افراد ہیں[۱]۔

(۹) آئن سٹائن[۲]: (حکیم، مفکر، ریاضیات کا ماہر، یہودی النسل سائنس داں اور مفکر جس کے نظریۂ اضافیت (خاص) نے ہمارے افکار و تصورات میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ طبیعیات میں وہ انکشافات۔ جو آخر: جوہری توانائی کی دریافت پر منتج ہوئے۔ آئن سٹائن ہی کے نظریوں کے مرہون منت ہیں) جرمنی میں ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوا اور ہٹلر نے یہودیوں کو آزار پہنچانے کی حکمت عملی رائج کی تو وطن سے ہجرت کر کے آخر امریکہ جا پہنچا اور وہاں مدت تک تحقیق میں مصروف رہا۔

اضافیت کا نظریہ (خاص) پہلے ۱۹۰۵ء پیش کیا گیا تھا۔ آئن سٹائن کہتا ہے کہ جس دنیا میں ہم رہتے ہیں، اس کے چار بُعد[۳] ہیں ایک بعد زمانِ مکانی کا ہے یعنی کسی واقعے کا وقت بہ تعلق مکان متحقق ہوتا ہے۔ مقام الف پر بجلی گرے تو مختلف مقامات کے ساکن بجلی گرنے کا مختلف وقت بتائیں گے۔ بشرطیکہ ان کے پاس ایسی نازک گھڑیاں ہوں کہ روشنی کی رفتار کو بھی ناپ سکیں جب ہم طاقتور دوربین کے ذریعہ "تارے کی روشنی دیکھ کر کہتے ہیں کہ ہم نے فلاں "تارا دیکھا تو

---

[۱] Aman Ullah, Ronald Wild, History of India, Moreland.

[۲] رسائل و جرائد میں متفرق مضامین -

[۳] دیکھیے۔ سہ پہلو۔ ایں جہاں چون و چنداست -۔

مراد دنیا ہوتی ہے۔ بعض تاروں کی روشنی تو ہم تک ہزاروں سالوں میں پہونچتی ہے گویا ہم نے اگر کوئی ایسا تارہ دیکھا (جس) کی روشنی دنیا تک ۱۰ ہزار برس میں پہونچتی ہے تو ہم نے دس ہزار برس پہلے جو اس تارے کی صورت تھی وہ دیکھی۔ اب تارے کی صورت کیا ہے وہ معلوم نہیں۔ اس لئے جب تک نظام نسبتی (System of Reference) قائم نہیں ہوگا تارے کا وجود ہی غیر متعین رہے گا

حرکت کے متعلق بھی ایک نظامِ نسبتی ضروری ہے۔ اگر دنیا میں صرف ایک چیز ہی باقی رہ جائے تو یہ طے کرنا ناممکن ہے کہ وہ چیز متحرک ہے یا ساکن۔ سکون اور حرکت، دوسری اشیاء کی نسبت سے متعین ہوتے ہیں

یہ بات اتنی مسلم ہے کہ ساکن کو متحرک اور متحرک کو ساکن فرض کرکے اور پھر اس کے برعکس بھی حرکت اشیا کی تعیین کی جاسکتی ہے۔[۱]

ظاہر ہے کہ یہ بیان سطحی ہے۔ مولف آئن سٹائن کے مطالب سے آگاہ ہونے کا مدعی نہیں ہے۔ صرف ان باتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو بہت مشہور ہیں۔

(۱۰) آئینِ سلمانی: حضرت سلمان فارسی، ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جن کا نام ہر مسلمان نہایت احترام سے لیتا ہے۔ وہ پہلے ایرانی ہیں جنھوں نے اسلام قبول کیا اسلام قبول کرنے سے پہلے ان کی مضطرب روح، صداقت کی جستجو میں کبھی موبدوں سے اعانت کی طالب ہوتی تھی اور کبھی عیسائی پادریوں سے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد

---

[۱] What is Relativity, Bertrand Russel,

"The Universe and Dr. Einstein" by Lincoln Barnett.

(یہ نہایت مفید کتاب ہے۔ اس کا دیباچہ خود آئن سٹائن نے لکھا ہے اور اس کے مطالب کی تعریف کی ہے)

Mentor Books;

قلب کو اطمینان نصیب ہوا تو رسول کے ان اصحاب میں شامل ہو گئے جو اصحاب صفہ کہلاتے تھے یہ لوگ ایسے مفلوک الحال تھے کہ نہ کوئی گھر تھا نہ دولتِ دنیا کا ذرا سا حصہ مسجد نبوی میں مقیم تھے بارش اور دھوپ سے بچنے کے لیے ایک سائبان سا لگا لیتے تھے (صفہ) اسی کے اعتبار سے یہ لوگ ارباب صفہ کہلاتے ہیں۔ دن کو اسلام کی خدمت کرتے۔ رات کو مسجد میں سو رہتے۔ سلمان فارسی نے کہ مہندسی کے رموز سے آگاہ تھے۔ مدینے کی مدافعت کے سلسلے میں رسول اکرم کی مدد کی۔ جس گروہ میں سلمان فارسی شامل تھے۔ اس کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ بہرحال اسی جماعت میں کہ حب رسول کے جذبے سے سرشار تھی۔ حضرت ابوذر غفاری بھی تھے۔

آئینِ سلمانی اور آئین ابوذر سے، قلندری کا مسلک مراد ہے کہ مومن کا آخری مقام یہی ہے۔ یہاں تسخیر آب و گل کا کام بھی ہوتا ہے لیکن دل علائق دنیوی میں اُلجھ کر نہیں رہ جاتا ہے مراد یہ ہے کہ فقر و درویشی کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی کے کسی کام نہ آئے بلکہ اصل فقر تو یہ ہے کہ مال و دنیوی سے بے نیاز ہو کر ملت کی خدمت کرے۔ اور

قلندراں کہ بہ تسخیر آب و گل کوشند

کا مصداق ہو جائے [۱]

(۱۱) ایوب (حضرت): حضرت ایوب صبر و تحمل کے لئے مشہور ہیں اور راضی بہ رضا رہنے کی علامت ہیں۔ ان کے متعلق کچھ حوالے بہ تفصیل ذیل ہیں۔ انبیا $\frac{۲۱}{۸۳}$ ص $\frac{۳۸}{۴۱\text{-}۴۲\text{-}۴۳\text{-}۴۴}$

حضرت ایوب کا وطن معین نہیں ہو سکا۔ لیکن یہ غالباً طے شدہ ہے کہ آپ یمن میں مدفون ہیں۔ عبری زبان میں سفرِ ایوب نہایت معرکے کی کتاب ہے اور گوئٹے نے فاوسٹ لکھتے وقت

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے۔

تاریخ تصوف در ایران۔ قاسم غنی۔ طہران۔ (اصحاب صفہ صفحہ ۳۸)

ادبیات ایران۔ براؤن (انگریزی) جلد اول (صفحہ ۲۰۳)۔ دیکھئے کلمات، قلندر۔ فقر۔

اس کتاب کے مطالب سے استفادہ کیا ہے۱؎

(۱۲) ایوبی (وضع ایوبی): صلاح الدین ایوبی ۵۸۳ھ ہجری سے مغرب میں برابر یہ شور برپا تھا کہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے مسیحیت (مذہب بھی اور تمدن بھی) خطرے میں ہے۔ اسی خطرے کے احساس نے مغرب کے سلاطین کو متحد کر دیا اور اُن جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا جو جنگہائے صلیبی کہلاتی ہیں (Crusades)۔ ان جنگوں میں مغرب کے بادشاہوں نے اپنی پوری قوت صرف کر دی کہ بیت المقدس پر ان کا قبضہ رہے اور مسلمانوں کا زور ٹوٹ جائے۔ مسلمانوں کو بھی خدا نے توفیق دی اور قریب قریب ہر اسلامی ملک کے فرماں رواؤں نے اس سلسلے میں، جہاد میں، کم و بیش (دامے درمے) مدد دی لیکن اتابکانِ موصل نے اس سلسلے میں جو کارہائے نمایاں کر کے دکھائے وہ تاریخ کو اب تک یاد ہیں۔ اس سلسلے کے فرماں روا عماد الدین زنگی اور نور الدین زنگی نے عیسائیوں کا خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ابھی اثنا میں نور الدین کا سپہ سالار اسد الدین شیر کوہ اور اس کا بھتیجا صلاح الدین یوسف مصر پہنچے کہ وہاں کے وزیر نے نور الدین سے اپنے ایک ذاتی قضیے میں اس کی مدد طلب کی تھی۔ اس قضیے کا فیصلہ یوں ہوا کہ پہلے شیر کوہ نے مصر پر قبضہ کیا۔ اس کی وفات کے بعد صلاح الدین نے خلفائے فاطمی مصر کے بادشاہ کو معزول کر کے خلیفہ عباسی کا نام خطبے میں داخل کر دیا۔ یہ تمہید تھی۔ جب فاطمی خلیفہ عاضد وفات پا گیا تو صلاح نے عملاً تمام اختیارات حکومت مصر کے سنبھال لئے اور ملحقہ علاقوں کو بھی زیرنگیں کر لیا۔ صلاح الدین ایوبی نے صلیبی جنگوں کے سلسلے میں بڑی ناموری حاصل کی اور عیسائیوں کے دانت کھٹے کر دیئے۔ اس کی تمام عمر مجاہدے میں بسر ہوئی۔ جہاد اس مجاہدے کا ایک جزو تھا۔ اس طرح عمر بسر کرنے کو وضع ایوبی کہہ سکتے ہیں (دیکھئے ہلال و چلیپا)

۱؎ قصص قرآن۔ صدر الدین بلاغی۔ چاپ تابان ۱۳۳۲ھ (ایران) کلمہ ایوب، صفحہ ۳۰ (فارسی) حفظ الرحمٰن صاحب کے قول کے مطابق ان کا زمانہ ۱۰۰۰ ق م سے ۱۳۰۰ ق م تک ہے اور وہ عربی الاصل ہیں۔ قصص القرآن۔ ۲؎ تاریخ اسلام (انگریزی) بروکس تاریخ اسلام (انگریزی) امیر علی۔ طبقات سلاطین اسلام .S Lane Pool ترجمہ عباس اقبال۔

ب

(۱) **بائرن**: انگریزی شاعری کے رومانی دور کا ترجمان اور شارح (۱۸۲۴-۱۷۸۸) اس کی نظم Childe Harolds Pilgrimage شائع ہوئی تو اس کی شہرت کو پر پرواز لگ گئے۔ اس کے بعد اس کا شمار اپنے زمانے کے بہت اچھے شعرا میں ہونے لگا، اس کی بعض مختصر نظمیں تغزل کے رنگ میں بے نظیر ہیں۔

۱۸۲۲ء میں ڈوب کر مر گیا۔ اس کی اخلاقی نامرادی اور زوال پذیری (Decadence) کی داستانیں بھی زبان زد عام ہیں۔

"بظاہر بائرن کے اشعار میں تنوع نظر آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تنوع ظاہری ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ بائرن اپنی انانیت کے شہر بند میں محصور تھا اور اپنی ذات کی حدود سے باہر قدم کم ہی نکالتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے اشعار کا مطالعہ کیا جائے تو آخری اثر جو دل پر طاری ہوگا وہ تنوع کا نہیں ہوگا تکرار کا ہوگا....

اس میں نقائص بھی ہیں۔ وہ بے پروا بھی ہے لیکن اس کے باوصف جب وہ جذبات کی شدت سے مجبور ہو کر شعر کہتا ہے تو یوں ہوتا ہے کہ گویا دریا میں سیلاب آگیا ہے"[1]

(۲) **بخارا:** دریائے جیحون جسے آمو دریا بھی کہتے ہیں اور جو ایران و توران کے درمیان کبھی حدِ فاصل تھا، کے اس پار کے ممالک ماوراء النہر کہلاتے تھے۔ اس علاقے میں ایک خطہ سغد بھی تھا جسے اپنی زرخیزی اور شادابی کے اعتبار سے جنت ارضی کہتے تھے۔ اس خطے میں بخارا کا شہر واقع تھا۔ اس کی وجہ تسمیہ کے بارے میں یہ روایت مستند معلوم ہوتی ہے کہ اس شہر کا اصل نام دہار تھا (یہاں بدھ مت کی تعلیم بہت عام تھی اور اس مت کے مقلدوں نے دہار بنائے تھے (بہار اس کلمے کی موجودہ شکل ہے) دہار سے بگڑ کر بخارا بنا۔ بخارا قدیم الایام سے تمدن و تہذیب کا مرکز رہا ہے۔ سامانیوں کے زمانے میں یہ شہر گویا ایرانی مملکت کا مرکز بن گیا تھا۔ (سمرقند بھی دیکھیے) بوعلی سینا نے یہیں آل سامان کے کتب خانے میں نہایت نفیس اور نادر کتابیں دیکھی تھیں۔ یہاں کے لوگ بھی ذہین اور خوش کلام تھے۔ یورشِ تاتار (۶۱۶ھ) کے بعد انہوں نے بخارا کی اہمیت ختم کر دی۔ شہر کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ بڑی بڑی عمارتیں جل کر راکھ ہو گئیں۔ تیمور کے زمانے سے پہلے بخارا پھر آباد ہو گیا تھا، اور تیمور کے زمانے میں تو اس کو پھر گویا پرانی اہمیت حاصل ہو گئی۔[2]

بخارا کے متعلق بہت سے مباحث، سید سلیمان ندوی کی کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" میں ملیں گے۔

رودکی اور "بوے جوے مولیان" والا افسانہ بہت مشہور ہے اس لئے اس کی تفصیلات

---

[1] تاریخِ ادبیاتِ انگلسی (انگریزی) ہڈسن (براؤن)۔

[2] تاریخِ مفصلِ ایران۔ عباس اقبال۔ طہران۔ جغرافیہ خلافت مشرقی۔ ترجمہ جمیل الرحمٰن۔ حیدر آباد دکن
احوال و اشعارِ رودکی۔ سعید نفیسی (ایران) (ذکرِ بخارا)۔

دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ بات کہہ دینی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ جوئے مولیاں کوئی ندی نہ تھی (جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے) بلکہ ایک تفرج گاہ کا نام تھا جو آل سامان نے اپنے غلاموں کے لئے تعمیر کروائی تھی۔[1]

(۳) براؤننگ ٹینیسن کے عصر کے شعرا میں بہت نمایاں ہے (۱۸۸۹ء۔ ۱۸۱۲ء) ۱۸۴۶ء میں اس نے الزبتھ بیرٹ سے شادی کی جو اس وقت شعر گوئی میں اس سے بھی زیادہ مشہور تھی۔

براؤننگ کا اسلوب بیان ٹینیسن سے بالکل مختلف ہے۔ وہ اپنے جذبات کی شدت سے ایسا مجبور ہو جاتا تھا کہ اپنے کلام کی آرائش اور نوک پلک سنوارنے کا اسے خیال تک نہ آتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ہاں ابہام، اکثر قاری کو پریشان کرتا رہتا ہے۔ اس کے باوصف اس کی عظمت مسلم ہے۔ اس کے شاہکار وہ منظومات ہیں جن کا اسلوب ڈرامائی ہے۔ اس نے اپنے فن کا بہترین اظہار ڈرامائی یک کلامی میں برتا ہے

اس کے کلام میں اخلاقی اقدار کو اجاگر کرنے کی شعوری کوشش کی گئی ہے۔[2]

(۴) برگساں: مشہور فرانسیسی مفکر اور فلسفی (۱۹۴۱ء۔ ۱۸۵۹ء) جس کی کتاب ارتقائے تخلیقی نے ارتقا کے متعلق نئے نظریے پیش کئے۔ اس نے وجدان یا کشف و شہود (Intuition) کی سائنسی بنیادیں تیار کیں اور کہا کہ وجدان کے ذریعہ جو علم حاصل ہوتا ہے وہ معدودے چند آدمیوں کا حق نہیں ہے۔ ہر شخص جو فکر سے کام لیتا ہے۔ وجدانیات کی حدود میں داخل ہو سکتا ہے۔ جوہر حیات (Elan Vital کی اصطلاح اس سلسلہ خیال کی نمایندگی کرتی ہے کہ حیات

---

[1] تاریخ بخارا۔
چہار مقالہ۔ حواشی۔ علامہ قزوینی۔ Gibb Memorial Edition

[2] تاریخ ادبیات انگلسی (ہڈسن)، انگریزی۔ (مطالب کی تلخیص کی گئی ہے)۔

مسلسل ارتقائی منازل سے گذر رہی ہے[۵۱]۔ اقبال پر برگسان کے فلسفے کا اثر ہونا لازمی تھا چنانچہ ہوا[۵۲]۔

(۵) **برہمن:** (برمھ) برمھا۔ خالق کائنات ہے اور برہمن وہ ہے جو خالق کائنات کے رموز و اسرار سے آگاہ ہو۔ اصطلاح میں بدھ مت کے بعد ہندو مت نے جو شکل اختیار کی اس کو برہمن مت کہتے ہیں۔ اس مسلک میں دوسرے مسالک و مذاہب کے پیشوا اور رہنما بھی قابل احترام ہو جاتے ہیں اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ برہمن مت میں تمام دوسرے مذاہب جذب ہو کر رہ جائیں چنانچہ بدھ مت اور جین مت کے مقلدوں کو بھی برہمنوں نے اس طرح اپنے معاشری اور تمدنی نظام میں جذب کر لینے کی کوشش کی۔ صرف اسلام جو دین کے معاملے میں کوئی سمجھوتہ نہیں کرتا تھا، ہندو دھرم میں جذب نہ ہو سکا اور برہمن پر واضح ہو گیا کہ یہ وضع زیست ہی بالکل جدا ہے۔ کبھی برہمن سے، صرف بت پرست مراد لیتے ہیں جو برمھا کی کلیت کو مجاز کے قالب میں پیش کرتا ہے۔ جیسے نظیری کہتا ہے۔

دلیل راہِ حقیقت برہمنی ست مرا

کبھی برہمن سے، جگت گرو، برہمنوں کے برہمن، شری شنکر آچاریہ مراد ہوتے ہیں۔ (ان کے لئے دیکھئے شنکر آچاریہ)

بہر حال برہمن خدا اور انسان کے درمیان اپنے آپ کو وسیلے کے طور پر پیش کرتا ہے اور مدعی ہے کہ میری مدد کے بغیر مکتی نہیں ہو سکتی۔ اسی تصور نے تصوف میں یہ گل کھلایا ہے کہ پیر مغاں، برہمن کی طرح مرید اور سالک کے احوال و مقامات پر حاوی ہوتا ہے اور اپنے احکام

---

[۵۱] Dictionary of Philosophy ; D. Runes New York

[۵۲] Iqbal and Bergson, "Iqbai" July, 1954.
Article by B. A. Dar.

کی آنکھیں بند کروا کے پیروی کرواتا ہے[1]۔

(۶) (حضرت) بوذر (غفاری) : مشہور صحابی۔ اصحابِ صفہ میں شامل تھے اور ان کا فقر اور ان کی قلندری بھی ضرب المثل ہے کہ مومن کے مقامات کا آخری مقام ہے۔ حضرت سلمان فارسی کے سلسلے میں اس بات سے بحث ہو چکی)

(اصحابِ صفہ کے لئے بھی دیکھئے سلمان فارسی۔ "آئین سلمانی، الف کے تحت ملے گا) (فقر و قلندری بھی)

جہاں آردشیر کے ساتھ حضرت بوذر کا ذکر آیا ہے تو مراد یہ ہے کہ انسان کامل میں دونوں صفات مجتمع ہوتی ہیں کہ دنیا کی تسخیر کی طرف بھی متوجہ رہتا ہے کہ یہی اس کی تخلیق کی غایت ہے اور فقر و قلندری کو ملحوظ خاطر بھی رکھتا ہے کہ اسباب دنیوی سے دل ایسا نہ لگے کہ انہیں کا حصول غایت آرزو بن جائے۔ دیوں آردشیر میں بھی کم و بیش فقر و قلندری اور تسخیر آفاق کی آرزو جمع ہو گئی تھی[2]۔

---

[1] Browne, Litrary History of Persia ; V. I. (Mysticism)

تاریخِ تصوف در ایران۔ قاسم غنی۔

Outlines of Islamic Culture, by Shustri

Legacv of Islam ; Arnold.

طبقاتِ چہار گانہ میں۔ برہمن کا مقام بھی ملحوظ رکھنا چاہیے)۔

برہانِ قاطع، محمد معین۔ طہران۔

[2] اصحاب رسول پاک[3] کی سیرت پر بہت کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ ہر کتاب میں حضرت ابوذر غفاری کے سوانح مل جائیں گے۔ یہاں فقط ان کی وضع زیست معرضِ بحث میں تھی۔ (فقر و قلندری)

[3] ایران بہ عہدِ ساسانیاں۔ ترجمہ محمد اقبال، سخندانِ پارس۔ آزاد (ذکر اردائے ویراف نامہ)

پ

(۱) **پہلوی:** وہ زبان جو کم و بیش کسی نہ کسی صورت میں عربوں کی تسخیر ایران سے پہلے ایران کے تمام حصوں میں بولی اور سمجھی جاتی تھی پہلوی کہلاتی تھی۔ اس کی دو شاخیں ہیں۔ ایک پہلوی شمالی و شرقی اور دوسری پہلوی جنوبی۔ ساسانی زمانے کی تمام تصنیفات پہلوی جنوبی میں لکھی گئی ہیں (کم و بیش)

پہلوی کا مادہ پہلو ہے۔ یہ اس قوم کا نام تھا جس نے ۲۵۰ ق م میں خراسان سے نکل کر یونانیوں کو ایران سے خارج البلد کر دیا۔ اس قوم کے لوگ پہلوان ہیں (جدید فارسی میں بزرگ اور قوی کو کہتے ہیں) رے، ہمدان اور اصفہان اس زبان کے بڑے بڑے مرکز تھے۔ رفتہ رفتہ فارسی جو عربوں کی تسخیر ایران کے بعد لکھی جانے لگی اسے بھی پہلوی کہنے لگے

غالب کہتا ہے

عطر بر مغزِ گیتی افشاناں　　　پہلواناں، پہلوی داناں

اور مشہور شعر ہے: مثنویِ مولویِ معنوی　　　ہست قرآں در زبانِ پہلوی

حافظ کہتا ہے:

بلبل بہ شاخ سرو بہ گلبانگ پہلوی   می خواند دوش درس مقامات معنوی

(وہ اشعار جن کی زبان پہلوی اور رسم الخط عربی ہو فہلویات کہلاتے ہیں. جیسے فہلویات باباطاہر) پہلوی اور فارسی (تسخیر ایران سے لے کر آج تک تمام تغیرات کے ساتھ) میں بنیادی فرق الفاظ کا نہیں، رسم الخط کا ہے جسے ہزوارش کہتے ہیں اور جس کی پیچیدگی صرف تحریر پر مبنی ہے. (تقریر میں پہلوی فارسی ہی معلوم ہوتی ہے)

آہستہ آہستہ پہلوی کے تمام لہجوں، اس کی تمام صورتوں اور انواع نے فارسی دری کی شکل اختیار کرلی اور عربی رسم الخط کے اختیار کر لینے سے یہ لسانی انقلاب بہت جلد وجود میں آگیا کہ ہزوارش کا قدم درمیان نہ رہا۔[۱]

ہزوارش کی پیچیدگی کی وجہ سے بعض پہلوی کلمات غلط پڑھے گئے ہیں. مثلاً نیزہ کہ نیزک تھا یا مژہ کہ مژک تھا. ان کی جمع میں اصل پہلوی حرف پھر داخل ہو جاتا ہے جیسے نیزگاں اور مژگاں)

(۴) **پیر مغرب شاعرِ المانوی (گوئٹے)** (۱۸۳۲ء۔۱۷۴۹ء) علامہ نے خود پیام مشرق کے دیباچہ میں گوئٹے پر فارسی ادبیات کے اثر کا ذکر کیا ہے اور اپنی کتاب کے محرکات سے بھی بحث کی ہے. (المان۔ جرمن. المانوی۔ جرمن سے متعلق) گوئٹے کے تخیل کی رفعت اور اس کا فلسفہ زیست اس کی تصنیف فاؤسٹ سے ہویدا ہے. جو دنیا کی چند انقلاب آفریں کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔

---

[۱] (الف) سبک شناسی ملک الشعرا بہار۔ جلد اول (پہلوی)۔ (ب) رضا زادہ شفق. تاریخ ادبیات ایران (پہلوی ہزوارش) (فارسی)۔ (ج) براؤن. تاریخ ادبیات ایران (انگریزی) جلد اول۔ (د) ترجمہ اوستا۔ پور داؤد (پہلوی ہزوارش)۔

ت

(۱) تاتار (تورانی): دریائے جیحون کے اس پار جو ممالک ہیں، ان کے رہنے والے تاتاری اور تورانی کہلاتے تھے۔ وسط ایشیا کی ان اقوام نے بہ مرورِ زبان یا بہ اختلافِ وطن مختلف نام اختیار کیے ہیں۔ فردوسی انھیں تورانی کے نام سے پہچانتا ہے۔ سفید ہن بھی یہی لوگ ہیں۔ یاجوج ماجوج بھی انھیں کے القاب یا نام ہیں۔ ان نیم وحشی قبیلوں اور ملتی جلتی نسلوں کی نظریں ہمیشہ ایران کے زرخیز میدانوں پر للچائی ہوئی پڑتی تھیں۔ چین کے دولت مند شہروں کو بھی یہی لوگ لوٹنے کی تاک میں رہتے تھے۔ دراصل یہ دشت و صحرا کے رہنے والے جنھیں خوراک بھی ٹھکانے کی نہیں ملتی تھی۔ تہذیب یافتہ شہروں اور مہذب لیکن سست خون اقوام پر حملہ اس لیے کرتے تھے کہ زندہ رہنے کا حق ان کو بھی تھا اور اپنے ملک میں کچھ نہ ملتا تھا تو ادھر اُدھر کے ملکوں پر جا پڑتے تھے۔ ان لوگوں کے حملوں سے بچنے کے لیے ہمسایہ قوموں نے سدیں تعمیر کی تھیں۔ سدِ نوشیروانی۔ سد ذوالقرنین۔ دیوارِ چین۔ یہ سب انھیں لوں کی دست برد سے بچنے

کے ذرائع ہیں۔ شاہنامے میں ایران و توران کی کش مکش بھی اسی ازلی آویزش کا روپ ہے جو دشت و صحرا کے سخت کوش باشندوں اور وادیوں اور شہروں کے ساکنوں کے درمیاں قائم رہی ہے۔ ہن، غز، ترک، سلجوق، چنگیز خانی قبایل، چغتائی، آل عثمان، سب انھیں اقوام کے مختلف روپ ہیں۔ ترک و تاتار، منگول یہ بھی انھیں کے نام ہیں۔ ان اقوام و قبائل کی سیکڑوں شاخیں ہیں۔ ان میں سے مشہور قبیلوں کے نام دیے جاتے ہیں۔

(۱) قنقرات (۲) کرایت (۳) نایمان (۴) ترکان اویغور (۵) ترکان قرلق (یہی لفظ خلخ بن گیا ہے۔ جہاں کے لوگ موزونی قد و قامت اور حسن صورت کے لیے مشہور ہیں) (۶) ترکان قراختائی (۷) غز۔ ان تمام قبیلوں اور شاخوں میں سے ترکانِ چغتائی، ترکانِ غز۔ ترکانِ سلجوق، منگول اور قراختائی[۱] بہت مشہور ہیں۔

(۲) تورانی: دیکھیے تاتار

(۳) تیمور: (ولادت ۷۳۶ھ) مسلّم ہے کہ امیر تیمور، ترکوں کے مشہور قبیلے برلاس سے متعلق تھا۔ عام طور سے یہ مشہور رہے کہ اس کا جدّ امجد چغتائی یا جغتائی (پسر چنگیز) کا رشتہ دار بھی تھا اور ملازم بھی۔ تیمور کے خواہ موزخوں نے یہ قصہ نہایت آب و تاب سے بیان کیا ہے لیکن دوسرے مورخوں نے اسی شدت سے اس کی تکذیب کی ہے۔ بہرحال تیمور چغتائی ہو یا نہ ہو وہ گورگان تو ضرور تھا کہ قبیلہ برلاس کی ایک معتبر شاخ ہے۔ اوایل عمر میں تیمور کو بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کچھ عرصے کے بعد امیر حسین کے ساتھ مل کر اس نے کوشش کی کہ کسی علاقے پر حکومت قائم

---

[۱] (الف) تاریخ مفصل ایران۔ عباس اقبال۔ طہران ۱۳۱۲ھ۔

(ب) History of the Mongol, H. Howorth

(ج) History of Persia ; Sykes V. I.

(د) Lands of the Eastern Caliphates ; Le Strange تاریخ جہاں کشائے جوینی

ہو جائے۔ جب اس مقصد میں کامیابی ہوئی تو امیر حسین اور تیمور برسر عناد ہو گئے۔ آخر امیر حسین مارا گیا اور تیمور نے ماوراالنہر پر قبضہ کر لیا۔ ۷۸۲ھ ہجری میں، اس نے فتوحات کا وہ سلسلہ شروع کیا جسے آخرکار اُسے تیمور اعظم کا لقب دلوانا تھا۔ ہرات، سیستان، ترشیز اور آذربائیجان فتح کرنے کے بعد وہ فارس کی طرف بڑھا کہ یہاں ابھی تک آلِ مظفر بہت رعب داب سے حکمراں تھے۔ آخر آلِ مظفر کا ایک بہادر فرد زین العابدین لڑتا ہوا مارا گیا۔ تیمور نے انسانی جان کو اتنا ارزاں بنا دیا تھا کہ کھوپڑیوں کے مینار بنائے جاتے تھے۔ فارس کی تسخیر کے بعد، تیمور نے روس کو اپنے بادپا گھوڑوں کے سموں تلے روند ڈالا۔ پھر ہندوستان پر حملہ کیا۔ واپسی پر بایزید (آلِ عثمان) سے جنگ ٹھن گئی اور ترک سلطان اسیر ہو گیا۔ ۸۰۸ھ ہجری میں جب تیمور کی عمر ۷۰ سال سے زیادہ تھی۔ اس نے فیصلہ کیا چین کو مسخر کر لیا جائے۔ لاؤ لشکر لے کر اترار تک پہونچا تھا کہ قضا نے آلیا۔ سائیکس کا قول ہے کہ تیمور (صاحب قِراں) ایشیا کا سب سے بڑا فاتح اور جرنیل ہے۔ اس کی ذکاوت، فطانت اور تجربہ کاری کے افسانے تاریخ کی کتابوں میں بڑے جگمگ جگمگ کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے ہاتھوں بے شمار انسانی جانیں ضایع ہوئیں لیکن اس لزام سے تو کسی فاتح کا دامن پاک نہیں ہو سکتا۔[۱]

گبن نے الفاظ میں جب تیمور نے وفات پائی ہے تو، دریائے والگا (روس) سے لے کر خلیج فارس تک، گنگا سے دمشق تک، ایشیا تمام و کمال، تیمور کے تصرف میں تھا؛ *

---

[۱] تاریخ مفصل ایران۔ عباس اقبال۔
تاریخ ادبیات ایران۔ براؤن (جلد سوم) (انگریزی)۔
طبقات سلاطینِ اسلام۔ عباس اقبال (ترجمہ)۔

* History of Persia, Sykes V. 2 1930, London; p. 135

ٹ

(۱) **ٹالسٹائی**: (۱۸۲۹ء تا ۱۹۱۰ء) مشہور روسی مفکر اور ادیب، اس نے ادب کو شعوری طور پر اور نہایت سلیقے سے اپنے افکار و آرا کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ خود اس کی ذاتی زندگی، اخلاقی طور پر قابلِ رشک نہ تھی، لیکن اس کی تصانیف کی ادبی اور ثقافتی حیثیت بہت اہم ہے۔ اسے مصلحِ اخلاق بھی تصور کیا جاتا ہے۔[۱]

---

[۱] دیکھئے دیباچہ ٹالسٹائی کی تصنیف حشر **Resurrection.** پر، اس دیباچے میں بہت سی اور کتابوں کے حوالے مندرج ہیں (اس کا انگریزی ترجمہ ویرا ٹریل نے کیا ہے اور ہیمش ہملٹن نے نے لندن سے شائع کیا ہے) ۱۹۴۷ء

ج

(۱) **جبروت**: ابوطالب مکی کی اصطلاح میں عالم عظمت ہے لیکن اکثر صوفیہ کا عقیدہ یہ ہے کہ عالم وسط ہے۔" (ابن العربی)[1]

عظمت و بزرگی و تکبر، اور سالکوں کی اصطلاح میں عالم عظمت و جلال اسمائے صفات الٰہی، اور مرتبۂ وحدت کہ حقیقتِ محمدی ہے اور مرتبۂ صفات سے اس کا تعلق ہے۔[2]

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عظمت الٰہی اور وحدتِ بسیط کے تصور کے لئے بھی جبروت کا کلمہ استعمال کرتے ہیں اور رسول اکرم کی بزرگی بھی اس کلمے سے ظاہر کرتے ہیں کبھی محض بزرگی بھی مراد ہوتی ہے۔[3]

---

[1] فرہنگ اصطلاحاتِ صوفیہ۔ جزو تاریخ تصوف در اسلام۔ قاسم غنی۔ طہران (فارسی)

[2] آنندراج۔ کلمۂ جبروت۔

[3] غفاری و قہاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

خ

(۱) خاتمِ سلیمانی: (دیکھیے ساغرِ جم، نمبر جم کی تلمیحات میں. جہاں واضح کیا گیا ہے کہ ادبی روایت میں جمشید اور حضرت سلیمان کو ایک ہی شخص تسلیم کر لیا گیا ہے)۔

جو روایت قطعی ادبی ہے اور جس کی کوئی سند نہیں ہے وہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان کے ہاتھ میں ایک انگشتری تھی کہ اس پر اسمِ اعظم کندہ تھا۔ اس کی برکت سے جن، دیو، انسان پر حکومت کرتے تھے۔ ایک دن یہ انگشتری ان کے ہاتھ سے گر گئی اور ایک دیو یا اہرمن کے ہاتھ لگ گئی جو حضرت سلیمان کی جگہ تخت نشیں ہو گیا۔ آخر یہ انگشتری اس اہرمن کے ہاتھ سے بھی گر گئی اور ایک مچھلی کے پیٹ سے نکلی۔ حضرت سلیمان نے جو ان دنوں ماہی گیر کے ہاں رہتے تھے، اس انگشتری پر پھر قبضہ کر لیا، اور اپنا تاج و تخت حاصل کر لیا۔

یہ واقعے کے بنیادی خدوخال ہیں۔ روایت میں بہت تفصیلات ہیں (ماہی گیر کی لڑکی جو مچھلی پکڑ کر لاتی ہے اس کے حالات بھی ملتے ہیں)، بہرحال یہ روایت بھی اس مسلمہ خلط بحث کا جزو

بن گئی جس کی بنا پر جمشید، سکندر اور حضرت سلیمان کو ایک شخص سمجھا جاتا ہے (اس کی وضاحت پہلے کی جا چکی ہے[۱])۔

غالب خاتم سلیمان کا ذکر کر رہا ہے لیکن حضرت سلیمان کو جمشید کے نام سے پکار رہا ہے:

سلطنت دست بدست آئی ہے

جام مے خاتم جمشید نہیں

(۲) **خاقان**: بادشاہِ بزرگ (ترکی) چین کے بادشاہوں کا لقب ہے اور ترکستان کا بادشاہ بھی خاقان کہلاتا ہے۔ اب ہر بڑے بادشاہ کو ادبی روایت خاقان کہہ دیتی ہے بلکہ صرف بادشاہ کو بھی عظمت کی بھی شرط نہیں[۲]۔

(۳) **خالد بن ولید**: خلافتِ راشدہ کے زمانے کے مشہور کمانڈر، شجاع اور ضابطہ و متحمل تھے۔ انھوں نے بہت سے معرکوں میں کانٹے کی تول لڑائی لڑی اور اپنی شجاعت کے بل پر دشمن کو پسپا کیا۔ حضرت عمر کے عہد حکومت میں یرموک کی فیصلہ کن جنگ کے بعد (۲۰ اگست ۶۳۶ء عیسوی)، انھیں اپنے عہدے سے معزول کر دیا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شاعر نے ان کی تعریف میں قصیدہ پڑھا اور انھوں نے خوش ہو کر حکم دیا کہ اسے ایک ہزار دینار انعام دیا جائے۔ اس پر حضرت عمر نے انھیں ساری فوج کی قیادت کے عہدے سے نہ صرف معزول کر دیا بلکہ فوج کے سامنے ان کے ہاتھ بھی باندھے گئے۔ خالد بن ولید نے تنظیم اور اتحاد کو ملحوظ رکھ کر فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ اور خلیفہ ان کو معزول کرنے کے مجاز بھی تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر کو یہ گمان ہوا کہ انعام شاعر کو اس روپے سے دیا جائے گا۔

---

[۱] (۱) آنند راج (۲) مزدیسنا تالیف محمد معین (۳) دیوان غالب اردو (۴) حماسہ سرائی در ایران۔ ذبیح اللہ صفا

[۲] آنند راج کلمہ خاقان۔

جو سب لوگوں میں تقسیم ہونا چاہیئے۔ بعد میں ظاہر ہوا کہ یہ انعام خالد بن ولید نے شاہی خزانے سے نہیں اپنی گرہ سے دیا تھا۔ بہرحال اس صفائی کے بعد، حضرت عمر نے کماندار کی بے گناہی کا اعلان کردیا۔ لیکن یہ ساتھ ہی کہا کہ میں ڈرتا تھا، لوگ ان فتوحات کو تم سے منسوب کر کے خدا کی طاقت و قدرت سے غافل نہ ہو جائیں لہ

(۴) **خراسان**: ایران کے مشہور صوبے کا نام ہے (جس طرف سے خور طلوع ہوتا ہے۔ خور + استان۔ مقامِ خورشید محل طلوعِ خورشید) اصطلاح میں موسیقی کے پردے کو کہتے ہیں ٢ه

(۵) **خیرِ کثیر**: حوالہ یہ ہے۔ $\frac{2}{269}$ (بقرہ)

"وہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا فرماتا ہے اور جس کو حکمت عطا کی گئی تو اس میں شک ہی نہیں کہ اسے خوبیوں کی بڑی دولت (خیرِ کثیر) ہاتھ لگی۔"

مراد یہ ہے کہ علم سب سے بڑی دولت ہے۔

له تاریخِ اسلام شرر۔ تاریخ اسلام۔ سید عبدالقادر (لاہور)۔

٢ه آنندراج۔ کلمہ خراسان۔ جلال ہمائی۔ تاریخ ادبیات ایران (موسیقی) غیاث۔

د

(۱) دل: مشاہدات سے تعقل سے، حواس خمسہ کے وسیلے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں ان کی تحصیل کا طریقہ خبر ہے۔ اس کے مقابلے میں مسلک نظر ہے کہ کشف والہام اور وجدان پر اعتماد کرنا سکھاتا ہے۔ اس کیفیت کا مصدر اور متعلقہ واردات کا منبع دل ہے جو عقل کے مقابلے میں صف آرا رہتا ہے۔

یہ بات واضح ہے اور اقبال کے کلام میں اس کے شواہد کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ البتہ ایک پیچیدہ کیفیت کے متعلق شعر سن لینا چاہیے۔

مقام اس کا ہے دل کی خلوتوں میں　　خدا جانے مقام دل کہاں ہے؟

بات یہ ہے کہ دل جن واردات کا مصدر ہوتا ہے، ان کو بہ تمام و کمال اسے قبول کرنا پڑتا ہے ملہم کو یہ اجازت نہیں کہ الہام کے کسی حصے کو مسترد کر دے اور کسی کو قبول کرے۔ الہام اپنی پوری کلیت میں نازل ہوتا ہے اور قبول کرنا پڑتا ہے۔[1]

---

[1] مقدمہ دیوان غالب، مرتبہ چغتائی۔ فقہ اسلامی کی تشکیل جدید پر خطبات متفرق مضامین اور خطوط کے اشارات (ایک) کیفیت کے متعلق ۲۲، تشریح کی گئی ہے: صاحبِ ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے　　گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش

ر

(۱) **رازی :** فخرالدین (امام) ابوعبداللہ فخرالدین محمد رازی اپنے زمانے کے معروف ترین فقیہہ اور ماہر علم الکلام تھے۔ علوم اسلامی میں ان کی نظر بہت گہری تھی اور ان کا اکثر وقت ہرات میں گذرتا تھا۔ جہاں لوگ دور سے، ان کے درس سے فیض یاب ہونے کے لئے آتے تھے۔ ان کی ولادت ۵۴۳ھ میں واقع ہوئی اور وفات ۶۰۶ھ میں۔[1]

امام صاحب کی تفسیر قرآن مجید بہت مشہور ہے (اگرچہ انھوں نے بہت سے علوم وفنون میں اپنی مہارت کا ثبوت دیا ہے)، براکلمن ان کی ۳۳ تصانیف کا ذکر کرتا ہے۔ علامہ اقبال مرحوم کے کلام میں امام رازی علامتی اہمیت اختیار کر گئے ہیں۔

مولانا رومی، (علامہ مرحوم کی نظر میں) گویا امام رازی کی ضد تھے۔ (شمس تبریز کے ملنے

۱؎ شفق: تاریخِ ادبیاتِ ایران۔ صفحات ۴۰ ۔ ۲۴۹۔

۲؎ تاریخِ ادبیاتِ ایران۔ براؤن (انگریزی) جلد دوم۔ صفحہ ۴۸۴۔

کے بعد، اور کشف و الہام کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ اس کے برخلاف امام صاحب ظواہر شریعت کے پابند تھے اور مکاشفات اور مقام عشق سے بے خبر۔

جن دنوں مولینا روم کے والد ماجد بہاؤالدین، خوارزم میں مقیم تھے، ان کے حلقۂ درس میں گویا سارا شہر شریک ہوتا تھا۔ شبلی کا بیان ہے کہ بہاؤالدین کی بڑھتی ہوئی مقبولیت میں خوارزم شاہ کو سیاسی نقصان کے احتمالات نظر آئے اور اس نے، مولینا سے کہلوا بھیجا کہ میرے پاس تو اب صرف خزانہ شاہی کی کنجیاں ہیں۔ امام رازی اس سلسلے میں خوارزم شاہ کے مشیر کار تھے اور انھوں نے ارشاد فرمایا تھا کہ اب تدارک نہ ہوا تو مشکل ہو گی[۵]۔

فروزاں فربھی، واقعے کی اس صورت کو قرین قیاس خیال کرتے ہیں۔

علامہ مرحوم نے متعدد مقامات پر رومی و رازی کو عشق و عقل کی علامت بنا کر پیش کیا ہے مثلاً:- نے مہرہ باقی نے مہرہ بازی جیتا ہے رومی ہارا ہے رازی

اسی کش مکش میں گذریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی، کبھی پیچ و تاب رازی

(۲) ربِ زدنی: حوالہ تفصیل ذیل ہے۔ $\frac{20}{114}$ (طٰہٰ)

"سچا بادشاہ خدا برتر و اعلیٰ ہے اور (اے رسول) قرآن (کے پڑھنے) میں اس سے پہلے کہ تم پر اس کی وحی پوری کر دی جائے جلدی نہ کرو۔ اور دعا کرو کہ اے میرے پالنے والے میرے علم کو اور زیادہ فرما۔"

۵؎ شبلی۔ سوانح مولینا روم (امام و نسب ولادت و تربیت)۔

ز

(۱) زحل : یہ کلمہ عربی ہے، فارسی میں زحل کو کیواں کہتے ہیں۔ ادبی روایت میں زحل یا کیواں بلند ترین سیارہ ہے اور ساتھ ہی نحس بھی ہے۔ اس لئے کبھی رفعت کی علامت کے لئے اور کبھی بدبختی کے لیے اس کا ذکر کرتے ہیں۔

ادبی روایت میں مختلف سیاروں کے القاب بھی متعین کر دیے گئے ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے :-

زحل	(کیواں)	پاسبانِ فلک یا ہندوئے فلک
مشتری	(برجیس)	قاضیٔ فلک
عطارد	(تیر)	منشیٔ فلک
زہرہ	(ناہید)	رقاصۂ فلک
قمر	(ماہ)	نمامِ فلک

مریخ	(بہرام)	جلادِ فلک
شمس	(خورشید)	شاہ سوارِ فلک

افلاک سے ان کی ترتیب کی یہ صورت رکھی گئی ہے:

قمر	فلکِ اول	عطارد	فلکِ دوم
زہرہ	فلکِ سوم	خورشید	فلکِ چہارم
مریخ	فلکِ پنجم	مشتری	فلکِ ششم
زحل	فلکِ ہفتم		

یوں سات آسمان بنتے ہیں کہ ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا۔ لیکن[۵] منطقۃ البروج اور عرش کے ساتھ ۹ ہو جاتے ہیں۔ (نہ سپہر)

جس سرزمیں پہ سایۂ نُہ آسماں رہے   اس پر سکونِ قلب سے کوئی کہاں رہے

(۲) **زہرہ**: (ناہید) صنمیاتِ انسانی کی قدیم ترین دیوی ہے۔ عربی میں زہرہ ہے۔ فارسی میں اس کلمہ کی اصل شکل یہ ہے۔ اَن + آہیتہ = اناہیتہ یا اناہیتا۔ آہیتہ یا آہیتا کے معنی ہیں پلید و ناپاک۔ اہک، پہلوی اسی سے ہے اور آہو گرفتن، عیب نکالنا محاورہ اسی کلمے پر مبنی ہے۔ فارسی اور سنسکرت میں کسی چیز کی عدم موجودگی دکھانے کے لئے الفِ نافیہ استعمال کرتے ہیں جیسے امر، اچل، اٹل، آہار، اچھوت لیکن جہاں اصل کلمہ جس پر الف نافیہ بڑھایا جاتا ہے الف سے شروع ہوتا ہے، وہاں لاحقے کی صورت الف کے بجائے ان کر دیتے ہیں کہ اشتباہ نہ ہو جیسے وہ لوگ جو غیر ایرانی ہیں۔ اَن + ایراں = انیراں کہلاتے ہیں۔ یہاں الف نافیہ کے بعد 'ن' کا اضافہ نہ کیا جاتا تو کلمہ کی شکل آایراں بنتی جو صوتی اعتبار سے لغو معلوم ہوتا ہے، اسی طرح آہیتہ

---

[۵] تفصیلات کے لئے دیکھئے غیاث۔ آنندراج۔ برہانِ قاطع (کلمہ ہفت کے تحت بھی دیکھئے)۔

سے پہلے ان (علامتِ نافیہ) کا اضافہ کیا گیا۔

اس دیوی کے مختلف نام اور روپ ہیں لیکن مشہور ترین یہ ہیں۔ استرتی ابستر، افرودیتی۔ زائیدہ کفِ دریا۔ زہرہ۔ وینس۔ پہلے یہ دھرتی ماتا کی علامت تھی، زرخیز، ثمرآور، اور حیات بخش۔ پھر تولید و تناسل اور عشق و محبت کی دیوی ہو گئی۔ کیوپڑ نے اس کے احکام کے مطابق، انسانوں کو اس جذبہ پُراسرار سے آگاہ کیا ہے جس کے مختلف نام ہیں (دیکھیے زحل)

مشرق کی ادبی روایت میں زہرہ زمین پر اتری تھی۔ ہاروت، ماروت دو فرشتوں نے اس کی محبت میں دنیا تیاگ دی اور اس کی سزا یہ پائی کہ ایک کنوئیں میں اُلٹے لٹک رہے ہیں اور ساری دنیا کا دھنواں ان کے نتھنوں میں جاتا ہے۔ زہرہ کو پھر آسمان پر بلا کر سیارہ بنا دیا گیا۔ رقص و سرود، عشق و محبت، ناز و نیاز، کے چونچلے اسی دیوی سے منسوب ہیں[۵]۔

---

[۱] تفصیلات کے دیکھیے :-

(۱) **Dictionary of Word Origins; Shipley, New York**

(۲) مزدیسنا۔ تالیف محمد معین۔ (طہران)

(۳) **Wyld, Dictionary of the English Language**

س

(۱) سلمیٰ[1] ۔ (سلیمیٰ) : سلمیٰ کے مختلف معانی لغات میں مندرج ہیں مثلاً موضعے است از نجد ونام شانزدہ صحابیہ (ام سلمیٰ زن ابی رافع است) لیکن یہ تحقیق ہے کہ عربوں میں سلمیٰ کا نام بھی خوبروئی اور دل ستانی کے افسانوں کے ساتھ اسی طرح منسوب ہے جیسے لیلےٰ کا یا ایران میں شیریں کا۔

گر بسر منزل سلمیٰ رسی اے بادِ صبا　　　چشم دارم کہ سلامے برسانی زمنش

مجازاً ہر معشوقہ کو سلمیٰ کہہ دیتے ہیں۔ علامہ نے بھی سلمیٰ اور سلیمیٰ کے کلمات دل ستانی اور حسن کے معیاری نمونوں کے لیے استعمال کیے ہیں۔

(۲) سمندر : ادبی روایت میں، ایک کیڑا ہے کہ آگ ہی میں پیدا ہوتا ہے اور وہیں پروان چڑھتا اور مرتا ہے۔ سخت کوشی اور امتحان صبر کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ عرفی کہتا ہے :۔

ہم سمندر باش وہم جیحوں کہ در دریائے عشق　　　روئے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش است

---

[1] آنندراج۔ کلمہ سلمیٰ۔

"جانورے معروف است کہ در آتش نہ سوزد و بعضے گفتہ اند کہ در آتش متکون می شود و بعضے طایر پنداشتہ اند...... در تحفہ گفتہ کہ جانورے است شبیہ بہ مار۔"

(۳) سیدِکل: صاحب ام الکتاب۔ سید کل اشارہ ہے رسول اکرم کی ذات گرامی کی طرف اور ام الکتاب سورۂ فاتحہ ہے، جس میں گویا، قرآن مجید کے بعض نہایت اہم مطالب بیان کیے گئے ہیں۔ ترجمان القرآن میں مولینا آزاد نے تفصیل سے ان مباحث سے بحث کی ہے جو سورۂ فاتحہ کا جزو ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے سلسلے میں بھی، اور رب العالمین کے سلسلے میں بھی ان کی نکتہ طرازی بے نظیر ہے۔ مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان کے خیال میں خدائے قدیر نے سورہ فاتحہ کے ذریعے اپنی ربوبیت، اور اپنے رحمان و رحیم ہونے کا ذکر کیا تاکہ انسان کے سامنے پہلے وہ صفاتِ خداوندی آئیں جو جمالی ہیں اور انسان کے دل میں امید کا چراغ روشن رہے۔

عالمین سے خدا کی عظمت کی ایک جھلک سی دکھائی گئی ہے کہ دنیا میں بے شمار ہیں اور صرف یہی ایک دنیا نہیں جس پر انسان بستے ہیں۔

انسان کو اپنے افعال کے ذمہ دار ہونے کا احساس بھی نہایت خوبی سے دلایا گیا۔ اور جبر و قدر کے بین بین ایک مسلک پیش کیا گیا۔

(۴) سیمیا: ادبی روایت میں، کیمیا کے مقابلے میں ایک علم ہے کہ جن چیزوں کا وجود نہیں ہوتا ہے[۵۱]۔ عالم سیمیا ان کو متشکل کر کے دکھاتا ہے۔

وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود | صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا
ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ | دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا[۵۲]

---

[۵۱] آنندراج۔ [۵۲] یہاں بازی گر سے مراد مداری بھی ہو سکتا ہے اور سیمیاگر بھی۔

ش

(۱) **شبّیر:** سیدنا حضرت امام حسین کا نام ہے۔ اربابِ لغات لکھتے ہیں کہ سریانی زبان میں شبرا ور شبیر کے معنی خوب و نیکو کے ہیں[۱]۔ آپ حضرت علی اور فاطمہ زہرا کے لختِ جگر اور رسولِ اکرم کے نواسے ہیں۔

جب یزید اموی (جلوس سنہ ۶۰ ہجری) نے سیدنا حسین سے بیعت لینا چاہی تو اختلافات کھڑے ہو گئے کہ سیدنا، یزید کے فسق و فجور کی وجہ سے، اس کے ہاتھ پر بیعت کرنا نہیں چاہتے تھے، وہ مدینے سے نکل کر مکے تشریف لے گئے۔ ادھر کوفے کے لوگوں نے امام حسین کو بلایا کہ ہم یزید کی حکومت سے بیزار ہیں اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہتے ہیں۔ سنہ ۶۰ ہجری میں سیدنا اہل و عیال سمیت کوفے کی طرف روانہ ہو گئے۔ عبید اللہ ابن زیاد نے حر کو بھیجا کہ امام حسین کو روکے۔ مجبوراً امام کوفے سے ۲۵ میل کے فاصلے پر کربلا کے مقام پر خیمہ زن ہوئے۔ آپ کے ساتھ

---

[۱] آنند راج۔

۷۰-۷۲ مرد و زن تھے۔ ان میں بچے بھی شامل تھے۔ عمر سعد کہ یزید کی فوجوں کا سردار تھا۔ (شمر کے مشورے سے) امام سے بیعت لینے پر مصر تھا، امام نے انکار کیا اور لڑائی ٹھن گئی۔ ایک طرف مسلح اور مستعد تازہ دم فوج کے سپاہی، دوسری طرف تھکے ماندے جاں باز کہ حق پر جان قربان کرنے کو بڑی سعادت تصور کرتے تھے۔ حضرت امام حسین کے تمام اقارب اور نصرت کرنے والے ایک ایک کر کے شہید ہو گئے اور آخر امام مظلوم کو بھی نرغے میں لے کر شہید کر ڈالا گیا یہ المناک واقعہ ۱۰ محرم ۶۱ھ ہجری، مطابق دس اکتوبر ۶۸۰ عیسوی میں پیش آیا۔

علامہ مرحوم، شبیر کو، مجاہدے اور ایمان کے بلند ترین مقام کی علامت تصور کرتے ہیں اور رسم شبیری ان کے کلام میں وہ عزم حق ہے۔ جو باطل سے ہمیشہ برسرپیکار رہے گا اور آخر کار باطل کو شکست دے گا۔

جو نیک نفس آدمی حجرہ نشیں ہو کر بیٹھ جاتے ہیں، ان سے علامہ مخاطب ہو کر کہتے ہیں

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری
کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ دلگیری

حقیقت ابدی ہے مقام شبیری
بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی

(۲) **شوپن ہار**: آرتھر شوپن ہار (۱۷۸۸ء۔ ۱۸۶۰ء) جرمن فلسفی اور مفکر جس کی تصانیف کی گوناگونی اور تنوع حیرت انگیز ہے۔ فلسفے کی ٹھوس کتابوں کے علاوہ (The world as Will and Idea) اس نے بہت سے موضوعات پر خیال افروز مضامین بھی لکھے ہیں۔

جس زمانے میں اس نے نشو و نما پائی وہ سخت اجتماعی ناکامی اور مایوسی کا زمانہ تھا۔

اور مایوسی کا عنصر اس کی ہر کتاب میں جھلکتا ہے۔ اس کے خیال میں کائنات میں کوئی نظم و ضبط نہیں ہے۔ خدا اگر ہے (معاذ اللہ) تو بے بصیرت ہے۔ بدھ کی طرح اس کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ بے آرزو ہونا ہی حاصل حیات ہے۔

(۳) شیراز: فارس کا پایۂ تخت اور ایران کا وہ شہر جو گل و گلزار اور آب رواں و چشمہ سار کے لئے اب تک مشہور ہے۔

آب رکنا باد، گلگشت مصلےٰ اسی شہر سے منسوب ہیں۔ خواجہ حافظ اور سعدی یہیں مدفون ہیں۔

منگولوں کی یورش کے زمانے میں[1] (ساتویں صدی ہجری) اتابکانِ فارس کا جو سلسلہ یہاں فرماں روائی کرتا تھا، اس کی سیاست اور حکمت عملی کی وجہ سے شہر غارت ہونے سے بچ گیا۔

نوازِ شیراز است سے مراد رنگینی اور دل فریبی ہے کہ بات لاکھ علمی ہو اور فلسفے سے متعلق ہو لیکن اسلوب شیرازی ہوگا۔

---

[1] (الف) جغرافیہ خلافتِ مشرقی، جمیل الرحمٰن۔ حیدرآباد۔

(ب) شیراز نامہ (زرکوب)۔

ط

(۱) **طارق بن زیاد:** اسلام کی تاریخ میں ۸۶ھ ہجری سے ۹۶ھ ہجری تک کا زمانہ بہت اہم اور وقیع ہے۔ یہ ولید کا عہد حکومت ہے۔ اسی زمانے میں محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کر کے راجہ داہر کو شکست دی اور وہاں اس زبان کے ارتقا کے سامان پیدا ہو گئے جسے اردو کے نام سے مشہور ہونا تھا۔ اسی زمانے میں مسلمانوں کی توجہ ہسپانیہ کی طرف منعطف ہوئی جس کے فرماں روا قوطی (Gothic) تھے۔ انھوں نے ایسے جابرانہ قوانین نافذ کر رکھے تھے کہ امرا تو ہر قسم کے ٹیکس سے بچ جاتے تھے اور رعایا کے متوسط الحال اور نچلے طبقوں پر سارا بوجھ پڑتا تھا۔

۹۲ھ ہجری میں موسیٰ ابن نصیر نے کہ افریقہ کے حاکم تھے (صدر مقام قیروان۔ یاد کیجیے قاآنی کا شعر؎

کشودی زلفِ قیر آگیں جہاں را قیرواں کردی
نمودی چہرِ مہر آگیں زمیں را آسماں کردی)

اپنے ایک بربری افسر طارق بن زیاد کو سات ہزار فوج کے ساتھ ہسپانیہ پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا۔ طارق، ساحل پر جس پہاڑی کے پاس اترا، وہ اب تک اُس کے نام پر جبل الطارق کہلاتی ہے۔ اس کے اعتمادِ نفس اور شوقِ جہاد کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ لڑنے سے پہلے اپنی کشتیاں تمام غارت کر دیں کہ واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہو۔ (انگریزی محاورہ to burn one's boats. اسی سے پیدا ہوا ہے)۔ بہر حال طارق نے آگے بڑھ کر ہسپانیہ کے بہت سے حصوں پر قبضہ کر لیا۔

اس کے بعد موسیٰ بن نصیر بھی ہسپانیہ آن پہونچے۔ دونوں نے مل کر گاتھوں کی حکومت کا تیا پانچہ کر دیا[۵]۔

طارق بن زیاد کے ذوقِ عمل، خود اعتمادی، شوقِ جہاد، اور قلندرانہ وضع سے علامہ بہت متاثر ہیں اور طارق کے حوالے سے دو تین معرکے کی نظمیں لکھی ہیں۔ مثلاً طارق کی دعا پیامِ مشرق میں طارق کی زبان سے کہلوایا گیا ہے:

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

یوں بھی ہسپانیہ میں مشرق و مغرب کے تمدنی تال میل سے جو صورت پیدا ہوئی ہے وہ بے غایت دلفریب ہے اور ہسپانیہ کی عمارات بھی علامہ کی بہت سی اچھی نظموں کے لئے محرکات ثابت ہوئی ہیں۔

---

[۵] تاریخ اسلام۔ بروکلمن۔ تاریخ اسلام۔ عنایت اللہ۔ عبرت نامۂ اندلس (ڈوزی) ترجمہ عنایت اللہ۔

ع

(۱) (محی الدین) عالمگیر: اورنگ زیب، شاہجہاں کا لڑکا تھا اور تیموری دودمان کا آخری جلیل القدر فرماں روا تھا۔ اس نے ۱۶۵۸ء میں جلوس کیا۔ اس عالی مرتبت فرماں روا میں بہت سی خوبیاں جمع ہو گئی تھیں۔ شجاعت، ذوقِ عمل، شوقِ جہاد، سوجھ بوجھ، سیاسی بصیرت۔ اس سے پہلے اکبر اور جہانگیر کی حکمتِ عملی سے جو نقصانات مسلمانوں کے سوادِ عظیم کو پہنچ چکے تھے، اورنگ زیب نے ان کی تلافی کی پوری کوشش کی اور یہ چاہا کہ دینِ اسلام کا ہندوستان میں وہی رنگ ہو، جو مناسب، قرینِ مصلحت اور مسلمانوں کے مفاد کے مطابق ہے لیکن پہلے بادشاہوں کی پالیسی کے اثرات مستقلاً مرتب ہو چکے تھے۔ اور عالمگیر صرف ان اثرات کو رفع کرنے کی کامیاب کوشش کر سکتا تھا۔ اس مسئلے کے ساتھ اسے تسخیرِ ممالک کا خیال بھی تھا کہ ہندوستان کے ہر حصے میں، ملّی اور قومی مفاد کے تقاضے پورے ہو سکیں۔ ساری عمر وہ جہاد کرتا رہا اور دکن کی الجھی ہوئی گرہیں سلجھاتا رہا۔ جب اس نے وفات پائی

ہے تو سلطنت کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ کابل سے راس کماری تک مغل بادشاہوں کے جھنڈے گڑے تھے لیکن اس کے جانشین اس وسیع سلطنت کا انتظام نہ کر سکے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کا انتشار بڑی تیزی سے شروع ہو گیا۔

علامہ کے دل میں عالمگیر کے لئے بڑی عقیدت تھی اور یہ بجا بھی تھی، چنانچہ انھوں نے فرمایا ہے،

درمیانِ کارزارِ کفر و دیں
ترکشِ مارا خدنگ آخریں

(اورنگ زیب پر جو الزام تعصب اور ظلم کے لگائے جاتے تھے۔ ان کے بادل اب چھٹ چکے ہیں، خود ہندو مورخوں نے اس بادشاہ کو سراہا ہے[۱]

(۴) عرفی: جمال الدین عرفی شیرازی (متوفی ۹۹۹ھ) جس نے عین عالم شباب میں (۳۶ یا ۳۷ سال کی عمر میں) وفات پائی، شیراز سے ہندوستان چلا آیا تھا کہ جو جنسِ سخن اس کا سرمایۂ زیست تھی اس کا کوئی قدردان نہ تھا۔ ہندوستان پہونچا تو پہلے فیضی سے ملا، لیکن یہاں بھی بیل منڈھے نہیں چڑھی۔ آخر جلد عبدالرحیم خان خاناں کے دربار سے منسلک ہو گیا جو ذوقِ شعر گوئی اور ہنر پروری میں بے نظیر گنا جاتا تھا۔ نظیری بھی اسی دربار کا زلہ ربا تھا۔ چنانچہ پردے پردے میں چوٹیں ہوتی تھیں بعض مقامات بالکل واضح ہیں۔ مثلاً نظیری کی غزل:۔

بزم خاص است دریں نکتہ بدستور بیار — معنی دور طلب کن سخن دور بیار

عرفی نے قصیدے کو اپنے مقام سے فروتر سمجھا تھا اور مدح بہ کراہت کرتا تھا۔ ممدوح کے ساتھ اپنی تعریف میں بھی کچھ شعر کہہ لیتا تھا لیکن عجب اتفاق ہے کہ ہندوستان میں

---

[۱] A Short History of India; Moreland 1945.
History of Aurangzeb, Sirkar.
اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر۔ شبلی نعمانی

[۲] رضا زادہ شفق۔ تاریخ ادبیاتِ ایران۔

اس کی قدر دانی قصیدے کی وجہ سے ہے۔ اس کی غزل کی طرف زیادہ توجہ نہیں ہے۔ عرفی کی غزل میں بھی دوسری اصنافِ سخن کی طرح عرفی کی آزادہ روی، استغنا، بلند نظری اور غرورِ نفس کے عناصر جھلکتے ہیں، عرفی کے ضابطۂ اخلاق میں شکر گدایانہ سے گلہ مندانِ بے ادب کا کفرانِ نعمت بہتر ہے۔

عرفی کے مطالب دقیق، طبعاً، دقیق اور بیچدار استعارات و تشبیہات کا سہارا لیتے ہیں۔ غزل ہو یا قصیدہ وہ فکر و عقل سے زیادہ کام لیتا ہے۔ جذبہ اس کے ہاں رکا ہوا اور کھنچا کھنچا سا ہے[۵]

علامہ نے عرفی کے اشعار کو تضمین کیا ہے۔ ایک شعر اس کے مشہور قصیدے میں سے لے کر مصرعوں کی ترتیب بدل دی ہے۔

حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی
نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی

(۳) **علم الاسماء:** آیتِ قرآن کی طرف تلمیح ہے۔ (سورہ بقرہ) ۲/۳۱

یہ وہ مقام ہے کہ خدا نے زمین پر اپنا ایک خلیفہ بنایا تھا (یہی حضرت آدم تھے) اور فرشتوں نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ یہ ہستی زمین پر خرابی پھیلائے گی اور خدا نے فرمایا کہ میری نظر جس حقیقت پر ہے تمھیں اس کی خبر نہیں ہے۔ پھر فرشتوں کو سمجھایا کہ حضرت آدم کو صفت علم سے نوازا گیا ہے اور اسی اعتبار سے وہ خلافت ارضی کے مستحق ہیں۔

۵[۱] (الف) مراۃ الشعراء۔ عبدالرحمٰن۔
(ب) شعر العجم۔ شبلی۔
(ج) مے خانہ۔ عبدالنبی۔
(د) شفق۔ تاریخ ادبیات ایران۔
(ہ) عبدالغنی (تاریخ ادبیات بہ عہد بادشاہان مغل) (انگریزی)۔

اس معاملے میں بہت اختلاف ہے کہ یہ علم الاسما کیا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی فکر کو اس قابل بنا دیا گیا تھا کہ وہ ہر چیز کے متعلق معلوماتِ صحیح حاصل کر سکے۔ اور جوں جوں اس کا علم بڑھتا جائے وہ اس علم سے دوسری معلومات منکشف اور دریافت کرنے کا کام لے۔

گویا یہ علم انسان کے فکری پیمانے کی ساخت کا اس طرح قائم رکھنا تھا کہ ماضی اور حال اور مستقبل کے تمام علوم و فنون کو محیط ہو سکے۔[۵]

---

۵ (الف) قصص القرآن۔ حفظ الرحمٰن۔

(ب) تذکرہ۔ مولوی عنایت اللہ مشرقی۔

(ج) ترجمان القرآن۔ آزاد۔

غ

(۱) **غالب**: اپنے قول کے مطابق، وہ سلاجقہ کبیر کی اولاد میں سے ہیں۔ ترسم خاں جو میرزا غالب کے پردادا تھے، برقیارق (۱۰۹۴ء - ۱۱۰۴ء) سے اپنا نسب ملاتے تھے۔[1] غالب ۸ رجب ۱۲۱۲ھ آگرہ میں پیدا ہوئے[2] اور میرزا نوشہ کے نام سے مشہور ہوئے کہ والد میرزا دولہا کہلاتے تھے۔ ان کے والد میرزا عبداللہ بیگ فوت ہوئے تو ان کے چچا میرزا نصراللہ بیگ نے بچوں کی دیکھ بھال کا بیڑا اٹھایا۔ یہ بھی ۱۸۰۶ء میں ایک معرکے میں جاں بحق ہوئے۔ اس کے بعد میرزا غالب کا کچھ وظیفہ مقرر ہو گیا اور وہ اپنی ننھیال میں رہنے لگے۔ میرزا مدعی ہیں کہ ان کے استاد عبدالصمد نامی ایک بالغ نظر محقق تھے لیکن قاضی عبدالودود[3] نے کہا ہے کہ عبدالصمد میرزا صاحب کی ذہنی تخلیق ہے اور اس کا وجود فی الخارج

---

۱ درفش کاویانی - غالب ۔

۲ یادگار غالب - حالی ۔

۳ علی گڑھ میگزین - غالب نمبر (غالب کا ایک فرضی استاد) ۔

نہیں ہے۔ ۱۲۲۵ھ میں غالب کی شادی الٰہی بخش خاں معروف کی چھوٹی صاحبزادی امراؤ بیگم سے ہوگئی اور اس کے کچھ عرصے کے بعد انھوں نے دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ یہاں میرزا کی شعر گوئی اور مالی پریشانیوں کا آغاز ہوا اور مرتے دم تک دونوں سے چھٹکارا نصیب نہیں ہوا۔ جب مالی پریشانیوں نے بہت بد دل کیا تو پنشن کے اضافے کی کوشش میں کلکتے تک پہونچے یہاں وہ معرکہ برپا ہوا جس کی تفصیل "بادِ مخالف" (مثنوی) میں مندرج ہے۔ پنشن کے سلسلے میں ناکام و نامراد لوٹے ۱۸۴۷ء میں قمار بازی کے جرم میں ماخوذ ہوئے اور چھ ماہ قید کی سزا ہوئی۔ اس پر آشوب زمانے میں نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے ان کی بہت دل جوئی کی۔ غدر سے ذرا پہلے نواب یوسف علی خاں ناظم والی رام پور ان کے شاگرد ہو گئے[۲۵]۔

میرزا غالب کے بچے پیدا ہوتے تھے اور مر جاتے تھے۔ آخر انھوں نے اپنی سالی کے لڑکے نواب زین العابدین خاں عارف کے دونوں لڑکوں مرزا باقر علی خاں اور حسین علی خاں کو اپنے پاس رکھ لیا اور اولاد کی طرح پالا۔

غالب نے ۱۸۶۹ء میں وفات پائی۔

ان کی تصانیف میں (نثر فارسی) پنج آہنگ، دستنبو، مہر نیم روز، قاطع برہان اور درفشِ کاویانی مشہور ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ بھی وہ دوسروں کے نام سے (قاطع برہان کے جھگڑے ہیں) کتابیں لکھا کرتے تھے۔ نظم میں کلیات، سبد چین، متفرقات غالب مطبوعہ ہیں۔ اردو کا دیوان ہے اور رقعات کے مجموعے ہیں عود ہندی۔ اردوئے معلّے۔ مکاتیبِ غالب[۲۳]، نادراتِ غالب[۲۴]۔

---

[۵۱] کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے (کلیاتِ اردو)

[۵۲] مکاتیبِ غالب عرشی رام پوری صفحہ ۱۲۰ حاشیہ۔ [۵۳] مرتبہ عرشی رام پوری۔
[۵۴] مرتبہ آفاق حسین۔ آفاق دہلوی۔

غالب اُردو نثر کے مجدد ہیں اور خطوط نویسی کا جو انداز ان سے مخصوص ہے، وہ بے نظیر ہے
یہی غزل کا حال ہے، اُردو ہو یا فارسی، صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک نئی آواز ہے۔
اقبال پر غالب کے کلام کا خاصا اثر ہے۔ خاص طور پر غالب کے کلام میں سخت کوشی
خودداری اور عزتِ نفس کے متعلق جو مطالب ملتے ہیں وہ علامہ مرحوم کی افتادِ طبع کے عین
مطابق ہیں۔ غالب پر بنیادی کتابیں بہ تفصیلِ ذیل ہیں:

۱۔ یادگارِ غالب — حالی
۲۔ غالب نامہ — اکرام
۳۔ مکاتیب غالب — عرشی رام پوری
۴۔ غالب نمبر۔ علی گڈھ میگزین
۵۔ شرح غالب طباطبائی
۶۔ مقدمہ نسخۂ حمیدیہ دیوان غالب
۷۔ عبداللطیف کی کتاب غالب پر

یوں غالب پر بے شمار کتابیں اور مضامین لکھے جا چکے ہیں جن کا احصا دشوار ہے۔

ف

(۱) **فارابی**: ابو نصر محمد فارابی (متوفی ۹۵۰ء) اترار یا فاراب کا رہنے والا تھا (یہ وہی مقام ہے جہاں کے حاکم نے چنگیز خاں کے تاجروں کو ہلاک کروا دیا تھا) آج کل یہ جگہ روسی ترکستان کا جزو ہے۔ فارابی نے ارسطو کے فلسفے کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا تھا۔ مختلف ممالک کی سیر و سیاحت کے بعد آخر وہ دمشق آ کر جم گیا۔

منطق اور یونانی فلاسفہ کے عقاید کی تشریح میں اس کا مقام اتنا بلند ہے کہ بوعلی سینا نے اس کی تصانیف کا حل کرنے کے بعد یہ جانا کہ علم کا راستہ کون سا ہے اور علم کا مقام کیا ہے۔ فارابی کی تصانیف اکثر ضائع ہو گئیں اور جو ہم تک پہونچی ہیں وہ نامکمل اور ناقص صورت میں ہیں۔

موسیقی کے متعلق بھی فارابی نے معرکے کے مضامین لکھے ہیں[۱]۔

(۲) **فاروق**: حضرت عمر بن الخطاب (۲۳ھ۔۱۳ھ) خلافت راشدہ کے سلسلے میں

---

[۱] Legacy of Islam : Arnold.
Outlines of Islamic Culture, Shustri, Bengalore, 1938.

دوسرے فرماں روا ہیں، ان کے زمانے میں عراق فتح ہوا۔ قادسیہ کا میدان سر ہوا، ایران کا دارالسلطنت مدائن مسخر ہوا۔ شام و فلسطین بھی مفتوح ہوئے۔ مصر بھی مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔ انھیں کے زمانے میں سنِ ہجری کا بھی آغاز ہوا۔ حضرت عمر نے مالیات کی تنظیم بھی کی۔ یہ شرعِ اسلامی کے نفاذ میں بہت سخت گیر تھے لیکن اس کے باوصف عام مسلمانوں سے ملتے ہیں۔ ان کی مشکلات دریافت کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا عہدِ حکومت سیاسی اعتبار سے، اسلام کی توسیع، استحکام اور تنظیم کا زمانہ ہے۔ ان کی سیرت اور کردار نے مسلمانوں پہ بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ کوئی مورخ ایسا نہیں جو ان کی تعریف میں رطب اللسان نظر نہ آتا ہو۔ حضرت عمر فاروق کے متعلق بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن اردو میں غالباً شبلی کی "الفاروق" سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ بھی ہو چکا ہے [۱]

(۳) **فردوس گوش**: غالب کے شعر کی طرف اشارہ ہے۔

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ — یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے [۲]

(۴) **فغفور**: حقیقت میں یہ کلمہ بغپور ہے یعنی بغ + پور۔ بغ، دیوتا، خدا اور بت کو کہتے ہیں [۳]۔ پور فارسی میں پسر کو کہتے ہیں۔ مثلاً پور زال یعنی رستم۔ تو بغپور کے لغوی معنی ہیں دیوتاؤں کا بیٹا۔ یہ چین کے بادشاہوں کا لقب ہے۔ ان کو انگریزی میں Son of Heaven. یا فرزندِ آسمانی کہتے ہیں۔ بغ کا کلمہ بغداد میں اسی طرح قائم ہے لیکن بیستون [۴] میں اس نے اپنی صورت بدل دی ہے کہ یہ حقیقت میں بغستان تھا یعنی محلِ خدایان۔ فغ بغ ہی کی ایک شکل ہے اور پور اور فور میں کوئی فرق نہیں کہ پ اور ف کا تبادلہ فارسی میں عام ہے جیسے پرتاب [۵]، فرتاب۔

---

[۱] تفصیلات کے لئے دیکھئے تاریخ اسلام خلافتِ راشدہ۔ دار المصنفین اعظم گڑھ۔ الفاروق شبلی نعمانی ہسٹری تاریخ عرب۔
[۲] دیوان غالب۔ [۳] برہان قاطع محمد معین۔ کلمہ بغ۔ بغداد بیستون۔ حواشی [۴] دیکھئے آنند راج۔ غیاث۔ [۵] برہانِ قاطع اور سخندان پارس، تالیف آزاد بصفت قلزم میں بھی حروف کے تبادلے سے بحث کی گئی ہے۔

ق

(۱) **قلزم**: سمندر اور چاہِ بسیار آب کو بھی کہتے ہیں۔ بحیرۂ احمر کا دوسرا نام ہے ادبی روایت میں کبھی اس سے مطلق سمندر مراد لیتے ہیں، کبھی چاہِ بسیار آب لیکن جغرافیے کی اصطلاح میں یہ بحیرۂ احمر[۱] ہے۔

(۲) **قہستان**: یہ کلمہ کوہستان یا کہستان کی ایک شکل ہے۔ پہاڑی علاقے کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن ایران کے ایک صوبے کا بھی یہی نام تھا۔ اس صوبے کا صدر مقام قائن تھا۔ ناصر خسرو نے یہ شہر دیکھا ہے۔ اس صوبے میں اسمٰعیلیوں کے قلعے واقع تھے جو ہلاکو خاں نے مسخر کیے۔ یہیں[۲] کشمر نامی ایک گاؤں تھا۔

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھیے قصص القرآن۔ داستانِ فرعون و حضرت موسیٰ۔ آنند راج۔ غیاث اور اٹلس آف اسلامک ہسٹری۔ پرنسٹن یونیورسٹی پریس ۱۹۵۱ء۔

[۲] جغرافیہ خلافتِ مشرقی۔ ترجمہ جمیل الرحمٰن۔ حیدر آباد دکن۔

ک

(۱) کابل: قدیم زمانے میں کابل سیستان یا سجستان کا مشہور شہر تھا۔ قندھار اور غزنی بھی اسی علاقے میں واقع تھے۔ آج کل افغانستان کا دارالخلافہ ہے۔ تیموری فتوحات کی تاریخوں میں غزنہ کے اردگرد کا علاقہ زابلستان کہلاتا تھا۔ اور اس کے بالمقابل کابلستان یعنی کابل کا ملک تھا۔[۵]

(۲) کارل مارکس: مشہور مفکر اور علوم عمرانی کا ماہر ۱۸۱۸ء میں جرمنی میں پیدا ہوا وہیں تعلیم پائی۔ برلن یونیورسٹی سے فلسفے کی ڈگری حاصل کی پھر اشتراکیت کی طرف جھکا اور فرانس چلا گیا۔ ۱۸۴۸ء میں اینگلز کے ساتھ مل کر اس نے اشتراکی جماعت کا منشور شائع کیا۔ مختلف اخبارات میں مضامین بھی لکھتا رہا۔ اس کی مشہور کتاب سرمایہ کی بنیاد ۱۸۶۷ء میں رکھی گئی۔ یہ کتاب تین جلدوں میں شائع ہوئی۔ دوسری اور تیسری جلد مصنف کی وفات

---

۵ جغرافیہ خلافت مشرقی۔ ترجمہ جمیل الرحمٰن۔ حیدرآباد۔

کے بعد طبع ہوئی۔ اس کی وفات ۱۸۸۳ء میں واقع ہوئی۔ اگرچہ اس نے اعلیٰ درجہ کی تعلیم حاصل کی تھی لیکن اس کے اشتراکی خیالات کی وجہ سے وہ تمام عمر کم و بیش عسرت کا شکار رہا تیس سال اُس نے لندن میں گزارے۔ اُس کے سات بچے تھے اور کبھی ایسا بھی وقت آن لگتا تھا کہ مارکس کے پاس کچھ بھی نہ ہوتا تھا۔ اینگلز نے عسرت کے اس زمانے میں مارکس کی بہت مدد کی۔

مارکس کے فلسفیانہ، معاشری اور اقتصادی نظریات بیشتر اینگلز کے تعاون کے مرہونِ منت ہیں۔ اشتراکیت اور اشتمالیت کے موجودہ نظام کارل مارکس کی تعلیمات کے ثمر ہیں۔ اُس نے پیشین گوئی کی تھی کہ سرمایہ دارانہ نظام بہت جلد ختم ہو جائے گا اور دنیا میں ہر جگہ اشتراکیت قائم ہو جائے گی۔ اس کے خیال میں ایسا انقلاب لازمی ہے، جو دولت کی موجودہ تقسیم کو مردود قرار دے کر نیا اقتصادی نظام قائم کرے[۱]۔

(۳) کاشان (ایران): کاشان قدیم جغرافیہ نویسوں کی تحقیقات کے مطابق اس علاقے کا مشہور شہر تھا جسے جبال کہتے ہیں۔ یہاں کی خشک کی ہوئی کھجوریں بہت مشہور تھیں اور دساور کی جاتی تھیں[۲] (برآمد)۔ آج کل یہ شہر ولایت کاشان کا صدر مقام ہے۔

کاشان میں قالین اور مخمل اور ریشمی کپڑے نہایت اچھے بنتے ہیں۔ اس شہر کے روغنی ظروف اور روغنی اینٹیں آج تک مشہور رہیں۔ یہ چیزیں کاشی کہلاتی ہیں اور اس طرح یہ فن کاشی گری کہلاتا ہے

(۴) کاشغر: ترکستان کا مشہور شہر ہے اور آج کل دولت اشتراکیہ روس کے صوبے سنکیانگ میں واقع ہے۔ یہ وہی علاقہ ہے جہاں سے برابر ترک اور تاتار ہندوستان

---

[۱] Dictionary of Philosophy, D. Runes, New York.

[۲] جغرافیہ خلافت مشرقی۔ ترجمہ جمیل الرحمٰن۔ حیدر آباد۔

پر حملہ کرتے رہے ہیں[۱۵]۔

(۵) کاشمر: کشمیر کا دوسرا نام ہے کہ علامہ اقبال مرحوم کا وطنِ مالوف ہے۔ اس ملک کو کاشمیر بھی کہتے ہیں۔ اشتباہ نہ ہو کہ اس کا کوئی تعلق کشمر سے ہے جس کا ذکر انوری نے اپنے قصیدے میں کیا ہے اور جہاں وہ مشہور سرو کا درخت تھا جسے زرتشت نے شاہ گشتاسپ کے تبدیلِ مذہب کی یادگار میں لگایا تھا۔

کشمیر کے لوگ نہایت ذہین فطین اور خوش وضع ہوتے ہیں اور فنونِ لطیفہ کی طرف مائل۔ اس ملک کا جو علاقہ آج کل ہمارے قبضے میں ہے وہ آزاد کشمیر کہلاتا ہے اور جو علاقہ بھارت کے قبضے میں ہے وہ بھارتی کشمیر کے نام سے موسوم ہے۔ کشمیر سے زعفران، مختلف پھل، رنگین گنے کی بنی ہوئی چیزیں دساور کی جاتی تھیں۔ اس خطے کی تاریخ بھی بہت قدیم ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ علاقہ صدیوں تہذیب[۱۶] و تمدن کا مرکز رہا ہے۔ مغلوں کے زمانے میں یہ علاقہ پھر اسلامی مقبوضات میں شامل کیا گیا اور مختلف شعرا نے اس باغ و بہارِ ملک کی تعریف میں قصیدے کہے۔ ان میں فیضی اور عرفی کے اشعار بہت مشہور ہیں۔

(۶) کانٹ[۱۷]: مشہور جرمن مفکر اور فلسفی (۱۸۰۴ء-۱۷۲۴ء) علم ہیئت اور فلسفے کا ماہر تھا۔ اس کی زندگی مجموعۂ اضداد تھی۔ بن ۱۷۷۰ء میں اسے جرمنی کی ایک یونیورسٹی میں منطق اور مابعد الطبیعیات

---

۱۵ جغرافیہ خلافت مشرقی۔ ترجمہ جمیل الرحمٰن۔ حیدر آباد۔ اٹلس آف اسلامک ہسٹری پرنسٹن یونیورسٹی پریس ۱۹۵۱ء صفحہ ۴۱-۴۰۔

۱۶ برائے رفعِ اشتباہ دیکھئے جغرافیہ خلافت مشرقی۔ جمیل الرحمٰن۔ حیدر آباد۔ حواشی کے صفحات ۳۵۵-۳۵۶

۱۶ کشمیر: تالیف صوفی۔ مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی۔

۱۷ Dictionary of Philosophy, D. Runes, New York.

Story of Philosophy.

کی پروفیسری مل گئی۔ اس کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور بحیثیت استاد کے بھی وہ بہت کامیاب تھا۔ لایبنز کی تصانیف کا کانٹ[۱] پہ خاصا اثر تھا۔ اس کی معرکے کی کتاب "تنقیدِ عقلِ محض" ہے۔ کانٹ کا اثر بعد کے فلسفیوں پر نہایت گہرا ہے ہیگل اور شوپن ہار پر۔

۱۷) **کعبتین**[۲]: کعب سے ہے جسے انگریزی میں (Cube) کہتے ہیں اور کعبتین (تثنیہ) ان دو پانسوں کو کہتے ہیں جن کی شکل مکعب کی سی ہوتی ہے۔ ان پانسوں پر جو نشان ہوتے ہیں، ان کے حساب سے پو بارا اور تین کانے ہوتے ہیں۔ اخلاقی تنزل کی حیرت انگیز مثال ہے کہ کعبے جیسے مقدس مقام کے لیے جو کلمہ مخصوص ہے اس کی جمع پانسے کہلائے لیکن اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں قوموں کے تنزل کے آثار ایسے ہی ہوتے ہیں۔

(۸) **کوثر و تسنیم**[۳]: ادبی روایت میں کوثر جنت کا حوض ہے اور تسنیم وہاں کی نہر اور سلسبیل چشمہ۔ علامتی طور پر زبان کی پاکیزگی اور شیرینی کے لیے یوں کہتے ہیں کہ کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی زبان استعمال کرتا ہے۔ قرآن مجید میں کوثر کا حوالہ بہ تفصیل ذیل ہے۔

تیسواں پارہ، سورۂ کوثر (۱۰۸/۱)۔

گوئٹے: دیکھئے۔ پیرِ مغرب۔ شاعرِ المانوی

---

[۱] Dictionary of Philosophy; D. Runes. New York.
Story of Philosophy.

[۲] سرگزشتِ الفاظ، لاہور، احمد دین۔ آنند راج

جو دل قمار خانے میں بت سے لگا چکے ‏ ‏ ‏ ‏ وہ کعبتین چھوڑ کے کعبے کو جا چکے ‏ ‏ ‏ ‏ (ذوق)

[۳] غیاث۔ منتخب، آنند راج۔

ل

(۱) **لاک** [۱]: انگریز مفکر اور فلسفی (۱۶۳۲ء تا ۱۷۰۴ء) لاک نے بہت سے عمرانی علوم کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا تھا۔ سیاسیات میں اس کا نظریہ یہ تھا کہ بادشاہوں کو حکومت کرنے کا کوئی ازلی حق حاصل نہیں۔ سیاسی اقتدار رعایا کی رضامندی سے مشروط ہوتا ہے اور مذہبی اقتدار عقل سے مربوط۔ تعلیم کے متعلق بھی اس نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

(۲) **لالۂ طور**: علامہ مرحوم نے اپنی رباعیات کو یہ نام دیا ہے۔ لالہ اقبال کے کلام میں امتِ محمدیؐ کی علامت ہے۔

یہ سوال ہمیشہ معرضِ بحث میں رہا ہے کہ آیا لالۂ طور کے عنوان سے جو رباعیاں پیامِ مشرق میں درج ہیں وہ اصطلاحی معنی میں رباعیاں ہیں یا نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وزن وہی ہے جو رباعیات باباطاہر کا ہے۔ ایران کے نقاد اور افاضل کم وبیش اس پہ

---

[۱] Dictionary of Philosophy ; D. Runes. New York.

متفق ہیں کہ بابا طاہر کے اشعار رباعیات ہیں قطعات نہیں۔ ہر چند کہ وہ بحر ہزج کے ان مخصوص شجروں میں نہیں لکھی گئیں جنہیں عروضیوں نے رباعیات کے صحیح پیمانے تسلیم کیا ہے۔ رضا زادہ شفق بابا طاہر کے اشعار کو دوبیتی کہہ کے پکارتے ہیں اور دوبیتی رباعی ہی کا دوسرا نام ہے۔ ملک الشعراء بہار کے بیانات مبہم ہیں۔ پروفیسر براؤن بھی بابا طاہر کے اشعار کو رباعیات کے نام سے پہچانتے ہیں۔ سید سلیمان ندوی بھی ان اشعار کو رے کی دہقانی بولی میں رباعیاں کہتے ہیں۔ یہ سوال البتہ الجھا ہوا ہے کہ اگر شعر میں دونوں مصرعوں میں قافیہ نہ ہو تو رباعی کی صورت پیدا ہوتی ہے یا نہیں۔ اصولاً اس کا جواب نفی میں ہونا چاہئے۔ طور کے متعلق دیکھئے۔ سینا۔ کلیم (حضرت موسیٰ)

(۳) لینن[۵۲]: مارکس اور اینگلز کے بعد اشتراکیت کی ترویج اور تبلیغ میں لینن ہی کا سب سے نمایاں حصہ ہے۔ اس کی ولادت ۱۸۷۰ء میں ہوئی (روس) اور اس نے قانون کی تعلیم حاصل کی۔ شروع ہی سے اس پر مارکس کی تعلیمات کا گہرا اثر تھا۔ جب روس میں اشتراکیت برسر اقتدار آئی تو حکومت کا سربراہ لینن ہی قرار پایا۔ اس نے ۱۹۲۴ء میں وفات پائی۔ اس کی تصانیف تیس سے زیادہ ہیں اور عمرانیات کے مختلف شعبوں سے متعلق ہیں۔

---

۵۱ تاریخ ادبیات ایران۔ رضا زادہ شفق۔ سبک شناسی۔ ملک الشعراء بہار۔ خیام۔ سید سلیمان ندوی۔

۵۲ Dictionary of Philosophy; D. Runes. New York.

م

(۱) **مات** :۔ (اسپ، فیل، فرزیں) شطرنج میں مقابل کے بادشاہ کو اس طرح گھیر لینا کہ ہر طرف سے اُس پر کشت یا زد پڑتی ہو اور وہ اس زد سے بچنے نہ پائے اس کو مات کہتے ہیں۔

اسپ شطرنج کا ایک مہرہ ہے جسے انگریزی میں نائٹ کہتے ہیں۔ یہ ڈھائی گھر چلتا ہے اور کوئی مہرہ راستے میں ہو وہ اُس کی رفتار میں حائل نہیں ہو بشرطیکہ جس گھر میں بیٹھنا مقصود ہے وہ خالی ہو۔

فرزیں۔ وزیر، انگریزی (Queen) شطرنج کا سب سے بڑا مہرہ ہے۔ ہر رُخ پہ چلتا ہے لیکن راہ میں مہرہ ہو تو گھوڑے کی طرح اس کے اوپر سے نہیں گزرتا۔

پیادے جو اسپ، فرزیں اور دوسرے مہروں کے خانوں کے ہوتے ہیں۔ وہ آخری خانے پر پہنچ کر خود بھی اسپ یا فیل یا فرزیں یا جیسی بھی صورت ہو بن جاتے ہیں۔

خاقانی نے مدائن پر جو قصیدہ لکھا ہے اس میں شطرنج کی بہت سی اصطلاحات استعمال کی ہیں

(۲) مدائن: اس کے لغوی معنی ہیں شہر۔ مدینے کی جمع۔ عربوں نے ایران قدیم کے پایۂ تخت کو مدائن کا نام دیا تھا کہ ایک شہر نہیں کئی شہروں پر مشتمل معلوم ہوتا تھا۔ یہ شہر یعنی مدائن دریائے دجلہ کے کنارے واقع تھا اور ساسانیوں کا سرمائی دار السلطنت تھا۔ اس شہر کا پرانا نام طیسفون ہے اور سلوکیہ کا شہر بھی اسی شہر میں شامل سمجھا جاتا تھا۔ سلمان مصنف لکھتے ہیں کہ مدائن سات شہروں کا مجموعہ تھا۔ دجلہ کے مشرقی کنارے پر ساسانیوں کا عالیشان قصر تھا جس کے کھنڈر ابھی تک باقی ہیں۔ اس کو عرب ایوان کسریٰ کہتے تھے۔ چوتھی صدی عیسوی میں مدائن ایک چھوٹا سا بارونق شہر تھا[۱]۔ اگرچہ ساسانیوں والی شان وشوکت تو اسے کہاں نصیب ہو سکتی تھی۔

(۳) اصل آیت کا جزو یہ ہے

حتیٰ توارت بالحجاب

حوالہ یہ ہے $\frac{۳۸}{۳۲}$

"یہاں تک کہ آفتاب مغرب کے پردے میں چھپ گیا"

(۴) مراد: سلطان مراد سے سلطان مراد خاں چہارم معلوم ہوتا ہے (۱۶۲۳ء تا ۱۰۳۲ھ) لیکن یہ معاملہ تحقیق طلب ہے کہ ترکان آلِ عثمان کی تاریخ میں پانچ مراد گزرے ہیں۔

(۵) مزدک: ایران کا پہلا اشتراکی مفکر۔ اس کی تعلیمات بعد کی ایرانی تحریکات پر بہت اثر انداز ہوئی ہیں۔ بہر حال یہ مسلم ہے کہ مزدک نے قباد کے زمانے میں ظہور کیا اور یہ تعلیم دی کہ تمام فساد دنیا میں اس لئے ہوتا ہے کہ ہم املاک پر جن میں عورتیں بھی شامل ہیں خصوصی حق جتاتے ہیں۔ مناسب یہ ہے کہ ملکیت ہر چیز کی سلطنت سے متعلق ہو۔ عورتوں کو عام آزادی ہو، جہاں چاہیں چلی جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی تحریک اس زمانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔

---

[۱] جغرافیۂ خلافتِ مشرقی (تاریخ ایران سائیکس انگریزی)۔ براؤن۔ تاریخِ ادبیاتِ ایران۔

چنانچہ جب نوشیرواں نے ہوش سنبھالا تو اس نے اپنے باپ کو سمجھا بجھا کر مزدکی طریقے سے ہٹایا۔ جب باپ راضی ہوگیا تو مزدکیوں کو ایک دعوتِ شاہانہ پر بلایا گیا۔ یہاں بیشتر مزدکی ترمائے گئے اور کچھ جان بچا کر نکل گئے۔ مزدک بھی مارا گیا۔ یہ ۵۲۸ء یا ۵۲۹ء کا واقعہ ہے۔ جب ۵۲۹ء میں نوشیرواں تخت پر بیٹھا تو اس نے چن چن کر مزدکیوں کو ہلاک کیا تا این کہ یہ مذہب بالکل نیست و نابود ہوگیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مزدک کی تعلیم اشتراکی نظریے سے قطع نظر مانوی مذہب کی ایک ترمیم شدہ صورت تھی۔ مزدکیت کی تحریک آخر آخر خالص سیاسی ہوگئی تھی اور مزدک کے حامی چاہتے تھے کہ خسرو نوشیرواں کو تاج و تخت سے محروم کردیا جائے۔ مزدک کے مرنے کے بعد مزدک کی تعلیم خفیہ خفیہ موثر رہی اور عہدِ اسلام میں اس تحریک نے کئی روپ دھارے[۱]۔

(۶) مصطفےٰ کمال پاشا: مصطفےٰ کمال پاشا جو اتاترک کے نام سے زیادہ مشہور ہیں ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے جلدی ہی یتیم ہوگئے۔ پھر جنگی سکول میں تعلیم حاصل کی۔ فوجی کالج پہنچے اور لفٹیننٹ مقرر ہوگئے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ترکی کی حالت بڑی سقیم ہوگئی تو انھوں نے ترکی کے مردوں، عورتوں اور بچوں کو جوش دلایا اور کچھ فوج جمع کی کہ یونانیوں کو شکست دیں جنھوں نے اناطولیہ پر حملہ کردیا تھا۔ اس کے بعد اتاترک کو انگریزوں سے ٹکر لینی پڑی۔ وقت وقت کی بات ہے مغرب کی دوسری قوموں نے انگریزوں کا ساتھ نہ دیا اور اتاترک انگریزوں کو ترکی سے نکالنے میں کامیاب ہوگئے۔ آخر انگریزوں سے صلح ہوگئی اور اتاترک قوم کے سربراہ مقرر ہوئے۔ انھوں نے اور عصمت انونو نے ترکی کے احیا کے سلسلے میں بڑا کام کیا ہے۔ جن دنوں غازی انگریزوں سے برسرِ پیکار تھے تو برصغیر ہند پاکستان کے مسلمان بھی اپنے جذبات کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ غازی نے ۱۹۳۸ء میں وفات پائی۔ انھوں نے ترکی قوم کو نئی زندگی بخشی اور ملک کو اپنے پاؤں پر کھڑا کردیا[۲]۔

---

[۱] براؤن۔ تاریخِ ادبیاتِ ایران۔ جلد اول (انگریزی)۔ ایران بہ عہدِ ساسانیاں۔ ترجمہ ڈاکٹر محمد اقبال انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۴۱ء
[۲] مشاہیر: غلام رسول مہر۔

ن

(۱) **نظیرِی نشاپوری**: (متوفی ۱۰۲۱ھ) اکبر کی فیاضی کی شہرت سن کر ہندوستان آیا اور پہلے خانِ خاناں کے دربار کے شعرا میں منسلک ہو گیا۔ وہیں عرفی سے مقابلے رہے اور دونوں کے جوہر خوب چمکے۔ نظیری کلاسیکی روایات کو ملحوظ رکھ کر نہایت دل پذیر غزل کہتا ہے اور تمام معاصر شعرا نے اس کی عظمتِ فن کا اعتراف کیا ہے۔[1]

(۲) **نیل**: وادیِ نیل کی تہذیب بہت قدیم ہے۔ بعض مورخ تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قدیم ترین تہذیب ہے۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ نیل کی وادی اور اس کے ملحقہ علاقوں میں، مصر وغیرہ، جو شاہیت کے سلسلے قائم ہوئے ہیں ان کی عظمت کا ہر ایک کو اعتراف ہے۔ (دیکھیے، موسیٰ، سینا، فرعون)۔

جرمنی کے مصنف Ludwiq. نے دریائے نیل پر ایک نہایت اعلیٰ درجے کی

---

[1] شعرالعجم۔ جلد چہارم ۔ شفق۔ تاریخِ ادبیاتِ ایران۔

کتاب لکھی ہے۔ جس میں نیل کے کناروں پر جو کچھ ہوتا رہا ہے۔ اس کے متعلق دریا نے چشم حباب سے جو واقعات دیکھے ہیں، ان کا ذکر کیا ہے۔ اہرام مصر، ابوالہول بھی اسی زمین پر اسرار سے متعلق ہیں اور سحر و طلسم کے افسانے بھی، حضرت یوسف کا قصہ بھی اسی ملک سے تعلق رکھتا ہے۔

(خود دریائے نیل کی تاریخ بھی Ludwiq. کی کتاب میں ملے گی۔[۱])

---

[۱] The Nile Story of River ; Emil Ludwiq.

و

۱۔ ولیم: قیصر جرمنی، جو ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کی نمایاں ترین شخصیت تھا۔ جرمنی کو شکست ہوئی تو ہالینڈ چلا گیا اور وہاں زندگی کے باقی ماندہ دن گذار دیے۔

ی

(۱) یسفک الدماء خصیم مبین: دو اجزا سے مرکب ہے۔ پہلے یسفک الدماء جس کا حوالہ یہ ہے ۲/۳۰ (بقرہ)۔ دوسرے خصیم مبین، جس کا حوالہ یہ ہے ۳۶/۷۷ -

پہلا حوالہ اس سلسلے میں ہے کہ فرشتے آدم کے متعلق کہتے ہیں کہ "زمین میں فساد اور خوں ریزیاں کرتا پھرے گا"

دوسرا اس سلسلے میں ہے کہ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے "ہم نے انسان کو پیدا کیا پھر وہ یکایک کھلم کھلا ہمارا مقابل بنا ہے"

جاوید نامه

الف

(۱) **ابغض الاشیاء عندی الطلاق**: حدیثِ نبوی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ میرے نزدیک سب سے زیادہ اکراہ پیدا کرنے والی چیز طلاق ہے۔

(۲) **ابوجہل**: رسولِ خداؐ نے جب بت پرستی سے تبرّا کیا اور توحیدِ محض کا وہ تصوّر پیش کیا جو اسلام سے مخصوص ہے تو ظاہر ہے کہ ان قبیلوں کو، جو بت پرستی کے ذریعہ مالی فائدہ اٹھاتے تھے رنج بھی ہوا اور نقصان بھی۔ انھیں لوگوں میں ابوجہل تھا۔ رسول پاکؐ نے اس کی جہالت کی وجہ سے اسے یہ لقب دیا تھا۔ بعد میں ابوجہل نے اپنے زعم میں گویا رفعِ شر کے لئے اپنے آپ کو ابوالحکم کہنا شروع کر دیا۔ یہ رسول پاکؐ کے مخالفوں میں پیش پیش تھا۔ آخر اس کا وہی انجام ہوا جو حق کی شدید مخالفت کرنے والوں کا ہوتا ہے۔ جب اسلام کی توسیع ہوئی تو وہ لڑائی میں مارا گیا۔ اس کی موت سے اس کے حامیوں کی گویا کمر ٹوٹ گئی۔ علامہ اقبال نے ابوجہل کی روح کو انتخاب کیا ہے کہ وہ طاسینِ محمدؐ میں اس بات پر ماتم کرے کہ رسول کی تعلیم

نے بت پرستی کا نظام درہم برہم کر دیا ہے۔ قبیلوں کی عصبیت کا خاتمہ کر دیا ہے اور حسب و نسب کی فضیلت کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔ روح ابوجہل کو یہ شکایت ہے کہ رسول پاکؐ نے حبشیوں اور عربوں کو ایک ہی صف میں لا کھڑا کیا اور خاندانی آبرو مٹی میں مل گئی۔

(۳) **ابوسعید ابوالخیر** (ولادت ۳۵۷ھ) ابوسعید ابوالخیر جو ایران کے اکابر متفکرین میں شمار ہوتے ہیں، ملک الشعراء بہار کی تحقیق کے مطابق مہنہ میں پیدا ہوئے۔ یہ مہنہ جو شیخ کا مسقط الراس ہے، سرخس اور ابیورد کے درمیان واقع ہے اور شیخ مدفون بھی وہیں ہیں۔ آج کل یہ مقام مقبوضاتِ دولتِ اشتراکیہ روس میں شامل ہے۔

قدیم نیشاپور کی ولایت میں ایک اور گاؤں بھی مہنہ نامی مشہور تھا اور غالباً یہی وجہ ہے کہ رضا قلی صاحب مجمع الفصحا کو یہ اشتباہ ہوا ہے کہ ابوسعید ابوالخیر نیشاپوری ہیں۔

یہ مسلّم ہے کہ شیخ نے اپنے وطن میں تحصیلِ علوم کی، پھر مرو چلے گئے کہ اُن دنوں اربابِ علم و فضل کا مرکز تھا۔ وہاں ابوعبداللہ الحصری کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ یہ صاحب فقہ میں اپنی نظیر آپ تھے اور رموزِ طریقت پر بھی مطلع تھے۔ جب علومِ منقول اور معقول سے بہرہ یاب ہو گئے تو شیخ ابوسعید نے کشف و طریقت کی طرف توجہ مبذول کی اور ابوعبدالرحمٰن (متوفی ۴۱۲ھ) کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

شیخ کے احوال و مقامات کا تفصیلی ذکر اس شاہکار نثری کارنامہ میں موجود ہے جو اسرار التوحید فی مقاماتِ شیخ ابی سعید کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے مولف محمد بن منور بن ابی سعید بن ابی طاہر بن ابی سعید ابوالخیر ہیں تو معلوم ہوا کہ ابوسعید ابوالخیر مولف کے جد امجد تھے۔

محمد منور لکھتے ہیں کہ ایک بار یوں ہوا کہ بوعلی سینا اور شیخ تین دن متواتر خلوت گزیں رہے۔ جب بوعلی شیخ سے رخصت ہوا تو شاگردوں نے اُس سے پوچھا کہ ہمارے شیخ کے متعلق آپ کی کیا

رہے ہے؟ بو علی سینا نے کہا "میں جانتا ہوں (بطریق علم) اور وہ دیکھتا ہے۔ (بطریق کشف) شیخ ابو سعید کے مریدوں نے طعام رشد سے پوچھا کہ بو علی سینا کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ تو ابو سعید نے فرمایا "جو کچھ میں دیکھتا ہوں (بطریق کشف) وہ جانتا ہے (بطریق علم)۔"

شیخ ابو سعید نے شعبان کی چار تاریخ ۴۴۰ھ میں وفات پائی۔

تمام تذکرہ نویس اور نقاد (ان میں مستشرقین بھی شامل ہیں) باتفاق رائے لکھتے ہیں کہ ابو سعید ابو الخیر پہلے شاعر ہیں جنھوں نے تصوف کی اصطلاحات کے معنی متعین کیے اور شعر میں وہ علائم و رموز استعمال کیے جو تصوف سے مخصوص ہیں۔ انھوں نے تصوف کی واردات بیان کرنے کے لیے غزل کی زبان استعمال کی چنانچہ وہ تمام کنایے، اشارے اور اصطلاحات جو تغزل کی روایت سے مخصوص ہیں تصوف کی حدود میں داخل ہو گئے اور ان کے معانی بدل گئے۔ عطار نے رومی نے اور حافظ نے انہی علائم اور رموز سے کام لے کر وہ سر بفلک عمارت کھڑی کی جس کی چوٹیاں بادلوں میں غائب ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔

اس سلسلہ میں تصوف کے آغاز و ارتقا کے متعلق بھی کچھ گذارشات پیش کرنی مناسب معلوم ہوتی ہیں۔ کلمہ تصوف کے اشتقاق کے متعلق شدید اختلاف رائے ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کا مادہ صوف ہے۔ صوفی پشمینہ پوش ہوتے ہیں یعنی صوف کا لباس پہنتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ تصوف کو اہلِ صفہ سے نسبت ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ صوفی صفا سے مشتق ہے کہ صوفی صفائے قلب پر زور دیتے ہیں۔ بہار نے "سبک شناسی" میں البیرونی کے اس نظریہ کی تائید کی ہے کہ یہ کلمہ یونانی کلمہ سوفی Sophy سے مشتق ہے جس کے معنی علم و حکمت کے ہیں۔ رشید یاسمی بھی اسی نظریہ کا موید معلوم ہوتا ہے۔ شبلی لغات ماخذ الفاظ (نیو یارک) کلمہ Sophisticated کے ماتحت لکھتا ہے کہ اس کلمہ کا مادہ سوفس ہے جس کے معنی دانشمند ہیں لیکن وہ آخر میں تصریح کر دیتا ہے کہ اس

کلمہ کے مادہ کو صوفی سے کوئی تعلق نہیں کہ اس کا مادہ صوف ہے یعنی پشمینہ اور صوفی مردِ پشمینہ پوش کو کہتے ہیں۔

اب قریب قریب یہ بات مُسلّم تصور کرنی چاہیئے کہ تصوف کا مادہ صوف ہے اور سوفی یعنی علم و حکمت نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یونانی سے جو کلمے عربی میں منتقل ہو کر آئے ہیں ان میں ایس (S) کا حرف ہمیشہ س کی شکل اختیار کرتا ہے جیسے سوفی سے فلسفہ اور سوفسطائی۔ کوئی وجہ نہیں کہ سوفی سے جب عربوں نے کلمات کو معرب کرنا چاہا ہو تو اپنی عادت کے خلاف یونانی ایس (S) کو ص میں تبدیل کیا ہو کیونکہ اس سے بڑا خلط مبحث پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔

تصوف کے آغاز اور مبدا کے متعلق جو مختلف نظریات ہیں۔ ان میں اہم ترین یہ ہیں:۔

(۱) تصوف دراصل حضرت علی ابن ابی طالب سے منسوب ہے۔ یہ رسول اللہ اور اصحاب صفہ اور حضرت ابوبکر صدیق کے اعمال کی تشریح اور اقوال کی توجیہ ہے۔ اکابر صوفیہ کا کم و بیش یہی عقیدہ ہے۔

(۲) تصوف یونانی فلسفہ کی اس شاخ پر مبنی ہے۔ جسے نوافلاطونی اشراقیت کہتے ہیں اور جو فلاطینوس سے منسوب ہے۔ پروفیسر نکلسن کا میلان کم و بیش اسی نظریہ کی طرف ہے۔

(۳) تصوف ویدانت کے فلسفے اور بدھ کی تعلیمات کو اپنی اساس قرار دیتا ہے۔

(۴) تصوف ایران قدیم کے مفکر مانی اور اس کے پیروؤں کی تعلیمات کا ثمر ہے۔ ان لوگوں نے ریاضت (تپسیا) اور ترک دنیا کو متصوفانہ عقائد کا لباس پہنا دیا اور انھیں اسلامی عقائد کا جزو بنانا چاہا۔ اس نظریہ کے حامی یہ کہتے ہیں کہ ایران کے لوگ تسخیر ایران کے بعد اگرچہ مشرف بہ اسلام ہو گئے (بالعموم) لیکن ان کا دماغ آریائی رہا اور ان کے سوچنے کے طریقے بھی ان کی دماغی ساخت کے مطابق ارتقا پاتے رہے۔ ایرانی دماغ کہ اصلاً آریائی ہے وحدتِ صرف یا وحدتِ محض کے تصور

ے نفور ہے اور غالباً اس چیز کا تعقل ہی نہیں کر سکتا، اس لیے جب تک عقائد میں دوئی کی کوئی نہ کوئی شکل موجود نہ ہو اور حقیقت کو مجاز کا رنگ نہ دیا جائے اسے تسکین نہیں ہوتی، عجمی تصوف میں بہت سے عناصر ایسے ہیں جو اس نظریے کے مؤید ہیں۔ علامہ اقبال نے ان عناصر کے خلاف مدت العمر جہاد کیا اگرچہ وہ خود بھی یہی فرماتے تھے کہ:

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

(۵) تصوف مسیحیت کے بعض عقائد پر اپنی بنیاد رکھتا ہے۔[۱]

حقیقت یہ ہے کہ عجمی تصوف بہت سے عقائد و افکار کے اجتماع اور شیر و شکر ہو جانے کا نام ہے۔ زہد، تپسیا، عبادت، فقر، ترکِ تعلقاتِ دنیوی یقیناً بدھ کی تعلیمات اور مسیحی عقائد کی یاد دلاتے ہیں۔ پیرِ مغاں کہ حقیقت اور مجاز کے درمیان واسطہ ہوتا ہے اور اس کا حکم مرید کے لیے واجب الاذعان ہوتا ہے۔ برہمن کی یاد دلاتا ہے۔ ریاضتِ شاقہ اور تیاگ جو عجمی صوفیوں کے بعض گروہوں کی خصوصیت ہے، ہندوستان کے جوگیوں کی ریاضت سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ یونانی فلسفہ اور اسماعیلیہ مصر کی تعلیمات نے بھی عجمی تصوف کو متاثر کیا ہے لیکن ان تمام عناصر کے اختلاط سے جو چیز تصوف کی وحدتِ فکری بن کر عالمِ وجود میں آئی وہ خالص ہی ہے اور کسی ایک عنصر کو عجمی تصوف کا اصلی مبدا، اور منشا قرار دیا جا سکتا ہے۔

تصوف کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ حقیقت کا علم حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں ایک تو

---

[۱] وحدتِ محض کے سلسلے میں یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی وحدت سے وحدتِ عددی مراد نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ عدد ایک تکرار سے ہزار بن سکتا ہے اور یہ وحدت بسیط کے تصور کے مخالف ہے اسی طرح وحدتِ بسیط سے وحدت تناسب بھی مراد نہیں۔ راگ راگنیوں میں مختلف سروں کے تال میل سے ایک وحدتِ تناسب پیدا ہوتی ہے جو دوسری وحدتوں سے پہچانی جاتی ہے۔ خدا کی وحدت بسیط یہ وحدت تناسب بھی نہیں ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وحدت بسیط کا تعقل کرنا کس قدر دشوار ہے۔

یہ کہ حواس خمسہ ظاہری سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ان پر استقرار اور استخراج کا عمل کیا جائے اور پھر وجودِ باری تعالیٰ، تخلیقِ کائنات، غایتِ انسانیت اور منصبِ حیات پر غور کیا جائے یہ عقل کا طریقہ ہے یعنی عقل استدلالی یا عقل جزئی کا یا فہم و ادراک کا۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ حسِ باطنی سے کام لیا جائے اور اس کے ذریعہ جو معلومات حاصل ہوتی ہیں یا کشف ہوتی ہیں ان پر استقرار یا استخراج کا عمل کیا جائے۔ کشفِ حقیقت کا وسیلہ یا مرکز دل ہے۔ حسِ باطنی کا مصدر بھی دل ہی ہے اس لئے جب تک مجلیٰ نہ ہوگا کشف و شہود کی نعمت سے بہرہ یاب نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ صوفی اس بات پر بڑا زور دیتے ہیں کہ سالک کے لئے بڑا ضروری ہے کہ دل کو معلومات سے اور ادراک سے بالکل خالی کر دے (حواسِ خمسہ ظاہری) اور حواسِ خمسہ باطنی سے کام لے۔

اصل حقیقت صرف وجودِ باری تعالیٰ ہے۔ کائنات و موجودات اضافی اور اعتباری ہیں۔ سلوک کی راہ طے کرنے میں صوفی جن احوال و مقامات سے گذرتا ہے۔ ان کی تفصیل احوال و مقامات میں دیکھئے۔

عشقِ مجازی میں عاشق اپنے محبوب کا بندۂ فرمان ہوتا ہے صوفی بھی ہر حالت میں محبوب حقیقی کی رضا کا طالب ہوتا ہے۔ اس لئے اصطلاح میں صوفی کو عاشق اور رند کہتے ہیں اور باری تعالیٰ کو محبوب اور معشوق۔ دل کو آئینہ اور ساغرِ جم کہتے ہیں۔ صوفیوں کا حلقۂ ذکر خرابات کہلاتا ہے اسی اعتبار سے صوفی پیمانہ کش اور خرابات نشیں ہوتے ہیں۔ صوفی جو خدا کی رضا کا طالب ہوتا ہے تو اس مقام کی تشریح کے لئے یوں کہا جاتا ہے (استدلال میں منطقی مغالطہ موجود ہے جو غور کر لینے سے ظاہر ہوگا) دنیا میں وہ ہوتا ہے جو خدا چاہتا ہے، صوفی وہی چاہتا ہے جو خدا چاہتا ہے، اس لئے دنیا میں وہی ہوتا ہے جو صوفی چاہتا ہے۔"

ابو سعید ابو الخیر کے ہاں تصوف کے تمام بنیادی مطالب بیش و کم نہایت شیریں انداز

میں بیان کیے گئے ہیں۔ ان کے کلام میں بے پناہ خلوص ہے۔ جو چھپائے نہیں چھپتا اور انداز میں ایسی شیرینی، رس، لوچ اور حلاوت ہے کہ صوفی شعرا میں کوئی ان تک نہیں پہنچا۔ انھوں نے سب سے پہلے تغزل کی زبان میں تصوف کے مطالب بیان کیے ہیں یعنی مذہبی واردات کو عاشقانہ کیفیات کے سانچے میں ایسا ڈھالا ہے کہ جو صوفی نہیں وہ بھی بڑے شوق سے ان کی رباعیات پڑھتے ہیں۔ حافظ نے دراصل ابوالخیر ہی کے اسلوب سے متاثر ہو کر شعر میں وہ دورُخا پن اختیار کیا تھا جس کی بنا پر اس کے اشعار کی تاویل و تفسیر میں شدید اختلاف ہے[۵۱]۔

(۴) **احمد شاہ ابدالی:** احمد خاں درانی (احمد شاہ ابدالی)، نادر شاہ کے عہدِ حکومت میں افغان اور ازبک افواج کا سپہ سالار تھا۔ جب نادر شاہ کو ہلاک کیا گیا (دیکھیے نادر شاہ) تو احمد شاہ ابدالی نے نادر شاہ کا انتقام لینا چاہا لیکن دوسرے امرا نے مل کر اسے شکست دی اور وہ قندھار کی طرف پیچھے ہٹا۔ یہاں اس نے درانی خاندان کی بنیاد رکھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ ایک قافلہ دہلی کے لوٹے ہوئے مال و اسباب سے لدا پھندا ایران کی طرف جا رہا تھا۔ احمد شاہ نے حملہ کر کے سب مال و اسباب لوٹ لیا۔ جو چیزیں ہاتھ آئیں ان میں مشہور ہیرا کوہ نور بھی تھا۔ اب جو اس کے ہاتھ روپیہ لگا تو اس نے فوجی طاقت کو منظم کیا اور آہستہ آہستہ پورے افغانستان کو مسخر کر لیا۔ مشہد بھی اس کے مقبوضات کا جزو بن گیا۔ سٹینلے لین پول لکھتا ہے کہ ہرات اور خراسان کی تسخیر کے بعد احمد شاہ ابدالی نے کشمیر، سندھ اور پنجاب کے ایک حصہ کو بھی اپنی سلطنت کا ایک جزو بنا لیا۔ لیکن ان علاقوں میں درانیوں کے قدم جمے نہیں اور سکھوں نے آہستہ آہستہ پنجاب

---

[۵۱] تاریخ ادبیاتِ ایران: سلیم نیساری۔
تاریخ تصوف در ایران: محمد معین۔
سبک شناسی: بہار (جلد دوم)۔
کشف المحجوب: ہجویری۔
تاریخ ادبیاتِ ایران: شفق۔
تاریخ ادبیات ایران: براؤن (جلد دوم)۔
لغاتِ ماخذ الفاظ شپلے (نیو یارک)۔
نفحات الانس: جامی۔

میں اور مختلف علاقوں میں اپنے پاؤں جمانے شروع کیے۔ البتہ احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر جو یورشیں کی تھیں ان کا یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ ہندوستان میں مرہٹوں کی طاقت پانی پت کی تیسری لڑائی میں بالکل ٹوٹ گئی۔[۱]

(۵) ادعونی: اشارہ ہے سورۂ مومن کی اس آیت کی طرف۔

وَقَالَ رَبُّکُمُ ادْعُونِی .... جَهَنَّمَ دَاخِرِین ۴۰/۶۰

ترجمہ حسب ذیل ہے

"اور (اے لوگو) تمہارے پروردگار نے فرمایا ہے کہ مجھ سے دعا مانگو میں تمہاری دعا قبول کروں گا، بے شک جو لوگ میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں عنقریب وہ لوگ جہنم میں ذلیل ہو کر داخل ہوں گے۔"

(۶) ازہ (حضرت زکریا علیہ السلام): حضرت زکریا علیہ السلام بنو اسرائیل سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے معزز کاہن بھی تھے۔ لوقا کی انجیل میں بھی ان کے لئے کاہن کا کلمہ استعمال کیا گیا ہے۔ حضرت زکریا حضرت داؤد کی اولاد میں سے تھے اور ان کی زوجہ حضرت ہارون کی ذریت میں سے تھیں۔ باقی انبیا کی طرح آپ بھی اپنی روزی کماتے تھے اور اس سلسلہ میں نجاری کا پیشہ اختیار کیا تھا۔ انھیں کے خاندان میں حضرت مریم تھیں اور وہی ان کے کفیل تھے۔ حضرت زکریا کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ ان کی بیوی بانجھ تھیں۔ انھوں نے دعا مانگی کہ اے خدا مجھے پاک اولاد عطا فرما۔ دعا مانگ چکے تو ایک فرشتہ ظاہر ہوا اور اس نے بشارت دی کہ آپ کے ہاں ایک

---

[۱] مختصر تاریخ ہند: مورلینڈ۔ چٹرجی — تاریخ ایران: سائیکس (جلد دوم)
طبقات سلاطین اسلام: سٹینلے لین پول، ترجمہ عباس اقبال
استدراک: درانی خاندان نے ۱۷۴۷ء سے ۱۸۴۲ء تک حکومت کی (۱۱۶۰ھ تا ۱۲۵۷ھ)۔ احمد شاہ ابدالی ۱۷۴۷ء میں تخت نشین ہوا اور ۱۷۷۳ء میں وفات پائی۔

بیٹا پیدا ہوگا۔ مولانا حفظ الرحمٰن بیان کرتے ہیں کہ مصدقہ واقعات وہی ہیں جو اوپر درج کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اساطیر ہیں یا بنو اسرائیل کی روایات۔ عام ادبی تلمیح یہ ہے کہ حضرت زکریا کو آرہ سے چیر دیا گیا تھا چنانچہ وحید الدین سلیم نے مضمون تلمیحات میں بتوضیح یہ بات کہی ہے اور علامہ نے بھی مشہور ادبی تلمیح کو ملحوظ رکھا ہے۔[۵]

(۷) **افرنگین**: سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ مغربی تہذیب اور ثقافت مراد ہے۔ یہی افرنگین اس نوجوان سے گفتگو کرتی ہے جو سیماب میں تا کمر غرق ہے اور مسلسل نالہ و فریاد کر رہا ہے۔ یہ نوجوان (استخوانِ آں جوان در تن شکست) یہودا اسقروطی ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا حواری تھا اور جس نے ان سے غداری کی تھی اور اشارہ سے ان کی نشان دہی کرکے ان کو گرفتار کرا دیا تھا۔ انگریزی میں Judas کا کلمہ غداری کی علامت بن گیا۔ یوحنا میں اس واقعہ کی تفصیلات مندرج ہیں (نیا عہد نامہ) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انجیلوں کے بیان کے مطابق یہودیوں نے شروع ہی سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف سازشیں شروع کردی تھیں اور آخر یہ طے پایا تھا کہ حاکمِ وقت کو اتنا اشتعال دلایا جائے کہ وہ انہیں سخت سے سخت سزا دینے پر مجبور ہو جائے۔ یہودی قیصر روم کے نائب پلاطیس یا فلاطوس کے پاس گئے اور کہا کہ خدشہ ہے کہ حضرت عیسیٰ عوام کو گمراہ کرکے یا شعبدے دکھا کے خود بادشاہ بن جائیں۔ فلاطوس نے ان کی گرفتاری کی اجازت دی۔ آخر اسقروطی کی نشاندہی پر انہیں گرفتار کرلیا گیا۔ فلاطوس انہیں سزا دینا نہیں چاہتا تھا لیکن بنو اسرائیل کے سرداروں نے اسے مجبور کیا اور آخر فلاطوس نے حکم دیا کہ انہیں مصلوب کردیا جائے۔ مولانا حفظ الرحمٰن نے قصص القرآن میں قرآن مجید کی آیات نقل کی ہیں اور بتایا ہے کہ خدا آپ فرماتا ہے:

---

[۱] قصص القرآن (حصہ دوم) مولانا حفظ الرحمٰن۔ دہلی۔ افادات سلیم مضمون تلمیحات: وحید الدین سلیم۔

"اے عیسیٰ بے شبہ میں تیری مدت کو پورا کروں گا اور تجھے اپنی جانب اٹھا لینے والا ہوں"

مولانا حفظ الرحمٰن لکھتے ہیں کہ اب جب کہ حضرت عیسیٰ کو یہ اطمینان دلا دیا گیا تھا کہ سخت محاصرہ کے باوجود دشمن نہ تو انھیں ہلاک کر سکیں بلکہ غیبی ہاتھ انھیں ملائے اعلیٰ کو اٹھالے گا اور اس طرح دشمنوں کے ناپاک ہاتھوں سے آپ محفوظ کردیے جائیں گے تو اس جگہ پہنچ کر ایک دوسرا سوال پیدا ہوا کہ یہ کیوں کر ہوا اور واقعہ نے کیوں کر یہ شکل اختیار کرلی کہ یہودی کہتے ہیں کہ مسیح کو سولی پر لٹکا دیا گیا اور مار دیا گیا۔ تب قرآن نے بتایا کہ مسیح بن مریم علیہ السلام کے مقتول صلیب ہونے کی داستان سرتاسر جھوٹ اور غلط ہے بلکہ اصل معاملہ یہ ہے کہ جب مسیح علیہ السلام کو بقید حیات ملائے اعلیٰ کی جانب اٹھا لیا گیا اور اس کے بعد دشمن مکان کے اندر گھس پڑے تو ان پر صورتِ حال مشتبہ کردی گئی اور وہ یہ نہ جان سکے کہ آخر اس بند مقام سے مسیح علیہ السلام کیسے باہر چلے گئے۔

بہر حال یہاں علامہ نے انجیل کے بیانات کو ملحوظ رکھا ہے اور یہودا اسقروطی کی غداری کا ذکر بھی اسی سلسلہ میں کیا ہے۔ یوحنا کا حوالہ یہ ہے، باب ۱۳، آیات ۲۱-۲۷ متعلقہ الفاظ یہ ہیں:

"یسوع نے جواب دیا کہ جسے میں نوالہ ڈبو کر دے دوں گا وہی (یعنی وہی مجھے گرفتار کرادے گا، پھر اس نے نوالہ ڈبو دیا اور لے کر شمعون اسکریوتی کے بیٹے یہوداہ کو دیدیا اور اس نوالہ کے بعد شیطان اس میں سما گیا۔"[۵]

(۸) **الا بسلطان**: اشارہ ہے سورہ رحمٰن کی اس آیت کی طرف:

یامعشر الجن والانس ان ستطعتم ان تنفذو من اقطار السموات

---

۵ قصص القرآن (جلد چہارم)، مولانا حفظ الرحمٰن (ندوۃ المصنفین دہلی)۔

والارض فانفذو لا تنفذون الا بسلطان۔ ۵۵/۳۳

ترجمہ حسب ذیل ہے:

اے جن وانس کے گروہ اگر تم (ہماری حدود سلطنت یعنی) آسمانوں اور زمین کے کناروں سے باہر چلے جانے کی طاقت رکھتے ہو تو نکل جاؤ (مگر اتنا سمجھ لو کہ) بغیر قوت کے تم باہر نہیں جا سکتے۔

(۹) **الارض للہ** اس کا معنی یہ ہے کہ زمین خدا ہی کی ہے۔ اس مرحلہ پر علامہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ جہاں پر معیشت کا دارومدار زیادہ تر زرعی ہوتا ہے۔ وہاں جس طبقہ پر زیادہ ظلم ہوتا ہے وہ کاشتکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دولتِ اشتراکیہ روس نے زمین کو قومی ملکیت قرار دے کر دولت کاشتکاروں کی ضروریات کے مطابق تقسیم کی ہے (استثنائی صورتیں قائم ہیں) علامہ نے بھی بار بار یہ کہا ہے کہ زمین اور زمین سے جو کچھ پیدا ہوتا ہے وہ خدا ہی کا ہے اور اللہ کے بندوں کا اس پر یکساں حق ہے۔ اس اعتبار سے اشتراکیت کی تعلیمات اور قرآنی تعلیمات میں مشابہت پائی جاتی ہے۔ خود علامہ نے کہا ہے کہ اشتراکیت اگر خدا کے وجود سے منکر نہ ہو تو اسلام کے بہت قریب آجاتی ہے۔[1]

(۱۰) **الاسلام جاء غریب**: یہاں علامہ وطنیت کے اسلامی تصور کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اور یہ بتا رہے ہیں کہ اسلامی وطنیت نسل یا رنگ سے تعلق نہیں رکھتی اس کے لئے دیکھئے وطنیت تلمیحاتِ بانگ درا۔

(۱۱) **الہ الوصل**: ہو سکتا ہے کہ عشق ومحبت کے دیوتا کیوپڑ یا کامدیو کی طرف اشارہ ہو لیکن تحقیق سے نہیں کہا جا سکتا۔

---

[1] مکاتیبِ اقبال۔

(۱۱) آں ز ایراں بود و ایں ہندی نژاد — آں ز حج بیگانہ و ایں از جہاد

اس شعر میں دو افراد کی طرف اشارہ ہے۔ "آں ز ایراں" سے مراد مرزا علی محمد باب ہے۔ (دیکھیے باب)، "و ایں ہندی نژاد" سے مراد مرزا غلام احمد قادیانی ہیں۔ مرزا صاحب کی ولادت ۱۸۳۹ء یا ۱۸۴۰ء میں ہوئی۔ انھوں نے بہت سے دعوے کیے۔ مثلاً یہ کہ میں امام آخر الزمان ہوں، مسیح موعود ہوں، رسول ہوں (یا کم از کم نبی ہوں اور میری نبوت ظلی ہے) اسی طرح انھوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ مجھے بہت سے الہام ہوئے ہیں۔ بہر حال یہاں علامہ جس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ مرزا صاحب نے اپنے فرقہ کے مصالح کو مدنظر رکھ کر انہیں جہاد سے روک دیا تھا۔ وہ اپنی تصانیف میں بھی اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ میں نے سرکارِ انگریزی کی بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ قادیانیت کی تحریک کے متعلق اردو میں بے شمار کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ہم کچھ کتابوں کے حوالے دیں گے جنھیں تفصیل سے اس تحریک کے مدوجزر کے مطالعہ کا اشتیاق ہو وہ ان ماخذوں سے استفادہ کریں۔

تاریخِ وفات ۱۹۰۸ء ہے۔[۱]

(۱۲) انقلابِ المان: پہلی جنگِ عظیم کے بعد جب بڑی بڑی طاقتوں نے جرمنی کی قسمت کا فیصلہ کیا تو کچھ عرصہ تک وہاں جمہوری نظام کی ایک صورت قائم رہی۔ ۱۹۳۳ء میں رائن لینڈ پر پھر جرمنی کا قبضہ ہو گیا۔ جرمن سیاست داں یہ چاہتے تھے کہ صلحنامہ وارسائے پر نظرِ ثانی کی جائے۔

---

[۱] قادیانی مذہب: محمد الیاس برنی۔ — قادیانی قول و فعل: محمد الیاس برنی۔
آئینۂ تلبیس: رفیق دلاوری۔ ابو القاسم۔ جیلانی الیکٹرک پریس لاہور ۱۹۱۰ء۔
رئیسِ قادیان: تالیف ابو القاسم رفیق دلاوری لاہور۔ — ڈاکٹر اقبال کے متفرق مضامین اور مکاتیب۔
بشارتِ احمد: سید بشارت احمد (اس میں مرزا غلام احمد کے پیرووں کا نقطۂ نظر ہے)۔

جب ۱۹۳۰ء میں یورپ کا اقتصادی نظام اور قوام بگڑا تو جرمنی میں وہ تحریک ابھری جسے ملی اشتراکیت کہتے ہیں ۔ نازی اپنے عقائد کی تبلیغ کرنے لگے اور آخر ہینڈن برگ نے ہٹلر کو جو نئی تحریک کا سرگروہ تھا وزیرِ اعظم مقرر کر دیا ۔ اسی نے جمہوری نظام کو پارہ پارہ کر دیا اور جرمنی میں آمریت قائم کی ۔ جن دنوں جاوید نامہ لکھا گیا ہے، اُن دنوں معلوم ہو رہا تھا کہ ہٹلر کا کوکبِ اقبال عروج کی منزلیں طے کر رہا ہے اور جرمنی میں اس انقلاب کے آثار پیدا ہو رہے تھے ۔ جو بعد میں دوسری جنگ عظیم کا سبب بنا ۔ علامہ اسی انقلاب کی طرف اشارہ کر رہے ہیں[۱]۔

(۱۴) ان کنت ازمعت الفراق : امراء القیس کے ایک شعر کا ٹکڑا ہے جس کے معنی ہیں کہ اگر تو نے جدائی کا ارادہ کر ہی لیا ہے تو کچھ مہلت دے ۔

امراء القیس وارداتِ عاشقی کو بہت اچھا بیان کرتا ہے ۔ اس کی شاعری میں فحاشی کا عنصر بھی خاصا ہے ۔ شمس العلما مولانا امداد امام[۲] اثر نے اس کے اشعار کے حسن و قبح سے بہت اچھی بحث کی ہے اور اسی سلسلہ میں یہ بحث بھی آ گئی ہے کہ کیا شاعر کو اخلاقی اقدار سے بے نیازی برتنا جائز ہے ؟

(۱۵) انھم اعجاز نخل خاویہ : سورۂ الحاقہ کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے :

سخرها عليهم سبع ليال وثمنية ايام حسوما
فترى القوم فيها صرعى كانهم اعجاز نخل خاوية ۶۹/۵–۸

اس آیت کا مطلب یہ ہے :

جس کو اللہ نے ان پر سات شب اور آٹھ روز مسلط رکھا جو ان کے حق میں بہت

---

[۱] قاموسِ سیاسیات عالم (انگریزی) ۔

[۲] کاشف الحقائق معروف بہ بہارستان سخن (جلد اول)، مصنفہ سید امداد امام اثر (جنوری ۱۹۵۶ء لاہور)

منحوس تھی۔ پس (اے نبی اگر تم وہاں ہوتے تو) لوگوں کو کھوکھلے درخت خرما کے تنہ کی طرح گرا ہوا دیکھتے۔"

اس مرحلہ پر قوم عاد و ثمود کے تباہ ہونے کا بیان ہو رہا ہے جن پر عذاب الٰہی نازل ہوا تھا۔ قوموں کی تباہی کی طرف قرآن مجید میں جہاں اشارات ملتے ہیں وہاں پہلے ان اجتماعی برائیوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جو تباہی کا باعث بنی تھیں تاکہ مسلمان عبرت حاصل کریں اور اس تباہی سے بچیں کہ نظام معاشرت میں فساد یا خلل پیدا ہو جائے تو بڑی مشکل سے رفع ہوتا ہے علامہ بھی مسلمانوں میں ملی اور اجتماعی شعور بیدار کرنا چاہتے تھے لیکن اس پر ابوجہل کی روح نے اس آیت کے الفاظ کے ذریعہ اپنی تمنا کا اظہار کیا ہے کہ کاش مسلمان عاد و ثمود کی طرح مٹ جائیں انگریزی محاورہ ہے کہ شیطان انجیل کے حوالے دے رہا ہے یہاں بھی وہی صورت کم و بیش پیش آئی ہے کہ ابوجہل قرآن مجید کی آیات پڑھتا ہے۔

(۱۶) انی جاعل : قرآن مجید کی آیات کی تفصیل یہ ہے $\frac{۲}{۳۱-۲۷}$

یہ وہی مقام ہے جہاں رب باری تعالیٰ انسان کو خلیفۃ الارض مقرر کرنے کی بشارت دیتا ہے اور فرشتے یہ کہتے ہیں کہ انسان زمین پر فساد پھیلائے گا اور خدا ارشاد فرماتا ہے کہ جو ہم جانتے ہیں تم نہیں جانتے۔ اس موقع پر معلوم ہوتا ہے کہ آدم علم الاسماء کے رموز سے آگاہ تھا۔ قیاس چاہتا ہے کہ اس سے مراد اشیا کا تعقل اور تصور ہو اور اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ انسان اشیاء کی ماہیت سے واقف ہو کر ان سے حسب دل خواہ کام لے گا کہ کائنات رو بہ ترقی ہو۔

یہ مقام بڑا پر اسرار ہے اور اردو فارسی کی ادبی تلمیحات میں اس قصہ کی طرف بڑے دلفریب اشارے ملتے ہیں۔ خود علامہ فرماتے ہیں

سختیاں کرتا ہوں دل پر غیر سے غافل ہوں میں ہائے کیا اچھی کہی ظالم ہوں میں جاہل ہوں میں

ذوق کہتا ہے:

بنایا آدمی کو ذوق ایک جزو ضعیف
اور اس ضعیف سے کل کام دو جہاں کے لئے

فارسی کا مشہور شعر ہے

آسماں بار امانت نتوانست کشید
قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

صاحبِ اخلاق جلالی نے انسان اور فرشتہ کا مقابلہ کرتے ہوئے بعض بڑی بلیغ باتیں بیان کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ انسان فرشتوں سے افضل ہے اور فرشتے انسان سے اشرف ہیں۔ ان کے نزدیک اشرف ہونے کا مدار قرب الٰہی پر ہے اور افضل ہونے کا انحصار اس پر ہے کہ انسان گناہ کی استعداد رکھنے کے باوصف اپنے نفس پر قابو پاتا ہے، اور بڑی محنت سے روٹی کماتا ہے۔ فرشتے معصوم ہیں امکان ہی نہیں کہ ان سے گناہ سرزد ہو لیکن انسان اس اعتبار سے افضل ہے کہ وہ نفس دنی کو مسخر کرتا ہے جیسا کہ رسول پاک نے فرمایا تھا کہ جو شیطان میرے اندر تھا میں نے اسے مسلمان کرلیا۔ (یہ روایت مشہور ہے) خلافت آدم ہی کے سلسلہ میں ابلیس کا انکار اور متعلقہ مسائل پیدا ہو جاتے ہیں جو بڑے دلچسپ اور عبرت آموز ہیں۔ ان سے جلد ہی بحث ہو چکی ہے۔ علامہ نے یہ بات کئی بار بصراحت کہی ہے کہ حیات کی غایت ہی یہی ہے کہ انسان تسخیر کائنات کا فریضہ پورا کرے کہ دنیا میں ہر چیز اسی مقصد کے لئے خلق کی گئی ہے اور کام کر رہی ہے وہ فرماتے ہیں:

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

جو شخص نفس و آفاق کو مسخر کرے علامہ اسے اپنی اصطلاح میں مومن، قلندر اور درویش کہتے ہیں۔[1]

(۱۷) اہلِ خطہ: اہلِ خطہ سے مراد اہلِ کشمیر ہیں اور کم و بیش سبھی جانتے ہیں کہ علامہ مرحوم کشمیری پنڈتوں کے خاندان سے متعلق تھے۔ وہ خود اپنے اشعار میں اسی اعتبار سے اپنے آپ کو برہمن زاد کہتے ہیں۔

محمد عبداللہ قریشی صاحب نے "حیاتِ اقبال کی گم شدہ کڑیاں" کے عنوان سے جو مضامین لکھے ہیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کو شروع ہی سے کشمیری مسلمانوں کی بہبود کا خیال تھا۔ چنانچہ وہ ابھی گورنمنٹ کالج لاہور میں طالب علمی کا زمانہ بسر کر رہے تھے کہ وہ انجمن کشمیری مسلمانان کے ایک سرگرم رکن ہو گئے۔ یہ انجمن لاہور کی کشمیری برادری کے اکابر نے قائم کی تھی۔ اور اس کا مقصد یہ تھا کہ کشمیری مسلمانوں کی بہبود و فلاح کے سلسلہ میں جو کچھ کام ہو سکتا ہے وہ کیا جائے۔ اس انجمن میں علامہ اقبال نے ایک نظم بھی پڑھی تھی جو مارچ ۱۹۰۹ء کے کشمیری میگزین میں شائع ہوئی (یہ نظم ان کی مطبوعہ کلیات میں شامل نہیں) عبداللہ قریشی صاحب نے اس بات کا سراغ دیا ہے کہ علامہ کے اشعار کشمیری گزٹ لاہور میں بھی شائع ہوتے تھے جب علامہ اورینٹل کالج میں لکچرار مقرر ہوئے تو انھیں انجمنِ کشمیری مسلمانان کا سکریٹری منتخب کر لیا گیا۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ کو شروع ہی سے اپنے وطن کی بہبود کا خیال تھا۔ بانگ درا سے لے کے ارمغانِ حجاز تک ہر تالیف میں اس قسم کے اشعار ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کشمیری مسلمانوں کی فلاح انھیں کتنی عزیز تھی۔

---

[1] ابلیس و آدم: غلام محمد یحییٰ ویز۔

اخلاقِ جلالی: نول کشور مطبوعہ ۱۹۱۶ء لکھنؤ۔

خطبات: علامہ اقبال (انگریزی۔ مدراس)۔

جاوید نامہ میں علامہ نے ذرا کھل کے بات کی ہے۔ سید علی ہمدانی اور زندہ رود کے مکالمات میں کشمیری مسلمانوں کی تاریخ کے بہت سے اشارات شامل ہیں۔ ان اشعار کی تشریح مختلف مقامات پر کردی گئی ہے[۱]۔

(۱۸) آیۂ تسخیر: اشارہ ہے سورۂ جاثیہ کی ان آیات کی طرف:

اللہ الذی سخر لکم البحر لتجری الفلک ....

وسخر لکم ما فی السمٰوٰت .... یتفکرون ۔ ۴۵/۱۲-۱۳

ان کا ترجمہ یہ ہے:۔

اللہ وہی ہے جس نے دریا کو تمہارے تابع کر دیا تاکہ اللہ کے حکم سے اس میں کشتیاں چلیں اور تاکہ تم اس کے فضل (یعنی روزی) کی تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو۔ اور اس نے آسمانوں اور زمین میں ہے سب اپنی طرف سے تمہارے تابع کر دیا۔ بے شک ان میں ان لوگوں کے لیے جو غور کرتے ہیں (ہماری قدرت کی) نشانیاں ہیں۔

عظمتِ آدم اور منصبِ انسانیت کی بزرگی کی طرف خدائے کریم نے قرآن پاک میں اشارے بھی کئے ہیں اور بوضاحت بھی بہت سے نکات بیان فرمائے ہیں۔ فارسی، عربی اور اردو ادبیات میں انسان کی عظمت کے متعلق یوں تو بہت اشعار کہے گئے ہیں لیکن سعدی کا یہ شعر اپنی نظیر آپ ہے:

ابر و باد و مہ و خورشید ہمہ در کار اند
تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

---

[۱] محمد عبداللہ قریشی صاحب کے مضامین بعنوان "حیاتِ اقبال کی گمشدہ کڑیاں" مطبوعہ مجلہ اقبال لاہور۔ اقبال اور انجمنِ کشمیری مسلمانان: محمد عبداللہ قریشی۔ مجلہ اقبال (اپریل ۱۹۵۲ء)۔

ذوقؔ نے بھی بڑا اچھا شعر کہا ہے:

بنایا آدمی کو ذوقؔ ایک جزوِ ضعیف

اور اس ضعیف سے کل کام دو جہاں کے لئے

صوفیوں کے ایک گروہ نے نفس انسانی کا نقطۂ عروج ہلاکتِ نفس قرار دیا تھا اور مراد یہ تھی کہ انسان دنیا سے بالکل بے تعلق ہو جائے کہ دنیوی خواہشات اسے متاثر نہ کر سکیں عجمی تصوف کا یہ نظریہ تعلیمات اسلامی کے منافی تھا اور علامہ مرحوم نے تمام عمر اس کے خلاف جہاد کیا اور یہ کہا کہ خودی کا استہلاک مقصودِ اسلام نہیں بلکہ قیودِ شرعی میں رہ کر خودی کا فروغ مقصود ہے یہی وجہ ہے کہ عظمت آدم اور منصب انسانیت کی بلندی کے متعلق علامہ کے ہاں نہایت اچھے اشعار پائے جاتے ہیں۔ اس موقع پر بھی انسان ہی کی عظمت کا ذکر ہو رہا ہے۔

(۱۹) آیہ لا تفسدوا: اشارہ ہے قرآن کی اس آیت کی طرف:

والی مدین اخاھم........ان کنتم مومنین ۷/۸۵

اس کا مطلب یہ ہے:

اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب (کو بھیجا) انھوں نے کہا کہ اے لوگو! خدا ہی کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا اور کوئی معبود نہیں۔ تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی آ چکی ہے تو تم پوری طرح ناپ اور تول کی پابندی کرو اور لوگوں کو چیزیں کم نہ دیا کرو اور زمین میں اصلاح کے بعد خرابی نہ کرو۔ اگر تم صاحبِ ایمان ہو تو سمجھ لو کہ یہ بات تمہارے حق میں بہتر ہے۔

ب

(۱) **برتری ہری:** بھرتری ہری کے متعلق ہماری معلومات اور ان کے ماٰخذ بہت ناقص ہیں۔ جو مشہور روایت اس سے منسوب ہے مستشرقین عموماً اس کی صحت سے منکر ہیں یعنی یہ کہ وہ وکرمادت کا بھائی تھا جو ۵۷ ق م میں ہو گزرا ہے۔ ایک دن یہ بات اس پر ظاہر ہو گئی کہ اس کی بیوی اننگ سینا بے وفا ہے، وہ آشفتگی کی حالت میں تاج و تخت سے دست بردار ہو گیا اور اپنے چھوٹے بھائی وکرمادت کو تخت پر بٹھا گیا۔ خود اس نے جنگلوں کو اپنا مسکن بنا لیا کہتے ہیں کہ اجین میں ابھی تک ایک غار موجود ہے جو بھرتری ہری کی گپھا کہلاتی ہے۔ روایتوں کا بیان یہ بھی ہے کہ اس گپھا سے ایک راستہ (زیر زمینی) بنارس کو جاتا تھا۔ بعض نقاد یہ کہتے ہیں کہ بھرتری ہری کے کلام میں ایسے اشعار پائے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا زمانہ شنکراچاریہ کے بعد کا ہے کیونکہ ان اشعار میں ویدانت کی دقیق تعلیمات کے آثار ملتے ہیں اس کے برخلاف بعض نقاد یہ کہتے ہیں کہ شنکراچاریہ سے پہلے بھی ویدانت کے مفسر موجود تھے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بھرتری ہری کا زمانہ پہلی یا دوسری صدی عیسوی سے متعلق ہے پروفیسر لاسن کا بیان ہے کہ بھرتری ہری نے اپنے اشعار تیسری صدی عیسوی میں کہے ہیں۔ ٹانی نے بھرتری ہری کے اشعار کا ترجمہ شائع کیا ہے اور دیباچہ بھی لکھا ہے کہ یہ بات بھی مشکوک ہے کہ آیا ان اشعار کا مصنف واقعی بھرتری ہری ہے۔ بہر حال یہ مسلّم ہے کہ

(۱) مورخوں اور نقادوں کا رجحان اس طرف ہے کہ یہ اشعار پہلی یا دوسری صدی عیسوی میں تالیف ہوئے ہیں۔

(۲) شاعر اس زمانہ کی درباری زندگی سے بخوبی آگاہ تھا۔

(۳) اشعار میں یہ اشارے موجود ہیں کہ مؤلف نے کسی عورت کے ہاتھوں بہت دکھ پایا ہے۔[۱]

(۳) بہ مقامِ عبدہٗ گہ دو رقیب: عبدہٗ کا کلمہ قرآن مجید میں متعدد بار استعمال ہوا ہے

مثلاً: سورۂ اسریٰ آیت ۱	سورۂ کہف آیت ۱
سورۂ فرقان آیت ۱	سورۂ نجم آیت ۱۱
سورۂ حدید آیت ۹	سورۂ مریم آیت ۱
سورۂ زمر آیت ۳۶	

مگر اس مقام پر سورۂ اسریٰ کی پہلی آیت کی طرف اشارہ ہے۔ قرآن سے متبادر ہوتا ہے کہ یہ واقعۂ معراج کی طرف اشارہ ہے۔

(۳) بعل: یہ بڑا مشہور بت ہے اور شہر بعلبک اسی کے نام سے مشہور ہے۔ قصہ یہ ہے بابلی تین بڑے بڑے دیوتاؤں کے قائل تھے ایک "انو" جو آسمان کا پروردگار تھا۔ دوسرے "بعل" یا "مردوخ" جو زمین یا انسان کا خالق تھا اور تیسرے "ہیا" جو پانی کا خالق تھا اور دانا

---

[۱] Three centuries of Bartari Hari, C. H. Tawney; (Calcutta) 1877.

تمام چیزوں پر متصرف تھا جو زمین میں ہیں۔ یہ تینوں دیوتا دیویوں سے بیاہے ہوئے تھے اور انتظام کائنات میں ان سے مدد لیتے تھے چنانچہ انو کی بیوی اینتو تھی اور بعل کی بعلیتو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں بعل کشتکاری سے تعلق رکھتا تھا۔ آہستہ آہستہ سورج اور بادل بھی اسی کے تصرف میں آگئے۔ پھر انسان کا خالق بھی یہی قرار پایا۔ بعل کے ماتحت جو چھوٹے دیوی دیوتا تھے ان میں ناہید کا رتبہ بہت بلند تھا۔ یہ وہی زہرہ ہے۔ رفتہ رفتہ بعل کا مقام بلند تر ہوتا چلا گیا۔ تمام دیوی دیوتاؤں کی صفات اس میں مرتکز ہو گئیں یہودی اسی خدا کو یہوداہ کہنے لگے اور رومیوں کے ہاں یہی دیوتا جوپیٹر، ڈیوپیٹر قرار پایا (قیاس چاہتا ہے کہ جوپیٹر میں جو یہ جوڑ ہوا اور پیٹر، پدر، پتر کے معنی باپ کے ہوں۔ جیو، دیوہی کی ایک شکل معلوم ہوتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصل کلمہ دیو پتر ہے یا دیو پتر) بتدریج بعل کی پرستش عربوں تک جا پہنچی۔ صدرالدین لکھتے ہیں کہ بعل کے لغوی معنی شوہر کے ہیں۔ یہ بت تمام دیوی دیوتاؤں پر تفوق رکھتا ہے اس لیے اس کا نام شوہر ہے۔[۲]

Charles Seltman, Twelve Olympian. [۱] قصص قرآن: صدرالدین بلاغی

ت

(۱) تانہ بینی از مقامِ ما رمیت ؛ آیتِ قرآنی کی طرف اشارہ ہے۔ حوالہ یہ ہے ۸/۱۷
آیت حسب ذیل ہے

فلم تقتلوھم ولٰکن اللہ .... سمیع العلیم

ترجمہ یہ ہے:

تم لوگوں نے ان (کفار) کو قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے انھیں قتل کیا اور (اے محمد) جس وقت تم نے کنکریاں پھینکیں تھیں وہ تم نے نہیں پھینکیں تھیں بلکہ اللہ نے پھینکیں تھیں۔ اس سے یہ غرض تھی کہ مومنوں کو اپنے (احسانوں) سے اچھی طرح آزمائیں۔ بے شک خدا سنتا اور جانتا ہے

اس آیت میں خدا یہ بتانا چاہتا ہے کہ جو بندہ واقعی مقام عبدہ تک پہنچ جاتا ہے یعنی ہر معنی میں خدا کا مطیع و فرماں بردار ہو جاتا ہے، اللہ بھی ہر مرحلہ پر اس کی مدد کرتا ہے جس طرح غزوہ احد میں توفیقِ الٰہی رسول پاکؐ کے شامل حال ہو گئی تھی۔

ج

(۱) **جمال الدین افغانی:** سید جمال الدین افغانی، افغانستان کے مشرقی اطراف میں کنڑ کے نواح میں اسد آباد کے مقام پر متولد ہوئے۔ تاریخ ولادت کے متعلق کچھ اختلاف ہے غلام رسول مہر ۱۸۳۶ء متعین کرتے ہیں اور قاضی محمد عبد الغفار ۱۸۳۹ء سید صاحب کے والد محترم سید صفدر عالم باعمل تھے جب جمال الدین کی عمر آٹھ برس کی تھی تو ان کے والد کو کابل بلایا گیا۔ جہاں دوست محمد مسند آرائے حکومت تھے۔ وہیں انھوں نے تحصیل علم کی۔ والد کی وفات کے بعد سید جمال الدین نے کچھ عرصہ تحصیل علم میں صرف کیا پھر حج کا ارادہ کیا اور ہندوستان سے گزرے یہ وہ زمانہ تھا جب ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی اپنے نقطہ عروج کو پہنچی ہوئی تھی۔

جب سید صاحب حج سے واپس آئے تو معلوم ہوا کہ ان کے خلاف سازشیں ہونے لگی ہیں۔ چنانچہ وہ ہندوستان چلے آئے اور ۱۸۶۹ء میں یہاں سے بھی آگے نکل گئے اور مصر پہنچے۔ اس زمانے میں انگریز مصر کے استعمار میں مصروف تھے۔ سید صاحب نے جامعہ ازہر میں تعلیم کا

ڈھنگ ایسا رکھا کہ انگریزوں نے تاڑ لیا کہ انھیں مصر سے نکالنا ضروری ہے ورنہ مصریوں کے جذبۂ حریت کو بیدار کردیں گے۔ آخر انگریز اپنے ارادوں میں کامیاب ہوئے اور ایک بہانہ رکھ کر سید صاحب کو مصر سے خارج البلد کردیا۔ مصر سے آپ ترکی پہنچے، وہاں بھی دشمنوں نے چین نہ لینے دیا پھر مصر آئے۔ اب کے چھ سات سال یہاں رہے اور نوجوانوں میں وہ جذبہ پیدا کیا جسے آخر کار مصر کی آزادی کے حصول میں کام آنا تھا۔ انگریز بھی غافل نہ تھے۔ سات سال کے بعد انھوں نے سید صاحب کو پھر مصر سے نکال دیا۔ اب کے وہ ہندوستان آئے اور حیدرآباد ٹھہرے پھر امریکہ گئے، پیرس پہنچے، وہاں مصر کے مشہور عالم شیخ محمد عبدہٗ بھی ان کے رفیق کار ہو گئے۔ اسی زمانہ میں سید صاحب نے شعوری طور پر مسلمانوں کو اس بات کا احساس دلایا کہ انھیں متحد ہو کر مغربی قوموں کی استعمار پسندی اور ملوکیت کے خلاف محاذ قائم کرنا چاہیے۔ اس تحریک کو اہلِ مغرب نے پین اسلامزم یا اتحادِ اسلامی کی تحریک کا نام دیا۔

سید صاحب اب پیرس سے نکل کر ایران گئے۔ وہاں بھی سید صاحب نے اصلاحات نافذ کرنی چاہیں تو اربابِ غرض نے انھیں نکلوا دیا۔ اس کے بعد وہ پھر استنبول پہنچے، اس زمانہ میں عبدالحمید خاں ترکی کا فرماں روا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ ترکی پھر ممالکِ اسلامیہ کی عقیدت کا مرکز و محور بن جائیں اسی سلسلہ میں وہ سید صاحب سے کام لینا چاہتا تھا۔

۱۸۹۷ء میں ۹ مارچ کو سید صاحب نے وفات پائی اور استنبول ہی میں وہ دفن ہوئے لیکن چالیس بنیتالیس سال گذرنے کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ ان کی میت افغانستان پہنچائی جائے۔ چنانچہ اب ان کا مزار کابل میں ہے۔

عبدالغفار لکھتے ہیں۔ انیسویں صدی کے بعد سے افغانستان کے علاوہ مصر اور ترکی میں بھی دستوری حکومت کے خیالات کی اشاعت کے خیال میں ان کا بڑا حصہ تھا۔ آپ تمام

عالم کے مسلمانوں کی تنظیم کے بڑے خواہاں تھے۔

انیسویں صدی کے آغاز میں اسلامی ممالک، حکومتیں اور خود مسلمان سخت قسم کے انتشار کا شکار تھے۔ اس کی وجوہ چند در چند تھیں۔ ایک تو یہ کہ مغربی تہذیب کا سیلاب مشرق کی ثقافتی اور اخلاقی اقدار کو بہائے لئے جا رہا تھا۔ دوسرے یہ کہ ایسا کوئی مرکز نہ رہا تھا جس کے گرد ممالک اسلامی جمع ہو جائیں۔ ترکی یورپ کا مردِ بیمار کہلاتا تھا۔ مصر انگریزوں کی نوآبادی تھی ؛ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت دم توڑ رہی تھی۔ اس زمانہ میں سید جمال الدین افغانی نے ایک تو مسلمانوں کو اپنی اخلاقی اور ثقافتی عظمت کا احساس دلایا۔ دوسرے یہ کوشش کی کہ مغربی ممالک کے عزائم جو ہمیشہ تدبر کے نقابوں میں ملفوف ہوتے تھے۔ ان کا صحیح مطلب مسلمانوں پر عیاں ہو جائے۔ تیسرے انھوں نے کم و بیش ہر اسلامی ملک میں جا کر اصلاح کی تحریکات کی بنیاد رکھی۔ ایک طرح کہا جا سکتا ہے کہ بیسویں صدی میں اسلامی ممالک نے جو مغربی استعمار سے چھٹکارا حاصل کیا ہے تو یہی فصل کاٹی گئی ہے جس کے بیج افغانی نے انیسویں صدی میں بوئے تھے۔ کوئی شک نہیں کہ بیسویں صدی میں جو دو بڑی لڑائیاں ہوئی ہیں انھوں نے بھی مغربی استعمار کے تابوت میں کیلیں ٹھونکی ہیں لیکن حریت اور آزادی خواہی کی جتنی تحریکات اسلامی ملکوں میں شروع ہوئیں اور پنپیں ان کے موسس ایک طرح سے جمال الدین افغانی ہی تھے[۱]

(۲) جنگ را رہبانیِ اسلام گفت

اشارہ ہے حدیثِ نبوی کی طرف جس کا مطلب ہے کہ جنگ اسلام کی رہبانیت ہے مراد یہ ہے کہ دوسرے مذاہب و ادیان تیاگ اور زہد کی آڑ میں بے عملی کی طرف مائل ہیں لیکن اسلام تلقینِ عمل کرتا ہے اور مسلمان کا ترکِ دنیا یہی ہے کہ وہ جہاد کرے۔ اور مال تو کیا اپنی جان بھی راہِ حق میں دینے سے دریغ نہ کرے۔ اصل رہبانیت یا ترکِ دنیا یہ ہے۔

---

[۱] مشاہیر: غلام رسول مہر۔ آثار جمال الدین افغانی: قاضی عبدالغفار۔

چ

(۱) چاہِ بابل: قرآن مجید میں سورۂ بقر میں ہاروت اور ماروت کا ذکر آیا ہے۔ یہ دو فرشتے تھے جنھیں بابل میں اتارا گیا تھا۔ یہ کہتے تھے کہ ہم تمہارے امتحان کے لیے آئے ہیں لیکن لوگ ان سے سحر سیکھتے تھے (اس بات کی تصریح کر دی گئی ہے کہ سحر غیر موثر ہے اور تقدیر صرف مشیت الٰہی کے تابع ہے)

ادبی روایت نے اس قصے کو آگے بڑھایا ہے اور اس کو یہ صورت بخشی ہے کہ ہاروت و ماروت ایک رقاصہ زہرہ کے عشق میں مبتلا ہو کر معتوب بارگاہ خداوندی ہو گئے تھے۔ انھیں ایک کنویں میں قید کر دیا گیا تھا، رقاصہ زہرہ کو آسمان پر اٹھا لیا گیا تھا اور اب وہ ایک کوکب کی شکل میں درخشاں ہے۔ زہرہ کو فارسی میں ناہید کہتے ہیں اور اس کے متعلق بڑی تفصیل سے اسی کلمہ کے تحت بحث ہو چکی ہے۔ دیوی ناہید یا زہرہ کی ہیکلیں اور معابد قریب قریب ہر ملک میں پائے جاتے تھے اور اس کی پرستش ہوتی تھی۔[۱]

---

[۱] مزدیسنا: محمد معین۔ غیاث اللغات۔ فرہنگ آنند راج

ح

(۱) **حضور**: صوفیوں کی اصطلاح میں حضور کے معنی ہیں کہ دل اللہ سے اس طرح لگا ہو کہ جو اس کے احکام غیبی ہیں وہ احکام عینی بن جائیں یعنی صوفی کو یوں معلوم ہو کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس کا آنکھوں سے مشاہدہ کر رہا ہے۔ اسی سلسلہ میں صوفیوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضور یہ ہے کہ صوفی اپنے آپ کو فراموش کر دے۔ علامہ کے ہاں حضور سے مراد تجلی خداوندی کا مشاہدہ ہے اور یہ صوفیا کی اصطلاح سے کچھ زیادہ دور نہیں۔[1]

---

[1] فرہنگ مصطلحات صوفیہ بنقل از تاریخ تصوف در اسلام: قاسم غنی

خ

(۱) **خافطین** : خافطین و یلدزم کے متعلق علامہ نے جاوید نامہ کے حاشیہ میں لکھا ہے "کوہ ہائے آتش فشانِ قمر" ظاہر ہے کہ یہ نام فرضی ہیں۔ قمر کے متعلق جو جدید ترین تحقیقات ہوئی ہے اس کا نچوڑ یہ ہے کہ یہ سیارہ غیر آباد ہے۔ اس میں جو داغ سے نظر آتے ہیں، پہلے یہ گمان تھا کہ یہ پہاڑ ہیں، اب کہا جاتا ہے کہ یہ گہری نہریں ہیں یا زمین کے شگاف ہیں۔ تاہم قمر کے آباد ہونے کا امکان قائم ہے اور بہ تحقیق یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ سیارہ غیر آباد ہے۔[۱]

(۲) **خالصہ** : اصطلاح میں سرکاری جاگیر کو کہتے ہیں لیکن سکھوں نے خود یہ لقب اختیار کر لیا تھا۔

(۳) **خلق و تقدیر ہدایت ابتداست** : قرآن مجید کی آیات کی طرف اشارہ ہے[۸۷: ۱، ۲، ۳]

سبّح اسم ربّک الاعلیٰ .... قدر فھدیٰ

---

[۱] Universe Around Us ; James Jeans.

اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ یہ سیارہ مکمل طور پر غیر آباد ہے۔ (ادارہ)

ترجمہ یہ ہے :

(اے پیغمبر) تم اپنے پروردگار جلیل الشان کی تسبیح کرو، جس نے (انسان) کو بنایا پھر (اس کے اعضا کو) درست کیا (اس کا) اندازہ ٹھہرایا (پھر اس کو) رستہ بتایا۔

(۴) **خوشحال خاں خٹک** : خوشحال خاں خٹک جو تلوار کا دھنی بھی تھا اور فن کار بھی۔ ۱۰۲۲ھ میں سرائے اکوڑہ کے مقام پر متولد ہوا (یہ مقام پشاور سے ۳۵ میل کے فاصلے پر واقع ہے) ربیع الثانی کا مہینہ تھا۔ خٹک اس کے قبیلہ کا نام ہے۔ اس کے والد کا نام شہباز خاں تھا جو حکومت مغلیہ کا منصبدار تھا۔ اس کی تاریخ ولادت خیر عالمیانی سے برآمد ہوتی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خوشحال خاں نے افغان سرداروں کے بیٹوں کی طرح بچپن اور جوانی کا بیشتر حصہ سیر و شکار میں صرف کیا لیکن اس کے باوجود وہ تحصیل علوم و فنون سے غافل نہ رہا۔ بیس سال کی عمر میں اس نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی غزلوں میں اکثر عقل اور عشق کا تقابل نمایاں کر کے دکھایا جاتا ہے۔ خٹک سے علامہ کو جو عقیدت ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ خوشحال خاں بھی عقل پر عشق کا تفوق تسلیم کرتا ہے۔ جب اورنگ زیب مسند آرائے حکومت ہوا تو سید امیر خاں نے کہ کابل کا صوبیدار تھا اور خٹکوں سے کھٹکتا تھا مغلیہ فرماں روا کے کان بھرے کہ خوشحال خاں اور اس کے قبیلے کے سرداروں کو گرفتار کرنا ضروری ہے کیونکہ وہ سرکاری احکام کے نافذ ہونے میں مانع ہوتے ہیں۔ خوشحال خاں کو گرفتار کر لیا گیا۔ پشاور سے اسے دہلی پہنچا دیا گیا۔ کوئی اڑھائی سال کے قریب وہ دہلی اور رنتھمبور کے قلعوں میں قید رہا۔ جس کے دوران میں اس نے جو غزلیں لکھی ہیں وہ دلپذیری اور اثر انگیزی کے اعتبار سے مسعود سعد سلمان کی حبسیات کی یاد دلاتی ہیں۔ آخر خوشحال خاں کو بعض عمائد دربار کی سفارش پر رہا کر دیا گیا۔ جب خوشحال خاں وطن لوٹا تو اسے معلوم ہوا کہ جن دنوں وہ محبوس تھا یوسف زئی قبیلہ نے

اس کے اہل وعیال کو پناہ دی. حالانکہ اس قبیلہ سے خٹکوں کے اختلافات قدیم الایام سے چلے آرہے تھے۔ ادھر مغلیہ فرماں روا کا حکم صادر ہوا کہ لنگر کوٹ (تحصیل و ضلع مردان) کے مقام پر ایک قلعہ تعمیر کیا جائے تاکہ یوسف زئی قبیلہ کی سرکوبی بوجہ احسن ہوتی رہے اور مغل فوج کے لئے ایک مستحکم جائے پناہ موجود ہو. خوشحال خاں کو ایک تو اپنے بے گناہ محبوس کئے جانے کا غم تھا. دوسرے وہ یوسف زئی قبیلہ کا احسان اتارنا چاہتا تھا جب قلعہ تعمیر ہو گیا (موجودہ گڑھی کپورہ) تو خٹک نے فیصلہ کیا کہ وہ یوسف زئی قبیلہ کا ساتھ دے گا۔ اب خوشحال خاں نے اپنے خطبوں اور اپنے اشعار کے ذریعہ افغانوں کو ابھارنا شروع کیا کہ مغل آہستہ آہستہ ان کے تمام ملک پر قبضہ کر کے انھیں غلام بنا لینا چاہتے ہیں. گیارھویں صدی کے آخر میں مغلوں اور افغانوں کی جھڑپیں آئے دن کا معمول بن گئی تھیں۔ ان میں افغانوں کو اکثر فتح حاصل ہوتی تھی۔ آخر شہنشاہ خود فوج لے کر حسن ابدال پہنچا۔ اس کی موجودگی نے حالات کا رخ بدل دیا اور افغانوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے باوصف علاقہ میں پوری طرح امن قائم نہیں ہوا اور خوشحال خاں برابر لڑائیوں میں بھی شریک ہوتا رہا اور ایسے شعر بھی کہتا رہا جن سے افغانوں کے دل میں مرنے مارنے کا شوق پیدا ہوا۔ خوشحال خاں نے اواخر عمر میں دل پر بڑا داغ کھایا۔ اس کا بیٹا نظام خاں جس کی عمر ۲۶ سال کی تھی وفات پا گیا۔ خوشحال خاں نے اس کی وفات پر بڑا دردناک مرثیہ لکھا۔

اس کے بعد مغلوں کی اور افغانوں کی صلح ہو گئی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ شہزادہ محمد معظم (شاہ عالم) نے افغانوں کی تالیفِ قلب کی پوری کوشش کی اور خوشحال خاں کو بہت محترم گردانا۔ یہ صلح ناپائدار ثابت ہوئی کچھ عرصہ کے بعد پھر علاقہ میں بدامنی کا دور دورہ ہو گیا اور خوشحال خاں پھر مغلوں کے خلاف صف آرا ہو گیا۔

اب خوشحال خاں بوڑھا ہو چکا تھا اور صدمے ایسے اُٹھائے تھے کہ زندہ رہنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ آخر ۱۶۸۹ء میں اس نے وفات پائی۔

خوشحال خاں کی تصانیف میں دیوان اشعار کے علاوہ فقہی اور عرفانی کتابیں بھی شامل ہیں۔ ایک کتاب حفظان صحت کے متعلق بھی ہے[1]۔

(۴) خیام (عمر خیام): حکیم عمر خیام نیشاپوری کے سنین حیات کے متعلق جو اختلافات تھے۔ جو سید سلیمان ندوی کی تصنیف "خیام" کی اشاعت کے بعد کم و بیش سبھی رفع ہو چکے ہیں۔

سوامی گوبند تیرتھ نے اپنی کتاب ( ) میں عمر خیام کا زائچہ سامنے رکھ کر بروئے علم نجوم حکم لگایا ہے کہ اس کی تاریخ ولادت ۱۸ مئی ۱۰۴۸ء ہے۔ سید سلیمان ندوی اس کی ولادت ۴۳۹ھ کے لگ بھگ بتاتے ہیں۔ سوامی گوبند تیرتھ کی تاریخ ولادت تسلیم کرلی جائے تو خیام کی زندگی کے واقعات کی چولیں بالکل ٹھیک بیٹھ جاتی ہیں۔

مسلّم ہے کہ خیام کا وطن نیشاپور تھا جو ان دنوں علوم و فنون کا مرکز تھا۔ خیام پہلے ترکستان گیا۔ جہاں قاضی ابوطاہر نے اس کی تربیت کی اور آخر شمس الملک خاقان بخارا کے دربار میں پہنچا دیا گیا۔ وہ یہیں تھا کہ ملک شاہ سلجوقی نے (متوفی ۴۸۵ھ) اسے اپنے دربار میں طلب کیا۔ اس جلیل القدر بادشاہ کے دربار میں اس کی بہت قدردانی کی گئی اور اسے زیچ ملک شاہی کی ترتیب پر مامور کیا گیا۔ اس کام میں اور فاضل بھی اس کے شریک کار تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خیام نے شادی نہیں کی اگرچہ یہ بات تحقیق سے نہیں کہی جاسکتی بہرحال اس نے ۵۲۶ھ میں وفات پائی اور گورستان حیرہ میں مدفون ہوا۔

خیام کی زندگی اور رباعیات کے متعلق دو مسائل متنازعہ فیہ ہیں اور ہمیشہ نقادوں

---

[1] اٹک کے آس پاس: مرتبہ فارغ بخاری اور رضا ہمدانی۔ مقالہ خوشحال خاں خٹک، تحریر دوست محمد خاں۔ الشاپریس لاہور

اور مورخوں کو دعوتِ فکر دیتے رہتے ہیں۔

۱۔ پہلے تو یہ داستان ہے کہ خیام نظام الملک اور حسن بن صباح کا ہم درس تھا۔ ہم درسی کے دنوں میں تینوں نے وعدہ کیا کہ جو بھی کسی رتبۂ بلند کو پہنچے گا وہ دوسرے دونوں دوستوں کی مدد کرے گا۔ پہلے نظام الملک منصب جلیل پر فائز ہوا تو حسن بن صباح اس کے پاس آیا اور پرانا وعدہ یاد دلا کر مدد کی درخواست کی۔ نظام الملک نے مدد کی لیکن حسن بن صباح نے یہ چاہا کہ اسی کو بادشاہ کی نظروں سے گرا دے۔ اس کے بعد دونوں دوستوں میں کشیدگی ہو گئی۔ حسن بن صباح چلا گیا اور اس نے وہ نظام قائم کیا جس کے افراد حشیشین کہلاتے ہیں۔ اسی گروہ کے ایک فرد یا فدائی نے نظام الملک کو قتل کیا۔

پروفیسر براؤن اس داستان کو مشکوک گردانتے ہیں لیکن اس داستان کے مشکوک ہونے کے جو دلائل دیتے ہیں وہ خود وزنی نہیں بلکہ مشتبہ ہیں۔ اس کے برخلاف سید سلیمان ندوی نے اس داستانِ معاصرت پر بڑی تفصیل سے انتقاد کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ داستان سرتاپا لغو، پوچ اور بے بنیاد ہے۔

۲۔ دوسرا مسئلہ عمر خیام کی رباعیات کی تعیین کا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ فارسی شاعری میں بہت سی رباعیات ایسی ہیں جو بہت سے رباعی گو شعرا کے دیوانوں میں ملتی ہیں۔ انھیں آوارہ گرد رباعیات کہتے ہیں۔ خیام کی بعض رباعیات بھی انھیں میں شامل ہیں۔ یہ طے کرنے کے لئے کہ خیام کی رباعیات کون سی ہیں مختلف طریقے تجویز کئے گئے ہیں لیکن تمام طریقے کم و بیش ناقص ہیں۔

(۱) عمر خیام کے زمانے میں رباعیات خصی نہیں لکھی جاتی تھیں یعنی تیسرے مصرعہ میں بھی قافیہ ہوتا تھا اس لئے جو رباعیات خصی ہیں وہ یقیناً خیام کی نہیں ہیں۔ یہ ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم پرنسپل اورینٹل کالج کا طریقہ ہے۔ اس طریقہ پر یہ اعتراض ہے کہ اول تو عمر خیام کے زمانہ میں بھی خصی

رباعیات ملتی ہیں، دوسرے یہ کہ اس طریقے کے مطابق یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ رباعیات عمر خیام کی نہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں رباعیات عمر خیام کی ہیں۔

(ب) جو رباعیات خیام کے کلام میں بھی ملتی ہیں اور دوسرے شعرا کے دواوین میں بھی پائی جاتی ہیں۔ ان کے متعلق فرض کر لیا جائے کہ یہ خیام کا مال نہیں ہے۔ یہ عام مستشرقین کا طریقہ ہے۔ اس کی خامیاں ظاہر ہیں۔ جو رباعیاں مثلاً خیام اور عنصری دونوں کے ہاں ملتی ہیں، ان کے متعلق نہ عنصری کو ترجیح ہے نہ خیام کو۔

(ج) خیام کے انداز کلام سے اندازہ لگایا جائے کہ یہ رباعیاں واقعی خیام کی کہی ہوئی ہیں سید سلیمان ندوی کا رجحان اسی طرف ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ طریقہ بھی ناقص ہے اس لئے کہ کسی نقاد کا یہ دعویٰ کرنا کہ میں خیام کی رباعیوں کو اس طرح پہچان لیتا ہوں کہ شک کی گنجائش ہی نہ رہے کچھ جسارت معلوم ہوتا ہے۔ ذوق سلیم اس معاملہ میں معیار حق و باطل قرار نہیں پا سکتا۔

علامہ محمد قزوینی نے چہار مقالہ کے حواشی میں خیام پر جو کچھ لکھا ہے اس کے مطالعہ کی ضرورت "خیام" کی اشاعت کے بعد بھی رہتی ہے۔

بیرن روزن نے خیام کی ایک نئی تصنیف کا سراغ دیا ہے جس کا نام نوروز نامہ ہے اس میں شراب نوشی کے آداب سے بحث کی گئی ہے اور کشف شراب کی داستان بھی بیان کی گئی ہے۔ ڈاکٹر محمد معین نے مزدیسنا میں یہ داستانیں جمع کر دی ہیں ان کا مطالعہ بھی سودمند ہوگا۔[۱۵]

---

۱۵ خیام: سید سلیمان ندوی۔ — حواشی چہار مقالہ: قزوینی۔
مزدیسنا: محمد معین۔ — تاریخ ادبیات ایران: شفق۔
تنقید شعر العجم: شیرانی۔ — تاریخ ادبیات ایران (جلد دوم)، براؤن۔
نوروز نامہ۔

Nectar of Grace; Swami Govind Tirath.

د

(۱) **داؤد:** حضرت داؤدؑ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ خدا نے ان کو پیغمبری سے بھی سرفراز کیا اور بادشاہت بھی عطا فرمائی۔ زبور کا صحیفہ انھیں پہ نازل ہوا۔ ادبی روایت کہتی ہے کہ لوہا ان کے ہاتھ میں نرم ہو جاتا تھا اور وہ خوش الحان ایسے تھے کہ ذکر خدا کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا ان کی ہمنوا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد کی بعثت سے پہلے بنو اسرائیل میں کاہن اور قاضی سخت ناانصافی کرتے تھے اور رشوت لینے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت داؤد مبعوث ہوئے کہ لوگوں کی حق تلفی نہ ہو سکے اور معدلت گستری کا تقاضا پورا ہو۔

اسرائیلیات میں حضرت داؤد کے متعلق بہت سی بے سروپا باتیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ ایک دوست کی بیوی کی محبت میں مبتلا ہو گئے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ خرافات ان یہودیوں کے ذریعہ اسلامی روایات میں داخل ہوئیں جو مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے۔

ادبی تلمیحات میں ایک تو حضرت داؤد کی زنجیر عدل کا ذکر آتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ بہت خوش الحان تھے۔ صدرالدین بلاغی نے ان صورتوں اور آیتوں کی تفصیل دے دی ہے[۱] جن میں حضرت داؤد کا ذکر آیا ہے۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

۲/۲۵۱، ۴/۱۶۳، ۶/۸۴، ۱۷/۵۵، ۲۱/۷۸، ۲۷/۱۵، ۳۴/۱۰، ۳۸/۲۰-۲۶، ۵/۷۸

(۲) **دودۂ آدم کنفسٍ واحدہ**: اشارہ ہے آیتِ قرآنی کی طرف، جس کا حوالہ یہ ہے ۳۱/۲۸ آیت کا ترجمہ یہ ہے:

تم سب کا پیدا کرنا اور زندہ کر دینا نہیں ہے مگر مثل ایک شخص کے بے شک اللہ سننے والا اور بینا ہے۔

صاحب اخلاق جلالی نے اس آیت کی بہت اچھی تفسیر و تشریح کی ہے اور سعدی کا مصرعہ بھی نقل کیا ہے ع

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند[۲]

(۳) **دہقان**: اردو میں دہقان کا کلمہ زوال پذیر ہو چکا ہے لیکن فارسی میں یہ ابھی تک عظمت کے معانی پر مشتمل ہے۔ ساسانی عہد میں جو طبقات مردم متعین کئے گئے تھے، ان میں

---

[۱] قصص قرآن: سید صدرالدین بلاغی ـ قصص القرآن: حفظ الرحمٰن [۲] اخلاقِ جلالی۔ نول کشور ۱۹۱۶ء۔

استدراک: زبور جو حضرت داؤد کا صحیفہ ہے، اس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ عہد نامۂ قدیم میں بھی زبور نامی ایک کتاب موجود ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس میں شدید قسم کی تحریف ہوئی ہے۔ اس میں وہ مزمور بھی موجود ہیں جو حضرت داؤد پڑھا کرتے تھے لیکن اندرونی شہادت سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت داؤد کے کئی سو سال بعد تک مختلف مصنف اپنی تالیفات زبور میں شامل کرتے رہے۔ بعض گیتوں میں اس بات کا ذکر آتا ہے کہ بنو اسرائیل بابلیوں کے محکوم ہو گئے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ یہ واقعہ حضرت داؤد کی وفات کے بعد پیش آیا ہے۔ صدرالدین کا خیال ہے اور درست معلوم ہوتا ہے کہ زبور اور غزل الغزلات کے وہ حصے جن میں یہودیوں کے محکوم ہونے کا ذکر ہے، وہ یقینی طور پر حضرت داؤد کی وفات کے بہت عرصہ بعد لکھے گئے ہیں۔

دہاقین وہ لوگ تھے جن کو حکومت کی طرف سے بڑی بڑی جاگیریں عطا کی گئی تھیں۔ علامہ نے دہقان کا کلمہ اُردو معانی میں استعمال کیا ہے یعنی مزارع، کاشت کار، فارسی میں دراصل اس کے معنی زمیندار یا جاگیر دار ہیں۔ یہ صراحت اس لئے ضروری سمجھی گئی کہ ساتھ ہی وہ خدا کا کلمہ آتا ہے جس کے معنی زمیندار اور نمبر دار کے ہیں۔ فارسیِ جدید میں البتہ دہقان کا کلمہ کچھ زوال پذیر ہوا ہے[۱]

(۴) دیو: سنسکرت میں بلکہ آریائی زبانوں میں اکثر و بیشتر خدا کو کہتے ہیں۔ رب النوع بھی دیو کہلاتا ہے سنسکرت ادب دیوتا اور دیوی اسی کلمہ سے مشتق ہیں اور بہتی دیو میں بھی یہی کلمہ لاحقہ کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ ہندی صنمیات کے مطابق خیر کی قوتیں دیوا اور دیوتا کہلاتی تھیں۔ اس کے مقابلہ میں قوائے شر آشر کہلاتے تھے۔

جب زرتشت نے آریائی دیوی دیوتاؤں سے تبرا کیا تو اس نے میکس ملر کی تحقیقات کے مطابق یہ کہا کہ جن کو تم دیوتا یا رب کہتے ہو وہ میرے دیو یا شیطان ہیں۔ چنانچہ فارسی جدید میں دیو شیطان کے معنی میں آتا ہے۔ فارسی اور اردو میں ا، ن، ہ (انہ) اس پر کلماتِ نسبت اضافہ کرتے ہیں اس سے دیوانہ برآمد ہوتا ہے یعنی وہ جو دیووں جیسے کام کرے۔ اس کی مثالیں بہت ہیں جیسے فرزنہ، فرزانہ اور پرو سے پروانہ کہ فرز دانائی کو کہتے ہیں اور پرو روشنی کو اس سلسلہ میں فرزیں پر بحث بھی دیکھیے[۲]

---

[۱] لغاتِ ماخذ الفاظ: شبلی۔
مزدیسنا: محمد معین۔
[۲] غیاث اللغات۔

تاریخ ادبیاتِ ایران (جلد اول)، براؤن۔
سرگزشتِ الفاظ: احمد دین (لاہور)۔
لغتِ فارسی انگلیسی: حییم۔

ر

(۱) **رب الفراق**: گمان ہوتا ہے کہ اس بت کی طرف اشارہ ہے جس کو صدرالدین ذات الوداع کا نام دیتے ہیں کلمہ کے معنی ہیں جدائی والی لیکن یہ قیاس ہے[1]۔

(۲) **رستم**: رستم جو شاہنامہ کا مشہور کردار ہے (مرکزی کردار یا ہیرو نہیں) ایک قدیم فارسی کلمہ کی موجودہ شکل ہے۔ ادبیاتِ پہلوی میں اس نام کی یہ شکلیں مندرج ہیں رُتستخم، رستہم، رُتستحمک۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تہم جو اس کلمہ کا جزو بے وہی ہے جو تہمتن میں پایا جاتا ہے۔ بعض مستشرقین کا خیال ہے کہ جب اوستا تالیف ہوئی ہے تو رستم کی داستانیں مشہور ہو چکی تھیں لیکن ان کا قصداً ذکر نہیں کیا گیا کہ رستم کے مذہبی عقائد موبدانِ زرتشتی کے مذہبی عقائد کے مطابق نہ تھے لیکن نولدکے کہتا ہے کہ یہ بات ناممکن ہے اوستا کے مولف چاہتے تو رستم کی مذمت کر سکتے تھے۔

رستم بن زال سیستان اور زابلستان کے پہلوانوں میں شامل ہے۔ گمان ہو سکتا ہے کہ

---

[1] قصصِ قرآن: صدرالدین بلاغی۔

سیستان یا سجستان کے اصلی باشندے اس روایت کو اپنے ساتھ لائے ہوں لیکن یہ گمان غلط ہے کہ ذبیح اللہ صفا کا خیال ہے کہ رستم کی داستان مشرق سے لے کے مغرب تک مشہور تھی تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت قدیم زمانے سے اس پہلوان کے کارنامے حماسہ ملی کا جزو ہو چکے تھے۔

بندھشنی میں یہ درج ہے کہ سام کے آٹھ ہی لڑکے تھے اور آٹھ ہی لڑکیاں۔ رستم بھی اسی کا لڑکا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رستم کی داستان یقیناً عہد ساسانی سے ادھر کی نہیں ہو سکتی لیکن ایسے دلائل بھی موجود ہیں جو اس داستان کی مزید قدامت کا اثبات کرتے ہیں۔ ذبیح اللہ صفا کا قیاس یہ ہے کہ رستم اشکانی پہلوانوں میں سے تھا (یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے سکندر کے حملہ کے بعد ایران پر قبضہ کر لیا تھا) جہاں تک رستم کا دیو سپید سے لڑنے کا تعلق ہے اس کی رمز کے متعلق کیقباد کے سلسلہ میں بحث کی جا چکی ہے۔ رستم کا مشہور گھوڑا رخش تھا کہ عجائب مخلوقات میں شمار ہوتا تھا (ہفت خوان رستم سے بحث ہو چکی ہے) آزاد سرو نامی ایک عالم کو رستم کے متعلق بہت سی داستانیں یاد تھیں (یہ احمد بن سہل کا معاصر تھا) اور فردوسی نے جب شاہنامے کے لئے روایات کی جمع آوری کا کام شروع کیا ہے تو آزاد سرو سے بہت استفادہ کیا ہے۔

رستم کا بیٹا سہراب جو اس کے ہاتھوں ہی مارا گیا تھا بہت سی داستانوں کا موضوع بن چکا ہے آرنلڈ نے ایک نظم "رستم و سہراب" کے عنوان سے لکھی ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی ادبیات میں سہراب کا ذکر اکثر ملتا ہے۔

مشہور ہے کہ خود فردوسی نے رستم کے متعلق کہا تھا:

منم کردہ ام رستم داستان
وگرنہ یلے بود در سیستان

ریل پہلوان کو کہتے ہیں اور چونکہ پہلوان عام طور پر سیانے نہیں ہوتے اس لئے پنجابی میں یہ کلمہ بے وقوف کے لئے استعمال ہوتا ہے مثلاً فلانا ایل ہے یا یلاّ ہے[۱]۔

(۴) رخن (بت): فرضی نام معلوم ہوتا ہے۔

---

[۱] حماسہ سرائی در ایران: ذبیح اللہ صفا۔ تہران (۱۳۲۴ء) مزدیسنا: محمد معین (تہران) ۱۳۲۶ھ۔

داستانہائے ایران قدیم: حسن پیرنیا۔

استدراک: ساسانی عہد میں پہلوانوں اور شجاعوں کا نام اکثر رستم رکھا جاتا تھا۔ مسلمانوں نے جب ایران پر حملہ کیا ہے تو رستم نامی ایک کماندار نے ایران کی طرف سے مدافعت کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ساسانی عہد میں رستم کے کارنامے بہت مقبول تھے۔

ز

(۱) زال سوئے گردوں بگواتی قریب: قرآن مجید کی آیت کی طرف اشارہ ہے
حوالہ بہ تفصیل ذیل ہے:

واذا سألک عبادی .... یرشدون

ترجمہ یہ ہے: (۲/۸۱۶)

اور جب میرے بندے تجھ سے میرے بارے میں پوچھتے ہیں تو بے شک میں قریب ہوں
میں فریادی کی فریاد سنتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے ......

(۲) زروان: زروان کے متعلق مورخوں اور محققوں میں بہت اختلاف رائے ہے۔
اور یہاں بھی آئین زروانی نے بہت تغیرات دیکھے ہیں۔ ساسانی عہد میں طبقات اشراف کے
اکثر لوگ اس بات کے قائل تھے کہ زرتشت نے اہورا مزدا اور اہرمن کا جو ذکر کیا ہے ان سے
بلند تر بھی ایک حقیقت ہے، وہ زروان اعظم ہے اور وہ اہورا مزدا اور اہرمن کا پدر ہے۔ اس میں

کوئی شک نہیں کہ ساسانیوں کے زمانے میں آئین زروانی کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی یہاں تک کہ مختلف مورخوں نے اور ارباب لغت نے یہ لکھنا شروع کر دیا کہ زروان زرتشت ہی کا دوسرا نام ہے۔ فرہنگ جہانگیری یہاں تک چلا گیا ہے کہ زروان اور زرتشت حضرت ابراہیم کے اسمائے مبارک ہیں۔

اردشیر ساسانی کے ذکر کے سلسلہ میں مجمل التواریخ کے مولف لکھتے ہیں کہ اس نے اصفہان میں تین آتش کدے تعمیر کئے ان میں سے ایک آتش کدہ کا نام وزوار اردشیر تھا۔ یہ وزوا رعربی کتابوں میں زروان پڑھا گیا ہے اور کوئی شک نہیں کہ یہ وہی زروان ہے کہ مزدیسنا کی تعلیمات کے مطابق اہورامزدا کا آفریدہ تھا لیکن جسے بعد میں ساسانی عمائد نے اہورامزدا اور اہرمن کا پدر تسلیم کر لیا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس طرح زرتشت کے مسلک سے دوگانگی رفع ہوگئی کہ ایک خدائے متعال کا تصور پیدا ہوا یا تثلیث کی صورت پیدا ہوئی کہ ایک رب کے نیچے دو طاقتیں خیر اور شر کی معرکہ آرا تھیں یعنی اہورامزدا اور اہرمن۔ بہرحال علامہ مرحوم زروان کو روح زمان و مکان کہتے اور وہی جاوید نامہ میں انھیں عالم علوی کی سیاحت کے لئے انھیں ساتھ لے جاتا ہے۔ اس کی تصویر بھی انھوں نے نہایت خوبصورت کھینچی ہے[۱]۔

(۳) **زوجِ مشتری**: مشتری کا ذکر پہلے آچکا ہے کہ بابلی اسے بعل کہتے تھے۔ یونانی زیوس اور رومی ژوپیتر یا جوپیتر۔ یہ گویا رب الارباب ہے۔ دیوتاؤں کا دیوتا ہے۔ ہیلٹ مین نے زیوس یا مشتری کی تین صفات کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے:

(۱) کہ وہ قادرِ مطلق ہے (۲) کہ وہ خالق ہے

(۳) کہ ابدی اور ازلی ہے

---

[۱] مزدیسنا: محمد معین۔

تین کا عدد بڑا پُر اسرار ہے۔

مشتری کی یا جوپیٹر کی بیوی کا نام ہیرا ہے۔ روایات کہتی ہیں کہ وہ زیوس کی یا مشتری کی بہن بھی تھی لیکن سیلٹ مین نے کہا ہے کہ یہ روایت صرف بیہودہ نگار شعرا نے بیان کی ہے ہیرا وہی دیوی ہے جو حسن کے مقابلہ میں افرودیتی کی حریف تھی (پیرس اس مقابلہ میں حکم تھا[۵]

(۴) زہرہ: اگرچہ زہرہ اور ناہید پر کچھ مباحث رقم ہو چکے ہیں لیکن اس مرحلہ پر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اردو اور فارسی ادبیات میں مختلف سیاروں کے جو نام ہیں اور ان سے جو صفات منسوب ہیں ان کا باختصار ایک ہی جگہ ذکر کر دیا جائے۔

۱۔ قمر: فارسی ماہ، ہندی سوم۔ سومنا تھا اسی سے ہے اس کی جگہ فلک اول ہے۔ قمر کینہ ورزی بھی کر سکتا ہے۔ انوری اپنے مشہور قصیدے میں قصدِ ماہ کہتا ہے یعنی قصد بد۔

۲۔ عطارد: فارسی تیر، ہندی میں اسے بدھ کہتے ہیں اس کی جگہ فلک دوم ہے۔ دبیر فلک کہلاتا ہے۔

۳۔ زہرہ: فارسی ناہید، ہندی سکر۔ اس کی جگہ فلک سوم ہے اور اس کا لقب رقاصۂ فلک ہے۔

۴۔ شمس: فارسی خورشید۔ اس کی جگہ فلک چہارم ہے۔

۵۔ مریخ: فارسی بہرام، ہندی منگل۔ اس کی جگہ فلکِ پنجم ہے اور لقب جلادِ فلک۔

۶۔ مشتری: فارسی برجیس، ہندی برہسپت۔ اس کی جگہ فلک ششم ہے اور اس کا لقب قاضیِ فلک ہے۔

۷۔ زحل: فارسی کیواں، ہندی سنیچر۔ اس کی جگہ فلک ہفتم ہے اور لقب اس کا ہندوے فلک ہے

فارسی اور اُردو میں شعری روایت ان سیاروں کے متعلق یہ بیان کرتی ہے کہ یہ اپنے

۵! Twelve Olympians; Charles Seltman England

اپنے فلک پر درخشاں ہیں اور ہر فلک پیاز کے چھلکے کی طرح ہے یعنی تہ درتہ افلاک ہیں۔ اس کے بعد فلک الافلاک کا رتبہ آتا ہے۔ یہاں بارہ برج ہیں یعنی عقرب، میزان، سنبلہ، اسد، سرطان، جوزا، ثور، حمل، حوت، دلو، جدی، قوس۔ اسے منطقۃ البروج بھی کہتے ہیں۔

اگر صرف سیاروں کے آسمانوں کو ملحوظ رکھا جائے تو آسمان سات بنتے ہیں اس لئے ہفت آسمان اور ہفت فلک کا ذکر اشعار میں آتا ہے جیسے:۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں　　　ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

لیکن اگر فلک الافلاک اور پھر عرش کو ملحوظ رکھیں تو پھر نو فلک ہو جاتے ہیں، چنانچہ ظہیر کہتا ہے:

نہ کرسیِ فلک نہد اندیشہ زیرِ پا　　　تا بوسہ بر رکابِ قزل ارسلاں دہد

(۵) زُہیر: اس کا اصل نام زہیر ابن ربیعہ ہے لیکن زہیر ابن ابی سلمہ کے نام سے بھی پہچانا جاتا ہے۔ عہدِ جاہلیت کا مشہور عربی شاعر ہے۔ نقادوں نے بالعموم اسے امرؤالقیس اور نابغہ کا حریف قرار دیا ہے۔ معلقات میں زہیر کا قصیدہ بھی شامل ہے[1]۔

(۶) زین العابدین: امام زین العابدین اثنا عشری شیعانِ علی کے چوتھے امام ہیں۔ جب امام حسین کربلا پہنچے ہیں تو آپ بیمار تھے۔ آپ پر جہاد واجب نہ تھا لیکن انھیں میدان جنگ میں جانے سے بڑی مشکل سے روکا گیا۔

آپ کی عبادت گذاری زہد و تقویٰ ضرب المثل ہیں۔ حسینؑ جیسے باپ کے مرنے کا طبعاً آپ کو بہت رنج ہوا، اکثر رویا کرتے تھے۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں آپ کی وفات کا سال ۹۴ھ بتایا گیا ہے۔ سٹینلے لین پول نے آپ کی وفات کی تاریخ ۹۵ھ بتائی ہے۔ اس سے پہلے یہ گذارش کیا جا چکا ہے کہ شیعہ دو بڑے گروہوں میں منقسم ہیں ایک اسماعیلیہ اور دوسرے

---

[1] کتاب الشعر والشعراء: ابنِ قتیبہ۔

اثنا عشریہ۔ اسماعیلیہ کا عقیدہ یہ ہے کہ امام جعفر صادق کے بعد امامت حضرت موسیٰ کاظم کے بجائے اسماعیل اور ان کے بیٹے محمد کو منتقل ہوئی۔ خلفائے فاطمیِ مصر اسماعیلیہ ہی تھے اور مدعی تھے کہ ان کے خاندان کا نسب حضرت اسماعیل کی اولاد سے ہے۔ یہ بتانے کے لئے کہ اثنا عشری اور اسماعیلی شیعوں میں اختلاف کہاں پیدا ہوتا ہے اور ان کے ائمہ کے نام کیا ہیں ذیل میں ایک شجرہ درج کیا جاتا ہے۔[۱]

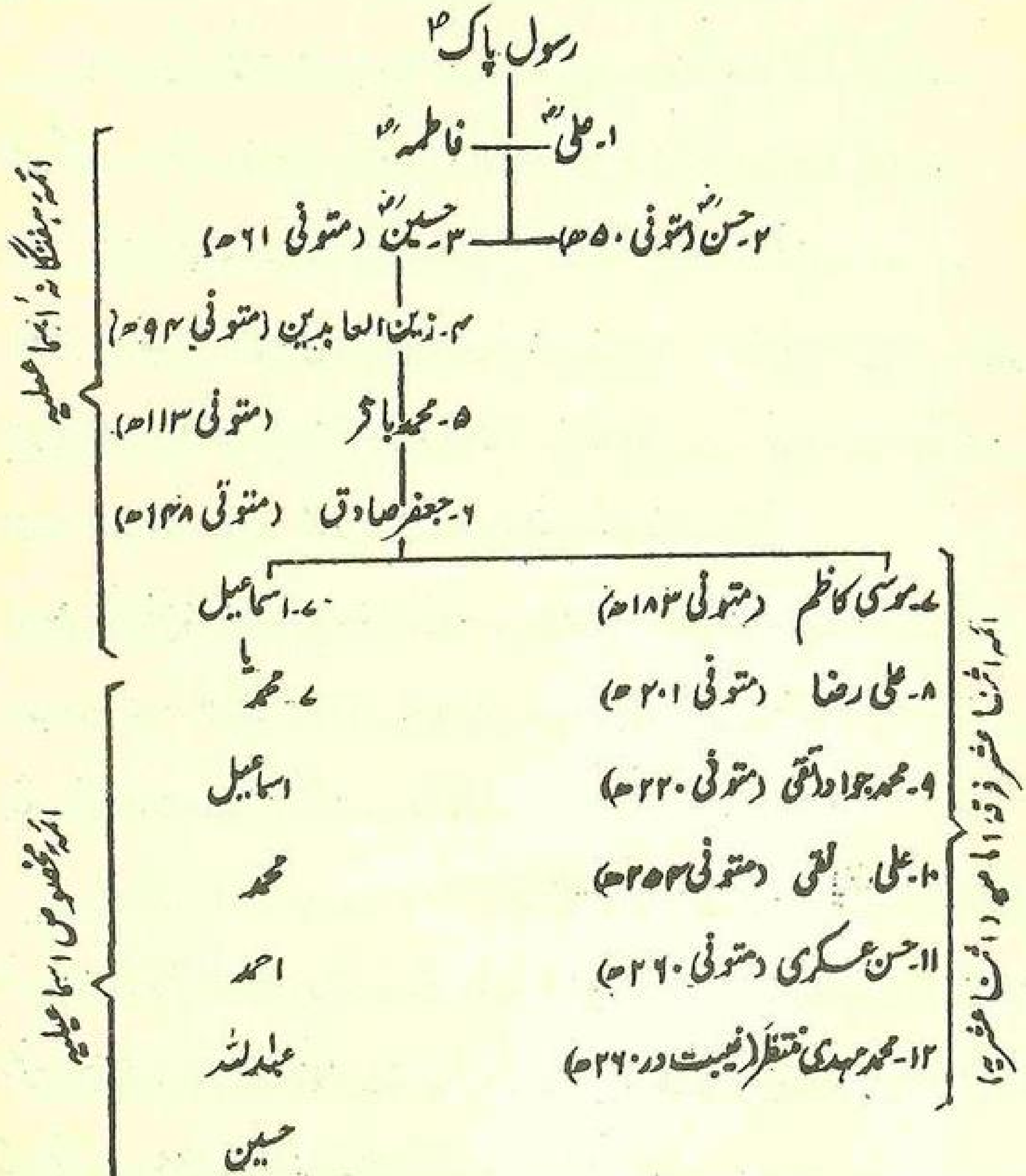

---

[۱] طبقات سلاطینِ اسلام: سٹینلے لین پول: مترجم عباس اقبال۔

س

(۱) سام (حام): ارباب لغت تو یہ لکھتے ہیں کہ حضرت نوح کے بیٹوں کے نام ہیں لیکن ظاہر ہے کہ سام وحام مختلف نسلوں کی علامات کے طور پر استعمال ہوئے ہیں مثلاً اقوامِ سامیہ (The Somitic Races)۔

چونکہ حضرت نوح کا زمانہ بہت قدیم ہے اس لئے نسلوں کے اختلاف کو انھیں کے وقت سے منسوب کیا گیا ہے۔ ایک اور بات یہ بھی ہے کہ طوفانِ نوح کے بعد انسان گویا از سرِ نو پھولا پھلا۔ نسلوں کا اختلاف بھی اسی زمانہ سے منسوب کر دیا گیا (ایرانِ قدیم کی داستانوں میں بھی ایک سام کا ذکر ملتا ہے۔ یہ سام پسر تورگ ہے)۔

صاحبِ تاریخ ملِ قدیمہ لکھتے ہیں کہ انسان کی چار مشہور نسلیں ہیں۔ سفید نسل، زرد نسل، سیاہ نسل، قرمزی یا سُرخ نسل۔ یورپ، مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ میں سفید نسل کے افراد رہتے ہیں یعنی بالعموم ایچینی، جاپانی اور منگول زرد نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ سیاہ نسل کے افراد

اکثر افریقہ میں آباد ہیں۔ امریکہ کے قدیم رہنے والے (Red Indians) سرخ نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ سفید نسل پھر دو گروہوں میں بٹ گئی ہے۔ ایک آریائی دوسری سامی۔[۱]

(۲) **سعید حلیم پاشا:** سعید حلیم پاشا مشہور سیاستدان ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں قاہرہ میں متولد ہوئے۔ ترکیہ اور جنیوا میں تحصیلِ علوم سے فارغ ہوئے۔ جب ترکیہ میں انھوں نے جدید تحریکات کی بنیاد رکھی تو حکومت نے انھیں ترکِ وطن پر مجبور کیا۔ وہ مصر میں آئے تو ایسے معرکے کے کام کئے کہ ۱۹۱۳ء میں انھیں مصر کا وزیرِ اعظم بنا دیا۔ آخر ۶ دسمبر ۱۹۲۱ء کو انھیں روم میں شہید کر دیا گیا۔[۲]

(۳) **سحبان بن زفر الوائلی:** ان کی تاریخِ وفات ۵۴ھ ہے۔ عرب کا مشہور خطیب اور مقرر جس کی فصاحت و بلاغت ضرب المثل ہو گئی تھی۔ فارسی اور اردو ادبیات میں اکثر اس کی ذات اور اس کے کلام کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔[۳][۴]

(۴) **(حضرت) سید علی (ہمدانی):** یہ مسلّم ہے کہ ہندوستان کے لوگوں نے جو اسلام قبول کیا ہے، ان میں ان صوفیائے کرام کا اور ساداتِ عظام کا بڑا حصہ ہے۔ جو تبلیغ کی خاطر ملکوں ملکوں پھرتے رہے ہیں اور اپنا وطن چھوڑ کر کالے کوسوں کا سفر کرکے ہندوستان کے مختلف گوشوں میں آباد ہو گئے۔ کشمیر میں جن بزرگوں نے یہ فریضہ سرانجام دیا ہے ان میں سید جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں جہاں گشت، سید تاج الدین، سید حسین سمنانی (سمنان تہران سے کوئی ڈیڑھ سو میل شمال کی طرف ایک قصبہ ہے)، بہت مشہور ہیں۔

۱ـ مزدیسنا: محمد معین۔ حماسہ سرائی در ایران: ذبیح اللہ صفا۔

۲ـ تاریخِ ملل قدیمہ: محمود اعظم فہمی (علی گڑھ ۱۹۲۱ء)۔ غیاث اللغات۔

۳ـ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔

۴ـ جمہرۃ خطب العرب، جلد دوم (عربی) احمد زکی صفوت۔

سید تاج الدین اور سید حسین سمنانی کو سید علی ہمدانی نے کشمیر بھیجا تھا کہ تبلیغی سرگرمیوں کے لئے زمین ہموار کریں۔ یہ سید علی ہمدانی جو شاہ ہمدان کے نام سے اور امیر کبیر کے نام سے مشہور ہیں ۷۱۴ھ میں رجب کی بارھویں تاریخ کو متولد ہوئے۔ رحمت اللہ سے تاریخ ولادت برآمد ہوتی ہے ان کے والد کا نام سید شہاب الدین تھا اور یہ بات مسلم ہے کہ وہ حسینی سید ہیں۔

شاہ ہمدانی نے بچپن میں قرآن حفظ کیا، علوم منقول اور غیر منقول میں کمال حاصل کیا، تصوف کی منزلیں طے کیں اس کے بعد بیس اکیس سال تک وہ سیر و سیاحت میں مصروف رہے، اس دوران میں اکابر صوفیہ سے ملاقات ہوئی۔ قرائن اس بات کے مؤید ہیں کہ امیر تیمور نے انھیں مجبور کیا کہ اپنے وطن سے ہجرت کریں۔ چنانچہ شاہ ہمدان سات سو سادات عظام کو ہمراہ لے کر کشمیر میں وارد ہوئے۔ ان دنوں سلطان شہاب الدین حکمران تھا۔ پہلے شاہ ہمدان نے حج کیا، اس کے بعد ۷۸۱ھ میں وہ کشمیر میں مستقلاً اقامت گزیں ہو گئے۔ انھوں نے بہتر سال کی عمر میں وفات پائی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ان کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔ شاہ صاحب نے وفات تو پکھلی میں پائی تھی جو ہزارہ کے ضلع میں ہے لیکن مدفون ختلان میں ہوئے۔ ابوالفضل "آئین اکبری" میں لکھتا ہے کہ شاہ ہمدان کی وفات باجور کے قریب ہوئی لیکن بابر کا بیان یہ ہے کہ اُن کی وفات کنہار کے مقام پر ہوئی۔ شاہ صاحب صوفیوں کے اس دودمان سے تعلق رکھتے تھے جو شیخ نجم الدین کبریٰ خوارزمی سے منسوب ہے۔ ان لوگوں کا سلسلہ صوفیائے سہروردیہ سے ملتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خطہ میں شاہ ہمدان نے تبلیغ کے سلسلے میں بے نظیر کام کیا۔ ان کے چار پانچ مخلص رفقا تبلیغ میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے یعنی سید کمال، سید جمال الدین، سید رکن الدین سید محمد اور سید غلائی۔ شاہِ ہمدان نے کشمیر میں مختلف شہروں اور قصبوں میں بیمارستان یا ہسپتال کھلوائے اور یوں لوگوں کے جسمانی اور روحانی امراض کی شفایابی کا انتظام کیا۔

سلطان قطب الدین نے ان کی یاد میں ایک خوبصورت عمارت تعمیر کرائی جو زیارت

شاہ ہمدانی کہلاتی ہے۔ یہاں شاہ صاحب ذکروفکر میں محو رہتے تھے اور بیان کیا جاتا ہے کہ یہاں انھوں نے چلہ بھی کھینچا تھا۔ اس عمارت میں بیشتر دیودار کی لکڑی سے کام لیا گیا ہے شاہ ہمدان کی بہت سی تصانیف بھی مشہور ہیں جن میں ذخیرۃ الملوک سیاسیات سے متعلق ہے (یعنی اس بات سے بحث کرتی ہے کہ اچھی حکومت کے طریقے کیا ہیں اور بادشاہ میں کیا اوصاف ہونے چاہئیں) علامہ اقبال اس کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس کتاب کا نام کتاب الملوک ہے۔ اس قسم کی کتابیں فارسی ادب میں بہت کم لکھی گئی ہیں۔ اخلاق جلالی اور اخلاق ناصری میں اگرچہ آئین مملکت اور طریق حکومت سے بھی بحث کی گئی ہے لیکن ان دونوں کتابوں کا انداز علمی ہے، اس کے برخلاف نظام الملک کی مشہور کتاب سیاست نامہ اور فارسی ادب کا دوسرا شاہکار قابوس نامہ ایسی تصانیف ہیں جن میں مولف بڑے دلپذیر پیرایہ میں پادشاہوں کو مشورہ دیتے ہیں اور جو کچھ کہنا چاہتے ہیں افسانوں اور داستانوں کے ذریعہ اس کی تشریح کرتے ہیں۔ شاہ ہمدان نے بھی سیاست نامہ کے اسلوب کو ملحوظ رکھا ہے، شاہ ہمدان کی بیشتر تصانیف کی فہرست ڈاکٹر صوفی نے تاریخ کشمیر (انگریزی) میں دے دی ہے۔

شاہ ہمدان شعر بھی کہتے تھے اور ظاہر ہے کہ ان اشعار میں تصوف کا عنصر زیادہ نمایاں ہوتا تھا۔ خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کشمیری تاریخ اعظمی میں لکھتے ہیں کہ کشمیر میں ان کے ورود کی تاریخ ۷۸۱ھ ہے وہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ کشمیر میں جہاں وہ پہلے آکر ٹھہرے ہیں۔ اس جگہ کا نام مقدم شریف ہے انھوں نے ایک قطعہ تاریخ نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے کونسا مقام ان کے ورود سے مشرف ہوا ہے اور وہ کس سال تشریف لائے۔ قطعہ یہ ہے:

میر سید علی شہ ہمدان | سیر اقلیم سبع کرد نکو
شد مشرف ز مقدمش کشمیر | اہل آں شہر از و ہدایت جو

سال تاریخ مقدم او را   یابی از مقدم شریف او

تفصیل حساب ابجد کی یہ ہے:

م	=	۴۰
ق	=	۱۰۰
د	=	۴
م	=	۴۰
ش	=	۳۰۰
ر	=	۲۰۰
ی	=	۱۰
ف	=	۸۰
ا	=	۱
و	=	۶
مقدم شریف او	=	۷۸۱

خواجہ صاحب اور ڈاکٹر صوفی بھی لکھتے ہیں کہ قطب الدین نے دو سگی بہنوں سے نکاح کر لیا تھا۔ شاہ ہمدان نے سمجھایا تو ایک کو طلاق دیدی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب سلطان جابر کے سامنے کلمۂ حق کہنے سے دریغ نہ کرتے تھے کہ جہاد اکبر ہے۔ خواجہ صاحب نے ان کی تاریخِ وفات کے متعلق لکھا ہے کہ اس مصرعہ سے برآمد ہوتی ہے[1]

عقل تاریخ سال رحلت او   سیدما علی ثانی گفت

---

[1] کاشر (تاریخ کشمیر، انگریزی)؛ ڈاکٹر صوفی، دانش گاہ پنجاب۔
تاریخِ کشمیر اعظمی: مصنفہ خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کشمیری (مطبوعہ سری نگر)۔

ش

(۱) **شاپور**: شاپور اول ساسانی دودمان کا مشہور بادشاہ ہے۔ اردشیر نے اپنی زندگی ہی میں اسے نظم و نسق سلطنت میں شریک کرلیا تھا۔ ۲۴۱ء میں اردشیر کی وفات کے بعد شاپور تخت نشین ہوا۔ اس کے زمانہ میں ایرانی فوج نے بڑی شاندار فتوحات حاصل کیں بالخصوص رومیوں کے مقابلے میں، شاپور ہی کے زمانے میں مانی نے اپنے مذہب کی تبلیغ شروع کی۔ اس کی وفات ۲۷۲ء میں ہوئی[1]۔

(۲) **شبلی**: ابوبکر شبلی (متوفی ۹۴۵ء) (نفحات الانس) اصلاً خراسانی تھے اور منصور حلاج کے ہمدرس۔ وہ صوفیائے کرام کے ابتدائی عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ شوستری لکھتے ہیں کہ شبلی کے اقوال سے مترشح ہوتا ہے کہ عالم مادی غیر حقیقی اور اضافی ہے اور اصل وجود صرف خدا کا ہے۔ قاسم غنی بھی یہی لکھتے ہیں کہ بایزید، حلاج اور ابوبکر شبلی وحدت الوجود کے عقیدے کے قائل تھے۔

---

[1] تاریخ ایران (فارسی)، عبداللہ رازی ہمدانی تہران ۱۳۱۷ھ۔

(دیکھئے وجود، وحدت تلمیحات ز. و، رسم)[۵]۔

(۳) **شرف النساء**: ابو الفتح روشن اختر محمد شاہ کے زمانہ میں پنجاب کے حالات بہت بگڑ چکے تھے۔ سکھوں کی طاقت بتدریج بڑھ رہی تھی۔ نواب عبد الصمد خاں دلیر جنگ جو مغلوں کی طرف سے پنجاب کا حاکم تھا ان کی سرکوبی کرتا رہتا تھا لیکن اس کے باوصف صوبہ میں کاملاً امن قائم نہیں ہوتا تھا۔ نواب عبد الصمد خاں جو اصلاً تورانی تھا۔ فرخ سیر ہی کے زمانہ میں اپنی شجاعت اور تدبر کی دھاک بٹھا چکا تھا اور فرخ سیر ہی کے زمانہ میں اس نے کئی بار سکھوں کے سردار بندہ کو شکست بھی دی تھی۔ عبد الصمد نے لاہور ہی میں ۱۷۳۷ء میں جون کے مہینے میں وفات پائی۔ اس کے مرنے پر روشن اختر نے جو ان دنوں مسند نشین حکومت تھا اس کے بھائی قمر الدین خاں کو خلعت دیا اور اس کے بیٹے زکریا خاں کو خان بہادر کا خطاب دے کر لاہور اور ملتان کا حاکم مقرر کیا۔ شرف النسا بیگم اسی زکریا خاں کی لخت جگر تھی۔ وہ روزانہ تلاوت قرآن کرتی تھی اور جب تلاوت سے فارغ ہو جاتی تھی تو ایک تلوار اس کے قریب رکھ کر حجرہ سے نکل آتی تھی۔ مرنے سے پہلے اس نے وصیت کی کہ قرآن مجید اور تلوار میری قبر پر رکھ دیں۔ اس کا مقبرہ جو لاہور میں ہے سرو والا مقبرہ کہلاتا تھا جب سکھوں کو معلوم ہوا کہ شرف النساء کے مقبرہ میں ایک جواہر نگار مرصع تلوار موجود ہے تو وہ مقبرہ میں داخل ہو گئے اور تلوار اور قرآن لے گئے۔ پہلے مقبرہ کے ارد گرد ایک خوبصورت باغ تھا اور ایک تالاب بھی تھا جس کے آثار لطیف کے زمانہ تک موجود تھے[۶]۔

(۴) **شہاب الدین (سلطان)**: شہاب الدین نے کشمیر کے تخت پر آٹھویں صدی ہجری میں جلوس کیا۔ اس کے زمانہ میں کشمیریوں نے یا اہل خطہ نے اپنے عزم و استقلال اور

---

[۵] اسلامی ثقافت کا خاکہ: شوستری۔ تاریخ تصوف در اسلام: قاسم غنی۔

[۶] تاریخ پنجاب (انگریزی) لطیف۔ تاریخ لاہور (انگریزی، آثار قدیمہ): لطیف۔

اپنی شجاعت کے ایسے ثبوت مہیا کئے کہ اس کا زمانہ کشمیر کے مسلمان سلطانوں کا عہدِ زریں سمجھا جاتا ہے۔

شہاب الدین نے جلوس کرنے کے بعد پہلے عسکری تنظیم کی طرف توجہ دی پھر تسخیرِ ممالک کا ارادہ کیا۔ تبت کا ملک فتح کر لیا۔ اس میں لداخ اور بلتستان کا علاقہ شامل ہے۔ پھر کشتواڑ اور جموں بھی اس کی مقبوضات میں شامل ہو گئے۔ اس کے بعد وہ کئی لاکھ کا آزمودہ سپاہی لے کر پنجاب میں در آیا اور دریائے سندھ کے کنارے خیمہ زن ہو گیا۔ سندھ کے فرماں روا جام نے مدافعت کی لیکن اسے شکست ہوئی۔ افسوس ہے کہ سندھ کی تاریخ میں اس زمانہ کے حالات کم ملتے ہیں۔ سلطان شہاب الدین آگے بڑھتا چلا گیا اور اٹک سے سولہ میل ادھر تک پہنچ گیا۔ پھر پشاور میں وہ افغانوں سے نبرد آزما ہوا اور انھیں بھی شکست دی۔ اب کاشغر، بدخشاں اور کابل پر اس کا اقتدار مسلم ہو گیا۔ جب وہ واپس اپنے وطن کشمیر کو لوٹا تو راہ میں کانگڑہ کے راجہ نے اس کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اسے اپنا مولا و آقا تسلیم کر لیا۔

سلطان شہاب الدین کے کارنامے صرف عسکری فتوحات ہی تک محدود نہیں بلکہ اس نے بہت سے شہر آباد کئے مثلاً لچھمی نگر، شادی پور۔ ابوالفضل شادی پور کی بڑی تعریف کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ یہاں چنار اور چیل کی بہار دیدنی ہے۔

شہاب الدین نے انیس سال تک حکومت کی اور آٹھویں صدی ہجری کے آخر میں وفات پائی۔ روایتوں کا بیان یہ ہے کہ وہ سری نگر میں مہاراج گنج کے ڈاک خانہ کی عمارت کے نیچے مدفون ہے۔ علامہ سلطان شہاب الدین کا ذکر اسی لئے کرتے ہیں کہ اہلِ خطہ پر یہ بات واضح ہو جائے کہ ان کے آبا و اجداد بہت شجاع تھے۔[۱]

۱؎ کاشر (تاریخِ کشمیر): ڈاکٹر صوفی۔ تاریخِ کشمیر اعظمی: خواجہ اعظم۔

استدراک: سنِ جلوس کے متعلق کچھ اختلاف ہے۔ خواجہ محمد اعظم ۷۸۰ھ قلمبند کرتے ہیں لیکن بعض مورخوں نے ۷۵۵ھ سن جلوس بیان کیا ہے۔

ص

(۱) صادق از دکن: میر صادق پہلے ارکاٹ میں نواب حیدر علی کے دربار میں ملازم ہوا (یہی نواب حیدر علی ٹیپو سلطان کا والد تھا۔ متوفی سنہ ۱۷۸۲ء)۔

پہلے مختلف عہدوں پر فائز رہا پھر جب نواب حیدر علی کا نیّر اقبال عروج پر پہنچا تو اس کا دبیر خاص مقرر ہو گیا۔ میر نظام علی خاں نظام الملک اور میر عالم حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے خاص دشمن تھے۔ بتدریج میر صادق بھی ان کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ میر نظام علی خاں نے یہ سوچا کہ حیدر آباد کی سلطنت تبھی قائم رہ سکتی ہے کہ میسور کے اقتدار کا خاتمہ کیا جائے۔ چنانچہ اس نے میر صادق کو خریدا اور میر صادق کے ذریعہ دوسرے وزرا اور امرا بھی میر نظام علیخاں کے جاسوسوں کے گروہ میں شامل ہو گئے۔ اب جو کچھ میسور میں ہوتا تھا اس کی رتی رتی خبر حیدر آباد ارکاٹ، مدراس اور کلکتہ پہنچتی تھی یہی وجہ ہے کہ سلطان کے جتنے جنگی نقشے تھے وہ ناکامیاب ہوتے تھے۔ سرنگا پٹم کی لڑائی میں جب ٹیپو سلطان مرنے مارنے پر تیار ہو کر محل سے باہر نکلا

(۱۷۹۹ء) تو میر صادق نے اپنی غداری چھپانے کی ضرورت محسوس نہ کی جونہی سلطان محل سے باہر نکلا میر صادق نے واپسی کے تمام دروازے بند کرا دیے۔ اور اسی کی نشان دہی پر ٹیپو سلطان تین طرف سے محصور ہو کر شہید ہو گیا۔ سلطان کی شہادت کے بعد جب انگریزوں نے اس کی مقبوضات کی تقسیم کے لیے کمیشن بٹھایا تو میر صادق کو بھی اس کا ایک رکن بنایا اور اس نے اصرار کیا کہ سلطان کی اولاد کو اب حکمرانی کا موقع نہیں دینا چاہیئے۔

سلطان شہید کی تاریخِ وفات اس مصرع سے برآمد ہوتی ہے: ع

ٹیپو بوجہ دینِ محمد شہید شد

محمود خاں محمود بنگلوری لکھتے ہیں کہ کتاب الاعراس کے مطابق میر صادق بھی اسی دن مقتول ہوا جس دن سلطان ٹیپو شہید ہوا۔ سلطان کے ایک جاں نثار سپاہی نے جو اس کی نمک حرامی سے واقف ہو چکا تھا ــــــــــــــــــــــــ اس کا کام تمام کر دیا۔

اس واقعہ کے چار دن بعد اس کی لاش اسی جگہ گاڑ دی گئی۔ اب بھی لوگ آتے جاتے ...... اس کو لعنت سے یاد کرتے ہیں۔

اکثر داستانوں میں میر صادق کے قتل کی یہی داستان درج ہے لیکن محمود بنگلوری کہتے ہیں کہ میں انگریز مورخوں کی اس روایت کو زیادہ قابلِ اعتماد سمجھتا ہوں کہ میر صادق زندہ رہا اور سلطان کی مقبوضات کے سلسلہ میں جو کمیشن مقرر کیا تھا اسے اس کا رکن بنایا۔ البتہ محمود بنگلوری خود بھی یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اگر کمیشن والی روایت صحیح ہے تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ سلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد میر صادق کی زندگی کے متعلق کوئی معلومات نہیں ملتیں (دیکھئے ٹیپو سلطان)۔

مورلینڈ اور چٹرجی بھی یہی لکھتے ہیں کہ ٹیپو کا مقصد یہ تھا کہ انگریزوں کو ہندوستان

سے نکال دے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ غیر جانب دار مورخ بھی اس نکتہ سے آگاہ ہیں کہ سلطان ٹیپو نے جو لڑائیاں لڑی ہیں ان کا مقصد بھی یہی تھا کہ ہندوستان میں اغیار کی حکومت کا خاتمہ کر دے۔[۵]

---

۵ مشاہیر؛ غلام رسول مہر۔
مختصر تاریخ ہندوستان (انگریزی) مورلینڈ اور چیٹرجی۔
تاریخِ سلطنتِ خداداد: محمود بنگلوری (بنگلور ۱۹۳۴ء)۔

ط

(۱) طاسینِ گوتم: (توبہ آوردنِ آں رقاصۂ عشوہ فروش)

یہ کہنا مشکل ہے کہ علامہ اس حکایت میں بدھ کی زندگی کے کس مرحلہ کی طرف اشارہ کر رہے ہیں. جو حکایت عام طور پر مشہور ہے اور جس نے ادبیات میں نظموں اور گیتوں کا روپ دھارا ہے (ٹیگور نے بھی اس حکایت کو نظم کیا ہے) وہ یہ ہے کہ ایک رقاصہ نے (جو غالباً کسی مندر کی دیوداسی تھی اور برہمنوں ہی کی فرستادہ تھی کہ بدھ کی آزمائش ہو جائے) بدھ کو لبھانا چاہا اور یہ تجویز پیش کی کہ بدھ اس کی حسن اور جوانی سے لطف اندوز ہو اور اس کے ساتھ چلے (ایک شکل روایت کی یہ ہے کہ رقاصہ نے اسے بلا بھیجا) بہرحال گوتم بدھ نے انکار کیا اور یہ کہا کہ میں ہر دکھی کی آواز سنتا ہوں اور اس کے پاس چل کے جاتا ہوں لیکن تمہارے پاس پہنچنے کا ابھی موقع نہیں آیا) اس روایت کے مختلف خط و خال ہیں اور ایک بیان یہ بھی ہے کہ اس موقع پر بدھ نے رقاصہ کو ماتا کہہ کر پکارا جو اسے سخت ناگوار گذرا) بہرحال

رقاصہ واپس چلی گئی۔ کچھ عرصہ گذر گیا یا تو یہ رقاصہ بیمار ہو گئی یا اسے کوئی ایسی بیماری لاحق ہوئی کہ لوگ اس سے نفرت کرنے لگے۔ اب اس کا چاہنے والا کوئی بھی نہ رہا اور وہ خستہ و زار بیمار سڑک کے کنارے لیٹ رہی۔ اتفاق سے بدھ کا اس دن وہاں گذر ہوا ظاہر ہے کہ بدھ مت پیروؤں کے عقیدے کے مطابق یہ ملاقات اتفاقی نہ تھی سب لوگ کوئی تقریب منا رہے تھے اور یہ رقاصہ کس مپرسی کے عالم میں پڑی تھی۔ بدھ اس کے قریب گیا اور باوجود اس کے کہ رقاصہ کا چہرہ بیماری نے اور صدموں نے مسخ کر دیا تھا بدھ نے اسے پہچان لیا۔ اس کے چرن چھوئے اور کہا: ماتا! میں نے وعدہ کیا تھا کہ جب تمہیں میری واقعی ضرورت ہوگی میں حاضر ہو جاؤں گا۔

ٹیگور کی نظم یہاں ختم ہو جاتی ہے لیکن روایات کا بیان یہ ہے کہ رقاصہ نے توبہ کی اچھی ہو گئی اور بھکشوؤں کے گروہ میں داخل ہو گئی۔ پہلے اگرچہ بدھ اس بات کے خلاف تھا کہ عورتوں کو بھکشو بننے کا موقع دیا جائے لیکن وہ بتدریج اس بات کی طرف مائل ہوتا چلا گیا کہ عورتوں کو بھی بدھ کے قائم کردہ نظام میں داخل ہونے کی اجازت ملنی چاہیئے۔ اس کے باوجود عورتوں کے متعلق جو بدھ کے خیالات تھے ان میں کچھ زیادہ تغیر نہیں واقع ہوا۔ ہمفریز بدھ کی موت کی داستان بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ آنند جو بدھ کا سب سے محبوب چیلا تھا، بدھ کے قریب آیا اور بولا کہ: مہاتما! عورتوں کے متعلق ہمارا کیا رویہ ہونا چاہیئے؟

بدھ نے کہا: آنند عورتوں سے تو ملنا ہی نہیں چاہیئے۔

آنند بولا: لیکن ان سے ملاقات ہو جائے تو؟

بدھ نے کہا: تو ان سے بات نہ کرو۔

آنند نے کہا: لیکن مہاتما جی اگر وہ آپ سے بات کریں تو؟

بدھ نے جواب دیا: تو اس صورت میں آنند چوکنے رہنا۔

علامہ اقبال نے واقعہ کی جو صورت نقل کی ہے اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ رقاصہ نے بدھ کی تعلیمات سے متاثر ہو کر اسی وقت توبہ کر لی تھی۔[1]

(۲) **طاہر غنی (مُلّا)**: ملا طاہر غنی کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اصلاً خراسانی ہے۔ لیکن ڈاکٹر صوفی یہ کہتے ہیں کہ اس روایت کی تائید میں قوی دلائل مہیا نہیں ہو سکے۔ تاریخ ولادت کے متعلق بھی کچھ اختلاف ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کی تاریخِ ولادت ۱۰۴۰ھ ہے اور بعض کا بیان ہے کہ اس کی تاریخ ولادت کے متعلق تحقیق سے کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مسلّم ہے کہ غنی نے تعلیم و تربیت ملا محسن فانی سے حاصل کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے جو غنی تخلص اختیار کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ بطریق حساب ابجد غنی کے حروف کا مجموعہ ۱۰۶۰ھ بنتا ہے اور اسی سن سے غنی نے شعر کہنا شروع کیا۔ ڈاکٹر صوفی کا خیال یہ ہے کہ اس نے غنی تخلص اس لئے اختیار کیا تھا کہ وہ اپنے فطری اور طبعی استغناء کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس نے کشمیر سے باہر قدم نہیں نکالا مگر غنی کا ایک شعر اس کی تردید کرتا ہے:

گر دست ہوائے ہند دگیر مرا
اے بخت رساں بباغ کشمیر مرا

کہا جاتا ہے کہ وہ راجوری کے قریب مقیم تھا اور جب گھر سے باہر جاتا تھا تو اسے غیر مقفل چھوڑ جاتا تھا کہ اس کے قول کے مطابق اس کے جانے کے بعد گھر میں کوئی ایسی چیز نہیں رہتی تھی جسے قیمتی کہا جا سکے۔

---

[1] مور لینڈ: تاریخ ہندوستان۔ ہمفریز: بدھ ازم (انگریزی)، مڈل سکس ۱۹۵۲ء۔

غنی کی زندگی میں جو لوگ کشمیر کی نیابت کے عہدہ پر فائز رہے ہیں ان میں سے اکثر سخن سنج اور سخن گو تھے اس لئے غنی کی بڑی قدر دانی کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے دیوان میں ایک لاکھ اشعار تھے۔ اس کا دیوان مطبوعہ اور قلمی عام ملتا ہے پنجاب یونیورسٹی میں اور پبلک لائبریری لاہور میں اچھے قلمی نسخے موجود ہیں۔

ڈاکٹر صوفی کہتے ہیں کہ غنی کی قوتِ متخیلہ حیرت انگیز طور پر عمل پیرا رہتی تھی تھوڑی ہی مدت میں اس نے دقیقہ سنجی میں نام پیدا کر لیا۔ اس کا بھائی محمد زماں بھی ادیب اور انشاپرداز تھا۔ ڈاکٹر صوفی بیان کرتے ہیں کہ غنی کی تاریخ وفات ۱۶۶۸ء ہے۔ یہ تو مسلم ہے کہ وہ سری نگر کے گرد و نواح میں مدفون ہے لیکن ابھی تک اس کی قبر شناخت نہیں ہو سکی۔ خواجہ محمد اعظم لکھتے ہیں کہ غنی قبیلہ اشائی سے متعلق تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس زمانہ میں غنی جیسا خوش خیال اور نازک بند کوئی شاعر نہیں تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ محمد اعظم اس بات کا سراغ دے رہے ہیں کہ غنی اُس ہندی فغانی دبستان سے تعلق رکھتا ہے جس کی خصوصیات مولانا شبلی نے شعر العجم کی تیسری جلد کے ابتدا میں گنائی ہیں یعنی دقیقہ سنجی، خیال بندی، معنی آفرینی، مبالغہ، لفظوں کی مینا کاری وغیرہ وغیرہ۔ صاحب سروِ آزاد لکھتے ہیں کہ:

"طبع بلند داشت۔ آخر بغواصیِ بحرِ سخن افتاد و جواہر یکہ بر نقد جاں تواں خرید بیروں آوردہ"

یعنی ایسے شعر کہے کہ جان دے کر خرید ے جائیں تو سستے ہیں۔ سروِ آزاد میں غنی کی تاریخِ وفات ۱۰۷۹ھ ہے۔ غنی کا اُستاد مُلا محسن فانی اکابرِ کشمیر میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے علم و فضل اور اس کی انتظامی قابلیت کا یہ عالم تھا کہ پہلے دارا شکوہ کا مصاحب ہوا اور پھر صدارتِ کشمیر کے عہدہ پر فائز ہوا ریُو نے نسبتاً تفصیل سے اس کے حالات قلمبند کئے ہیں۔

عموماً علامہ اُن شعرا کو پسند نہیں کرتے جن کے کلام میں صرف خیال بندی اور مبالغہ پایا جائے لیکن غنی کبھی کبھی ایسا شعر بھی کہہ جاتا ہے کہ جس سے خواہ مخواہ کی خیال آرائی کے تمام گناہوں کی تلافی ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے علامہ کو اس سے عقیدت ہے۔ غنی کے ایک شعر کو علامہ نے تضمین بھی کیا ہے یعنی :

غنی روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

یہ نظم بانگِ درا میں موجود ہے اور یوں شروع ہوتی ہے :

کبھی اے نوجواں مسلم تدبّر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں ہے تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

(۳) طواسین : ایک فرضی وادی کا نام ہے۔

لہ تاریخ کشمیر اعظمی : خواجہ محمد اعظم دیدہ مری۔ کاشر (تاریخ کشمیر) : صوفی۔
سہ روِ آزاد : آزاد بلگرامی۔

ع

(۱) عارفِ ہندی (جہاں دوست): قیاس چاہتا ہے کہ اس سے مراد مشہور رشی وشوامتر ہو، جس کی پرہیزگاری، اتقا اور اخلاقی سربلندی کی داستانیں اب تک مشہور ہیں۔ وشوامتر کا زمانہ ایک ہزار سال قبل مسیح سے پہلے پڑنا چاہیے (یہ مورخوں کی رائے ہے لیکن روایات کا بیان یہ ہے کہ وشوامتر کا زمانہ پانچ ہزار سال قبل مسیح ہے[۱]۔

(۲) عبدالصمد: دیکھیے شرف النسا۔

(۳) عسر (بت): فرضی نام معلوم ہوتا ہے۔

---

[۱] مزدیسنا: محمد معین۔

غ

(۱) غسر (بُت): فرضی نام معلوم ہوتا ہے۔

(۲) غیرِ حق ہر شے کہ بینی ہالک است: اس مصرعہ میں قرآن کی ان آیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

وما کنت ترجوا ان یلقی الیک .... والیہ ترجعوا

ترجمہ یہ ہے:

اور آپ کو یہ توقع نہ تھی کہ آپ پر یہ کتاب نازل کی جائے گی مگر محض آپ کے رب کی مہربانی سے اس کا نزول ہوا سو آپ ان کافروں کی ذرا تائید نہ کیجیے اور جب اللہ کے احکام آپ پر نازل ہو چکے تو ایسا نہ ہونے پائے کہ یہ لوگ آپ کو ان احکام سے روک دیں اور آپ اپنے رب کی طرف بلاتے رہیے اور نہ مشرکوں میں شامل ہو جیے اور اللہ کے ساتھ کوئی معبود نہیں سب چیزیں فنا ہونے والی ہیں بجز اس کی ذات کے اس کی ہی حکومت ہے اور اس ہی کے پاس تم سب کو جانا ہے۔

ف

(۱) فسر ۱۶ اس بُت کے متعلق معلومات حاصل نہ ہوسکیں گمان ہوتا ہے کہ شاید فرضی نام ہو۔

(۲) **فضیل بن عیاض :** (متوفی ۸۰۲ء / ۱۸۷ھ) صوفیوں کے اس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کا مسلک ریاضت تھا اور جو بجائے فلسفیانہ موشگافیوں کے اعمال نیک پر زور دیتے تھے۔ آپ کوفہ کے رہنے والے تھے لیکن بعض مورخوں نے یہ کہا ہے کہ آپ اصلاً خراسانی ہیں۔ تاریخ تصوف در اسلام میں جس کے حوالے پہلے دئے جاچکے ہیں۔ آپ کے بہت سے اقوال منقول ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں محمد معین کے سامنے تذکرۃ الاولیا کے سوا اور کوئی کتاب نہ تھی۔ مولانا جامی نے نفحات الانس میں ان کا ذکر کیا ہے ان کے کچھ قول ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں:

"تمام برائیاں ایک جگہ جمع کی جاسکتی ہیں اور ان سے نجات پانے کا راستہ ایک ہی ہے یعنی دنیا سے دشمنی۔"

یہاں بھی ترک علائق دنیوی پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ پھر فرمایا:

"دنیا سے تعلق قائم کرنا آسان ہے لیکن یہ تعلق منقطع کرنا اور نجات پانا بہت مشکل ہے"۔

"جو شخص خدا کو پہچانتا ہے معرفت خود اس کی پرستش کرتی ہے" (کہ یہ اس کا حق ہے)۔

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ فضیل بن عیاض صوفیا کے اس گروہ سے متعلق تھے جسے براؤن نے طبقۂ اول کا نام دیا ہے اور جو بیشتر ترک دنیا، زہد اور تقویٰ پر زور دیتا تھا۔ یہی ترک دنیا کی تعلیم بعد میں ایسی صورت اختیار کر گئی کہ اس سے بہت سی خرابیاں پیدا ہو گئیں۔

(۳) **فلاطوس**: ۲۶ء سے ۳۶ء تک یہ رومی سردار یہودیہ کا حاکم تھا اور قیصر روم کی نیابت اسی کے سپرد تھی۔ نئے عہد نامہ میں اس کا نام پلاطیس بتایا گیا ہے لیکن علامہ نے اس کی دوسری شکل فلاطوس کو ترجیح دی ہے۔ حضرت عیسیٰ اسی کے زمانہ میں انجیل کے بیان کے مطابق مصلوب ہوئے۔ فلاطوس کی زندگی کے متعلق تفصیلات بہت کم ملتی ہیں بعض مورخ لکھتے ہیں کہ اس نے خودکشی کر لی تھی۔

یہ درست ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ کو سزا دینے پر آمادہ نہ تھا اور سمجھتا تھا کہ وہ بے قصور ہیں لیکن بنو اسرائیل کا دباؤ اتنا زیادہ تھا کہ وہ ان کی گرفتاری کا حکم دینے پر مجبور ہوا۔ اس واقعہ کی کچھ تفصیلات یہودا اسقروطی (نئے عہد نامہ میں اس کی شکل اسکریوتی ہے) کے سلسلہ میں لکھی جا چکی ہیں۔ اناطول فرانس نے اپنے ایک مختصر افسانہ میں فلاطوس کی زندگی کے آخری سالوں کے متعلق ایک واقعہ قلمبند کیا ہے۔ اسے ایک قدیمی دوست ملتا ہے۔ گزرے ہوئے زمانے کی باتیں ہونے لگتی ہیں تو وہ اسے یاد دلاتا ہے کہ یسوع مسیح نامی ایک شخص کو یہودیوں

۱؎ نفحات الانس: عبدالرحمن جامی۔ تذکرۃ الاولیاء: عطار۔

تاریخِ تصوف در اسلام: محمد معین۔ تاریخِ ادبیاتِ ایران: شفق۔

کے کہنے پر اس کے عہد میں مصلوب کیا گیا۔ فلاطوس اپنے ذہن پر بہت زور ڈالتا ہے لیکن اسے یہ واقعہ بالکل یاد نہیں آتا۔ طنز کے اعتبار سے یہ افسانہ اپنی نظیر آپ ہے اور اس اعتبار سے بہت حیرت انگیز ہے کہ ایک عیسائی مصنف کا تحریر کردہ ہے۔[۳]

(۴) **فواد**: سولھویں صدی عیسوی سے مصر ترکیہ کی مقبوضات میں شامل ہو گیا تھا لیکن اُنیسویں صدی کی ابتدا میں محمد علی پاشا نے جو ترکیہ سلطنت کا نائب تھا اس نے خدیو کا لقب اختیار کر کے خود مختاری کا دم بھرنا شروع کر دیا اس کے بعد محمد علی کی اولاد کا لقب سرکاری طور پر خدیو ہو گیا۔ جب سوئز کی نہر کی تعمیر ہوئی اور مصر کی اہمیت بڑھ گئی تو برطانیہ نے مصر کو اپنے دائرۂ اقتدار میں شامل کر لیا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد مصر ان ملکوں میں شامل تھا جن کی حفاظت برطانیہ پر فرض تھی۔ انہی دنوں میں عباس حلمی ثانی جو قیصر جرمنی کا حلیف تھا معزول کر دیا گیا اور اس کی جگہ شہزادہ حسین کامل کو تخت پر بٹھایا گیا۔ ۱۹۱۷ء میں جب اس کی وفات ہوئی تو شاہ فواد تخت نشیں ہوا۔ علامہ نے اسی شاہ فواد کی طرف اشارہ کیا ہے۔

شاہ فواد کی وفات ۲۸ اپریل ۱۹۳۶ء میں ہوئی؛ اور اس کے بعد اس کا بیٹا فاروق اول تخت نشیں ہوا۔[۴]

(۵) **فیصل**: عراق ۱۹۱۸ء تک ترکیہ مقبوضات کا جزو رہا۔ اس کے بعد برطانیہ اس میں متصرف ہو گیا۔ ۱۹۲۰ء امیر فیصل جو شاہ حسین سلطانِ حجاز کا لڑکا تھا اور ہاشمی تھا شام سے عراق آ گیا اور وہاں کا سلطان بن بیٹھا۔ آخر اس کی امارت کے معاملہ پر پبلک کے ووٹ لئے گئے۔ ۹۶ فی صدی لوگوں نے اس کے حق میں ووٹ دئے اور اس کی سیادت کو تسلیم کر لیا۔ سلطان فیصل اول کی وفات ۱۹۳۳ء میں ہوئی۔[۵]

---

[۱] چیمبر بائیگرافیکل ڈکشنری صفحہ ۳۴۷ ۔ [۲] قصص القرآن (جلد چہارم) حفظ الرحمٰن ۔ [۳] اناطول فرانس: مختصر فسانے: انگریزی ترجمہ

[۴] قاموس سیاسیاتِ عالم، فیبر اینڈ فیبر ۔ [۵] قاموس سیاسیاتِ عالم: فیبر اینڈ فیبر ۔

ق

(۱) **قرۃ العین طاہرہ:** (دیکھئے باب)۔

قرۃ العین طاہرہ نہایت خوش تقریر، خوش وضع اور خوش جمال خاتون تھی۔ اس نے بابی عقائد کی تبلیغ میں نمایاں حصہ لیا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کی سیرت اور کردار کے جو پہلو ہمارے سامنے آئے ہیں ان میں دشمنوں کے تعصب کو کہاں تک دخل ہے، بہرحال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرۃ العین طاہرہ کی خانگی زندگی خوشگوار نہ تھی۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کا دامن گناہوں سے بھی ملوث تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ طاہرہ نے اپنی خوش تقریری سے ایران میں آگ لگا دی۔ باب کے عقائد کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تبلیغ کرنے والوں میں قرۃ العین ایسی خاتون بھی شامل تھی کہ جہاں تقریر کرنے کھڑی ہو جاتی تھی ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے تھے۔

یہ تحقیق نہیں ہو سکا کہ اس نے تعلیمی اعتبار سے کیا مقام حاصل کیا تھا۔ لیکن یہ مسلّم ہے کہ وہ ایک تخلیقی فن کار تھی۔ جو گنتی کی چند غزلیں ہم تک پہنچی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے

کلام میں جوش، خلوص اور صداقت تھی۔ ایران سے ایک بار اس کی غزلیات کا مختصر سا مجموعہ شائع ہوا تھا لیکن آج کل غالباً نایاب ہے۔

قرۃ العین کا اصلی نام زرین تاج تھا۔ اس کے والد کا نام ملا صالح تھا کہ قزوین کا رہنے والا تھا اور شیعی علما میں ممتاز تھا۔ جو مذاہب کے متعلق ہمدردانہ نقطۂ نظر رکھتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ زرین تاج کو حدیث، تفسیر، فقہ، الٰہیات اور فلسفہ کی تعلیم دی گئی۔ سن بلوغ کو پہنچی تو مجتہد ملا محمد تقی کے بیٹے ملا محمد کے ساتھ اس کی شادی کر دی گئی۔ اس اثنا میں علی محمد باب کی تبلیغات کا شہرہ قزوین پہنچا تو قرۃ العین نے باب سے خط و کتابت شروع کی اور آخر اس پر ایمان لے آئی۔ باب نے قرۃ العین کو تبلیغ کا حکم دیا اور ساتھ ہی قرۃ العین کا خطاب بھی عطا کیا۔ اس سے پہلے گھر والے اسے طاہرہ کہہ کے پکارتے تھے۔ چنانچہ اس کا پورا نام اب زرین تاج قرۃ العین طاہرہ کتابوں میں مندرج ہوتا ہے۔

قرۃ العین نے باب کے احکام کے مطابق بابیت کی تبلیغ شروع کی اور پہلے اپنے خسر، اپنے باپ اور اپنے شوہر کو باب کا معتقد بنانا چاہا۔ جب شوہر کسی طرح راضی نہ ہوا تو قرۃ العین نے یہ کہا کہ میں طاہرہ ہوں، باب کی تعلیم امر حق ہے اور میرا شوہر امر حق کو مسترد کرکے ملعون ہو چکا ہے اور اس لئے شرعاً ہم دونوں میں تفریق واقع ہو چکی ہے جس کی نوعیت طلاق قانونی کی ہے۔ دلیل یہ پیش کی کہ رسولؐ خدا کے عہد میں جن مسلمان عورتوں کے شوہر کافر رہے تھے رسولؐ پاک نے انھیں بے طلاق مسلمانوں کے عقد میں دے دیا۔

قرۃ العین نے پہلے کربلا میں اپنی تبلیغ کا مرکز قائم کیا اور پردہ میں بیٹھ کر مصروف درس و تدریس ہوئی۔ شسرنے لکھا ہے کہ قرۃ العین مزدک کی ہم خیال تھی اور یہ تبلیغ کرتی تھی کہ یہ جائز نہیں کہ عورت ایک ہی آدمی کی پابند کر دی جائے لیکن یہ بیان قطعاً غلط ہے۔ پروفیسر براؤن لکھتے ہیں

کہ میں نے صبح ازل سے پوچھا کہ کیا قرۃ العین نے پردہ اتار دیا تھا تو صبح ازل نے جواب دیا کہ یہ غلط ہے البتہ تقریر کے دوران میں کبھی کبھی نقاب اُلٹ دیتی تھی۔

کربلا سے قرۃ العین بغداد گئی، وہاں سے کرمان شاہ اور پھر ہمدان۔ اس سفر کے دوران میں اس کی تبلیغ برابر جاری رہی، اب قرۃ العین کے اختلافات اپنے خسر سے بہت بڑھ گئے تھے جو مورخ قرۃ العین کے مخالف ہیں وہ لکھتے ہیں کہ اسی کے ایما پر ملا محمد تقی کو بابیوں نے ہلاک کر دیا۔

اس واقعہ نے شہر میں آگ لگا دی اور قرۃ العین نے خیریت اسی میں دیکھی کہ وہ خراسان کی طرف چلی جائے۔ یہاں باب کا داعی ملا محمد علی بارفروشی اس سے ملا۔ اس ملاقات کے متعلق قرۃ العین کے مخالف بہت باتیں بناتے ہیں اور یہ بیان کرتے ہیں کہ قرۃ العین اور ملا محمد علی کے تعلقات کی اساس فسق پر تھی لیکن اس کی کوئی مستند دلیل مہیا نہیں ہو سکتی۔

باب کے مرنے کے بعد جب ناصر الدین شاہ پر قاتلانہ حملہ کیا گیا تو بہت سے لوگ اس الزام میں ماخوذ کیے گئے کہ وہ قتل کی سازش میں شریک تھے۔ ان میں قرۃ العین بھی تھی۔ اس کی ہلاکت کے احکام صادر کیے گئے۔ یہ مسلّم ہے لیکن اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ اسے کس طرح ہلاک کیا گیا۔ ایک بیان یہ ہے کہ اس کا گلا گھونٹ دیا۔ ایک یہ کہ اسے کنوئیں میں دھکیل دیا اور پھر اسے پتھروں سے پاٹ دیا۔ یہ ۱۸۵۲ء کا واقعہ ہے۔ قرۃ العین کی جو نظم علامہ نے نقل کی وہ بہت اچھی ہے لیکن مؤلف کے خیال میں قرۃ العین کا وہ قصیدہ بہت اچھا ہے جس کا پہلا مصرع ہے: ع

جذبات شوقک الجمت بسلاسل الغم والبلا

اس قصیدہ میں عربی ٹکڑوں کی تضمین بہت خوبصورتی سے کی گئی ہے۔ بعض کے مصرعے ہی عربی ہیں۔ اس کے کچھ اشعار جن میں عربی ٹکڑے نسبتہً کم ہیں نقل کئے جاتے ہیں:

تو و ملک و جاہ سکندری، من و رسم و راہِ قلندری — اگر آں خوش است تو درخوری و گر ایں بد است مرا سزا

من دعشق آں مہ خوبرو کہ چو زد صلائے بلا برو — کہ نشاط و قہقہہ شد فرو کہ انا الشہید بکربلا
بجوابِ طبلِ الست تو زدلا چو کوس بلیٰ زدند — ہمہ خیمہ زد بدرِ دلم سپہ غم و حشم و بلا[1]

(۲) قریہ ہا از دخلِ شاہاں خوار و زبوں

اشارہ ہے آیتِ قرآنی کی طرف جس کا حوالہ یہ ہے ۲۷/۳۴

ترجمہ اس آیت کا یوں ہے :

بے شک جب بادشاہ کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو ویران کر دیتے ہیں اور وہاں کے باعزت لوگوں کو ذلیل کرتے ہیں۔

پچھلے زمانے میں بادشاہ تسخیر ممالک کے بعد اکثر فوج کو اجازت دیتے تھے کہ وہ شہروں کو لوٹ لے علاوہ ازیں سفر کرتے وقت بھی ملوک اپنی افواج کے لئے جس طرح چاہتے تھے رسد حاصل کر لیتے تھے۔ اس غارت گری کی طرف اردو اور فارسی اشعار میں اکثر اشارہ کیا گیا ہے۔ سب سے مشہور شعر نظامی گنجوی کا ہے جس نے قرآن مجید کی اس آیت کی طرف بڑی خوبصورتی سے اشارہ کیا ہے (سکندر نامہ) :

پئے شاہ او آفتابی کند — بہر جا کہ آید خرابی کند[2]

(۳) **قشمرود**: علامہ لکھتے ہیں: "نام کوہے از کہستانِ قم"۔
ظاہر ہے کہ ایک فرضی نام ہے۔

---

[1] نقطۃ الکاف: حاجی میرزا جانی **Episode of the Bab, Browne** (Cambridge)
تاریخِ ادبیاتِ ایران (جلد چہارم) براؤن۔

[2] نظامی گنجوی: سکندر نامہ۔ — گنجینۂ گنجوی: وحید دست گردی۔

ک

(۱) کرم (حضرت ایوب): حضرت ایوب علیہ السلام کا تعلق بھی بنی اسرائیل سے ہے۔ سید سلیمان ندوی کی تحقیق یہ ہے کہ ان کا زمانہ ایک ہزار اور سات سو قبل مسیح کے درمیان ہے۔ توراۃ میں یوباب نامی ایک بادشاہ کا ذکر آتا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن کا خیال ہے کہ یہی یوباب حضرت ایوب علیہ السلام ہیں البتہ وہ ان کے زمانہ کے متعلق سید سلیمان ندوی سے اختلاف رکھتے ہیں اور بیان کرتے ہیں کہ ان کا زمانہ ۱۵۰۰ اور ۱۳۰۰ قبل مسیح کی حدود میں ہے۔ بہرحال قرآن پاک میں حضرت ایوب کے متعلق سورۂ ص میں یہ تخصیص کہا گیا ہے کہ وہ دکھ میں پڑ گئے تھے، خدا نے ان کی دعا قبول کرلی اور ان کا دکھ دور کردیا۔ ان کو اہل و عیال عطا کیے اور ان کو صبر کرنے والا پایا۔ اسرائیلی روایات میں یہ مندرج ہے کہ حضرت ایوب کے بدن میں پھوڑے نکل آئے تھے اور بعض پھوڑوں کی یہ حالت تھی کہ گل سڑ گئے تھے۔ مفسرین قرآن نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ نبی کو ایسا مرض لاحق نہیں ہوتا جو انسانوں کی نظر میں قابل نفرت ہو کہ اس سے امر حق کی تبلیغ

میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ دوسرا اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ اسرائیلی روایات غیر مستند ہیں بہرحال اردو ادب کی تلمیحات میں یہ تلمیح شامل ہے کہ حضرت ایوب کے بدن پر ایسے پھوڑے تھے جن میں کیڑے پڑ گئے۔ علامہ مرحوم نے بھی اس معاملہ میں ادبی تلمیح کو ملحوظ رکھا ہے۔ (قصص القرآن)

(۲) **کچنر، کشنر (ذوالخرطوم):** لارڈ کچنر جو اپنے زمانے میں جنگی چالوں کا ماہر سمجھا جاتا تھا ۱۸۵۰ء میں متولد ہوا۔ بیسویں صدی کے شروع میں وہ جنوبی افریقہ میں انگریزی فوج کا کمانڈر ان چیف تھا۔ ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۹ء تک ہندوستان میں برطانوی افواج کا کمانڈر رہا۔ ان دنوں لارڈ کرزن سے اس کی جھڑپ ہوئی اور متنازعہ فیہ امر یہ تھا کہ نظم و نسق سلطنت میں آیا کمانڈر ان چیف نائب السلطان یعنی وائسرائے کا محکوم ہے؟ برطانوی حکومت نے کرزن کے حق میں اور کچنر کے خلاف فیصلہ دیا۔ پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں کی بہت سی توقعات اس سے وابستہ تھیں لیکن جنگ کے آغاز ہی میں جس جہاز میں سوار ہو کر وہ جا رہا تھا اسے جرمنوں نے غرق کر دیا۔ (۱۹۱۶ء)

جس وقت مصر میں مہدی سوڈانی نے حریت کی تحریک شروع کی اور انگریزی افواج کو پے در پے شکستیں اٹھانی پڑیں تو لارڈ کچنر کو مصر بھیجا گیا تاکہ وہاں کا نظم و نسق انگریزوں کے دل خواہ درست کر دے۔ کچنر نے مہدی سوڈانی کی تربت کھدوا کر اس کی ہڈیاں سمندر میں بہا دیں۔ ذوالخرطوم کچنر ہی کی طرف اشارہ ہے۔ کچنر نے خرطوم کے مقام پر مہدی سوڈانی کے جانشین عبداللہ کی افواج کو شکست دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسے ذوالخرطوم کہا گیا۔

(۳) **کل یوم:** سورۂ رحمٰن کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے:

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ

جس کا مطلب یہ ہے کہ:

ہر روز وہ ایک حالت میں ہے

یہاں علامہ نے مردِ حق کے متعلق یہ کہا ہے کہ خدا کی طرح وہ بھی لحمہ بہ لحمہ ایک نئے مرحلے سے گذرتا ہے یعنی اس کے کرشمے، اس کے طریقے۔ معراج بھی ایک مختلف سطح حیات پر زندگی بسر کرنے کا نام ہے۔ مومن یا قلندر کو اس زندگی کے بسر کرنے کا راز معلوم ہوتا ہے۔[1]

(۴) کیمیائے آفتاب: آفتاب کی حدت جو کم نہیں ہوتی۔ اس کے متعلق ایک نظریہ یہ پیش کیا گیا ہے کہ اس میں خود بخود وقتاً فوقتاً جوہر فرد پھٹتا ہے۔ اس سے روشنی اور گرمی پیدا ہوتی ہے۔ سورج کی جو تصویریں لی گئی ہیں ان میں ایسی بھی ہیں جن میں معلوم ہوتا ہے کہ شعلے ہزاروں میل تک سورج کے کناروں سے بلند ہو رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس وقت کی تصویریں ہیں جب سورج میں کوئی جوہر فرد پھٹا ہے۔ یہ کوشش بھی کی جا رہی ہے کہ سورج کی روشنی سے اتنی قوت حاصل کی جائے کہ وہ بجلی کی جگہ لے سکے۔ اس سے پہلے علامہ اقبال جوہر فرد، ذرہ اور خورشید کا تعلق اس شعر میں بیان کر چکے ہیں:

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرہ کا دل چیریں

یہ شعر بھی توجہ کا محتاج ہے:

کمال وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوک نشتر سے تو جو چھیڑے
یقیں ہے مجھ کو گرے رگِ گل سے قطرہ انسان کے لہو کا[2]

---

[1] خطبات: علامہ اقبال۔

[2] بانگ درا۔

Universe Around Us: James Jeans.

ل

(۱) **لا یراعی لا یخاف:** اس عربی عبارت کا مطلب یہ ہے کہ وہ نہ کسی کی رعایت کرتا ہے اور نہ کسی سے خوف کھاتا ہے۔

(۲) **لاہوت:** علامہ نے خود لکھا ہے کہ لاہوت کے معنی روح ہیں۔ لاہوت کے اصطلاحی معنی بھی ہیں، صاحبِ غیاث لکھتے ہیں:

"عالم ذات الٰہی است کہ سالک را دراں مقام فنا فی اللہ حاصل می شود و مرتبہ صفات را جبروت و مرتبہ اسماء را ملکوت نامند از کشف و لطائف۔"

صاحبِ غیاث یہ بھی لکھتے ہیں کہ لاہوت لاہ سے مشتق ہے اور لاہ اصل میں الٰہ ہے اور یہ لیہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں چھپنا اور صراح کی سند دیتے ہیں۔

واضح رہے کہ صاحبِ مصطلحاتِ صوفیہ فرماتے ہیں کہ ملکوت عالم غیب کو کہتے ہیں جو ارواح نفوس سے مخصوص ہے اور ابن العربی کی سند دیتے ہیں[1]۔

---

[1] فرہنگ مصطلحاتِ صوفیہ نقل از تاریخ تصوف در اسلام (قاسم غنی فارسی ۱۳۲۲ھ شمسی تہران)۔ غیاث اللغات (۱۳۷۲ھ قمری)۔

(۳) لن تنالوا البر: اشارہ ہے چوتھے پارہ کی پہلی آیت کی طرف جو یہ ہے

لن تنالوا البر حتی تنفقوا

جس کا ترجمہ یہ ہے کہ

تم ہرگز نیکی حاصل نہ کرو گے جب تک کہ راہِ خدا میں صرف نہ کرو

اس مرحلہ پر یہ سبق دیا جا رہا ہے کہ دولت کا کچھ ہاتھوں میں مرتکز ہو جانا نظام معاشرت کے لئے سخت مہلک ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام نے وراثت کے قانون ایسے رکھے ہیں کہ دولت کے بڑے بڑے انبار چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہوتے رہتے ہیں اس طرح انسان پھر کوشش اور ہمت سے کام لینے پر مجبور ہوتا ہے اور علاوہ ازیں ریاست کی دولت کا فائدہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچتا ہے۔ جہاں پر دولت کے بڑے بڑے مرکز سا ہو کارے بینک، منڈیوں کے سلسلے قائم ہو جاتے ہیں اور گنتی کے چند لوگ ان پر متصرف ہو جاتے ہیں وہاں پر ایک مصنوعی اقتصادی نظام پیدا ہو جاتا ہے۔ اقتصادی بدحالی اور خوش حالی کا انحصار گنتی کے ان اشخاص پر ہوتا ہے جو ذرائع پیداوار پر متصرف ہوتے ہیں۔ قرآن مجید ذرائع دولت کے ارتکاز کی شدید مخالفت کرتا ہے لیکن وہ فرد کو یہ موقع بھی دیتا ہے کہ ہمت کر کے دوسروں سے آگے نکل جائے اور دوسروں سے زیادہ باثروت ہو جائے۔ یوں اسلام کا اقتصادی نظام الغنی کی حفاظت کا بھی ذمہ دار ہے اور اجتماعی مفاد کو بھی ملحوظ رکھتا ہے۔

(۴) لی مع اللہ وقت: حدیث نبوی کی طرف اشارہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ میرے لئے اللہ کے ساتھ وقت ہے۔

علامہ کے تصور زمان و مکان کے سلسلے میں اس بات سے بحث کی جا چکی ہے کہ وقت کے متعلق ان کے نظریات کیا تھے۔ ظاہر ہے کہ جاوید نامہ میں زروان یہ کہنا چاہتا ہے کہ

ایک وقت تو وہ ہے جو اس دنیا سے منسوب ہے اور ایک وقت کا وہ دھارا ہے جو مسلسل رواں ہے اور جس میں ہر لحظہ حال ماضی میں تبدیل ہوتا ہے اور مستقبل حال بن جاتا ہے۔ اس وقت میں سفر کرنا گویا دنیا کے وقت سے ماورا، ایک سطح پر سفر کرنا ہے اور یہی یہاں علامہ مرحوم کی مراد ہے۔

(دیکھئے تلمیحاتِ زبورِ عجم، تصورِ زمان ومکان)

م

(۱) **مرو:** خراسان کا مشہور شہر ہے۔ اسی کے نام سے خراسان کا ایک حصہ ربع مرو بھی کہلاتا ہے۔ مرو دو ہیں ایک مرو کلاں ایک مرو خورد۔ مرو کلاں کو مروِ شاہ جاں بھی کہتے ہیں اور شاہ جاں کا مطلب ہے شاہِ گاں یعنی شاہوں کے قابل۔ مرو کے ریشمی کپڑے بہت مشہور تھے۔ سلاجقہ کبیر کا آخری تاجدار سلطان سنجر یہیں مدفون ہے اور یہی شہر اس کا دارالخلافہ تھا۔ جب مغلوں نے ایران پر حملہ کیا ہے تو اس شہر میں ایسی غارت گری کی کہ نوے لاکھ کے قریب انسان مارے گئے۔[1]

(۲) **مظفر بیگڑہ:** سلطان مظفر سلاطین گجرات کے سلسلہ کا مشہور بادشاہ ہے۔ ان بادشاہوں کا عہد حکومت ۷۹۹ھ سے ۹۸۰ھ تک چلتا ہے۔ طبقات سلاطین اسلام میں مظفر اول کو پہلا بادشاہ دکھایا گیا ہے اور مظفر ثالث کو آخری۔ مظفر اول دراصل ظفر خان کا لقب ہے۔

---

[1] جغرافیہ خلافت مشرقی: لی اسٹرینج، مترجمہ جمیل الرحمن۔

جو اصلاً راجپوت تھا سنہ ۷۹۳ھ میں ظفر خاں گجرات کا حاکم مقرر کیا گیا۔ ۷۹۹ھ سے اس نے خود مختاری کا دم بھرنا شروع کر دیا۔ محمود شاہ اول نے (محمود شاہ اول بایقرا سنہ ۸۶۳ھ سنہ ۹۱۷ھ) جو بیگڑا بھی کہلاتا ہے جوناگڑھ، کاٹھیاواڑ، اور چمپانیر کو بھی گجرات کی سلطنت میں شامل کر لیا۔ سلطان مظفر جس کا ذکر علامہ کر رہے ہیں اسی محمود شاہ اول کا فرزند تھا (سنہ ۹۱۷ھ سنہ ۹۳۲ھ)۔

سنہ ۹۸۰ھ میں اکبر اعظم نے گجرات کو مغلوں کی مقبوضات کا جزو بنا لیا۔[1]

(۳) مہدی سوڈانی (درویش سوڈانی) متوفی سنہ ۱۸۸۵ء۔

محمد احمد مہدی سوڈانی کی تاریخِ ولادت سنہ ۱۸۴۸ء ہے۔ بائیس سال کی عمر میں اس نے دعویٰ کیا کہ وہ مہدی موعود ہے رفتہ رفتہ بہت سے لوگ اس کی تحریک میں شامل ہو گئے اور آخر سنہ ۱۸۸۰ء میں خرطوم کے قریب وہ مسند نشیں ہوا۔ سنہ ۱۸۸۵ء تک اس کی سلطنت کے حدود مصر تک پہنچ گئے اور انگریزوں کو یہ خدشہ پیدا ہو گیا کہ مہدی تمام مصر پر نہ چھا جائے۔ لارڈ کچنر کو مصر بھیجا گیا اور اس نے آخر کار مہدیت کی یہ تحریک سنہ ۱۸۹۸ء میں بالکل دبا دی، ظاہر ہے کہ اس وقت مہدی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کے بعد سوڈان کو مصری مقبوضات کا ایک جزو بنا لیا گیا۔ علامہ نے مہدی سوڈانی کی تحریک کو خالص سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھا ہے اور یہ کہا ہے کہ مصر پھر ایسے ہی کسی مہدی کی آمد کا منتظر ہے یعنی مہدی سوڈانی جیسے مہدی کی آمد کا۔[2]

(۴) میر جعفر (از بنگال): سنہ ۱۷۵۶ء میں بنگال کے نواب سراج الدولہ نے جس کی سیاسی بصیرت یہ بھانپ چکی تھی کہ انگریزوں کو زیادہ پاؤں پھیلانے کی اجازت مصلحتِ ملکی کے خلاف ہے کلکتہ پر حملہ کیا۔ مورلینڈ جو مختصر تاریخ ہندوستان کا مصنف ہے طبعاً انگریزوں سے ہمدردی رکھتا ہے

---

[1] طبقاتِ سلاطینِ اسلام؛ ترجمہ عباس اقبال۔

[2] قاموسِ سیاسیاتِ عالم۔ قاموسِ مذاہب و اخلاق۔ (انگریزی)۔

اس گے۔ برو صف وہ کہتا ہے کہ اس حملہ کے محرکات کا تجزیہ بہت دشوار ہے۔ یہ تو کم از کم مسلّم ہے کہ سراج الدولہ کو یہ خدشہ لاحق ہو گیا تھا کہ اگر اس نے خود کوئی اقدام نہ کیا تو بنگال کا بھی وہی حشر ہوگا جو کرناٹک کا ہوا۔ بہر حال کلکتہ پر حملہ ہوا قلعہ دار نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس کے بعد کیا ہوا، یہ بہت متنازعہ فیہ ہے۔ انگریز مورخ کہتے ہیں جن لوگوں نے ہتھیار ڈالے تھے انھیں ایک چھوٹے سے کمرے میں بند کر دیا گیا جسے کلکتہ کی کال کوٹھری یا بلیک ہول کہتے ہیں لیکن ہندوستانی مورخ اس الزام کی تردید کرتے ہیں۔ تاریخ ہندوستان (کیمبرج) کے مولفوں نے اس سلسلہ میں بہت قیل وقال کی ہے۔ بہر حال اس کے بعد کلایو نے سراج الدولہ سے صلح کر لی۔ کلکتہ پھر انگریزوں کے تصرف میں چلا گیا۔ جب انگریزوں اور فرانسیسیوں میں جنگ ہفت سالہ چھڑی تو سراج الدولہ نے اس سے فائدہ اٹھانا چاہا لیکن اس نازک مرحلہ پر میر جعفر جو نواب کا ملازم ہوتا تھا اور اس معتمد علیہ تھا انگریزوں کے آڑے آیا اور اس نے نواب کے خلاف سازشوں کا ایک جال بچھایا۔ اس نے کلایو سے یہ کہا کہ اگر آپ فوج لے کر نواب پر یورش کریں تو میں نہ صرف آپ کی مدد کروں گا بلکہ رعایا اور فوج میں بددلی پھیلانے کی بھی کوشش کروں گا۔ مور لینڈ اور چیٹر جی لکھتے ہیں کہ نواب کی ہندو رعایا نے نواب نے خلاف بغاوت کی اور میر جعفر کو اپنا سرغنہ قرار دیا لیکن قرائن اس بات کے موید ہیں کہ میر جعفر نے اس بغاوت کے بیج خود بوئے ہوں گے۔ بہر حال ۲۲ جون ۱۷۵۷ء کو پلاسی کے مقام پر جنگ ہوئی۔ سراج الدولہ نے مجبوراً عمائد فوج اور اکابر دربار کی غداری مشاہدہ کر کے راہ فرار اختیار کی اور انگریزوں نے میر جعفر کو بنگال کی مسند حکومت پر بٹھا دیا۔ میر جعفر کلایو کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا رہا اور اسی کے زمانہ میں انگریزوں نے اپنے قدم بنگال میں مضبوطی سے جمالیے۔ اسی زمانے میں ولندیزیوں نے یہ چاہا کہ انگریزوں کی طاقت توڑ دیں اور ہگلی کے راستے بنگال میں داخل ہونا چاہا لیکن انھیں شکست ہوئی۔ اس شکست نے انگریزی استعمار کی بنیادیں

اور مضبوط کر دیں۔ میر جعفر کو بھی انگریزوں نے غداری کا پورا انعام نہیں دیا بلکہ کچھ عرصہ بعد میر قاسم کو بنگال کا حکمراں مقرر کر دیا۔ جب میر قاسم نے انگریزوں کی پالیسی پر اعتراض کیا تو پرانی کٹھ پتلی یعنی میر جعفر کو پھر تخت پر بٹھا دیا گیا۔ ۱۷۶۵ء میں جب اس کی وفات ہوئی تو اس کا بیٹا تخت نشیں ہوا لیکن عنان اقتدار انگریزوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ انہی دنوں سلطان شاہ عالم نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال اور بہار کا دیوان مالیات مقرر کر دیا۔ اس کے بعد کلایو کے سامنے جو منزل مقصود تھی وہ اب سب کو نظر آنے لگی۔ یوں یہ کہنا درست ہوگا کہ میر جعفر نے ایک معمولی تجارتی کمپنی سے اس قسم کے معاہدے کئے کہ بالآخر یہی کمپنی ہندوستان کی مطلق العنان حکومت بن گئی۔ اگر وہ سراج الدولہ سے غداری نہ کرتا تو تاریخی واقعات کا رُخ کچھ اور رہتا اور غالباً اغیار کی حکومت ختم ہو گئی ہوتی۔

میر جعفر کا مقبرہ مرشد آباد میں ہے۔[۱]

(۵) می شناسی حرص فقر حاضر است

حدیث نبوی کی طرف اشارہ ہے یعنی ایاکم والطمع فانہ الفقر الحاضر مطلب اس کا یہ ہے کہ طمع سے خبردار رہو کیونکہ اس کی وجہ سے انسان ہر وقت فقر میں مبتلا رہتا ہے۔

---

[۱] تاریخ ہندوستان (انگریزی) مطبوعہ کیمبرج۔

مختصر تاریخ ہندوستان (انگریزی) مورلینڈ اور چٹرجی۔ مطبوعہ لونگ مین گرین لندن ۱۹۳۵ء۔

ن

(۱) **نازعات:** قرآن کی ایک سورت جس کا نمبر ۷۹ ہے

(۲) **ناسوت:** علامہ نے خود تصریح کردی ہے کہ ناسوت سے ان کی مراد جسم ہے لیکن یہ کلمہ اصطلاحی معنی بھی رکھتا ہے اور ان کا ذکر اس لئے ضروری ہے کہ علامہ نے جو معانی ملحوظ رکھے ہیں ان میں اور اصطلاحی معانی میں اشتباہ نہ ہو، صاحب غیاث اللغات لکھتے ہیں:

"عالمِ اجسام کہ دنیا واین جہاں باشد وگاہے بمعنی شریعت وعبادت ظاہری"[1]

(۳) **ناصر خسرو:** حکیم ناصر خسرو قبادیانی کی تاریخ ولادت ۳۹۴ھ ہے۔ اس میں شروع ہی سے تحصیلِ علوم وفنون کا شوق تھا۔ جب سنِ بلوغ کو پہنچا تو غزنوی سلاطین کے دربار میں ملازم ہوگیا اور اس کے بعد سلجوقیوں کے دربار میں محکمۂ مالیات سے اس کا تعلق ہوگیا۔ شفق لکھتے ہیں کہ:

"خدمتِ دیوانی داشت ودبیر بود"

---

[1] غیاث اللغات۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سیکریٹریٹ میں بھی کسی عہدہ پر فائز رہ چکا ہے۔

۴۳۷ھ میں اس نے وطن کو اور ملازمت کو خیرباد کہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چالیس سال کے بعد اس کی مذہبی زندگی میں انقلاب آیا اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ میں نے جن اخلاقی اقدار کو ملحوظ رکھا ہے اور جس مذہب پر میں قائم ہوں ان کی تحقیق میرا فرض ہے یا نہیں جب وہ سفر پر نکلا تو سات سال تک سیر و سیاحت میں مصروف رہا۔ حج کیا، شام، مصر اور ایشیائے کوچک میں پھرتا رہا۔ اس سفر کے دوران میں اس نے مختلف مذاہب و ادیان سے گہری واقفیت بہم پہنچائی۔ جب مصر پہنچا اور شیعانِ اسماعیلی سے ملا تو ان کی تاویلات سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اپنا مذہب ترک کر کے اسماعیلی مذہب اختیار کر لیا۔ مصر کے اسماعیلی فرماں روا اپنے پیرووں کو مختلف مذہبی عہدوں پر فائز کرتے تھے۔ ان میں حجت بہت بلند مقام تھا۔ ناصر خسرو کو حجت خراسان مقرر کیا گیا۔ چنانچہ وہ ایران لوٹا تو اس نے اسماعیلی عقائد کی تبلیغ شروع کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عام مسلمان اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے اور مجبوراً شہر بہ شہر پھرتا رہا۔ آخر ۴۵۶ھ میں وہ یمگان چلا گیا جو بدخشاں کی ولایت میں ہے۔ یہاں اس نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور یہیں ۴۸۱ھ میں اس نے وفات پائی۔

ناصر خسرو کی تصانیف میں مندرجہ ذیل کتابیں بہت مشہور اور اہم ہیں۔

۱۔ سفرنامہ: سفرنامہ کے مطالب بہت سی نئی معلومات پر مشتمل ہیں۔ لکھنے والا دیانت دار اور ذہین ہے اس لئے اس کے مشاہدہ پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ سفرنامہ مطبوعہ صورت میں عام ملتا ہے۔ انجمن ترقی اردو نے اس کا ترجمہ بھی شائع کر دیا ہے۔ مترجم عبدالرزاق کانپوری ہیں جنھوں نے کتاب پر نہایت بسیط حواشی لکھے ہیں۔

۲۔ زادالمسافرین: فارسی زبان میں فلسفہ کی کتابیں گنتی کی موجود ہیں انھیں میں یہ کتاب

بھی شامل ہے۔ اس میں ناصر خسرو نے عقائد اسماعیلیہ کی حقانیت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

۳۔ **دیوان:** دیوان میں قریباً تیس ہزار اشعار تھے رضا شفق کی روایت ہے لیکن اب جو دیوان چھپا ہے اس میں دس گیارہ ہزار اشعار سے زیادہ نہیں۔ ناصر کے دیوان میں عرفانی اور اخلاقی مطالب پر مشتمل بہت معرکے کے قصیدے موجود ہیں۔ شفق اور دوسرے ایرانی نقاد متفق الکلمہ ہو کر لکھتے ہیں کہ قصیدہ سرائی میں ناصر خسرو نہایت بلند مقام رکھتا ہے۔[۱]

(۴) **نسر:** سرزمینِ سبا کا بت ہے۔ حمیری اور دوسرے لوگ اسی بت کو پوجتے تھے اس کی شکل گدھ کی تھی اور یہ بت بھی انھیں بتوں میں شامل تھا جنھیں قوم نوح پوجا کرتی تھی۔[۲]

(۵) **نسلِ مہر:** ہندو صنمیات میں بھی سورج دیوتا کی اولاد حکومت کرتی ہوئی دکھائی گئی ہے جیسے سورج بنسی خاندان۔ مغربی صنمیات میں اپالو سورج دیوتا ہے۔ اس کی اولاد نسلِ مہر ہوئی۔ یونانی صنمیات میں دیوی دیوتا انسانوں سے بھی شادیاں رچا دیتے تھے۔[۳]

(۶) **نشاط (باغ):** نشاط باغ کشمیر نور جہاں کے بھائی آصف خاں نے تعمیر کرایا تھا باغ کی تعمیر کی تاریخ ۱۰۴۳ھ ہے۔ یہ باغ جھیل ڈل کے کنارے واقع ہے اور اس کے بارہ تختے ہیں۔ یہ بروج آسمانی کی رعایت سے ہیں۔ ہر تختہ دوسرے سے بلند ہوتا چلا گیا ہے اور نہر کے مشرق کی طرف جو پہاڑیوں کا سلسلہ ہے ان پر گویا صعود کرتا چلا گیا ہے۔ باغ کا دوسرا تختہ باغ کی جان ہے۔ یہاں گل و گلزار کی کثرت اور آب و آبشار کی فراوانی نے طلسمات کا عالم پیدا کر رکھا ہے۔ گلاب کے پھولوں کے تختے حدِ نگاہ تک مخملی فرش کی طرح بچھے ہوئے نظر آتے ہیں۔

---

[۱] تاریخِ ادبیاتِ ایران: شفق۔ تاریخِ ادبیاتِ ایران: یزدانی۔ تاریخِ ادبیاتِ ایران: براؤن (جلد دوم)۔

[۲] قصص قرآن: حفظ الرحمٰن سیوہاروی۔

[۳] Twelve Olympians; Charles Seltman

مغل جب ہندوستان میں آئے تو طبعاً یہاں کے میدانی اور ریگستانی علاقوں کو دیکھ کر انھیں اپنے وطن کے آبشار، لالہ زار اور خیاباں بہت یاد آئے۔ کشمیر پہنچے تو معلوم ہوا گویا اپنے وطن میں آپہنچے ہیں۔ یہیں وہ مشہور باغ بنوائے گئے جن کے دھندلے سے عکس میدانی علاقوں میں ملتے ہیں۔ مثلاً لاہور کا شالامار باغ کشمیر کے شالامار باغ کا عکس ہے۔ مغلوں کے باغوں میں آب و آبشار سے بڑا کام لیا جاتا ہے۔ میدانوں میں آب رسانی کا کام مشکل تھا، کشمیر میں آسان اس کے باوجود جب کشمیر میں باغوں کی تعمیر ہو چکی تو مغلوں نے میدانوں میں بھی باغ اس طرح اور ایسی جگہ لگائے کہ ان کے سیراب ہونے کا انتظام درست رہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ مغلوں کو باغوں سے اتنا شغف تھا کہ اپنے مقبروں کو بھی باغوں ہی کی صورت بخش دیتے تھے۔[۱]

(۷) **نوجوانا نیمہ پیری است غم**

حدیث کی طرف اشارہ ہے یعنی غم سے آدمی قریب قریب بوڑھا ہو جاتا ہے۔

(۸) **نور:** قرآن کی ایک سورت ہے جس کا نمبر ۲۴ ہے۔

---

[۱] کاشغر (تاریخ کشمیر) ڈاکٹر صوفی۔ تاریخ کشمیر: خواجہ محمد اعظم دیدہ مری۔
مغلوں کے باغات (انگریزی) مسز سٹوارٹ۔

ہ

(۱) ہُبل: بروزن زُحل قریش کا سب سے بڑا بت تھا۔ اس کی صورت انسان کی تھی اور عقیق سرخ کا بنایا گیا تھا۔ کسی مرحلہ پر اس کا دایاں بازو ٹوٹ گیا تھا تو قریش نے سونے کا بازو لگا دیا۔ سب سے پہلے جس شخص نے اس بت کو نصب کر کے اس کی پرستش کی ہے وہ مدرکہ بن الیاس بن مضر قبیلہ خزیمہ کا ایک فرد تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس بت کو ہبل خزیمہ بھی کہتے ہیں۔ اس بت کے سامنے سات تیر پڑے رہتے تھے۔ ہر تیر پر ایک طرف صریح کا کلمہ منقش ہوتا تھا اور دوسری طرف ملصق کا کلمہ تھا۔ جب کسی بچے کے متعلق شک ہوتا تھا کہ آیا یہ بچہ حلال زادہ ہے تو پہلے بت پر چڑھاوا چڑھاتے۔ اس کے بعد ان تیروں سے شگون لیتے تھے۔ اگر تیر کا وہ حصہ سامنے آئے جس پر صریح لکھا ہوتا تھا تو فیصلہ صادر کرتے تھے کہ بچہ صریحاً حلال زادہ ہے اگر ملصق والی طرف سامنے آتی تھی تو بچے کے دعوے کو مسترد کر دیتے تھے۔ اسی طرح دوسرے معاملات میں بھی انہیں تیروں کے ذریعے فیصلے صادر کرتے تھے۔ جب مکہ فتح ہوا تو رسول پاک کے فرمان

سے حضرت علی نے ہبل کو زمین پر گرا دیا اور پھر انھیں کے زمان سے اسے باب بنی شیبہ میں دفن کر دیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بت کی پرستش قریش سے مخصوص تھی کیونکہ دوسری قوموں کی صنمیاتی داستانوں میں یا دیومالا میں اس بت کا ذکر نہیں ملتا۔[۱]

(۲) ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ

آیاتِ قرآنی کی طرف اشارہ ہے جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔ دونوں جگہ ارشادِ الٰہی یہ ہے کہ مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد جو کچھ بچ رہے اسے راہِ خدا میں صرف کر دے۔

۲/۲۱۵ ، ۲/۲۱۹ ۔

---

[۱] قصصِ قرآن : صدر الدین بلاغی ۔

ی

(۱) یا اولالامر کہ منکم شان اوست

اشارہ ہے آیاتِ قرآنی کی طرف جن کی تفصیل یہ ہے ۴/۵۸ ، ۴/۸۲

مفہوم یہ ہے کہ جب امت میں کسی معاملہ میں اختلاف رائے ہو یا کوئی جھگڑا اٹھ کھڑا ہو تو امیر المومنین کی طرف رجوع کیا جائے لیکن ایسا امیر المومنین جو ہر طرح حکومت کا حقدار ہو اور آیت اولوالامر منکم کا سزاوار ہو۔ امیر المومنین کی اصطلاح میں وہ تمام اربابِ مناصب بھی شامل ہیں جن کو اختیارات شرعاً اور قانوناً سونپ دئے گئے ہیں۔

(۲) یالیت قومی یعلمون : قرآن مجید کی ان آیات کی طرف اشارہ ہے۔

انی اٰمنت بربکم فاسمعون ...... وجعلنی من المکرمین ۳۶/۲۵-۲۷

ان آیات کا ترجمہ حسب ذیل ہے :

" میں تمہارے پروردگار پر ایمان لایا ہوں سو میری بات سنو۔ حکم ہوا کہ بہشت میں

داخل ہو جا۔ وہ بولا کاش! میری قوم کو معلوم ہو کہ خدا نے مجھے بخش دیا اور عزت والوں میں کیا۔"

(۳) **یرغمید**: یرغمید بھی ایک فرضی وادی کا نام ہے۔

(۴) **یزدجرد (یزدگرد)**: خسرو پرویز کی وفات (۶۲۸ء) کے بعد ساسانی سلطنت بڑی تیزی سے زوال پذیر ہونا شروع ہوئی۔ آخر ۶۳۲ء میں اکابر مملکت نے یزدگرد سوم کے سر پر کانٹوں کا تاج رکھا۔ یہ وہی بدنصیب بادشاہ ہے جس کے زمانے میں ساسانیوں کی عظمت خاک میں مل گئی۔

ایرانیوں سے عربوں کی چھڑپیں مدت سے ہو رہی تھیں مگر آخر نہاوند کے مقام پر کانٹے کی تول لڑائی ہوئی۔ ایرانیوں کو شکست ہوئی۔ یزدجرد بھاگا اور اس کوشش میں مصروف تھا کہ مزید لشکر جمع کرے کہ مرو کے نواح میں آسیابان نے اسے ہلاک کر دیا اور یوں دولتِ ساسانی کا کوئی نام لیوا نہ رہا۔ ساسانیوں کا عہدِ حکومت ۲۲۶ء سے لے کر ۶۵۲ء تک قائم رہا۔[۱]

(۵) **یعوق**: یعوق یمن کے پایۂ تخت صنعا میں صاحبِ اقتدار تھا۔ صدرالدین لکھتے ہیں کہ یہ بت اُن بتوں میں سے ہے جنھیں قومِ نوح پوجتی تھی۔[۲]

---

[۱] تاریخِ ایران، عبداللہ رازی۔ تاریخِ ایران: سائیکس۔
تاریخِ ادبیاتِ ایران: یفساری۔

[۲] قصصِ قرآن: صدرالدین رفاعی۔

پس چہ باید کرد

الف

(۱) **ابرِ نیساں**: نیساں بالفتح نون وسین مہملہ رومیوں کی تقویم کے مطابق ان کے ساتویں مہینہ کا نام ہے اور اس مدت میں آفتاب، برجِ حمل میں رہتا ہے۔ مشہور یہ ہے کہ اس مہینے میں بادلوں سے جو قطرے ٹپکتے ہیں۔ وہ صدف میں مروارید یا موتی پیدا کر دیتے ہیں۔ اس مہینہ میں جو مینھ برستا ہے اسے بھی بطریقِ مجاز نیساں کہہ دیتے ہیں۔

جن دنوں آفتاب برجِ حمل میں ہوتا ہے وہ ایرانیوں کے لئے قریب قریب بہار کا موسم ہے۔ چنانچہ ابرِ نیساں کے معنی ابرِ بہار کے بھی لئے جاتے ہیں اور اسی ابرِ بہار کے برسنے سے مروارید پیدا ہوتے ہیں

ادبی روایت میں ابرِ نیساں سے کبھی توفیقِ الٰہی مراد ہوتی ہے جو بطنِ صدف میں مروارید پیدا کرتی ہے کبھی محض ابرِ بہار مراد لیا جاتا ہے کہ اس موسم میں بارش سے طبیعت شگفتہ ہوتی ہے، ابرِ نیساں کے اس عمل کی طرف کہ موتی پیدا کرتا ہے: اردو اور فارسی کے بہت سے اشعار میں

اشارہ کیا گیا ہے لیکن صائب کا یہ شعر زبان زد خواص و عوام ہے:

تاک را سیراب کن اے ابرِ نیسانِ بہار
قطرہ تا مے تواند شد چرا گوہر شود[1]

(۲) الحمراء: جب بنو عباس کی دعوت کامیاب ہوئی اور بنو امیہ کا آخری فرماں روا مروان ہلاک کر دیا گیا تو عباسی فرماں رواؤں نے یہی مناسب سمجھا کہ چن چن کر بنو امیہ کے افراد کو ہلاک کر دیا جائے تاکہ کوئی تخت کا طلبگار کم از کم عرب اور اس کے گرد و نواح میں باقی نہ رہے۔ عباسیوں کے قتل و غارت کے باوجود اور ان کی انتہائی احتیاط کے باوصف ایک باہمت شخص، جو دسویں خلیفہ اموی ہشام کی اولاد سے تھا اور جسے تاریخ عبدالرحمٰن الداخل کے نام سے پہچانتی ہے، ہسپانیہ یا اندلس پہنچا۔ ۱۳۸ھ میں اس نے قریب قریب تمام مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کر لیا اور امویان اندلس کے دودمانِ جلیل کی بنیاد رکھی۔ اندلس کے یہ اموی خلیفہ قریباً تین سو سال ہسپانیہ پر حکمراں رہے یعنی ۱۳۸ھ سے ۴۲۲ھ تک۔

پانچویں صدی ہجری کے ابتدا ہی میں اموی خلفا کا اقتدار ٹوٹ گیا تھا اور ہسپانیہ میں طوائف الملوکی کا دور دورہ ہو گیا تھا۔ جو لوگ بنو امیہ کے جانشین ہوئے ان میں امرائے بنی حمود، امرائے عبادی، بنی زیری، بنی عامر، بنی ہود اور بنی نصر بہت مشہور رہے ہیں۔ بنو نصر نے غرناطہ میں ۶۲۹ھ سے ۸۹۷ھ تک فرماں روائی کی (۱۲۳۲ء اور ۱۴۹۲ء)۔ اس خاندان کا مؤسس محمد اول تھا کہ الملقب بالغالب تھا۔ اس سلسلہ کو اسپین کے عیسائی فرماں روا فرڈیننڈ اور اس کی ملکہ ازابیلا نے پندرھویں صدی کے آخر میں ختم کر دیا۔ براکلمن لکھتے ہیں کہ ۱۲۳۵ء میں بنو نصر کے پہلے فرماں روا نے غرناطہ پر قبضہ کیا۔ ان کے قول کے مطابق یہ شخص ابن یوسف، ابن احمد ابن نصر تھا اور اس کا قبیلہ بنو احمر کہلاتا تھا۔

---

[1] غیاث اللغات، کلمۂ نیساں۔ بہارِ عجم۔ ترکیب آب نیساں۔

اُس زمانہ میں اقتدار کی جو کش مکش ہو رہی تھی اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے بنو نصر نے فرڈیننڈ اول کی باج گزاری قبول کر لی۔

الحمرا یا قصرِ الحمرا (سرخ محل) بنو نصر کی یادگار ہے۔ اموی خلفاء ہی کے زمانے سے جہاں آج الحمرا ہے وہاں ایک قلعہ موجود تھا لیکن بنو نصر نے یہاں ایک ایسی عظیم الشان عمارت کی بنیاد رکھی جو مغرب کا تاج محل کہلاتی ہے۔ یہ عمارت مشہور شہر غرناطہ کے قریب واقع ہے جس کی بنا مسلمانوں نے آٹھویں صدی عیسوی میں رکھی تھی۔ شوستری کہتے ہیں کہ قصر الحمرا کی بنیاد ابن احمد نے (محمد الغالب ۱۲۳۲ء تا ۱۲۷۳ء) رکھی محمد ثالث نے اس کی تکمیل کی اور اس کے بعد اس خاندان کے مختلف فرماں روا اس قصر کی تزئین میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ افسوس ہے کہ زمانے نے اس قصر کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ کچھ نقصان اسے زلزلوں نے پہنچایا۔ کچھ آتش زدگی نے۔ اس کا کچھ حصہ منہدم کر دیا گیا تھا تاکہ چارلس پنجم کے محل کی بنیاد رکھی جا سکے۔ یہ محل مکمل نہیں ہو سکا۔ اس کے بعد فرانسیسیوں نے قصر الحمرا کو بڑا نقصان پہنچایا۔ بلکہ اس متمدن قوم نے یہاں تک کوشش کی کہ قصر بتمام وکمال ختم ہو جائے۔ اس کے باوجود یہ عمارت آج تک باقی ہے اور اپنے بنانے والوں کے ذوقِ سلیم اور جلالتِ شان کی شہادت زبانِ سنگ سے دیتی ہے۔ محمد خلیل الرحمٰن صاحب مرحوم نے "اخبار الاندلس" میں اس قصر کے متعلق بہت معلومات بہم پہنچائی ہیں کیونکہ مصنف سکاٹ مسلمانوں کے ہسپانوی دور اور اس کی تہذیب سے بہت متاثر تھا۔

اس قصر کی دیواروں پر اس فن کے بے نظیر نمونے دکھائی دیتے ہیں جسے انگریزی میں Arabesque کہتے ہیں۔ فنکار پتھر پر بیل بوٹے اس خوبصورتی سے بناتے تھے کہ آدمی عش عش کر اٹھتا تھا۔ ان بیل بوٹوں میں کہیں کہیں جانوروں اور انسانوں کی تصاویر بھی دکھائی دیتی تھیں لیکن انھیں بھی بیل بوٹوں کے پیچ و خم ہی میں اس طرح مخفی کر دیا جاتا تھا کہ بحیثیت مجموعی جو تاثر پیدا

وہ یہ تھا گویا نہایت متناسب فن کاری کے نمونے پیش نظر ہیں جن میں بیل بوٹوں کے پیچ وخم سے حرکت کی بیرون خرامی کا احساس ہوتا تھا یعنی یوں معلوم ہوتا تھا جیسے بیل بوٹوں میں زندگی ہے اور وہ پھیلتی ہوئی باہر جا رہی ہے۔ پھر بیل بوٹوں کے پیچ وخم اس زندگی کا رُخ اندر کی طرف موڑ دیتے تھے۔

الحمرا کے محراب نہایت سبک اور خوبصورت ہیں۔ ان میں نعلی انداز بھی ہے اور نیم قوس بھی نظر آتی ہے بعض محراب منقش ہیں اور بعض شکستہ ایوں کے بالائی حصوں میں نہایت خوبصورت جالیاں ہیں جو گویا روشن دان کا کام کرتی ہیں اور جن سے سورج کی شعاعیں چھن چھن کر اندر پڑتی ہیں۔ (خلیل الرحمن صاحب نے Arabesque کا ترجمہ زخرفۃ العرب کیا ہے) اسکاٹ لکھتے ہیں:

"ناممکن ہے کہ کوئی شخص ان عجیب وغریب گچ کے پھول بوٹوں کا شمار کر سکے جس کو عرب صناعوں کی چابک دستی نے انواع واقسام کی صورتیں دی ہیں۔ قصرِ الحمرا کے چھوٹے چھوٹے رواق اور دالان، ان میں سے بہت سی خوبصورت، نازک محرابیں گلکاریاں گلدستے، جنگلی طغرے، اشعار وآیاتِ قرآنی، ہندسی اصول پر نقش ونگار وہ نمایاں چیزیں ہیں، جو نگاہ کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں...... قبوں میں لاجوردی، ارغوانی اور سنہرا کام اس خوبصورتی سے کیا ہوا ہے کہ جواہرات جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں......

قصرِ الحمرا میں جا کر ایک دقیق النظر نقادِ فنِ تعمیر کی آنکھیں موزونیت ولطافت کا ایک سدا بہار باغ اپنے سامنے دیکھتی ہیں۔ اس عمارت کو وہ جس پہلو سے دیکھتا ہے، اس کو وہ ایسی بے نظیر چیز پاتا ہے کہ اس کی چشمِ تخیل کو اس کا کہیں نمونہ نہیں ملتا۔ وہ ایسی یادگار ہے کہ کسی خاص طرزِ عمارت سے علاقہ نہیں رکھتی۔ اس جیسی عمارت اس سے پہلے کہیں نہیں بنی وہ فنِ تعمیر کے مسلمہ اصول کو اسی طرح توڑتی ہے جس طرح مصنفین ایک دوسرے کے قرار دادہ اصول کو توڑتے چلے آئے ہیں، اس کے

صناعوں کے دل و دماغ کے جوہر کو دیکھ کر لاکھوں آدمی اسی طرح خوش ہوتے ہیں جیسے کسی خوش کلام شاعر کے عالی تخیلات سے۔ بظاہر ہر جگہ ایک عجیب بے قاعدگی معلوم ہوتی ہے۔ یہی غیر پابندی وہ چیز ہے جو ایک سطحی سیاح کے قلب پر جادو کا کام کرتی ہے۔ اس عمارت کی مختلف چیزوں کی اگر تحلیل کی جائے تو ممکن ہے کہ ان کی عربی اصلیت مابہ النزاع رہے، مگر اس میں کسی طرح کا کلام نہیں ہے کہ ان کی تنظیم اور جوڑ توڑ میں انتہا درجہ کی صنعت دکھلائی گئی ہے۔ اگرچہ ایک نقادِ فن یہ کہہ سکتا ہے کہ اصول تعمیر کا اس میں کوئی شک نہیں کہ عمارت کی خوبصورتی اور موزونیت ایک جادو ہے کہ جو اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہتی۔ یہ مشہور عربی قصر اندلس کی عمارتوں کی سرتاج، مسلمانانِ اندلس کی صنعت کا نمونہ ہے۔۔۔۔۔۔ جب تک اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی باقی رہے گا وہ طالبانِ علم اور علمائے ابنیۂ قدیمہ کے لئے سبق آموز رہے گا اور اس عظیم الشان سلطنت کو یاد دلاتا رہے گا جس کے علمی جواہر ریزے، سائنٹفک انکشافات، تمام مذاہب کی آزادی، ذوقِ تحقیق، تہذیب زمانہ حال کی علمبردار اور باعثِ تشویق ہو۔ قصرِ الحمرا کے منقش موریوں اور برجوں کے سامنے مسلمان اور عیسائی بہادر اپنی بسالت کا نام پانے کے لئے اپنی جان پر کھیلتے تھے۔ قصرِ الحمرا۔۔۔۔ سلطنتِ غرناطہ کی عظمت و جلالت کا نشان ہے، اپنے بادشاہوں کا مایۂ فخر و ناز ہے۔ دنیا کا اعجوبہ ہے، جس قوم کی یہ یادگار ہے وہ اس پر جتنا غرور کرے کم ہے۔ قصرِ الحمرا کی شان و شوکت کا خاتمہ ہو گیا، اس کی روشنی مکدر ہو گئی لیکن اس کا مرثیہ اس کا قصۂ غم یعنی اس کی تاریخ جو اب تک روایات عامہ اور افسانے بن بن کر زبان زدِ عوام ہیں، کبھی دنیا سے رخصت نہ ہوں گے جن بادشاہوں نے اس کو بنایا اور جن بادشاہوں نے اس کو

بگاڑا اس کا نام بھی اس کے در و دیوار پر درخشاں ہے۔ ان بادشاہوں میں سے اہلِ اسپین کا مغرورانہ اور پر مشیخت قول "و لا غالب الا اللہ" اور شیقیانِ اسلام کا طغرا "لا فاتح الا اللہ" اب بھی اس کے ذرّے ذرّے میں آفتاب بن کر چمک رہا ہے۔"

(خلیل الرحمٰن: تاریخ اندلس۔ جلد سوم صفحات ۶۱۷-۶۱۸)

ان اقتباسات سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ الحمرا کے ساتھ اس کی تعمیر کی وضع، اس کی تزئین، اس کا مخصوص تعمیری اسلوب دراصل بہت سے تعمیری دبستانوں پر مبنی ہے۔ ہوا یہ ہے کہ مسلمانوں نے یورپ میں جو عمارتیں دیکھی ہیں انھیں بھی ملحوظ خاطر رکھا ہے لیکن جو عمارتیں بنائی ہیں انھیں اس اسلامی اور عربی تہذیب و ثقافت کا ترجمان بنانے کی کوشش کی ہے جس پر ہسپانیہ کا اثر ہے بالفاظ دیگر الحمرا اور متعلقہ عمارتیں مشرقی اور مغربی فن تعمیر کے تال میل اور امتزاج کا ایک نہایت دلفریب نمونہ ہیں۔ ایک بات البتہ مسلمانوں کے تمام تعمیری کارناموں میں مشترک ہے۔ وہ کمروں کی کشادگی، ایوانوں اور صحنوں کی وسعت ہے۔ ایوانوں اور صحنوں کی یہ وسعت، ستونوں کے یہ سلسلے جو حد نظر تک پھیلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اس بات کی دلیل ہیں کہ دراصل مسلمان فن کار یہ محسوس کرتے تھے کہ ان کے ذہنوں کے افق غیر محدود ہیں۔ غیر مسلم تعمیری دبستانوں میں جو گھٹن سی پائی جاتی ہے اور جو اس بات کا سراغ دیتی ہے کہ فن کار کے تصورات و افکار محدود ہیں الحمرا میں بالکل نظر نہیں آتی۔ اس کے علاوہ تزئین کے کام میں بالخصوص زخرفۃ العرب یا Arabesque میں جس کاوش سے کام لیا گیا ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمان فن کار (جن کو ہسپانوی فن کاروں کا تعاون ضرور حاصل تھا) فنی کارناموں کی تخلیق نہایت محنت اور صبر سے کرتے تھے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ عمارتوں کی تعمیر میں ان کی غایت ہمیشہ ملحوظ رہی ہے اور تعمیر کا اصول ہمیشہ ان سے مشروط رہا ہے لیکن اس کے باوصف الحمرا اور متعلقہ عمارتوں سے عربی کی ذہنی بے تعصبی اور فکری آزادی

کا پتہ چلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ علم کی طرح فن کو بھی اپنی میراث جانتے تھے۔ اگر الحمرا کے تمام تعمیری اجزا کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مختلف تعمیری دبستانوں نے فن کاروں کو متاثر کیا ہے لیکن اس کے باوصف ان دبستانوں کے تال میل سے ایک تعمیری وحدت وجود میں آئی ہے اور جو ہسپانیہ کے معماروں سے مخصوص ہے اور جس کی نظیر آج تک نہیں مل سکی۔ بے شک الحمرا کو مغرب کا تاج محل کہا گیا ہے لیکن یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیے کہ الحمرا کی عمارتوں میں لطافت اور نزاکت کے ساتھ ساتھ فن کاری کے اس اسلوب کا اظہار بھی ہوتا ہے جسے علامہ اقبال قاہری کہتے ہیں۔ یوں ہی کہہ لیجیے کہ یہ عمارات علامہ کے الفاظ میں قاہری یا دلبری کا نمونہ پیش کرتی ہیں باوجود اس کے کہ عمارات کے اجزا نہایت سبک معلوم ہوتے ہیں، یہ عمارت بہت مضبوط ہے اور صدیوں تک حوادث روزگار کا مقابلہ کرتی رہی ہے۔ اسے وقت کے بے رحم ہاتھوں نے نہیں بلکہ بلکہ متعصب انسان کی خوئے تخریب نے برباد کیا ہے اور وہ بھی جزواً۔

الحمرا کے متعلق بہت سی داستانیں مشہور ہیں۔ یورپ کے مصنف اور شاعر اس عمارت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے اس کے متعلق بہت سی منظوم اور منثور تخلیقات اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان تخلیقات میں الحمرا، اس کی فضا، اس کا زمانہ فن کار کو کہیں کا کہیں لے جاتا ہے۔ واشنگٹن ارونگ کی مشہور کتاب "الحمرا کے افسانے" اسی عمارت سے پیدا شدہ تاثرات کے مرہونِ منت ہیں۔

بعض فن کاروں اور نقادوں کو مسجد قرطبہ میں الحمرا سے زیادہ جلال و جمال کا امتزاج نظر آتا ہے اور یہ درست بھی معلوم ہوتا کیونکہ خانہ خدا کی تعمیر میں تقریباً ان تمام قوموں نے اپنے تعمیری دبستانوں کا اسلوب استعمال کیا ہے جو ملتِ اسلامیہ کا جزو بن چکی تھیں[1]۔

---

[1] بحیثیت نامۂ اندلس: تالیف ڈوزی ترجمہ عنایت اللہ دہلوی۔ ثقافتِ اسلامی کا خاکہ: (جلد دوم) خوستری۔
اخبار الاندلس: تالیف اسکاٹ ترجمہ خلیل الرحمٰن (لاہور) تین جلدیں۔ میراث اسلام (انگریزی) مرتبہ آرنلڈ۔
اندلس کا تاریخی جغرافیہ: عنایت اللہ دہلوی۔ نفح الطیب: تالیف علامہ مقری ترجمہ خلیل الرحمٰن۔
الحمرا کے افسانے (انگریزی) واشنگٹن ارونگ۔ طبقاتِ سلاطینِ اسلام: عباس اقبال۔ محاصرۂ غرناطہ: تالیف لنگ ترجمہ سید امتیاز علی تاج۔

(۳) الصّٰفّٰت اشارہ ہے سورۂ والصّٰفّٰت کی طرف جو مکہ معظمہ میں نازل ہوئی اور قرآن میں یہ سینتیسویں نمبر پر ہے. یہ سورت اس طرح شروع ہوتی ہے:

والصّٰفّٰت صفاً ....

یعنی قسم ہے ان (جماعتوں) کی جو صف بستہ رہتی ہیں۔

(۴) اُمّی: اس کلمہ کے متعلق ایسی بات کہنا جو محل نظر نہ ہو یا جو مورد اختلاف نہ ہو مشکل ہے۔ عام طور پر اس کے معنی وہ شخص لئے جاتے ہیں جس نے علوم کی باقاعدہ تحصیل نہ کی ہو لیکن بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ام القرا کے رہنے والے کو امی کہتے ہیں اور رسول پاک اسی اعتبار سے امی کہلاتے تھے. ام القرا مکہ معظمہ کا لقب ہے کہ پہلے متمدن آبادی اسی شہر کے گرد و نواح میں وجود میں آئی[1]

(۵) آیہ فاصبحتم: اشارہ ہے سورۂ آل عمران کی اس آیت کی طرف جس میں مسلمانوں پر اللہ نے اپنے احسان جتلا کر اسلام پر عمل کرنے کی دعوت دی ہے:

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا واذکروا نعمت اللہ علیکم اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا .... $\frac{3}{103}$

یعنی (اے مسلمانو) سب کے سب مل کر اللہ کی رسی مضبوطی سے پکڑو اور متفرق نہ ہو اور اللہ کا احسان اپنے اوپر یاد رکھو جب تم دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی. پھر تم اس کے فضل سے بھائی بھائی ہو گئے۔

---

[1] غیاث اللغات۔ فرہنگ آنندراج۔

ب

(۱) **بایزید**: بایزید بسطامی خراسان کے رہنے والے تھے اور تاریخ وفات ۲۳۴ھ ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ قدیم صوفیوں میں ان کا مقام بہت بلند ہے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ ان کی تصانیف سے امام غزالی نے استفادہ کیا ہے لیکن افسوس ہے کہ آج وہ تصانیف بے نام ونشان ہیں۔ ان کے جو اقوال مشہور ہیں ان میں سے کچھ درج کیے جاتے ہیں۔

کسی نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ ایک شخص ایک رات میں مکے پہنچ جاتا ہے فرمایا کہ شیطان بھی ایک لحظہ میں مشرق سے مغرب پہنچ جاتا ہے۔ ان کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ فلاں آدمی پانی پر چلتا ہے۔ فرمایا مچھلیاں زیادہ تعجب انگیز کام کرتی ہیں اور پرند اس سے بھی زیادہ۔

انھیں کا قول ہے کہ اگر کوئی آدمی پانی پر سجادہ بچھائے نماز پڑھ رہا ہو یا ہوا میں معلق ہو تو اس کا فریب نہ کھاؤ، یہ دیکھو کہ اللہ کے احکام کی بجا آوری کا کیا حال ہے۔

براؤن کا خیال ہے کہ تصوف اپنے ابتدائی مرحلوں میں کوئی پیچیدہ چیز نہ تھا۔ اس میں زہد توکل اور استغنا کے عناصر زیادہ نمایاں تھے۔ بایزید اسی مرحلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔[۱]

---

[۱] تاریخ تصوف در ایران: قاسم غنی۔ تاریخ ادبیات ایران (جلد اول): براؤن۔ ثقافتِ اسلامی کا خاکہ: شوستری۔

ج

(۱) **جاناں**: جانان فارسی اور ادبی روایت میں محبوب کے معنی میں آتا ہے۔ فارسی کی لغات کا اس پر اتفاق ہے کہ اصل کلمہ جان ہے اور آخر میں الف اور نون زائد ہے جیسے جاویداں میں۔ صاحبِ غیاث رسالہ عبدالواسع کی سند دیتے ہیں لیکن تعجب ہے کہ صاحب فرہنگ آنند راج یہی بات لکھنے کے بعد کہتے ہیں کہ غیاث اور موید میں لکھا ہے کہ جاناں محبوب کو کہتے ہیں اور اس کی اصل جانا ہے جس میں الف زائد ہے۔ صاحبِ غیاث جاناں کے معنی محبوب بالکل نہیں بتاتے (میں اس نسخہ پر بھروسہ کر رہا ہوں جس میں منتخب اللغات بھی اور چراغ ہدایت بھی شامل ہے اور جسے نول کشور نے لکھنؤ سے شائع کیا ہے یہ اڈیشن ۱۹۳۰ء کا ہے) موید الفضلا میں البتہ (نول کشور ۱۸۹۹ء) یہ درج ہے کہ جاناں محبوب کو کہتے ہیں اور اس کی اصل جانا تھی۔

میں سمجھتا ہوں کہ جاناں میں الف، نون زائد نہیں ہے بلکہ جمع کا ہے۔ جاناں اگرچہ محبوب کے لئے بھی بطریق مجاز استعمال ہوتا ہے لیکن اکثر و بیشتر اس کے معنی محبوب حقیقی کے ہوتے ہیں۔

اور صوفی شعرا اس کلمہ کو بدون استثنا اسی معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ اب محبوب حقیقی گویا تمام کائنات کی روحوں اور جانوں کی کلیت کا نام ہے (وحدت وجود کے مسائل سمجھ لینے ہوں گے) اس اعتبار سے جانان محبوبِ حقیقی ہوا۔ پھر بہ طریق مجاز معشوق مجازی کے لئے بھی استعمال ہونے لگا یہ میرا قیاس ہے۔ مؤید الفضلا نے جو لکھا ہے وہ تو مجھے بغایت مستبعد معلوم ہوتا ہے کہ اس میں الف ندائیہ ہوا اور نون غنہ کا اضافہ خواہ مخواہ کر دیا گیا ہو۔ فارسی شعرا کے کلام سے میری توجیہ کو تقویت ملتی ہے۔ مشہور رباعی ہے:

چوں قطرہ سرگشتہ بعماں پیوست
چوں ذرہ بخورشید درخشاں پیوست
جاں بود میاں وے وجاناں حائل
فی الحال کہ جاں داد بجاناں پیوست

اور قاآنی کہتا ہے

رسم عاشق نیست بایک دل دو دلبر داشتن
یاز جاناں یاز جاں بایست دل برداشتن

(دیکھئے کلمۂ جاں) تعجب ہے کہ صاحب برہان قاطع جان جاں کو پہچانتے ہیں لیکن جاناں کو نہیں پہچانتے[1]

---

[1] غیاث اللغات - مؤید الفضلا -
بہار عجم - فرہنگِ آنندراج -

ح

(۱) **حکم انظر**: اشارہ ہے اس آیت قرآنی کی طرف:

افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت

یعنی کیا یہ لوگ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ یہ کیسا پیدا کیا گیا ہے۔

یہ آیت سورۂ غاشیہ کی ہے۔ دیکھئے ۴۴

(۲) **حکمت فرعونی**: علامہ حکمت فرعونی سے ملوکیت کا وہ خاص مسلک مراد لیتے ہیں جس کے ذریعہ مکتبوں میں اور مدرسوں میں محکوم اقوام کے افراد کو غلامی سے سمجھوتہ کرنا سکھایا جاتا ہے۔ اس تعلیم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ طالب علم علوم و فنون سے واقف ہو جائے لیکن اپنی خودی سے آگاہ نہ ہو۔ حاکم قومیں محکوموں کو ہمیشہ اس چکر میں اسیر رکھتی ہیں کہ وہ روٹی کس طرح کمائیں اور یہ مسئلہ ثانوی حیثیت رکھتا ہے کہ روٹی کمانے میں آبرو باقی رہتی ہے یا جاتی ہے اسی مسلک کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ جو لوگ دینی نفوذ و اقتدار رکھتے ہیں۔ ملوکیت ان کو

اپنے ساتھ ملا لیتی ہے اور احکام دینی کی تفسیر و تاویل اس طرح ہوتی ہے کہ حاکموں کا مفاد ہمیشہ مدنظر رہتا ہے ملوکیت کے اس مسلک کو حکمت فرعونی اس لئے کہا گیا ہے کہ جو بڑی بڑی مشرقی سلطنتیں تھیں ان کے فرماں روا مذہبی رہنماؤں کی تائید سے خدائی کا دعویٰ بھی کرتے تھے۔ موجودہ زمانہ میں خدائی کے دعوے کی ضرورت نہیں رہی فقط اس امر کی ضرورت رہ گئی ہے کہ حکمت فرعونی کے ذریعے محکوموں کو اپنے مفاد سے بے خبر رکھا جائے اور انھیں اس طرح تعلیم دی جائے کہ وہ حاکموں کے مفاد کو اپنے مفاد پر ترجیح دیں۔[۱]

---

[۱] قاموس سیاسیات عالم: ملوکیت۔ تاریخ ملل قدیمہ: محمود اعظم فہمی (انجمن ترقی اردو دہلی)۔

قدیم تہذیبیں: عبدالمجید سالک۔ اقبال نئی تشکیل: عزیز احمد۔

(۱) ربی الاعلیٰ: نماز میں سجدہ کرتے وقت سبحان ربی الاعلیٰ کے کلمات پڑھے جاتے ہیں یعنی پاک ہے میرا رب بزرگ و برتر۔ یہ اشارہ اسی کی طرف ہے۔

(۲) روس: روس کا موجودہ نام دولت اشتراکیہ روسیہ ہے۔ روس کا رقبہ ۸۷۰۸۰۰۰ مربع میل ہے اور آبادی انیس کروڑ تیس لاکھ ہے دارالسلطنت ماسکو ہے۔ اس سلطنت کی حدود وہی ہیں جو زار کے زمانہ میں روس میں تھیں سوائے اس کے کہ پولینڈ اور فن لینڈ اس میں شامل نہیں۔

۱۹۱۷ء میں روس میں جمہوری نظام قائم ہوا۔ اس کے بعد یہاں ایک اشتراکی ری پبلک کی بنیاد رکھی گئی۔ اس انقلاب کے موسس لینن اور ٹراٹسکی تھے۔ روس نے زمین کاشت کاروں میں بانٹ دی اور اشتراکی نظام قائم کر دیا۔ اس کے بعد زور کی خانہ جنگی ہوئی لیکن اشتراکی قوتوں کو فتح حاصل ہوئی۔ ۱۹۲۳ء میں روس کی مختلف مقبوضات خودمختار ہو گئیں اور انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک فیڈریشن قائم کریں گی جن کا نام دول اشتراکیہ ہوگا۔ لینن کے بعد سٹالین

برسر اقتدار آیا اسی کے زمانہ میں پنج سالہ منصوبہ پیش کیا گیا اور اس پر عمل بھی ہوا۔ اس وقت اشتراکی روس گیارہ جمہوری سلطنت پر مشتمل ہے۔ آئین کے مطابق کاشتکاروں اور مزدوروں کے نمائندے سوویت کہلاتے ہیں اور سوویٹ ہی کی حکومت کی وجہ سے یہ دولت اپنے آپ کو سوویٹ جمہوریتوں کا وفاق کہتی ہے۔ قانون سازی کا کام سپریم سوویٹ کے سپرد ہے۔ جو پارلیمنٹ کے مشابہ ہے۔ اس کے بھی دو دیوان ہیں۔

علامہ نے بار بار اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ سوویٹ روس نے یہ تو اچھا کیا کہ ان تمام طاقتوں کی نفی کر دی جو انسان کی طاقتوں کو محدود کرتی تھیں اور اس طرح لا کا مرحلہ طے کر دیا۔ لیکن روسی مفکر اور سیاست داں یہ نہ سمجھ سکے کہ برائی کی قوتوں کو مٹا دینے کے بعد یعنی تخریب کے بعد ایک تعمیر کا مرحلہ بھی آتا ہے جس کی شکل کلمۂ طیبہ میں الّا کی صورت میں موجود ہے یعنی تمام طاقتوں کو مٹا دینے کے بعد ایک طاقت کے سامنے سر جھکایا جاتا ہے۔ روس نے اللہ کا انکار کیا (معاذ اللہ) یعنی وہ تخریب کی منزل میں رہے تعمیر تک نہ پہنچ سکے۔ جب تک سیاست داں اور مفکر خود قانون الٰہی کے پابند نہ ہوں گے سلطنت کی توسیع کی بات نہ بنے گی۔ اسی لئے علامہ بار بار روس کے متعلق کہتے ہیں کہ یہاں ہنگامۂ لا تو ہے مگر الّا نہیں ہے۔ یہاں سلاطین نہیں، کلیسا نہیں، جاگیرداری نہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ اللہ بھی نہیں۔ اس بات کو عزیز احمد نے بہت سلجھا کے لکھا ہے۔[1]

---

[1] اقبال نئی تشکیل : عزیز احمد کراچی -

س

(۱) **سلطان صلاح الدین ایوبی:** بارھویں صدی عیسوی میں دو نہایت جلیل القدر شخصیتیں نمایاں ہوئیں ایک ایوب دوسرے شیر کوہ۔ یہ لوگ اصلاً کرد تھے۔ ایوب بظاہر عباسی خلیفہ کے ماتحت تھا حالات کچھ ایسے پیش آئے کہ دونوں بھائی جدا ہوگئے۔ شیر کوہ زنگی کی ملازمت میں منسلک ہوگیا اور ایوب دمشق چلا گیا۔ جب نورالدین زنگی نے دمشق پر حملہ کیا تو اتفاق کی بات ہے کہ ایوب شہر کی مدافعت کرنے والوں کا سردار تھا اور شیر کوہ محاصرہ کرنے والوں کا سرگروہ۔ حسن اتفاق سے دونوں بھائیوں میں صلح ہوگئی۔ اس کے بعد ایوب تو نورالدین کے نائب کی حیثیت سے دمشق میں مقیم رہا اور شیر کوہ حمص کا حاکم ہوگیا۔

اس اثنا میں مصر میں نہایت اہم واقعات پیش آرہے تھے۔ جب آخری فاطمی فرمانروا ۱۱۶۰ء میں مسند آرائے جلال ہوا تو حقیقت میں اقتدار ان کے ہاتھ سے نکل کر مختلف امرار کے ہاتھ میں چلا گیا۔ آخر کار کچھ امرا نے شیر کوہ سے اعانت کی درخواست کی۔ اس نے مصر کے

معاملات میں مداخلت کی لیکن اسے واپس جانا پڑا کیونکہ اسے معلوم ہوا کہ اس کا بھتیجا یعنی ایوب کا لخت جگر صلاح الدین اسکندریہ میں محبوس کر دیا گیا ہے۔ آخر کار آخری فاطمی خلیفہ عاضد نے شیر کوہ ہی کو اپنا وزیر مقرر کیا اور اس کی وفات پر اس کا بھتیجا سلطان صلاح الدین ایوبی الملک الناصر کے لقب سے اسی عہدہ پر فائز ہوا۔ مصر میں پہلے تو سلطان نے ان حبشیوں کی سرکوبی کی جن کو فاطمی خلفا نے سر چڑھا رکھا تھا۔ جب اہل فرنگ کو یہ معلوم ہوا کہ مصر میں سلطان بد عنصر نکال رہا ہے تو انھوں نے یورپ سے کمک منگائی اور یہ چاہا کہ سلطان کا تیا پانچا کر دیں۔ ۱۱۷۱ء میں سلطان صلاح الدین نے حکم دیا کہ مساجد میں فاطمی کے بجائے خلیفہ عباسی کا نام خطبات میں پڑھا جائے۔ جب عاضد کی وفات واقع ہوئی تو شیعوں کا زور طبعاً مصر میں گھٹ گیا اور اہل سنت والجماعت برسر اقتدار آ گئے۔

نور الدین سلطان صلاح الدین کی حکمت عملی سے بدظن ہو چکا تھا اور قریب تھا کہ اس پر فوج لے کر چڑھ دوڑے کہ ۱۱۷۳ء میں وہ اس دنیا سے سدھار گیا۔

پہلے تو اس کا بیٹا اسماعیل الملک الصالح تخت نشین ہوا لیکن اس کے بعد جھگڑے شروع ہو گئے۔ ادھر سلطان صلاح الدین ایوبی اچھی طرح جانتا تھا کہ جب تک مصر اور شام سیاسی طور پر متحد نہ ہو جائیں صلیبی جنگ آزماؤں کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اس سے پہلے جزیرہ صقلیہ کی نارمن افواج کو شکست دے چکا تھا۔ اب صلاح الدین حمص کی طرف بڑھا اور جب اس مہم میں ناکامی کی صورت نظر آئی تو اس نے یہ تجویز پیش کی کہ اسے دمشق کا حاکم تسلیم کر لیا جائے۔ یہ تجویز مسترد کر دی گئی۔ آخر حمص کے قریب ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی اور صلاح الدین کو فتح حاصل ہوئی۔ اسماعیل الملک الصالح کی طاقت روز بروز گھٹتی چلی گئی اور عباسی فرماں روا نے سلطان صلاح الدین کو ایک خود مختار فرماں روا تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد کچھ عرصے کے لئے

سلطان صلاح الدین مصر کے داخلی حالات کی اصلاح میں مصروف رہا۔ادھر صلیبی جنگ آزما برابر سلطان صلاح الدین سے جھڑپیں لیتے رہتے تھے ۱۱۷۷ء میں جب سلطان صلاح الدین نے جنوبی فلسطین میں صلیبی افواج کا راستہ روکنا چاہا تو اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا لیکن آخر اسے فتح حاصل ہوئی۔صلیبی جنگ آزماؤں سے بھی وقتاً فوقتاً سلطان کی صلح ہو جاتی تھی۔ آخر سلطان یروشلم کو بڑھا۔یروشلم کے بادشاہ کو شکست دی اور اسے اسیر کر لیا۔۱۱۸۷ء میں شہر میں مسخر ہو گیا۔یروشلم کے مسخر ہو جانے سے یورپ میں اضطراب کی ایک لہر دوڑ گئی۔ یورپ سے برابر کمک پہنچنی شروع ہو گئی۔رچرڈ شیر دل میدان میں اترا۔سلطان کے بھائی الملک العادل نے رچرڈ سے صلح کر لی جو انگلستان واپس جانا چاہتا تھا۔یہ ۱۱۹۲ء ۲ نومبر کا واقعہ ہے۔اس کے بعد سلطان نے عیسائیوں کو اجازت دے دی کہ وہ یروشلم کی زیارت کے لئے آ سکتے ہیں۔

افسوس کہ سلطان ابھی پچپن سال ہی کا تھا کہ فروری ۱۱۹۳ء میں وہ خدا کو پیارا ہو گیا۔یورپ والے بھی اس کی شجاعت،استقامت اور ثابت القول ہونے کے معتقد تھے۔ وہ اسیروں سے اتنا اچھا سلوک کرتا تھا کہ سب مورخوں نے اس کی تعریف کی ہے علوم وفنون کی تربیت میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہ تھا۔اس کا دبیر محمد الکاتب الاصفہانی تھا جو تمام مہمات میں شریک رہا تھا۔افسوس ہے کہ اس کی تصانیف میں اسلوب نگارش اس قدر تو جھل اور پر تکلف ہے کہ مطالب اور معانی کو گویا دریافت کرنا پڑتا ہے۔یورپین مورخوں نے بھی اس کے سوانح حیات قلمبند کئے ہیں۔

یروشلم اور قاہرہ میں سلطان نے بہت سی عمارات تعمیر کرائیں۔امام شافعی کے مزار مبارک کے قریب ایک مدرسہ بھی تعمیر کیا گیا۔قاہرہ کی قلعبندی اور استحکام بھی اس نے

بہت روپیہ صرف کیا۔

اگرچہ سلطان کی وفات کے بعد ایوبیوں کی وہ شان باقی نہ رہی لیکن اس کے باوصف صلیبی جنگ آزماؤں کو کچھ بہت زیادہ کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

ایوبیان مصر کا خاندان ۱۱۶۹ء سے ۱۲۵۲ء تک مسند آرائے حکومت رہا۔ دمشق کے ایوبی البتہ ۱۱۸۶ء سے ۱۲۶۰ء تک فرمانروائی کرتے رہے (منگولوں نے اس سلسلہ کو ختم کردیا)۔ ایوبیانِ حلب بھی ۱۱۸۶ء سے ۱۲۶۰ء تک حکمران رہے۔ الجزیرہ میں اور حمص میں بھی ایوبیوں کی حکومت قائم تھی حمص کی حکومت کے سلسلہ کو ممالیک نے ختم کردیا۔[۵]

---

[۵] میراث اسلام (انگریزی) مرتبہ سر ٹامس آرنلڈ۔ تاریخِ عالم اسلام: براکلمن (انگریزی)۔

طبقاتِ سلاطینِ اسلام: عباس اقبال (فارسی)۔ مشاہیر: غلام رسول مہر (حصہ اول)۔

استدراک: ابنِ خلدون نے سلطان صلاح الدین کے متعلق بڑی تفصیل سے معلومات فراہم کی ہیں جنھیں تفصیلی حالات جاننے کا اشتیاق ہو وہ اس ماخذ سے رجوع کریں۔

ف

(۱) **فقر کافر:** دیکھئے فقر، علامہ بار بار یہ کہتے ہیں کہ مسلمان کا فقر یہ ہے کہ مال و دولت سے مستغنی ہو کر تسخیر کائنات کی طرف متوجہ ہو اور دنیا میں پھلنے پھولنے کے ساتھ روحانی ترقی بھی کرے لیکن فقر کافر یہ ہے کہ دنیا کو ترک کر کے غاروں اور گپھاؤں میں انسان ٹھکانہ کرے اور یہ سمجھے کہ جب تک دنیا سے قطع تعلق نہ کرے گا پاک و صاف نہ ہوگا۔ یعنی فقر کافر میں خودی کی ہلاکت ہوتی ہے اور فقر مومن میں خودی کا فروغ۔ بشرطیکہ خودی قوانین الٰہی کی تابع ہو۔ اپنے خطوط میں علامہ کئی مرتبہ اظہار کر چکے ہیں کہ غیر مقید خودی شیطانی خودی ہے

ہندو فلسفہ میں اس مکتبِ خیال کو بڑی اہمیت حاصل ہے جسے اصطلاح میں، مایا کہتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کائنات کے مختلف مظاہر دراصل واہمہ ہیں اور خود کائنات بھی ایک واہمہ ہے۔ مایا دراصل وہ نقاب ہے جو حقیقت کے چہرہ پر دائما پڑا رہتا ہے۔ انسان مظاہر کائنات ہی کو اصل حقیقت سمجھ کر برمھ کی حقیقت دریافت کرنے کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

چنانچہ جب تک انسان کائنات اور مظاہر کائنات کو زیبِ خیال تصور نہ کرے ظاہر ہے کہ اس مکتبِ فکر کے مطابق اسے حقیقت کا شعور نہیں ہو سکتا۔ کائنات اور مظاہر کائنات کو زیبِ خیال تصور کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان دنیا کو تیاگ دے، اسے چھوڑ دے، تپسیا اور تیاگ اسی مقصد کو حاصل کرنے کے ذریعے ہیں۔ یہ مکتب فکر و ہدایت کا فلسفہ کہلاتا ہے۔ اس فلسفہ کے خلاف اسلام نے بڑی سختی سے جہاد کرنے کا حکم دیا ہے کہ اسلام خودی کا استہلاک نہیں بلکہ خودی کا فروغ چاہتا ہے۔[1]

---

[1] عزیز احمد: اقبال نئی تشکیل (کراچی)۔ اقبال نامہ یعنی اقبال کے خطوط۔
لغتِ فلسفہ (انگریزی): ریونز (نیویارک)۔
شنکر آچاریہ کی زندگی کے متعلق متعدد تصانیف جس نے برہمنیت کو فروغ دیا۔

ل

(۱) لا قیصر و کسریٰ: اس حدیث کی طرف اشارہ ہے:

هلك قيصر فلا قيصر بعدهٗ

یعنی قیصر ہلاک ہو گیا اب اس کے بعد کوئی قیصر نہ ہو گا۔

ارمغانِ حجاز

الف

(۱) ابوحامد: امام ابو حامد محمد الغزالی جن کا لقب حجۃ الاسلام ہے اصلاً خراسانی تھے ان کی ولادت ۴۵۰ھ میں طوس میں ہوئی۔ (بعض مورخ ۴۵۱ھ قلمبند کرتے ہیں) امام نے پہلے امام ابونصر کے حلقۂ درس میں شرکت کی پھر نیشاپور چلے گئے جب تحصیل علوم سے فارغ ہوئے تو نظام الملک طوسی کہ سلاجقۂ کبیر کے وزرا میں امتیازی حیثیت رکھتا تھا ان کے علم و فضل سے اتنا متاثر ہوا کہ انھیں ۴۸۴ھ میں مدرسۂ نظامیہ بغداد میں معلم مقرر کردیا۔ اس مدرسہ میں وہ چار سال تک درس و تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ اس کے بعد حج کے لئے تشریف لے گئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن دنوں میں نظامیہ بغداد میں درس دے رہے تھے اور فلسفہ کی باریکیوں سے مطلع ہو رہے تھے تو انھیں یہ محسوس ہوا کہ دانش وری، فلسفہ اور علم الکلام اس اعتبار سے بے ثمر ہیں کہ روح انسانی ان سے سکون نہیں پاتی۔

حج کرنے کے بعد انھوں نے کچھ عرصہ کے لئے نظامیہ نیشاپور میں بھی درس دیا لیکن

آخر طوس پہنچے جہاں انھوں نے ۵۰۵ھ میں انتقال کیا۔

ان کی تصانیف بیشتر عربی میں ہیں۔ ان میں احیاء العلوم الدین بہت ممتاز ہے۔ جو رتبہ نظم میں مولانا روم کی مثنوی کو حاصل ہے وہی نثر میں امام کی اس تصنیف کو حاصل ہے۔ نہایت دقیق اخلاقی اور عرفانی نکات ایسے پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں کہ پڑھنے والا ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکے۔ اسی کتاب کے مطالب کا خلاصہ انھوں نے خود فارسی میں بھی کیا ہے۔ اس تصنیف کا نام کیمیائے سعادت ہے۔

عربی تصانیف میں انھوں نے اپنی طبیعت کے انقلاب کی سرگزشت بھی بیان کی ہے اور ساتھ ہی فلسفہ کی بے ثمری کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

امام کے رتبۂ بلند کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ امام سیوطی نے فرمایا ہے کہ اگر رسول پاک کے بعد کوئی شخص حامل وحی ہوتا تو وہ یقیناً غزالی ہوتا۔

امام کے علمی کارناموں کو تفصیل سے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں مختصراً گزارش کی جاتی ہے کہ امام غزالی کے زمانہ میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان کم وبیش ہمیشہ جنگ ٹھنی رہتی تھی۔ ملک میں چاروں طرف مناظرے اور مجادلے ہوتے رہتے تھے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ اختلافات کی خلیج زیادہ وسیع ہوتی تھی بلکہ یہ بھی ہوتا تھا کہ علمائے کرام کے جاہل مقلد ایک دوسرے سے اُلجھ پڑتے تھے اور کشت وخون کی نوبت آتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ امام کے زمانہ میں فلسفہ منطق اور دیگر علوم مذہبی افکار وتصورات سے اس طرح گھل مل گئے تھے کہ اسلامی تعلیمات کی اصل شکل پہچاننا دشوار ہو گیا تھا۔ نظامیہ بغداد میں بھی امام نے مناظرے اور مجادلے کے بہت سے مناظر دیکھے۔ ان چیزوں کو مسلمانوں کے لئے مضر پایا اور آخر کار علم الکلام اور فلسفہ سے کلیتہً دست برداری اور برأت کا اظہار کر دیا۔ وہ جب فلسفہ کی بے ثمری کا، اور دانشوری کی

بے حاصلی کا ذکر کرتے ہیں تو لکھتے ہیں کہ یہ باتیں وہ شخص کر رہا ہے جس کی عمر فلسفہ کی تحصیل میں گزری ہے اور جو اس کے رگ و ریشہ سے واقف ہے۔

جب امام نے فلسفہ اور علم الکلام کو خیر باد کہہ دیا تو بیشتر لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ اسلامی تعلیمات کی غایت یہ ہے کہ ایک صحت مند معاشرہ قائم کیا جائے نہ یہ کہ فروعی باتوں کے متعلق مجادلہ اور مناظرہ کو خونریزی کی حد تک پہنچا دیا جائے۔

یہ زمانہ یوں بھی مسلمانوں کے لئے بڑا خطرناک تھا صلیبی لڑائیوں کا آغاز ہو چکا تھا اور قوم کو یہ سبق یاد دلانے کی ضرورت تھی کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑنے کے بجائے دشمن کا مقابلہ کرنا چاہئے کہ خود اسلام ایک بہت بڑے خطرہ سے دوچار ہے عجیب اتفاق ہے کہ جب صلیبی لڑائیاں شروع ہوئیں تو جہاں سلجوقی مقبوضات میں ہر طرف مذہبی اختلاف بڑی شدت اختیار کر چکا تھا، وہاں سلجوقی شہزادے بھی برسر پیکار تھے۔ سلطان برکیارق اور سلطان محمد کے درمیان چار پانچ سال تک جنگ ٹھنی رہی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک تو اسماعیلیوں نے ایران میں اپنے پاؤں جما لئے۔ دوسری طرف اہل فرنگ نے یہ حالات دیکھ کر لڑائی کا ڈول ڈال دیا۔ امام نے محمد اور برکیارق کے درمیان صلح کرانے کی پوری کوشش کی اور عام مسلمانوں کو صلیبی جنگوں کے خطرات سے آگاہ کیا۔

امام نے جو فلسفہ سے روگردانی کی ہے تو اس بنا پر کی ہے کہ ان کے خیال میں وہ معلومات جو ہم تک حواس خمسہ کے ذریعہ پہنچتی ہیں ناقص ہوتی ہیں عقل استدلالی یا ذہن انسانی صرف دلیل منطق اور کلام کے ذریعہ حقیقت کی کلیت کا شعور نہیں کر سکتا حقیقت مکشوف ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر امام نے یہ کہا کہ حقیقت کے ادراک کے جتنے وسیلے ہیں ان میں کشف و شہود بڑی اہمیت رکھتے ہیں مسلمان یہی بات بھولتے جا رہے تھے۔ دراں حال کہ ان کا مذہب سراسر مکشوف

تھا اور ان کے مذہب کی تعلیمات بصورتِ وحی رسولِ پاک ؐ پر نازل ہوئی نہیں۔

امام نے یہ اعلان کر کے کہ میں مذہبی مناظروں اور مباحثوں میں حصہ نہیں لوں گا اور اس درس و تدریس میں شامل نہیں ہوں گا جس سے اسلامی فرقوں میں افتراق پیدا ہوتا ہے گویا بروقت مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ وہ اپنی تمام قوتیں بیکار باتوں میں صرف کر رہے ہیں۔

سلاجقۂ کبیر کے زمانہ میں مذہبی اختلافات کے متعلق جو مناظرے ہوتے تھے ان کے اصول مدون ہو چکے تھے۔ چنانچہ جلال ہمائی لکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں فنِ خلاف و جدل کی باریکیوں سے لوگوں کو واقف کیا جاتا تھا۔ جدل و خلاف کے فن پر معرکہ کی تصانیف لکھی جا رہی تھیں چنانچہ ابو اسحٰق شیرازی کہ نظامیۂ بغداد میں مدرس تھے۔ اکثر ایسی تصانیف لکھا کرتے تھے۔ ان کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ مسائلِ خلاف انھیں ایسے ازبر تھے جیسے مسلمانوں کو سورۂ فاتحہ۔

امام نے قولاً اور فعلاً مسلمانوں کی بڑی جلیل القدر خدمات انجام دی ہیں اور انھیں واقعی حجۃ الاسلام کا لقب زیب دیتا ہے۔[۱]

۱؎ تاریخِ ادبیاتِ ایران (انگریزی)؛ براؤن (جلد دوم)۔ غزالی نامہ: جلال ہمائی (تہران)۔

تاریخِ ادبیاتِ ایران: یسارکی۔ ثقافتِ اسلامی کا خاکہ (انگریزی)؛ شوستری (جلد دوم)۔

میراثِ اسلام (انگریزی)۔ میراثِ ایران (انگریزی)۔

ب

۱) **بہشت** : اس کے پہلے دونوں حرف مکسور ہیں (بِ ہِ ش ت) ش ساکن ہے۔ صاحبِ فرہنگ آنندراج لکھتے ہیں کہ یہ "دارالجزائے مردمانِ نیکوکار ہے"۔ افسوس کہ اس کی لسانی تحقیقات مزید نہ ممکن ہو سکی۔ عربی میں اس کے مقابلہ میں خلد ہے جس کے لغوی معنی ہیں مقامِ ابدی اور اشارہ یہ ہے کہ نیکوکار دائماً لطفِ الٰہی سے بہرہ مند ہوں گے۔ ایرانیوں کے عقیدہ کے مطابق بہشت کے آٹھ درجے بہ تفصیلِ ذیل ہیں :

(۱) خُلد (۲) دارالسلام (۳) دارالقرار (۴) جنّتِ عدن
(۵) جنّت الماویٰ (۶) جنّت النعیم (۷) علیّین (۸) فردوس

سنسکرت میں بھی دوزخ کے یا نرک کے درجے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی آریائی اثر ہے جو ایرانیوں اور ہندوستانیوں کے درمیان قدرِ مشترک کے طور پر پایا جاتا ہے۔[1]

---

[1] غیاث اللغات۔ فرہنگ آنندراج۔

خ

(۱) **خواب وخستگی**: اشارہ ہے دو آیاتِ قرآن کی طرف جن میں سے پہلی یہ ہے:

لا تاخذہ سنۃ ولا نوم (دیکھئے ۲/۲۵۵)

اور: ومامسنا من لغوب (دیکھئے ۵۰/۳۸)

پہلی آیت کا ترجمہ یہ ہے:

اسے نہ تو اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔

دوسرے جزو کے معانی یہ ہیں:

اور نہ ہمیں تھکن محسوس ہوئی

(۲) **خسرو**: امیر خسرو کا سالِ ولادت سنہ ۶۵۱ھ ہے۔ مولد ایک قصبہ ہے پٹیالی جو ایٹہ کے ضلع میں واقع تھا۔ اس قصبہ کو مومن پور یا مومن آباد بھی کہتے تھے سنہ ۶۹۵ھ میں دریائے گنگا اس قصبہ کے ساتھ بہتا تھا لیکن اب دریا نے اپنا رخ بدل لیا ہے اور قصبہ دریا کے ساحل

سے دور ہو گیا ہے۔

امیر کے والد سیف الدین محمود ترک تھے اور مسلّم ہے کہ ہزارہ لاچین نامی ایک قبیلہ سے متعلق تھے۔ ڈاکٹر وحید کی تحقیق یہ ہے کہ یہ قبیلہ اصل میں ماوراءالنہر کے پاس آباد تھا۔ جب چنگیز خاں کا سیلاب بڑھنا شروع ہوا تو امیر کے والد بیوی بچوں کو لے کر ہندوستان چلے آئے اور سلطان شمس الدین التتمش کی ملازمت اختیار کر لی۔ یہ وہی جلیل القدر بادشاہ ہے جو خود قطب الدین ایبک کا غلام تھا لیکن جس نے خود ہندوستان میں گویا اسلامی سلطنت کی بنیادوں کو استوار کر دیا۔ امیر کے نانا عماد الملک بھی شاہی ملازمت میں منسلک تھے اور نہایت خوش ذوق اور خوش وضع بزرگ تھے۔ انہیں موسیقی سے شغف تھا۔ علما اور ارباب فن کی تربیت اس بے دریغی سے کرتے تھے کہ دور دور سے آتے تھے اور جھولیاں بھر بھر کے انعام پاتے تھے۔ ان کے مکان پر اکثر ہندوستان کی کلاسیکی سنگیت کی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ امیر نے موسیقی کی ابتدائی تعلیم انہی محفلوں میں حاصل کی ہے کہ کن رسیا ہو گئے۔ اس کے بعد راگ ودّیا کے ماہر ہو گئے۔ پھر گانے کی طرف مائل ہو گئے، اور اس فن میں ایسا کمال حاصل کیا کہ اب تک نائک کہلاتے ہیں (یہ خطاب کلاسیکی سنگیت جاننے والے معدودے چند آدمیوں کو عطا کرتے ہیں) تعجب ہے کہ امیر کو شروع ہی سے شعر گوئی کا چسکہ تھا۔ ادھر اتفاق سے ۶۵۲ھ میں ان کے والد کی وفات ہو گئی اور ان کے نانا نے ان کی تعلیم و تربیت اپنے ذمہ لی۔

جب امیر خسرو نے ذرا پر پرزے نکالے تو علاء الدین قتلغ مبارک باربک کے دربار سے منسلک ہو گئے کہ سخاوت میں بے نظیرِ زماں تھا اور شعراء کی تربیت کی طرف بطورِ خاص متوجہ رہتا تھا۔

جب امیر خسرو قتلغ کے دربار سے منسلک ہوئے ہیں تو اس وقت اُن کی کیفیت یہ

تھی کہ علوم شعری ان کو خوب مستحضر تھے موسیقی سے شغف تھا۔ شعر خوب کہتے تھے۔ درباداری کے لوازم میں مہارت رکھتے تھے۔ اگرچہ علوم معقول کی طرف توجہ دینے کا موقع نہیں ملا، مگر کچھ سالوں تک امیر درباداری کے قواعد سے آشنائی پیدا کرتے رہے اور ساتھ ہی راگ ودّیا کے رموز سے بھی آگاہ ہوتے رہے۔

کچھ عرصہ کے بعد امیر بلبن کے بیٹے شہزادہ محمد کے دربار سے منسلک ہو گئے جو اگرچہ شجاع اور شیر دل تھا لیکن جنگی چالوں سے بخوبی آگاہ نہ تھا۔ شہزادہ محمد کے دربار میں حسن سجزی یا سنجری[۵] بھی تھے۔ یہ حسن سجزی وہی شاعر ہیں جن کے متعلق مشرق کے داستان طرازوں نے بہت چمکا کر یہ افسانہ لکھا ہے کہ شہزادہ محمد کو دونوں کی دوستی ناگوار تھی چنانچہ حسن کو خسرو سے ملنے پر روکا گیا اور اسے تازیانے مارے گئے۔ دوسرے دن جب دربار میں حاضر ہوئے تو انھوں نے آستین اُٹھا کر دکھایا کہ ان کے بدن پر بھی تازیانے کے نشان تھے اور یہ مصرعہ پڑھا:

گواہ عاشق صادق در آستیں باشد

پروفیسر شبلی نے بھی اس قصہ کو خوب چمکا کے لکھا ہے۔ وحید مرزا اس افسانہ کو مشتبہ اور سخت مشتبہ قرار دیتے ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ معاصر مورخ برنی اس قصہ کا ذکر نہیں کرتا ہے کہ ان دونوں میں دوستی محبت کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں امیر اور حسن کے کلام میں اس واقعہ کی طرف قطعاً کوئی اشارہ نہیں۔

انھی دنوں امیر کی شادی ہو گئی۔ ان کی غزلیں بھی اب حال وقال کی محفلوں کو گرماتی تھیں اور رندوں کو بھی پسند آتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی غزلوں کی مقبولیت کا یہ عالم

---

[۵] سنجری اور سجزی سے مراد ہے سیستانی کہ سیستان کا پرانا نام سگستان اور سجستان تھا۔ گ اور ج کا تبادلہ آریائی زبانوں میں عام ہے۔ حسن کے متعلق سنجری کی نسبت سخت مشتبہ ہے اور تمام قرائن اس بات کے مؤید ہیں کہ کسی کاتب نے سجزی کو سنجری پڑھا ہے اور پھر مورخ آئیکل آرلین کے الفاظ میں برابر اپنے آپ کو دہراتے چلے آئے ہیں اور حسن سجزی سنجری ان گئے ہیں۔

تھا کہ سعدی ان سے ملنے کے لئے ہندوستان آئے۔ آیا سعدی ہندوستان آئے یا نہیں؟ یہ متنازعہ مسئلہ ہے سعدی بوستان میں خود لکھتے ہیں کہ وہ ہندوستان آئے ہیں لیکن مورخ اور نقاد اس داخلی شہادت کو بھی اہم قرار نہیں دیتے۔

یہ وہ پرآشوب زمانہ تھا جب منگول برابر سلطنت ہندوستان کے دروازوں پر دستک دے رہے تھے بلبن کے جانشینوں سے لے کے علاءالدین خلجی تک ہر فرماں روا نے منگولوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کا صحیح اندازہ لگایا اور یہ کوشش کی کہ ہندوستان ان کے حملوں سے محفوظ رہے۔ ۱۲۸۳ھ میں تیمور خاں کہ جو منگولوں کی فوجوں کا ایک مشہور سردار تھا اپنا لاؤ لشکر لے کر ملتان پر چڑھ دوڑا۔ دریائے راوی کے کنارے کانٹے کی لڑائی ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فتح مسلمانوں کو ہوئی ہے۔ منگول ذرا پیچھے ہٹے تو شہزادہ محمد نماز کی صف باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس حالت میں منگولوں نے شہزادہ کی فوج پر حملہ کیا۔ شہزادہ شہید ہوا اور ساتھ ہی جیسا کہ اکثر ہوتا ہے فوج آمادہ فرار ہوئی۔ منگولوں نے بھاگتے ہوئے سپاہیوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر امیر خسرو بھی گرفتار ہوئے۔ وہ کہتے ہیں ؎

آں کہ بر سر نمی نہادہ گل   بار بر سر نہاد و گفتا جل

یعنی جو لوگ سر پر فرط نزاکت سے پھولوں کے سہرے بھی نہیں باندھتے تھے منگولوں نے انہیں مجبور کیا کہ سر پر بوجھ اٹھائیں اور مزدوروں کی طرح چلیں۔

لہ جو شعر نقل کیا گیا ہے اس میں امیر نے بہت کمالات کا اظہار کیا ہے ایک تو یہ کہ ملتان کی طرف جل امر ہے یعنی چل اور اس میں کوئی شک نہیں کہ چلنا اور جلنا ایک ہی مصدر ہے لیکن جو نزاکت کی بات ہے وہ یہ ہے کہ اہل عرب نے گل کو معرب کر کے جل کر دیا ہے چنانچہ وہ گلاب کو جلاب کہتے ہیں۔ گل قند کھانے سے معدہ کا عمل ٹھیک ہو جاتا ہے اور یوں بھی اگر معدہ کا عمل بہت خراب ہو تو گلاب کے پھول کا شربت پلاتے ہیں (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امیر اس حبس سے جلد ہی رہا ہو گئے اور ملتان پہنچے۔ ملتان میں صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی وہاں سے وہ دہلی گئے اور محمد کی موت پر ایک نہایت معرکہ کا مرثیہ کہا جو اب تک بے نظیر تصور کیا جاتا ہے۔

اگرچہ منگولوں کے حملہ اور سلطان محمد کی شہادت کی وجہ سے دہلی میں افسردگی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی لیکن عام لوگ کچھ عرصہ کے بعد اس واقعہ کو بھول گئے اور اسی طرح عیش و نشاط کی محفلیں گرم ہونے لگیں۔ اس زمانہ میں دلی کے کوچے واقعی اوراق مصور تھے اور جو شکل تھی واقعی تصویر تھی۔ امیر نے اس زمانہ میں دلی کے خوب رُویوں کے چہرے دل پر ضرور رکھائے ہیں۔ ان کی غزلیں شاہد ہیں کہ دلی کے طرحدار محبوب دلبری کی تمام اداؤں سے آگاہ تھے۔ اسی زمانہ کی امیر کی ایک غزل ہے:

اے دلی وائے بتان سادہ پگ بستہ و چیرہ کج نہادہ

اس شعر سے اندازہ ہو گا کہ فارسی میں کس تیزی سے ہندوستانی الفاظ داخل ہو رہے تھے۔ پگ فارسی میں پاؤں ہے لیکن ہندوستانی زبان میں دستار کہتے ہیں اور یہ چیرہ تو ظاہر ہے کہ مانگ نکالنے کی ایک خاص وضع کا نام ہے۔ پگ اور چیرہ کا اجتماع کچھ حیرت انگیز ضرور معلوم ہوتا ہے۔

امیر برابر شعر گوئی میں، راگ وِدیا میں، بذلہ سنجی میں، خوش کلامی میں ماہر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ دہلی میں بادشاہ برابر معزول ہو رہے تھے، مر رہے تھے، تخت نشیں ہو رہے تھے لیکن امیر کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اور اس صورت میں شربت کو دو آتشہ کر دیتے ہیں۔ یہ شربت طبی اصطلاح میں شربت ورد احمر کہلاتا ہے۔ عربی میں ورد گلاب کے پھول کو کہتے ہیں اور سعدی نے "ماورد" کا کلمہ گلاب کے لئے یا پھول کے عرق کے لئے استعمال کیا ہے۔ بہر حال امیر نے گل اور جل میں جو کرشمہ مخفی رکھے ہیں ان کی داد وہی لوگ دے سکتے ہیں جو ملتانی لہجہ جانتے ہوں اور فارسی اور عربی سے بھی آگاہ ہوں۔

قدر دانی ہر کوئی کرتا تھا۔

جب کیقباد نے تخت حکومت پر جلوس کیا اس نے امیر کی بڑی قدر دانی کی لیکن وہ عیش و عشرت میں ایسی بری طرح مشغول ہوا کہ امرا اس کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔ آخر بادشاہ پر فالج گرا۔ چنانچہ ۶۸۹ھ میں فیروز خلجی نے تخت حکومت پر جلوس کیا۔ خلجی اگرچہ بڑھا تھا لیکن دل جوان رکھتا تھا۔ چنانچہ اس کے زمانے میں بھی امیر کی قدر دانی برابر ہوتی رہی۔ ادھر خلجی نے جو بڑھاپے میں مسند حکومت پر جلوس کیا تو اس نے چاہا کہ زندگی کے جو چند سال باقی ہیں ان میں عیش و نشاط کا تمام رس نچوڑ لے۔ وحید مرزا نے اس کی محافل نشاط کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کے دربار میں محمد شاہ جیسا مغنی تھا۔ فتوحہ اور نصرت خاتون جیسی عورتیں رقص کا کمال دکھاتی تھیں اور مہر افروز جیسی انجمن آرا نازنین ارباب محفل کو موسیقی اور رقص سے مسحور کرتی تھی انہی محفلوں میں خسرو کی غزلیں اکثر گائی جاتی تھیں۔

جلال الدین خلجی کے عہد حکومت میں علاء الدین خلجی کا ستارۂ اقبال بھی ابھرا اور آخر ۶۹۵ھ میں وہی مسند آرائے حکومت ہوا۔ اس رد و بدل کا امیر پر کوئی اثر نہیں پڑا اور وہ برابر شعر گوئی اور راگ ودیا کی تعلیم حاصل کرنے میں مصروف رہے۔ علاء الدین کے زمانے میں بھی منگولوں نے ہندوستان پر حملہ کیا لیکن منہ کی کھائی۔ علاؤ الدین نے مغلوں کے خلاف مستقل محاذ قائم کیا، مستقل فوج ملازم رکھی۔ قلعہ بندی کے انتظامات کی تکمیل کی۔ سرحدی علاقوں کی طرف خاص طور پر توجہ دی یہاں تک کہ منگولوں کو یقین ہو گیا کہ علاء الدین کے زمانہ میں ہندوستان کی تسخیر ناممکن ہے

علاء الدین نے بیس سال حکومت کی اور اسی کے زمانہ میں امیر خسرو کا فن اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا۔ فن میں اس کی نغز نگاری اور اس کی اختراعات متعلق بہ موسیقی بھی شامل ہیں۔

۷۱۵ھ میں امیر کی زندگی میں وہ واقعہ پیش آیا جس نے ان کی شعر گوئی اور موسیقی کی دنیا

کا رُخ بدل دیا۔ قصہ یہ ہے کہ کچھ سالوں سے امیر بے چین سے رہتے تھے اور ان کا جی چاہتا تھا کہ ظواہر شریعت پر عمل کرنے کے بجائے طریقت اور سلوک کی منزلیں طے کریں۔ ان دنوں دہلی میں خواجہ نظام الدین اولیاء مسندِ ہدایت و ارشاد پر جلوہ افروز تھے۔ امیر نے انھیں کے ہاتھ پر بیعت کی۔ نظام الدین اولیا نے بڑے بڑے اولیا سے فیض حاصل کیا تھا۔ داتا گنج بخش کے روضہ میں بھی مقیم رہے تھے۔ وہ سماع کو مباح جانتے تھے۔ چنانچہ جب امیر نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی تو قوالی کی محفلیں گرم ہونے لگیں۔ انھی دنوں امیر نے نئی راگ راگنیاں بھی اختراع کیں جن میں بہار بہت مشہور ہے۔ یہ وہی راگنی ہے جس کو فن کار مختلف راگوں کے سانچہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً بھیرویں کو یا مالکوس کو بہار کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں اسے بھیرویں بہار یا مالکوس بہار کہتے ہیں۔ خواجہ ناصر نذیر فراق کا دعویٰ ہے کہ امیر خسرو نے پکھاوج ایجاد کر کے رہتی دنیا تک موسیقاروں اور ساز نوازوں کو اپنا ممنون احسان کر دیا۔ طبلہ کے بولوں کو پکھاوج بالکل ہندسی صحت سے مختلف اجزا میں بانٹ دیتا ہے پکھاوج بجانے والے بھی شاذ و نادر ملتے ہیں۔ ستار کی ایجاد بھی امیر سے منسوب ہے لیکن مجھے کسی مستند تاریخ میں یا کسی راگ ودیا کی کتاب میں (عربی، فارسی، ہندی، اردو) یہ شہادت دستیاب نہ ہوئی کہ ستار ان کی ایجاد ہے۔ خود امیر نے بھی اپنی تصنیفات میں اشارہ تک نہیں کیا کہ وہ ستار کے موجد ہیں۔ وحید مرزا نے یہ کہا ہے کہ ستار کے ایجاد کی نسبت امیر سے مشکوک ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ طے سمجھنا چاہئے کہ امیر ستار کے موجد نہیں ہیں۔ امیر نے نظام الدین اولیا کی محفلوں میں جو سماع کی خاص وضع ایجاد کی تھی اسے قوالی کہتے ہیں وہ آج تک رائج ہے اور اکثر غزلیں قوالی ہی میں گائی جاتی ہیں۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ امیر نے دھرپد کے مقابلے میں فارسی موسیقی سے مدد لے کر خیال کی نیو رکھی ہے لیکن یہ دعویٰ بھی سخت مشتبہ ہے۔ اس سلسلہ میں سہ نثر ظہوری کے بیانات بڑے مستند اور وقیع ہیں کہ ظہوری خود بھی اور

اس کا ممدوح بھی راگ ودّیا کے ماہر تھا خیال کی موجودہ شکل قطعاً امیر خسرو کے بعد پیدا ہوئی ہے۔ موسیقی ہی کے سلسلہ میں خسرو سے ایک اور ایجاد منسوب ہے یعنی ترانہ اس کی صورت یہ ہے کہ راگ کو کچھ بولوں پر بانٹ دیا جاتا ہے جو طبلہ پر بجائے جاتے ہیں کیفیت اس کی یا تو سننے سے سمجھ میں آسکتی ہے یا جزواً کسی راگ کا ترانہ نقل کرنے سے اور یہ بتانے سے کہ گر کہاں پڑتا ہے۔ واضح رہے کہ راگ کے بولوں کی تقسیم بالکل مختلف چیز ہے۔ اس میں راگ یا راگنی کے الفاظ درت یا بلمپت لے میں مختلف طریقوں سے بانٹ دیے جاتے ہیں۔ ترانہ میں یہ نہیں ہوتا مثلاً ہمیر کا ترانہ روپک تال بہ تفصیلِ ذیل ہے:

تانا دیم تانا۔ نا در در دانی در در

انترہ: تانا نادرنا۔ دیم تادانی۔ دیم تانانا۔ دیم تانانا۔ دیم تانا

امیر خسرو نے نظام الدین اولیا کی تعریف میں کچھ نئے بول بھی لکھے ہیں۔ مثلاً بہار راگنی کے جو بول اکثر گائے جاتے ہیں وہ یوں شروع ہوتے ہیں:

کلین سنگ کرت رنگ رلین

لیکن امیر نے اس کے بول یہ لکھے ہیں:

حضرت خواجہ سنگ کھیلئے دھمال — بیش خواجہ تم بن ٹھن آئے

حضرت رسول صاحب جمال — حضرت خواجہ سنگ کھیلئے دھمال

بڑے بڑے فن کار اور نائک امیر ہی کے بول گاتے ہیں چنانچہ میں نے ہر بلب میں شنکر راؤ، نارائن راؤ پٹ وردھن اور اونکارناتھ پنڈت کو سالانہ میلے پر یہ بول گاتے سنا ہے۔

جب خواجہ نظام الدین اولیا سخت بیمار ہوئے تو انھوں نے خلافت کی تمام نشانیاں جو فریدالدین گنج شکر سے ان تک پہنچی تھیں، مولانا نصیر الدین شاہ چراغ دہلوی کے حوالے کر دیں،

اور اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کردی۔ اُن دنوں امیر اودھ میں تھے۔ انھوں نے اپنے مرشد کے وصال کی خبر سُنی تو فوراً دہلی لوٹے۔ روضہ پر پہنچے، یہ شعر پڑھا:

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈالے کیس

چل خسرو گھر آپنے رین بھئی سب دیس

اس کے بعد ان کی طبیعت خراب ہوتی چلی گئی اور آخر مرشد کی وفات کے بعد ۷۲۵ھ میں جمعہ کی رات ذوالقعدہ کے مہینہ کی انتیس تاریخ کو وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

۲۔ تصانیف اور ان پر انتقاد: امیر کی تصانیف اس قدر متنوع کہ حیرت ہوتی ہے۔ تصوف انشا غزل، مثنوی، قصیدہ، معمہ، درسی منظومات سبھی قسم کی چیزیں انھوں نے لکھی ہیں۔ اس مضمون میں ان تمام تصانیف سے بحث تو نہ ممکن ہے نہ مناسب، صرف اہم ترین تالیفات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

امیر نے پانچ تو دیوان غزلیات اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ پانچوں کے ناموں سے معلوم ہوتا ہے کم وبیش تالیف کا زمانہ کیا تھا یعنی امیر جوان تھے یا ادھیڑ عمر کے ہو چکے تھے یا بڑھاپے کے زمانہ کا کلام ہے۔

امیر کی غزلوں کے متعلق کم وبیش سب ہی نقادوں نے یہ لکھا ہے کہ ان میں وہی رنگ موجود ہے جو سعدی کی غزلوں میں نظر آتا ہے۔ اگر یہ دعویٰ ہر معنی میں صحیح ہے تو نہ سعدی کیلئے باعثِ افتخار ہے اور نہ امیر کے لئے۔ ہر بڑے شاعر کی انفرادیت اس وضع کی ہوتی ہے کہ اس کا کلام ہمیشہ دوسرے شعرا کے کلام سے مشخص ہو جاتا ہے اور ادبی روایت کی ہم آہنگی بھی اس امتیاز میں حائل نہیں ہوتی۔ بیشک کچھ ظاہری مشابہتیں امیر اور سعدی کے کلام میں موجود ہیں لیکن ان کا وجود بیشتر فارسی غزل کی روایت کے تسلسل کا مرہون ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ امیر کے کلام میں بھی دوراز کار استعارے اور پیچدار تشبیہات نہیں لیکن ان چیزوں کے

نہ ہونے سے امیر اور سعدی کا رنگِ تغزل مشابہ نہیں ہوجاتا۔

قصہ یہ ہے کہ امیر کے ہاں جذبہ اور اس کا اظہار سعدی سے زیادہ شدید ہے۔ سعدی کے ہاں تصوف اگر ہے بھی تو برائے وزن بیت ہے۔ امیر نے تصوف برتا ہے اور وہ ان واردات سے متاثر ہوئے ہیں جنہیں احوال و مقامات کہتے ہیں۔ اس لئے امیر کی غزل میں جہاں متصوفانہ واردات بیان ہوتی ہیں وہاں ان کا کلام سعدی سے بالکل جدا ہوجاتا ہے۔ ایک اور امتیاز یہ ہے کہ امیر کے کلام سے اکثر متبادر ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان میں بیٹھ کر شعر کہہ رہے ہیں۔ کلام میں ہندی اور پراکرت کے دوسری شکلوں کے الفاظ کی بہتات، ہندی رسم و رواج کا ذکر ان کے ہاں اکثر ملتا ہے۔ علاوہ ازیں امیر کے کلام کی موسیقی۔ ترنم اور نغمہ۔ سعدی کی روانی اور سادگی سے بالکل مختلف ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے امیر کلاسیکی سنگیت کے ماہر تھے اور اپنی شعر گوئی میں ان تمام امور سے کام لیتے تھے جن پر انھیں عبور حاصل تھا۔

امیر نے مثنویاں بھی بہت لکھی ہیں۔ ان میں رومانی مثنویاں بھی ہیں اور تاریخی بھی۔ تاریخی مثنویوں میں قرانِ السعدین اور مفتاح الفتوح بہت مشہور ہیں۔ رومانی مثنویوں میں ایک تو انھوں نے نظامی گنجوی کے خمسہ کا جواب لکھا ہے۔ دوسرے خضر خاں دولرانی کے معاشقہ کو بھی نظم کردیا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ امیر نے خمسہ کا بہترین جواب لکھا ہے۔

امیر سے ایک اور کتاب بھی منسوب ہے یعنی خالق باریؔ لیکن پروفیسر شیرانی نے "پنجاب میں اُردو" میں یہ کہا ہے کہ اس کتاب کی نسبت امیر سے سخت مشکوک ہے۔

مثنویوں، غزلوں اور قصیدوں کے علاوہ امیر نے ہندی دوہے بھی کہے ہیں۔ ایسی زبان بھی استعمال کی ہے جسے ملی جلی ہندی اردو کہا جا سکتا ہے۔ چیستان بھی لکھے ہیں۔ انشا پردازی اور موسیقی پر بھی رسالے قلمبند کئے ہیں۔

امیر کی تالیفات علی گڑھ سے بہت اہتمام سے شائع ہوئی ہیں۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے فاضل اساتذہ نے مثنویوں پر اور دوسری کتابوں پر دیباچے لکھے ہیں۔ البتہ غزلوں کا دیوان مکمل اب کم ملتا ہے۔ نول کشور نے ان کی غزلوں کا انتخاب عناصر "دواوینِ خسرو" کے نام سے شائع کردیا ہے اور وہی آج کل متداول ہے۔

پہلے گذارش کیا جاچکا ہے کہ امیر کی تالیفات کا تنوع حیرت انگیز ہے۔ بعض یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ اردو نظم کے موسس بھی امیر ہی ہیں لیکن حافظ محمود شیرانی کو اس دعوے کو تسلیم کرنے میں تامل ہے۔ یوں بھی یہ دعویٰ اس لئے محلِ نظر معلوم ہوتا ہے کہ اردو نظم ونثر کی ابتدا لطبعاً اُن علاقوں میں ہوئی ہوگی جہاں مسلمانوں کے قدم پہلے جمے ہیں۔ یہ علاقے ملتان اور پنجاب ہیں اور یہی بات قرین صواب معلوم ہوتی ہے کہ اُردو نظم کی ابتدا انہیں ہوئی ہے۔ ابھی تک ان علاقوں میں جو اولیا ہو گزرے ہیں ان کے ملفوظات کے متعلق پورا کام نہیں ہوا جب یہ تحقیق ہوچکے گی تو معلوم ہوگا کہ اُردو نظم ونثر کے ارتقاء میں پنجاب کا کیا حصہ ہے۔ یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ کئی سو سال قبل مسیح ہخامنشیوں نے مغربی پاکستان کو فتح کرلیا تھا اور اُن دنوں پنجابی پراکرت میں فارسی قدیم کے الفاظ کی آمیزش ضرور ہوئی ہوگی۔ بہر حال یہ ایک علیحدہ سوال ہے اور امیر خسرو کے حالات میں اس سے تفصیلی بحث کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔[۹]

لہ شعر العجم: شبلی (حالاتِ امیر خسرو)۔ امیر خسرو کی زندگی اور تصانیف: وحید مرزا، پی ایچ ڈی کا مقالہ کلکتہ۔

مضامینِ ناصر نذیر فراق: ساقی دہلی۔ معارف النغمات۔

تفصیلِ موسیقی: محمد افضل خاں۔ تاریخِ ادبیاتِ ایران: شفق۔

دیباچہ کلیاتِ حسن سجزی: مطبوعہ حیدرآباد۔

امیر خسرو کی تالیفات جو وقتاً فوقتاً علی گڑھ یونیورسٹی سے شائع ہوئیں بالخصوص اعجازِ خسروی۔

د

(۱) دخمہ: ایران قدیم میں قاعدہ تھا کہ اکثر اوقات مردوں کو خاص عمارتوں کے صحن میں رکھ کر چلے آتے تھے۔ گدھ اور دوسرے جانور گوشت نوچ کے کھا جاتے تھے۔ یہ خاص عمارتیں دخمہ کہلاتی تھیں۔ بمرورِ زماں ایرانیوں نے اس کے معنی میں تصرف کر لیا۔ چنانچہ صاحب بہارِ عجم لکھتے ہیں:

"دخمہ بالفتح سردابہ کہ گبراں را دراں دفن کنند وصندوق مردہ وگنبد کہ بر سر قبر سازند مجاز است۔"

سنجر کاشی — شہیدِ عشق را در دخمہ کافر گر اندازی
ملک تسبیح سازد از تبرک استخوانش را،

حیم بھی یہ لکھتا ہے کہ دخمہ پارسیوں کے قبرستان کو کہتے ہیں اس کے لئے وہ انگریزی کا کلمہ Tower of Silence استعمال کرتا ہے (حصار خاموشی)۔ وہ یہ بھی تصریح کرتا ہے

کہ عام قبرستان کو بھی کہتے ہیں۔ سردابہ اور تہ خانہ بھی وہ اس کے معنی بتاتا ہے۔

اس سے پہلے گزارش کیا جا چکا ہے کہ لاشوں کو ٹھکانے لگانے کے متعلق ایران میں مختلف دستور تھے۔ مردہ کو دفن بھی کرتے تھے۔ چنانچہ ہخامنشی بادشاہ مدفون ہیں۔ لاشوں کو دخمہ میں بھی پھینک آتے تھے اور یہ بھی مستند تاریخی شہادت سے ثابت ہے۔[1]

---

[1] بہارِ عجم۔ — لغتِ فارسی انگلیسی: سلیمان حییم۔

تاریخِ مملکتِ ایران (انگریزی) ۲۱۹ اومسٹیڈ۔ — حماسہ سرائی در ایران: ذبیح اللہ صفا۔

مزدیسنا: محمد معین۔

ص

(۱) صبت الکاس عنا ام عمرو
وکان الکاس مجراھا الیمینا

ابنِ کلثوم زمانۂ جاہلیت کا مشہور شاعر ہے۔ اس کی خوش کلامی اور معنی طرازی کا یہ عالم تھا کہ جو قصائد مکہ معظمہ میں آویزاں کیے گئے ہیں اور "معلقات" کہلاتے ہیں، ان میں ابنِ کلثوم کا قصیدہ بھی شامل ہے بعض مورخ اس دعوی کی تردید کرتے ہیں لیکن عام روایت یہی ہے کہ یہ قصیدہ معلقات میں شامل ہے۔ جس قصیدہ کا شعر علامہ نے نقل کیا ہے اس کا مطلع یہ ہے:

الا ھبی بصحنک فاصبحینا
ولا تبقی خمور الاندرینا

کہ اے محبوب اُٹھ اور ہمیں صبوحی پلا اور اندرین کی بنی ہوئی شراب میں سے کچھ بھی باقی نہ چھوڑ۔

عرب کے مشہور قصیدہ نگاروں کی طرح ابن کلثوم نے بھی اس قصیدہ میں اپنی عالی نسبی اور عالی گہری کا ذکر کیا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ اگر کوئی شخص ہم سے ناروا سلوک کرے گا تو ہم بھی اس سے ایسا ہی سلوک کریں گے۔ وہ کہتا ہے:

الا لا یجهلن احد علینا
فنجهل فوق جهل الجاهلینا

یعنی خبردار کوئی شخص ہم سے جہالت کا سلوک نہ کرے ورنہ ہم بھی جہلا کی جہالت سے بڑھ کر اس سے جہالت کا سلوک کریں گے۔

علامہ نے جو شعر نقل کیا ہے، اس کا ترجمہ یہ ہے:

اے اُمِ عمرو! تو نے ہم سے شراب کے پیالہ کو روک لیا ہے درانحالیکہ اب دائیں طرف کے لوگوں کے پینے کی باری تھی۔[1]

---

[1] تاریخِ ادبیاتِ عرب: نکلسن۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔

ط

(۱) **طاغوت:** صاحب منتخب لکھتے ہیں کہ عربوں کے جو دو مشہور بت تھے لات اور عزیٰ انھیں کا یہ ایک نام ہے۔ اس سے مراد شیطان بھی ہوتا ہے اور کاہن بھی۔ صدرالدین بلاغی لکھتے ہیں کہ طاغوت ہر وہ چیز ہے جس کی پرستش خدا کی جگہ کی جائے لیکن یہ تصریح بھی کرتے ہیں کہ طاغوت لات یا عزیٰ کا ہی ایک اور نام ہے۔ طاغوت سے مکر و فریب، شیطنت اور سیاہ کاری کے ایسے تصورات وابستہ ہیں کہ اس معاملہ میں نسبتاً مفصل تحقیق کی ضرورت ہے۔

مفسر اور لغت نویس دونوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ لات و عزیٰ کو کہتے ہیں۔ لات اور عزیٰ کی حقیقت پر غور کرنے سے طاغوت کی حقیقت بھی بآسانی ذہن نشیں ہو جائے گی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لات اصلاً بابلی بت ہے۔ اس کی شکل عرب میں محض ایک سنگِ چہار گوشہ کی تھی۔ اس سے پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ ایسے بت جو محض پتھروں کے ٹکڑوں سے عبارت ہوں بالعموم جنسی علائم و رموز کی نشاندہی کرتے ہیں۔ بابلیوں کے عقیدہ کے مطابق لات رب الارباب

یا سب سے بڑے دیوتا کی بیٹی تھی۔ اس کی بہن ماماتو تھی جسے عرب اپنی زبان میں منات کہتے ہیں۔ منات درحقیقت افرودیتی کا دوسرا نام ہے۔

عزیٰ کی تاریخ پر غور کرنے سے بات بالکل سلجھ جاتی ہے۔ قریش کا عقیدہ یہ تھا کہ لات، منات اور عزیٰ رب الارباب یا خدا کی بیٹیاں ہیں۔ بابلی کتبوں پر جو عبارتیں منقوش ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بت یعنی عزیٰ وہی ہے جو محبت، جنس، زرخیزی اور تخلیق و نشوونما سے منسوب ہے۔ یونانی اسے افرودیتی کہتے تھے۔ آرانی اسے اِیستر کہتے تھے۔ ہیروڈوٹس کے زمانے میں اسی بت کو بلیتی یا ملیتا کہتے تھے۔ چنانچہ قدیم زمانہ کی عورتوں کے نام اکثر اسی دیوی کے نام پر رکھے جاتے تھے یعنی ملیتا۔

اِن تمام باتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ طاغوت دراصل افرودیتی ہی کا ایک نام ہے جس طرح لات و عزیٰ اس کے نام ہیں۔ اس دیوی کی پرستش کی آڑ میں (یعنی افرودیتی) کاہنوں اور پجاریوں نے ایسی ایسی سیاہ کاریوں کا ارتکاب کیا ہے کہ اب طاغوت شیطان کو بھی کہنے لگے ہیں اور طاغوتی سے شیطانی یا ابلیسی مراد ہوتا ہے۔[1]

---

[1] غیاث اللغات۔ منتخب اللغات۔ قصص قرآن: صدرالدین بلاغی۔
لغتِ فارسی انگلیسی: سلیمان حیم۔ بابلی صنمیات (انگریزی) میکنزی۔

ع

(۱) **عبدالعزیز (ابن سعود)**: عبدالعزیز ابن عبدالرحمن الفیصل السعود کی ولادت کا سال ۱۸۸۰ء ہے۔ مولد الریاض ہے کہ نجد میں واقع ہے۔ عبدالعزیز وہابیوں کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ بچپن میں اسے جلاوطن کر دیا گیا لیکن ۱۹۰۱ء میں وہ کوئی دو سو آدمیوں کو ہمراہ لیکر ریاض میں در آیا اور شہر کو فتح کر لیا۔ یوں تو ۱۹۱۸ء تک نجد ترکیہ کی مقبوضات میں شامل رہا لیکن ابن سعود نے اپنے ثبات اور اپنے حوصلے سے دراصل ایک خودمختار سلطنت کی بنیاد رکھ دی تھی۔ آخر اس نے سلطان نجد کا لقب اختیار کر لیا۔ عربوں کو متحد کرنے کی کوشش کی اور یہ تلقین کی کہ بدوی زندگی چھوڑ کر فلاحت کی زندگی بسر کرنا چاہیے۔ اس نے مجلسِ اخوان بھی قائم کی۔ ابنِ سعود کے سپاہی اسی مجلس کے ارکان ہوتے تھے۔

پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں جب انگریزوں نے سلطان حسین کو کہ شریفِ مکہ تھا مدد دی تو ابن سعود نے بے باکانہ آگے بڑھ کر حجاز پر حملہ کر دیا اور حسین کی افواج کو شکست دے دی۔

آہستہ آہستہ اس کی مقبوضات پھیلتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ نجد کا شمالی حصہ اور اسلام کے مقامات متبرکہ بھی اس کے تصرف میں آ گئے۔ جب سلطان حسین مفرور ہوا تو ۱۹۲۶ء میں ابنِ سعود نے حجاز کو بھی رسمًا اپنی مقبوضات میں شامل کر لیا اور پھر سلطانِ نجد و حجاز کہلانے لگا۔ بعد میں اس کی مقبوضات سعودی عرب کے نام سے مشہور ہوئیں۔ برطانیہ نے سب سے پہلے اس نئی سلطنت کے وجود کو تسلیم کیا۔ بتدریج عرب کے بیشتر حصے پر ابنِ سعود کا قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد ابنِ سعود نے عرب کے دوسرے حصوں کے فرماں رواؤں سے معاہدے کر لئے کہ بوقت ضرورت ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

ابنِ سعود نے عمر بھر یہ کوشش کی کہ اس کے اصلی وطن کے رہنے والے یعنی نجدی تہذیب و تمدن کی تمام نعمتوں سے بہرہ یاب ہو جائیں اور تعلیم حاصل کریں۔

دنیا میں تیل کا جتنا ذخیرہ ہے اس کا نصف ابنِ سعود کی مقبوضات میں پایا جاتا ہے۔ امریکن کمپنیوں کو ٹھیکے دے دئے گئے ہیں۔ تیل نکالنے کا کام شروع ہے اور غالباً اس وقت ابنِ سعود کا خاندان دنیا کے متمول ترین خاندانوں میں سے ہے۔

عبدالعزیز ابنِ سعود نے کہیں باقاعدہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن تدبّر اور فراست کے اعتبار سے وہ اپنی نظیر آپ تھا۔ اس نے بڑی سے بڑی مغربی طاقت سے ٹکر لی اور ایسی شاطرانہ چالیں چلیں کہ فتح اسی کی ہوئی۔

امین ریحانی نے اپنی متعدد تصانیف میں ابنِ سعود کی فراست کے واقعات بیان کئے ہیں اور دارالسلطنت ریاض کی اقتصادی اور تمدنی زندگی سے بحث کی ہے۔

امیر عبدالعزیز ابنِ سعود ثالث کا اب انتقال ہو چکا ہے اور اس کی جگہ اب سعود ابنِ عبدالعزیز ثالث فرماں روا ہیں۔ پچھلے دنوں وہ پاکستان بھی تشریف لائے تھے۔

جب مکہ معظمہ پر ابنِ سعود کا تسلط ہوا تو حج کے سلسلہ میں کچھ ایسے احکام جاری کئے گئے جو عامۂ مسلمین کو ناگوار گذرے لیکن اب ان واقعات کی یاد دلوں سے بالکل محو ہو چکی ہے اور تمام لوگ فریضۂ حج اپنے اپنے عقائد کے مطابق ادا کرتے ہیں[۱]۔

---

[۱] قاموس سیاسیاتِ عالم (انگریزی) فیبر اینڈ فیبر -
وہابیوں کے عہد حکومت میں عرب (انگریزی): فلبی -
ابنِ سعود (انگریزی): امین ریحانی - عرب (انگریزی) اقبال علی شاہ -
عرب کے مقاماتِ متبرکہ (انگریزی) رٹر -

ق

(۱) **قد قامت :** نماز پڑھنے سے پہلے یہ کلمات استعمال ہوتے ہیں۔ پورے کلمات ہیں "قد قامت الصلوٰۃ" جس کے معنی ہیں تحقیق نماز کھڑی ہوگئی۔

۴۲۴

کتاب لکھی ہے۔ جس میں نیل کے کناروں پر جو کچھ ہوتا رہا ہے۔ اس کے متعلق دریا نے چشم حباب سے جو واقعات دیکھے ہیں، ان کا ذکر کیا ہے۔ اہرام مصر، ابوالہول بھی اسی زمین پر اسرار سے متعلق ہیں اور سحر و طلسم کے افسانے بھی، حضرت یوسف کا قصہ بھی اسی ملک سے تعلق رکھتا ہے۔

(خود دریائے نیل کی تاریخ بھی Ludwiq. کی کتاب میں ملے گی)[1]

---

[1] The Nile Story of River ; Emil Ludwiq.

ک

(۱) **کیکاؤس:** فردوسی نے ایران کے قدیم بادشاہوں کو دو خانوادوں میں تقسیم کیا ہے؛ پیشدادی اور کیانی۔ کاؤس یا کیکاؤس فردوسی کی روایت کے مطابق کیقباد کا لڑکا تھا اور کیانی بادشاہوں کے سلسلہ کا گل سرسبد تھا۔ اسی کے عہد میں ایرانیوں کی لڑائی دیو سپید سے ہوئی اور اس نے جادو کے زور سے کیکاؤس کو اندھا کر دیا۔ اس کے بعد نامی پہلوان رستم نے دیو سپید کو ہلاک کیا اور جادو کا اثر زائل ہونے سے کیکاؤس کی بینائی واپس آگئی۔ اسی کے زمانے میں افراسیاب تورانی سے ایرانیوں کے بڑے معرکے رہے۔ رستم اور سہراب کی داستان کا تعلق بھی اسی زمانہ سے ہے۔ روایات کہتی ہیں کہ اس کی بادشاہی کا زمانہ ایک سو ساٹھ سال تھا۔

اوستا میں کاؤس کا نام "کوی اوسن" آیا ہے اور گمان غالب یہ ہے کہ اس کا مطلب آرزومند یا خود پسند ہے۔ اوستائی اور پہلوی متون میں کاؤس کا ذکر ملتا ہے اور پہلوی کتابیں تو تفصیل کے ساتھ اس کے زمانہ کے حالات بیان کرتی ہیں۔ کیکاؤس کے ظالمانہ

اور جابرانہ اعمال کی تفصیل بھی ملتی ہے۔ غالباً اس کے ظلم اور جبر ہی کی وجہ سے روایات کہتی ہیں کہ فرکیانی (توفیق یزداں) اس کی مدد پر آمادہ نہ رہی۔ کاؤس کا ایک بیٹا سیاؤش تھا جس کے ناحق قتل ہونے کی داستان فارسی ادب میں بہت سی تلمیحات کا ماخذ ہے اور جس کے نام سے ایک راگنی بھی مشہور ہے یعنی کین سیاؤشاں۔

طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیکاؤس اور رستم کا زمانہ کون سا ہے قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایرانی تاریخ کا وہ زمانہ ہے جس کے حجابات ابھی تک رفع نہیں ہوئے۔ کاؤس کا عہد غالباً وہ عہد ہے جب آریائی قوم کی شاخیں ابھی مختلف ملکوں میں جاکر مستقلاً آباد نہیں ہوئی تھیں۔

کیکاؤس کے زمانے کی روایات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد محقق اس نتیجہ پر پہنچے ہیں

(۱) ایران نسبتہً متمدن ملک تھا اور اس کے مقابلے میں توران یعنی وسط ایشیا کا علاقہ وحشی قوموں کی آماجگاہ تھا۔ ایرانیوں اور تورانیوں کی لڑائی دراصل بدوی اور شہری تہذیب کی لڑائی ہے۔

(۲) جس دیوِ سپید کا ذکر کیا گیا ہے وہ مسلم ہے کہ سپید ہُنوں کے کسی قبیلہ کا سردار ہے۔ یہ لوگ بھی اصلاً آریائی تھے لیکن نسبتہً غیر متمدن تھے اور ایران پر اکثر حملہ آور ہوتے رہتے تھے۔

(۳) یہی غیر متمدن تورانی یا ہُن یا وسط ایشیا کے خانہ بدوش قبیلے قرآن مجید میں یاجوج ماجوج کے نام سے یاد کئے گئے ہیں۔ متمدن ملکوں میں ان کا ورود روکنے کے لئے مختلف سدیں تعمیر کی گئیں ہیں۔ ان میں سدِ باب الباب یا سدِ نوشیروانی، سدِ سکندری یا سدِ ذوالقرنین بہت مشہور ہیں۔ دیوارِ چین بھی انہی لوگوں کے حملوں کو روکنے کے لئے تعمیر کی گئی تھی۔

(۴) رستم کی سات مہمات یعنی ہفت خوانِ رستم ہرکلیس کی مہمات سے مشابہ ہیں۔ عام روایت یہ ہے کہ جب رستم دیو سپید کا مقابلہ کرنے کے لئے نکلا ہے تو جوں جوں منزلوں

سے گزرتا تھا ایک دستر خوان لگاتا تھا. اسی کو ہفت خوانِ رستم کہتے ہیں۔ یہ روایت حقیقت سے بالکل بعید ہے۔ اصل یہ ہے کہ کلمہ ہفت خان اور خان خانہ کی ہی ایک شکل ہے۔ خانمان میں یہی کلمہ موجود ہے۔ رستم نے دیوِ سپید کو ہلاک کرنے کے بعد اپنی فتح کی یادگار کے طور پر ایک عمارت تعمیر کی تھی جو اپنی منزلوں اور بلندی کے اعتبار سے ہفت خوان کہلاتی تھی سنسکرت کے فاضلوں سے رجوع کرنے سے معلوم ہوا کہ "دیان" بلند عمارت کو کہتے ہیں مان پھر وہی کلمہ ہے جو خانمان کے مرکب کلمہ میں موجود ہے۔ سامان میں بھی یہی کلمہ ہے بہر حال ہفت خوان سے مراد وہ عمارت ہے جو رستم نے اپنی فتح کی یادگار کے طور پر تعمیر کرائی ہے۔

اوِستا میں کیکاؤس کے ذکر کا موجود ہونا اور متعلقہ داستانوں کا بیان ثابت کرتا ہے کہ جس زمانہ کا ذکر ہو رہا ہے وہ بہت قدیم ہے اور آریاؤں کی نہایت قدیم معاشرت سے متعلق ہے۔ واضح رہے کہ اگرچہ رستم کا ذکر کیکاؤس کے زمانہ میں تفصیل سے آتا ہے لیکن وہ شاہنامہ کا ہیرو نہیں ہے[۱]۔

---

[۱] مزدیسنا: محمد معین۔ حماسہ سرائی در ایران: ذبیح اللہ صفا۔
مطالعاتِ راجع بشاہنامہ (انگریزی) کاؤس جی ممبئی۔ ایران بعہدِ ساسانیاں: محمد اقبال (انجمن ترقی اردو دہلی)۔
سخندانِ پارس: محمد حسین آزاد۔ اوِستا کے متون۔ شاہنامہ: فردوسی۔

م

(۱) **منکر نکیر (نکیرین)**: مشہور ہے کہ دو فرشتے قبر میں انسان سے اس کے اعمال کے متعلق سوال کریں گے۔ انھیں نکیرین بھی کہتے ہیں[۱]۔

(۲) **منوچہری**: ابوالنجم احمد منوچہری دامغانی خراسانی دبستان کا نہایت مشہور شاعر ہے مجمع الفصحا کے قول کے مطابق اس کی تاریخ ولادت ۴۳۲ھ ہے۔ تاریخِ ولادت کے متعلق شفق اور بدیع الزماں دونوں خاموش ہیں۔ یہ مسلّم ہے کہ منوچہری نے اپنا تخلص فلک المعالی منوچہر بن شمس المعالی قابوس (۴۰۳ھ - ۳۶۶ھ) کے نام پر رکھا ہے لیکن تعجب کی بات ہے کہ منوچہری کے دیوان میں فلک المعالی کا نام ممدوحوں کی فہرست میں موجود نہیں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ سلطان محمود کے دربار کا شاعر تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا تعلق بیشتر مسعود بن محمود غزنوی سے رہا ہے، جس کا امارت کا زمانہ ۴۲۱ھ سے ۴۳۲ھ تک ہے۔ منوچہری کے معاصر

---

[۱] غیاث اللغات۔ فرہنگِ آنندراج۔ منتخب اللغات۔

بڑے بڑے جلیل القدر شاعر تھے خلاً فرخی، عسجدی اور عنصری ۔ موخر الذکر کی تعریف میں منوچہری نے ایک قصیدہ بھی کہا ہے جسے ایرانی نقاد بڑے معر کے کا قصیدہ گنتے ہیں ۔ پروفیسر بدیع الزماں لکھتے ہیں کہ اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ منوچہری عربی ادب سے بڑا متاثر تھا اور اس کے قصیدہ کی وضع بالکل عربی قصیدہ کی سی ہے تاہم اس کی انفرادیت اپنی جگہ قائم ہے ۔ بدیع الزماں نے کہا ہے کہ خوبی متانت، اسلوب، حسن قوافی کو ملحوظ رکھ کر اس نے جو مسمط لکھے ہیں وہ اپنی نظیر آپ ہیں ۔ پروفیسر ہادی حسن نے ایک طرح منوچہری کے کلام کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے اور یہ قرار دیا ہے کہ اس کے اشعار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اولاد کا بھوکا تھا ۔ اس کے اکثر قصائد میں یہ ذکر آتا ہے کہ انگور کی بیل حاملہ ہوگئی ہے اور اب اس سے دخت رز یعنی شراب پیدا ہوگی ۔ بدیع الزماں لکھتے ہیں کہ منوچہری بھی عمر خیام کی طرح عشرت طلب اور خوش گذران شاعر تھا اور اس کے اشعار میں شادکامی کا عنصر بہت نمایاں دکھائی دیتا ہے

خراسانی دبستان کے نقیبوں میں منوچہری کو بڑا مقام حاصل ہے بالخصوص قصیدہ کی روایت نے منوچہری کے ہاتھوں گویا پرورش پائی ۔ بعض قصیدوں میں تو وہ عرب قصیدہ نگاروں کی طرح ان مقامات پر کھڑا ہوا ماتم کناں نظر آتا ہے جہاں محبوبہ کے قبیلے نے خیمے گاڑے تھے لیکن بعض قصیدے عربی اثر سے بالکل آزاد معلوم ہوتے ہیں ۔ محمد معین نے مزدیسنا میں مے مغانہ سے بحث کرتے ہوئے پرانی حکایت بیان کی ہے کہ شراب اتفاق سے دریافت ہوگئی ۔ انھوں نے منوچہری کے اس قصیدہ کے بہت سے اشعار نقل کئے ہیں جو اس طرح شروع ہوتا ہے :

چنیں خواندم امروز در دفتری

کہ زندہ است جمشید را دختری

یہ بڑا خوبصورت قصیدہ ہے اور مے مغانہ کے متعلق جتنی حکایات ہیں ان کی تلمیحات

اس قصیدہ میں موجود ہیں۔ اس قصیدہ میں منوچہری خم شراب کو دختر جمشید کہتا ہے اور یہ بیان کرتا ہے کہ اس کا موقف گبروں کا گھر ہے (مئے مغانہ کی اتفاقی دریافت اور جمشید کی ایک کنیز کا اس سے تعلق ایسے مباحث ہیں جن کا منوچہری کے کلام سے بہت کم تعلق ہے۔ جن کو اس داستان کی تفصیلات پڑھنے کا شوق ہو وہ نیچے دیے ہوئے ماخذوں سے رجوع فرمائیں) شبلی نے منوچہری کے کلام سے تفصیل بحث کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ اس کے کلام پر عربی ادبیات بالخصوص قصائد کا کیا اثر ہوا۔ بدیع الزماں نے اس کی غزلوں کے کچھ شعر بھی نقل کیے ہیں۔ ان میں یہ مشہور شعر بھی ہے:

چہ دعا کردی جاناں کہ چنیں خوب شدی
تا چو تو جاکر تو نیز دعائے تو کند[۱]

---

[۱] سخن و سخنوران (جلد اول): بدیع الزماں فروزاں فر۔
تاریخ ادبیاتِ ایران: شفق۔
شعر العجم: شبلی۔
مزدیسنا: محمد معین۔
دیباچہ دیوانِ منوچہری (ایرانی ایڈیشن)۔
ہادی حسن: ایرانی شعر کا مطالعہ (انگریزی) علی گڑھ
براؤن: تاریخِ ادبیاتِ ایران جلد دوم (انگریزی)۔

ن

(۱) نخستیں بادہ کاندر جام کردند

یہ عراقی کی مشہور غزل کے مطلع کا ایک مصرعہ ہے۔ دوسرا مصرعہ یہ ہے:

ز چشمِ مستِ ساقی وام کردند

جامی کے قول کے مطابق عراقی اصلاً ہمدانی ہیں۔ اوائل عمر میں انھوں نے مبادیات تعلیم قرآن پر عبور حاصل کیا۔ پھر فقہ کی طرف متوجہ ہوئے اور ابھی تعلیم کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ قلندروں کی ایک جماعت ہمدان میں وارد ہوئی جن میں براون کے قول کے مطابق ایک خوبرو درویش تھا۔ اسی کی کشش عراقی کو ایران سے ہندوستان لے آئی۔ ملتان پہنچ کر بہاءالدین زکریا کی بیعت کی اور ان کی مدح میں ایک زوردار قصیدہ لکھا۔ اسی زمانہ میں انھوں نے چلہ کاٹا لیکن چلہ کشی کے دوران میں بھی ان کی تخلیقی قوتیں بروئے کار آتی رہیں۔ یہ مصرعہ جو علامہ نے نقل کیا ہے اسی زمانہ کی یادگار ہے۔ یہ غزل خلوص اور صداقتِ احساس سے اس طرح لبریز ہے کہ اس کے دو تین شعر

نقل کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اسی غزل میں وہ کہتا ہے:

ازاں لب کآرزوئے جملہ دل ہاست — نصیبِ بے دلاں دشنام کردند
بعالم ہر کجا درد و غمے بود — بہم کردند، و عشقش نام کردند
چو خود کردند راز خویشتن فاش — عراقی را چرا بدنام کردند

عراقی نے ملتان میں بیس پچیس سال گزارے اور شیخ بہاء الدین کے انتقال کے بعد مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے۔ حلقے کے دوسرے افراد کو یہ بات ناگوار گذری۔ عراقی نے ہندوستان کو خیرباد کہا اور سیر و سیاحت کرتا ہوا قونیہ پہنچا۔ یہیں اس نے اپنی مشہور کتاب لمعات لکھی جس میں وقت کے متعلق نہایت دقیق مباحث موجود ہیں اور جن سے علامہ نے بصراحت استفادہ کیا ہے۔

عراقی کا سالِ ولادت بتحقیق غیر معلوم ہے لیکن یہ طے ہے کہ اس نے ۶۸۸ھ میں وفات پائی اور دمشق میں شیخ محی الدین ابن العربی کے پہلو میں دفن ہوا۔

عراقی نے قصیدے بھی لکھے ہیں اور غزلیں بھی لیکن اس کی مشہور ترین تصنیف وہی لمعات ہے جس کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ جامی نے اس کی شرح کی ہے۔ یہ شرح شائع ہو چکی ہے۔

عراقی صحیح معنوں میں درویش اور قلندر تھا۔ اس کے مزاج میں وہ استغنا تھا جو صوفیوں کے قول کے مطابق سالکوں کو زیبا ہوتا ہے۔ ہندوستان میں اس کا دیوان نول کشور نے متعدد بار چھاپا ہے اور متداول ہے۔ اس کے غزلیات میں بیشتر تصوف کے مطالب منظوم کر دیے گئے ہیں اور ایسی غزلیں کم ملتی ہیں جن کے متعلق یہ دعویٰ کیا جا سکے کہ متصوفانہ مطالب سے قطع نظر بھی ان میں شاعرانہ خوبی موجود ہے۔[۵۱]

---

[۵۱] ادبیات ایران بعہد مغولاں: تالیف براؤن ترجمہ محمد داؤد رہبر (انجمن ترقی اردو نمبر ۱۲۶ کراچی)۔
تاریخ تصوف در اسلام: قاسم غنی۔ تصوف اسلام: عبدالماجد دریا بادی۔ مکاتیب اقبال۔

(۲) **نرگس**: نرگس مشہور پھول ہے جس کی دو قسمیں معروف ہیں ایک شہلا اور ایک عبہر، ہمارے ہاں جو نرگس عام طور پر پائی جاتی ہے یعنی زرد و زرد اور سپید سپید وہ عبہر ہے۔ نرگس کی جس قسم سے شعرا محبوبوں کی آنکھ کو تشبیہ دیتے ہیں وہ شہلا ہے چنانچہ سعدی کہتا ہے:۔

سر بہ بالینِ عدم باز نہ اے نرگسِ مست　　　　کہ زخوابِ سحر آں نرگسِ شہلا برخواست

صنمیات اور روایات کے ذخیرہ میں یہ تذکرہ ملتا ہے کہ نرگس ایک نوجوان تھا خوبرو کہ اپنے آپ پر عاشق ہوگیا۔ وہ ہر وقت اپنا چہرہ جھیل یا تالاب کے پانی میں دیکھا کرتا۔ آخر اس خود بینی میں وہ اس قدر منہمک ہوا کہ کھانے پینے کا ہوش نہ رہا مرگیا اور اسی تالاب میں گر گیا۔ جس جگہ وہ لیٹ کر پانی میں اپنا عکس دیکھا کرتا تھا وہاں نرگس کا پھول اُگا کہ دائماً نگراں رہتا ہے اور اسے چشمِ انسانی سے مشابہ گردانتے ہیں۔

موجودہ نفسیات میں نرگسیت ایک ذہنی الجھن یا بیماری کا نام ہے جس میں انسان اپنی ہی ذات میں مگن ہوکر رہ جاتا ہے اور خارجی دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا ہے[1]۔

(۳) **نیاگاں**: قواعدِ فارسی میں یہ مندرج ہے کہ جب ایسے کلمات کی جمع کرتے ہیں جن کے آخر میں حرفِ علت آتا ہے تو بعض اوقات کلمہ "یاں" کا اضافہ کرتے ہیں جیسے خدا سے خدایاں۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ جن کلمات کے آخر میں "ہ" ہو، ان کی جمع بالعموم "گاں" سے ہوتی ہے جیسے مژہ سے مژگاں اور نیزہ سے نیزگاں۔ اس میں ذی روح اور غیر ذی روح کی کوئی تخصیص نہیں جیسے نیزگاں۔

فارسی میں کلمات کی جمع بنانے کے جو پیچیدہ اصول درج ہیں اس کی وجہ یہ ہے

---

[1] لغاتِ ماخذ الفاظ (انگریزی) شبلی۔　　لغتِ انگریزی: وائلڈ۔
غیاث اللغات۔　　بہارِ عجم۔　　تحلیلِ نفسی: حزب اللہ۔

کہ آج کل عام طور پر ایران کی قدیم زبانوں سے واقفیت کم ہوتی چلی جا رہی ہے (میں برصغیر ہند و پاکستان کا ذکر کر رہا ہوں۔ ایران میں تو ایران کی قدیم زبانوں کے متعلق تحقیق کا حق ادا کر دیا گیا ہے)

نیاگاں ظاہر ہے کہ جمع ہے اور اس کے معنی ہیں آبا و اجداد۔ اس کا واحد نیا ہے لیکن قواعد فارسی کی رو سے اس کی جمع نیایاں آنی چاہئے تھی جیسے خدا کی خدایاں آتی ہے حالانکہ ہوا یہ کہ نیا کو ان کلمات میں شمار کر لیا گیا جن کے آخر میں ہ ہوتی ہے اور جمع نیاگاں کر دی گئی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اصل کلمہ پہلوی میں نیاک ہے اس پر علامت جمع آں کا اضافہ کیجئے تو نیاکاں یا نیاگاں ہاتھ آتا ہے۔ جب پہلوی متون عربی رسم الخط میں لکھے گئے تو نیاک کو نیا پڑھا گیا۔ فارسی کتابوں کی طرف رجوع کیا گیا تو معلوم ہوا کہ نیا کی جمع نیاگاں ہے۔ صرف و نحو کے علما اس کی کوئی توجیہ نہ کر سکے یہی حالت مژگاں کی ہے۔ اصل میں کلمہ مژک تھا۔ عربی رسم الخط میں غلطی سے ک کو ہ پڑھ لیا گیا۔ اب جو مژہ نے جمع کی صورت میں تشکل مژگاں اختیار کی تو کوئی توجیہ اختیار کرنا پڑی۔ اس توجیہ کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں۔ خلاصہ اس بحث کا یہ کہ فارسی میں علامت جمع آں یا یاں ہے۔ بس جہاں استثنائی صورتوں کا ذکر کیا گیا ہے وہاں اصل کلمہ کو غلط پڑھا گیا ہے۔ نیاگاں ان کلمات میں سے ہے جو کسی توجیہ کے ماتحت نہیں آتے اور جن کے متعلق یہ کہہ کے چپ ہو جانا پڑتا ہے کہ اہلِ زباں اسی طرح بولتے ہیں۔ ورنہ حقیقت وہی ہے جو عرض کر دی گئی۔

لہ دستورِ فارسی: محمد دین۔ مزدیسنا: محمد معین۔

سبک شناسی: ملک الشعرا بہار۔

مُسافِر

الف

(۱) **آبِ حیواں:** فارسی تلمیحات کے ذخیرہ میں جو تلمیحات موجود ہیں ان میں یہ تلمیح بہت پہلودار اور معنی خیز ہے۔ روایت یہ ہے کہ ظلمات میں (یہ بھی ایک دنیائے پُراسرار ہے جو معلوم نہیں کہاں واقع ہے) ایک چشمہ بہتا ہے جسے چشمۂ آبِ حیواں یا چشمۂ آبِ حیات کہتے ہیں۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ جو شخص اس چشمہ کا پانی پی لے وہ زندہ جاوید یا امر ہو جاتا ہے۔ تلمیحی روایات کے مطابق حضرتِ خضر دریاؤں اور چشموں کے نگران ہیں اور عالمِ ظلمات پر بھی انہیں کی عملداری ہے۔ وہ بھی اسی لئے عمرِ جاوداں رکھتے ہیں کہ آبِ حیواں پی چکے ہیں۔ مشہور ہے کہ سکندر نے آبِ حیات پینے کی خواہش ظاہر کی تھی اور خضر اسے عالمِ ظلمات میں لے بھی گئے تھے لیکن عین وقت پر چشمہ نظروں سے غائب ہو گیا اور سکندر تشنہ کام لوٹا۔ اس سلسلہ میں فارسی اور اُردو کے شعراء نے بہت نفیس اور نادر مضمون پیدا کئے ہیں۔ مثلاً:

تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل	کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

گلیمِ بخت کسے را کہ بافت سیاہ — ز آبِ چشمۂ حیواں سپید نتواں کرد

غالب کہتا ہے:

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر — نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

کسی اور شاعر کا شعر ہے:

کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے — خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے

اور: کیا کیا خضر نے سکندر سے — اب کسے رہنما کرے کوئی

مے لال کو آبِ حیواں بنا — خطِ جامِ مے کو رگِ جاں بنا

سلیم لکھتے ہیں:

"عام طور سے اردو اور فارسی ادب میں بحر و بر دونوں میں رہنمائی اور مشکل کشائی کا کام خضر ہی کے حوالے کیا گیا ہے۔ جہازوں اور کشتیوں کی رہنمائی۔ طوفان کے وقت مصیبت زدوں کی مدد کرنا۔ جنگلوں اور بیابانوں میں راستہ بھولنے والوں کو راہِ راست پر لگانا انہیں کا کام سمجھا جاتا ہے ..... آبِ حیات، آبِ بقا، چشمۂ حیواں، آبِ خضر، چشمۂ خضر، آبِ حیوان، چشمۂ زندگی، ظلمات، راہِ ظلمات، اسی قصہ کی تلمیحات ہیں۔"

(۲) اسریٰ: دیکھئے معراج۔

لہ افاداتِ سلیم: مضمون تلمیحات۔ — بہارِ عجم۔

غیاث اللغات۔ — فرہنگِ آنند راج۔

ب

(۱) **بابر:** ظہیر الدین بابر کی تاریخ ولادت ۱۴۸۳ء ہے اور مولد فرغانہ (ترکستان) بابر کے والد کا نام عمر شیخ مرزا تھا۔ اس نے تاشقند کے مشہور چغتائی خان یونس خان کی لڑکی قتلغ نگار خانم سے شادی کی تھی۔ بابر اسی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ یونس خاں یعنی بابر کا نانا علم دوست بھی تھا اور عالم بھی۔ موسیقی اور مصوری سے بھی شغف رکھتا تھا۔ ادھر عمر شیخ مرزا بھی عالم اور علم دوست تھا۔ تو بابر نے شروع ہی سے ایسے ماحول میں تربیت پائی جہاں علم دوستی کا چرچا تھا۔ اس کی ابتدائی تعلیم بڑے اچھے پیمانے پر ہوئی۔ تاریخ نے اس کے جن اتالیقوں کا نام محفوظ رکھا ہے ان میں بابا قلی علی اور قاضی عبد اللہ بھی شامل ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان اساتذہ کی نگرانی میں بابر نے کون کون سے علوم باقاعدہ حاصل کئے لیکن تزک میں اس نے جگہ جگہ فارسی کی مستند کلاسیکی کتابوں کے حوالے دئے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم فارسی ادبیات پر تو اسے خاصا عبور تھا۔

یوں بھی سمرقند، فرغانہ، خراسان اور ہرات ان دنوں فضل و کمال کے بہت بڑے مرکز تھے۔

تیموری عہد کا بیشتر ثقافتی سرمایہ انہی شہروں میں محفوظ تھا ابھی وہ بارہ ہی برس کا تھا کہ بابر تخت نشین ہوا لیکن اس کے بہت جلد بعد مخالف امراء نے اسے وطن سے نکال دیا۔ بابر نے سمرقند کا رُخ کیا اور اس شہر کو تسخیر بھی کرلیا لیکن تین چار برس کے بعد یہاں سے بھی نکلا۔ آخر کار بتدریج بابر پر یہ حقیقت روشن ہوئی کہ اس کی مخالفت کی جڑیں اس کے اپنے وطن میں اتنی مضبوط اور گہری ہیں کہ اس کا فرغانہ یا اس کے گردونواح میں بسنا مشکل ہے چنانچہ وہ ترکستان سے نکل کر افغانستان پہنچا اور کابل میں اپنی حکومت کی داغ بیل ڈال دی۔ جب افغانستان کے بہت سے علاقے اس کے زیرنگیں آگئے تو طبعاً اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ہندوستان کے بعض علاقوں کو تسخیر کرے کہ وہ اس ملک کو تیمور کی میراث سمجھتا تھا۔ ہندوستان میں ابراہیم لودھی مسند آرائے حکومت تھا۔ کچھ امراء اس کے خلاف تھے۔ ان میں لاہور کا حاکم پیش پیش تھا جسے یہ گمان تھا کہ میری ہلاکت کا فرمان لودھی کی بارگاہ سے صادر ہوچکا ہے اس نے بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ بابر ہندوستان آیا اور اپریل ۱۵۲۶ء میں پانی پت کی پہلی لڑائی میں یہ طے کردیا کہ اب یہاں صدیوں تک مغل مسند آرائے جلال رہیں گے۔

تزک سے بھی معلوم ہوتا ہے اور خارجی شہادتیں بھی اس کی تائید کرتی ہیں کہ ابراہیم لودھی کا لشکر پچاس ہزار آدمیوں پر مشتمل تھا۔ ایک ہزار ہاتھی تھے۔ بابر کی فوج آٹھ ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی البتہ اس کے پاس توپیں ضرور تھیں جو اس نے ترکستان سے منگوائی تھیں۔ بابر نے جنگ کا نقشہ اس طرح ترتیب دیا کہ لودھی کی فوجیں محصور ہوکر رہ گئیں۔ خود لودھی مارا گیا۔ بابر نے پہلے دہلی پر قبضہ کیا اور پھر آگرہ کو بڑھا بابر کے راستہ میں دو رکاوٹیں تھیں۔ افغانی امراء اور راجپوت سردار لودھیوں کے عہدِ حکومت میں علاوہ افغانی ایلچی ولایت کا خودمختار بادشاہ ہوتا تھا۔ پانی پت کی پہلی لڑائی کے بعد کچھ امیر تو خودمختاری کا دم بھرنے لگے اور کچھ یہ خواب دیکھنے لگے کہ لودھی

کی جگہ تخت پر بیٹھ جائیں۔ بابر نے پہلے افغان امرا کا صفایا کیا۔ اکثر بنگال کی طرف بھاگ گئے۔ پھر وہ راجپوتوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ابراہیم لودھی کے عہدِ حکومت میں راجپوت میواڑ کے رانا سنگرام کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے تھے اور چاہتے تھے کہ لودھیوں کو ہندوستان سے باہر نکال دیں۔ سنگرام نے بابر سے گفت و شنید کرنے کے بعد اس کی مدد کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا لیکن "ہندوستانی روایا کے مطابق یہ وعدہ پورا نہ کیا گیا۔" (یہ مورلینڈ اور چیٹرجی کے الفاظ ہیں جو راجپوتوں کے متعلق استعمال کئے گئے ہیں) بابر نے لودھی پر فتح پائی تو سنگرام اور اس کے ساتھی حملہ آور کے خلاف نبرد آزما ہوئے۔ مارچ ۱۵۲۷ء میں آگرہ سے کوئی چالیس میل کے فاصلے پر ایک فیصلہ کن لڑائی ہوئی۔ راجپوت لشکر کی تعداد بابر کے لشکر سے آٹھ گنی تھی۔ اس کے باوصف راجپوتوں کو شکست ہوئی۔ سنگرام زخمی ہوا۔ اور راجپوتوں کا خطرہ بھی بابر کے سر سے ٹل گیا۔ عمر کے آخری تین چار سال اس کے سلطنت کے استحکام میں صرف کئے۔ ۱۵۳۰ء میں جب اس کی عمر صرف ۴۷ سال کی تھی اس نے وفات پائی۔ اس کی موت کی داستان مشہور ہے کہ ہمایوں بیمار ہوا تو بابر نے پرانے رسم و رواج کے مطابق یہ کہا کہ میں اپنی سب سے قیمتی چیز بیٹے کی جان بچانے کے لئے قربان کرتا ہوں۔ پھر مزید وضاحت کی کہ یہ چیز میری جان ہے۔ ہمایوں اچھا ہو گیا اور بابر کچھ عرصے کے بعد وفات پا گیا۔

بابر نے اپنی زندگی کے حالات ترکی زبان میں قلمبند کئے ہیں۔ یہ تصنیف "تزکِ بابری" کہلاتی ہے۔ اکبر کے عہد میں اس کا فارسی میں ترجمہ ہوا۔ تزک کا شمار آج بھی ان کتابوں میں کیا جاتا ہے جن کے مندرجات ہر طرح درست ہیں۔ مستشرقین نے اور مورخوں نے لکھا ہے کہ تزک میں بابر نے نہایت سلیس طرزِ نگارش اختیار کیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے فقروں میں اس نے اپنی زندگی کے تفصیلی حالات بیان کئے ہیں۔ زندگی کے انقلابات، سمرقند اور فرغانہ سے فرار، کابل سے ہندوستان تک کا سفر، ابراہیم لودھی سے لڑائی، خانگی حالات، عیش و نشاط کی محفلیں، کیا چیز ہے جو تزک میں نہیں ملتی۔

ہندوستان کے بعض مناظر کا نقشہ بھی بہت دلفریب کھینچا ہے۔

مشہور یہ ہے کہ بابر فارسی اور ترکی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ رام پور کے شاہی کتب خانہ میں ایک دیوان موجود ہے جو بابر سے منسوب ہے۔ رسائلِ عروض کے نام سے اس نے ترکی شاعری کے عروض پر بھی ایک کتاب لکھی ہے مختلف تذکروں میں اس کی رباعیات اور اشعار منقول ہیں۔ یہ شعر تو ضرب المثل ہے :

نوروز و نوبہار و مے و دلبر خوش است

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

ابوالفضل کو بابر کے یہ دو مطلعے بہت پسند تھے :

ہلاک می کندم فرقتِ تو دانستم

وگرنہ رفتن ازیں شہر می توانستم

تا بزلفِ سیہش دل بستم از پریشانیِ عالم رستم

بابر کو اچھی اچھی کتابیں جمع کرنے بہت شوق تھا۔ چنانچہ اس کا شاہی کتب خانہ نہایت نفیس کتابوں پر مشتمل تھا۔ حقیقت میں ہندوستان میں مغلوں کی سلطنت کا موسس اور بانی بابر ہی ہے۔ اس کے بعد اگرچہ شیر شاہ کے زمانہ میں مغلوں کو کچھ ضعف پہنچا لیکن سلطنت کی بنیادیں ایسی مضبوط رکھی جا چکی تھیں کہ شیر شاہ کے بعد صفویوں کی مدد سے مغلوں نے ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔

بابر نے ہر طرح سے بھرپور زندگی بسر کی۔ بزمِ عیش و نشاط میں ہوتا تھا تو ایسے معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کی اسے فکر ہی نہیں۔ میدانِ جنگ میں لڑائی کی چالیں سوچتا تھا تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ ساری عمر فوج کو لڑاتے گزری ہے۔ علم دوستی اور ہنر پروری میں تیموری اولاد کا سچا وارث تھا۔ فنونِ لطیفہ سے یوں تو تیموری شہزادوں کو عام طور پر دلچسپی رہی ہے لیکن ہرات میں سلطان حسین کا دربار

تو گویا علوم و فنون کا مرکز بن گیا تھا۔ بابر ہرات کے اس دربار کی روایات لے کر ہندوستان آیا اور اس کے اپنے بیٹے ہمایوں کو بھی ایسے ماحول میں پایا کہ جب اس نے تختِ سلطنت پر جلوس کیا تو فنونِ لطیفہ کی طرف خاص توجہ دی۔ جب صفوی فوج لے کر ہندوستان واپس آیا تو بہت سے فن کار ساتھ لایا جن میں مصور پیش پیش تھے۔ مغلوں کے زمانہ میں فنونِ لطیفہ کو جو معراج نصیب ہوئی ہے اس کی وجہ وہی بابر کا ذوقِ سلیم ہے جو اس نے تیموری شہزادوں سے ورثہ میں پایا تھا اور جس کا پیوند ہرات کے شجر پر بہار سے لے کر اس نے ہندوستان میں لگا دیا تھا۔

فنِ تعمیر میں اگرچہ بابر کی یادگاریں ہندوستان میں موجود نہیں لیکن تزک کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بابر کو باغ لگانے کا بڑا شوق تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا وطن سرتا پا گلزار تھا۔ باغ لگوانے کا یہ شوق مغلوں کے فنِ تعمیر کا جزوِ لازم بن گیا۔ یہاں تک کہ بادشاہوں کے اور امراء کے مقابر بھی اس طرح تعمیر ہوئے گویا نہایت دلفریب باغوں میں کوئی عمارت بنی ہے[۱]۔

(۲) **بحیرۂ احمر:** بحیرۂ احمر کی اہمیت اس اعتبار سے ہے کہ حضرت موسیٰ اپنی قوم کو لے کر اسی بحیرہ کو عبور کر کے ساحلِ نجات کو پہنچتے ہیں تک ہیں خدائے کریم نے حضرت موسیٰ کو تسلی دی ہے کہ نہ تو تمہیں تعاقب کرنے والوں سے کسی قسم کا اندیشہ ہوگا اور نہ خطرہ۔ شعرا میں یہ درج ہے کہ حضرت موسیٰ نے جب اپنا عصا مارا تو دریا پھٹ گیا (اور موسیٰ تو اپنی قوم کو لے کر نکل گئے) فرعون تعاقب کرنے والوں کے ساتھ ڈوب گیا۔ "یونس" میں بھی اس قصہ کا ذکر ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو بھی سمندر سے نکال دیا اور جب فرعون سمندر میں ڈوبنے لگا تو پکارا کہ میں بھی بنی اسرائیل کے خدا کے بندوں میں سے ہوں تو یہ ارشاد ہوا کہ آج ہم ایسا کریں گے کہ تیرے جسم کو سمندر کی موجوں سے بچا لیں گے

---

[۱] بزمِ تیموریہ: صباح عبدالرحمٰن (دارالمصنفین اعظم گڑھ)۔ مشاہیر: غلام رسول مہر۔
تاریخِ ہندوستان (انگریزی) مورلینڈ اور چیٹرجی۔ طبقاتِ سلاطینِ اسلام۔
تزکِ بابری (فارسی ترجمہ) تزکِ بابری کا جزوی اردو ترجمہ مکتبہ اردو لاہور۔

تاکہ بعد میں آنے والوں کے لیے یہ ایک نشانی رہے۔

خدا کا کہنا پورا ہو کر رہا۔ اب یہ طے ہے کہ یہ فرعون منفتاح تھا جو رعمیس ثانی کا بیٹا تھا اور جس کی لاش حنوط شدہ اب تک عجائب خانہ میں موجود ہے۔ بحیرۂ احمر کے پھٹ جانے اور حضرت موسیٰ کے وہاں سے صحیح وسلامت گذر جانے کے متعلق بہت قیل وقال ہوتی رہی ہے۔ سر سید احمد خاں نے تفسیرِ احمدی میں یہ فرمایا ہے کہ جس وقت بنی اسرائیل نے سمندر عبور کیا ہے تو اس کا پانی حالتِ جزر میں تھا اور جب فرعون کا لشکر آیا تو اس کا پانی چڑھ رہا تھا یعنی حالتِ مد میں تھا۔ مولانا حفظ الرحمٰن نے قصص القرآن میں ایک نقشہ دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے کس مقام پر قلزم کو عبور کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ اس واقعہ کو معجزہ کی حدود سے خارج کر دینے کی جتنی کوششیں کی گئی ہیں وہ باطل بھی ہیں اور گمراہ کن بھی۔ قرآن مجید اسے خود معجزات میں سے شمار کرتا ہے اور ہمارے لیے وحی الٰہی کا فیصلہ ناطق ہے[1]۔

(۳) برزخ لایبغیان : اشارہ ہے سورۂ رحمٰن کی اس آیت کی طرف :

بینھما برزخ لایبغیان

یعنی ان دونوں کے درمیان ایک پردہ حائل ہے جس سے یہ تجاوز نہیں کر سکتے۔

دیکھئے $\frac{55}{20}$ القرآن

---

[1] قصص القرآن : حفظ الرحمٰن دہلی۔ قصصِ قرآن : صدرالدین بلاغی۔

ح، د

(۱) **حکیم غزنوی**: سنائی مراد ہے۔ دیکھئے سنائی۔

(۲) **حی لایموت**: اشارہ ہے سورۂ فرقان کی اس آیت کی طرف:

وتوکل علی الحی الذی لایموت وسبح بحمدہ ۲۵/۵۸

یعنی اے نبی تم اس زندہ (خدا) پر بھروسہ کرو۔ جو (کبھی) نہ مرے اور اس کی تعریف کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرو۔

(۱) **دانائے طوس**: فردوسی مراد ہے۔ دیکھئے فردوسی۔

س

(۱) سلطان محمد فاتح: سلطان محمد ثانی (فاتحِ قسطنطنیہ) نے جس کا عہدِ حکومت ۱۴۵۱ء سے ۱۴۸۱ء تک ہے قسطنطنیہ ۱۴۵۳ء میں فتح کیا۔ اس کے فتح ہوتے ہی دولتِ روم شرقی گویا بالکل نیست و نابود ہوگئی اور آلِ عثمان کی دھاک بیٹھ گئی۔

مختصراً واقعہ کی صورت یہ ہے کہ جب سلطان محمد فاتح ثانی تخت نشین ہوا تو ادھر ایشیائے کوچک میں بغاوت ہوگئی اور ادھر قسطنطین نہم نے شہزادہ اورخان کو مدد دینا شروع کی کہ وہ شہزادہ محمد کی جگہ تخت نشین ہو جائے۔ یہ شہزادہ اورخاں سلیمان کا پوتا تھا۔ سلطان محمد فاتح نے بازنطینی بادشاہ کے تیور بدلے ہوئے دیکھے تو بالکل قسطنطنیہ کے قریب باسفورس کے کنارہ ایک قلعہ تعمیر کرایا جسے رومیلی حصار کہتے تھے۔

بازنطینی شہنشاہ نے قاصد بھیجے کہ اس قلعہ کی تعمیر کے خلاف احتجاج کرے لیکن انھیں ہلاک کر دیا گیا۔ اب جنگ ٹھن گئی۔ پاپائے روم بازنطینی سلطنت کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن شرط یہ تھی کہ

کلیسا پر ان کا اقتدار بھی تسلیم کیا جائے لیکن قسطنطنیہ کے لوگوں نے یہ بات نہ مانی۔ رضا زادہ شفق اپنے مضمون "تعصب اچھا ہے یا برا"، میں کہتے ہیں کہ جب مسلمان بازنطینی سلطنت کی تخریب کے درپے تھے تو شہر کے اندر مختلف کلیسیائی رہنماؤں میں شدید قسم کے مناظرے جاری تھے۔ ایک گروہ یہ کہتا تھا کہ مخالف گروہ کے اقتدار کو تسلیم کرنے کے بجائے مسلمانوں کا غلام ہو کر رہنا کہیں بہتر ہے۔

بازنطینی شہنشاہ کے پاس اپنی فوج نہ تھی کہ شہر کی مدافعت بطریقِ احسن کر سکتا لیکن اس کے باوصف دو مہینے تک وہ قلعہ بند ہو کر بیٹھا رہا۔ اس اثنا میں عثمانیوں نے توپ خانہ سے بھی کام لیا۔ لیکن آخر ۱۴۵۳ء میں مئی کی انتیس تاریخ کو سلطان محمد فاتح کی فوجوں نے ایک آخری حملہ کیا اور شہر میں داخل ہو گئیں۔ بازنطینی بادشاہ مارا گیا۔ سلطان نے شہر میں داخل ہو کر سینٹ صوفیہ کے گرجے پر قبضہ کر لیا۔ اس اثناء میں بازنطینی فوجیں بازنطینی بادشاہ کی مدد کے لئے پہنچیں لیکن قسطنطنیہ مسخر ہو چکا تھا۔ سلطان محمد فاتح کچھ دنوں کے لئے ایڈریانوپل چلا گیا تاکہ قسطنطنیہ کے قلعہ کی مرمت ہو سکے۔ قسطنطنیہ کی تسخیر کے بعد فاتح سلطان نے تالیفِ قلب کی حکمت عملی پر عمل کیا۔ بہت سے یونانی شہر میں آ کر آباد ہو گئے۔ یہ لوگ بڑے دولت مند تھے اس لئے ان کے بسنے سے شہر کو بڑا فائدہ پہنچا۔ سینٹ صوفیہ کے گرجے کو مسجد میں تبدیل کر دیا گیا۔ تصاویر پر پلستر پھیر دیا گیا۔ قبلہ کی سمت متعین کی گئی۔ اس کے بعد بھی اس مسجد کی تعمیر میں عثمانی فرماں روا حصہ لیتے رہے۔

سلطان محمد فاتح نے شہر میں اور بھی عمارتیں تعمیر کرائیں۔ ان میں ابو ایوب انصاری کی لحد کے پاس جو مسجد تعمیر کرائی گئی تھی بہت مشہور ہے۔ اسی مسجد کے قریب وہ مقام تھا جہاں بعد کے عثمانی فرمانروا مسند نشین ہوتے تھے۔ مسجدوں کے ساتھ سلطان نے بہت سے کتب خانے بھی تعمیر کرائے اور بہت سے تعلیمی ادارے بھی وجود میں آ گئے جہاں طلبہ کو مفت تعلیم دی جاتی تھی۔ سلطان فاتح ہی

نے وہ مشہور عمارت بھی تعمیر کرائی جو بعد میں امرائے سلطنت کو محبوس رکھنے کے استعمال ہوتی تھی۔ ۱۵۵۷ء میں سلطان نے وہ محل تعمیر کرایا جو بعد میں وزیر جنگ کا دفتر بنا۔

تمام مورخ سلطان کی جلالت قدر، ہمت، شجاعت اور تدبر کی تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ دنیا کے عظیم ترین بادشاہوں میں سے تھا۔ سلطان کو ایرانی ادب بہت پسند تھا۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ شاہنامے کی طرز پر ترکی کا بھی ایک حماسہ ملی تصنیف کیا جائے۔ افسوس کہ اس کی وفات کے بعد تخت نشینی کے بہت سے جھگڑے پیدا ہو گئے۔

لہ طبقات سلاطین اسلام: عباس اقبال۔ تاریخ اسلام: بروکلمن۔
اسلامی ثقافت کا خاکہ: سوشتری۔ تاریخ ایران: سائیکس۔

ص

(۱) صبغۃ اللہ: اشارہ ہے سورۂ بقرہ کی اس آیت کی طرف:

صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ ونحن لہ عبدون ۲/۱۳۸

اس آیت کا ترجمہ یہ ہے:

(کہو کہ ہم) اللہ کے رنگ (میں رنگے گئے) اور (اللہ کے رنگ) سے کس کا رنگ اچھا ہے.

ظ

(۱) **ظاہر شاہ:** سلطان نادر شاہ کے فرزند ارجمند ہیں۔ سلطان مغفور کی شہادت کے بعد وہی تخت نشین ہوئے تھے اور تا دم تحریر وہی مسند افروز جلال ہیں۔ ان کو مشورہ دینے کے لئے سلطان مغفور کے قدیم مشیر موجود ہیں لیکن ایک مجلس شوریٰ بھی قائم ہے۔ انھوں نے ۱۹۳۳ء میں جلوس کیا تھا۔[۱]

---

[۱] قاموس سیاسیات عالم: فیبر اینڈ فیبر (انگریزی) ۔

ع

(۱) **عارف**: اصطلاح میں عارف اس شخص کو کہتے ہیں جس کا باطن تجلیاتِ الٰہی سے
اس طرح متنیر ہو گویا خدا اس کے لئے مشہود ہے اور تمام احوال پر وہ مطلع ہے۔ ایسے شخص کی
حالت کو یعنی کیفیت علمی کو معرفت کہتے ہیں (ابن العربی)۔

صوفیوں کا عقیدہ ہے کہ انسان کی فضیلت اس بات میں مخفی ہے کہ وہ معرفت خداوندی
حاصل کر سکتا ہے۔ معرفت کے سلسلہ میں چار کلمات کا ذکر اکثر آتا ہے۔ ان کے اصطلاحی معانی سے
آگاہ ہونا ضروری ہے۔

۱۔ **قلب**: اصطلاح میں قلب ایک لطیفۂ روحانی ہے کہ انسان کی حقیقت اور ذات
قلب ہی کے ذریعہ روشن ہوتی ہے۔ تجلیاتِ الٰہی کا مصدر بھی وہی ہے اور عارف تک تجلیات کا
مفہوم پہنچانے والا یہی قلب ہے۔ حقیقت میں قلب کو عقل کے مقابل میں استعمال کیا جاتا ہے۔ عقل
حواسِ خمسہ کے ذریعہ حقیقت کی جزئیات کا استقصاء کرتی ہے۔ اس کے برخلاف قلب حقیقت

کی کلیت کا احاطہ کرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر عقل استدلالی یا فہم انسانی یا عقل جزئی بیک وقت حقیقت کے تمام پہلوؤں کا مشاہدہ نہیں کر سکتی۔

کہا جاتا ہے کہ حکما اس معنی میں قلب کو نفسِ ناطقہ کہتے ہیں۔ صوفیا کہتے ہیں کہ جس وقت قلب پاک و صاف ہو جاتا ہے تو نورِ ایمان سے روشن ہو جاتا ہے اور تجلیاتِ الٰہی اس میں یوں منعکس ہوتی ہیں جس طرح آئینہ میں۔ قلب کی پاکیزگی بڑی مشکل سے حاصل ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کبھی تو علم آڑے آتا ہے اور حجاب اکبر بن جاتا ہے اور کبھی مادی خواہشات اور شہوانی مقتضیات قلب کو آلودہ کر دیتے ہیں۔ قلب (صوفیا کا عقیدہ ہے) طاغوتی اور یزدانی طاقتوں کا میدانِ کارزار بھی ہوتا ہے کہ ایک دریچہ سے معرفت کا نور داخل ہوتا ہے تو دوسرے دریچوں سے وسوسے۔ وسوسے غالب آجائیں تو انسان پستی میں گر جاتا ہے اور جب قلب ایمان سے منور ہو جائے تو انسان فرشتہ سے افضل ہو جاتا ہے یہی بات اس مشہور قصیدہ میں کہی گئی ہے:

آدمی زادہ طرفہ معجونیست
از فرشتہ سرشتہ واز حیواں
گر کند میل ایں شود پس ازیں
ور کند میل آں شود بہ ازاں

۲۔ روح، صوفیوں کی اصطلاح میں روح بھی حقیقتِ انسانی کے رموز میں سے ہے اور وہ قرآن مجید کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں:

قل الروح من امر ربی

یعنی کہہ دے کہ روح میرے رب کا امر ہے۔ اس معنی میں روح اسرارِ قلب کے معنی میں مستعمل ہے بلکہ بعض صوفی تو کہتے ہیں کہ اس معنی میں قلب اور روح میں کوئی فرق نہیں۔

۳۔ نفس: نفس میں جو غضب اور شہوت کی قوتیں مخفی ہوتی ہیں، ان پر قابو پانا جہادِ اکبر کہلاتا ہے۔ جب اس جہادِ اکبر کے بعد نفسِ انسانی پاکیزہ ہو جاتا ہے تو نفسِ مطمئنہ کے مقام پر پہنچتا ہے۔ صوفی نفس سے عام طور پر نفسِ مطمئنہ مراد لیتے ہیں لیکن کبھی نفس کے مجموعی احوال بھی پیشِ خاطر ہوتے ہیں:

۴۔ عقل: ظاہر ہے کہ عقل کے مختلف معانی ہیں مثلاً فہمِ انسانی، منطقی استدلال، ادراک معلوماتِ حسی سے تجریدی تصورات پیدا کرنے کا عمل۔ صوفی اکثر جب عقل کا کلمہ استعمال کرتے ہیں تو ان کی مراد ہوتی ہے مدرکِ علوم یعنی علوم کا ادراک کرنے والی طاقت۔ صوفی یہ کہتے ہیں کہ حواس کے وسیلہ سے معرفتِ الٰہی تک پہنچنا ناممکن ہے اس لئے کہ عقل جو محدود ہے لامحدود کا تصور بھی نہیں کر سکتی پس عقل سے یہ کام لینا چاہیئے کہ تصفیۂ قلب کے بعد حقائق کا ادراک صوفی کے لئے ممکن ہو جائے اور اس ادراک کا ذریعہ کشف و وحی ہو۔[۱]

---

[۱] تاریخِ تصوف در اسلام: قاسم غنی۔ فرہنگِ مصطلحاتِ صوفیہ، بنقل از قاسم غنی۔

ف

(۱) **فاران** : توراۃ میں یہ بشارت دی گئی ہے کہ فاران کے مقام سے تجلی کا ظہور ہوگا مسلمان کہتے ہیں کہ مکہ معظمہ کا کوہستانی علاقہ ہے لیکن عیسائی مورخوں کو اس تعبیر سے اختلاف ہے۔

ق

(۱) **قندھار**: قندھار اس علاقہ میں واقع ہے جسے ایرانی سیتان یا سگستان کہتے ہیں اور عرب سجستان۔ قندھار کی سطوح مرتفع جو دریائے ہلمند کے بالائی حصے کے متوازی واقع واقع ہیں زابلستان کہلاتی ہے۔ روایات کہتی ہیں کہ رستم اسی علاقہ کا رہنے والا تھا چنانچہ اسے رستمِ سیتان کہتے ہیں:

منم کردہ ام رستم سیتان
دگرنہ یلے بود در سیتان

صاحب "جغرافیۂ خلافتِ مشرقی" لکھتے ہیں کہ بادیہ ایران کو طے کرنے کے بعد مسلمانوں نے جن مقامات کو فتح کیا ان میں القندھار بھی تھا۔ اس میں ان دنوں بھی البُد یعنی مہاتما بدھ کا ایک بہت بڑا بت موجود تھا جسے توڑا گیا۔ مشہور شہر غزنہ بھی اسی شہر کے نواح میں واقع ہے۔ یہ شہر بہت قدیم ہے اور سائیکس کے قول کے مطابق سکندر نے آباد کیا تھا اور

اس کا نام سکندریہ رکھا تھا لیکن بعد میں یہ قندھار یا گندھارا کے نام سے مشہور ہوا۔ سکندر نے اپنے مفتوحہ پاکستانی علاقہ کو چار صوبوں میں تقسیم کیا تھا۔

۱۔ گندھارا یا قندھار: اس میں وہ خطہ شامل تھا جسے شمالی مغربی سرحدی صوبہ اور قبائلی علاقے کہلاتے تھے۔

۲۔ ٹیکسلا: یہ علاقہ راجہ ٹیکسلا کے سپرد کیا گیا۔

۳۔ جہلم: یہ راجہ پورس کے سپرد کیا گیا۔

۴۔ سندھ: ایک یونانی سردار کو اس کا فرماں روا بنایا گیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ سکندر ہی کے زمانہ میں قندھار کو یہ اہمیت حاصل ہو چکی تھی کہ وہ ایک بہت بڑے خطے کا دارالخلافہ قرار پایا۔ اسی علاقے سے یعنی گندھارا سے آرٹ کا ایک خاص دبستان منسوب ہے جسے گندھارا آرٹ کہتے ہیں۔ اس آرٹ پر یونان کے فن کاروں کا اثر نمایاں دکھائی دیتا ہے چنانچہ گندھارا یا قندھار کے فن کاروں نے بدھ یا بدھی ستوا کے جو بت بنائے ہیں ان پر یونانی اثر نمایاں ہے۔ اشوک کے زمانہ میں جب اس کی سلطنت کی حدود دریائے آمو تک پھیل گئیں (جہاں اس کے زمانہ کے کتبے اب تک ملتے ہیں) بدھ مت ہندوستان سے نکل کر قندھار سے ہوتا ہوا وسط ایشیا اور چین تک پہنچا اور گندھارا آرٹ میں بدھ کے مجسموں کا وجود بتاتا ہے کہ اس کے عروج کا زمانہ بدھ مت کے عروج سے تعلق رکھتا ہے۔ یوں مورخ یہ کہتے ہیں کہ کنشک سنہ ۱۲۰ یا ۱۲۵ء عیسوی میں تخت نشین ہوا تو آرٹ کے چار مرکز اس کے عہد میں وجود میں آئے جو یہ ہیں: سارناتھ، متھرا، امراؤتی اور گندھارا۔

کنشک کے زمانہ میں ہندوستان میں جو سکے، بت اور استوپے بنائے گئے ان پر قدیم یونانی آرٹ کا بڑا گہرا اثر ہے۔ یہاں تک کہ بدھ کا بت بعض اوقات یونانی دیوتا اپالو کا بت معلوم

ہوتا ہے۔ مورخ کہتے ہیں کہ آرٹ کے اس دبستان کو یونانی بدھ دبستان کہنا چاہئے لیکن آج تک اسے گندھارا ہی کہتے ہیں۔ بیان کیا جا چکا ہے کہ زمانہ قدیم میں سرحدی علاقے، آزاد قبیلے گندھارا کے نام سے یاد کیے جاتے تھے۔ اس علاقہ کا ایک بہت بڑا اہم مرکز پرش پور یا پشاور گندھارا دبستاں کے آرٹ کے متعلق محققین کی آرا مختلف ہیں بعض کے نزدیک متھرا اور امراوتی کے آرٹ پر بھی بڑا اثر ہوا۔ اور بعض کہتے ہیں اس کا اثر مغربی پاکستان تک محدود رہا ہندوستان کے آرٹ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا، یہ بات ٹھیک بھی معلوم ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گپت دور میں جب فن تعمیر اور بت گری کا ایک نیا دبستان قائم ہوا تو اس میں گندھارا دبستان کے بہت اثرات نظر آئے۔[۱]

(۲) قیام وسجود: نماز میں کھڑے ہونے کی حالت قیام کہلاتی ہے اور زمین پر سر رکھنے کی حالت کو سجود کہتے ہیں۔ یہاں قیام سے مراد اسلامی تعلیمات کا وہ پہلو ہے جو تسخیر کائنات کی ترغیب دیتا ہے اور سجود سے وہ فقر و استغنا مراد ہے جس کے متعلق رسول پاک ؐ نے کہا تھا

۱؎ جغرافیۂ خلافتِ مشرقی: جمیل الرحمٰن۔ جغرافیہ تاریخ ایران: حمزہ سردار در (طہران)۔ تاریخِ ایران: سائیکس (جلد اول)۔ تاریخِ افغانستان: سائیکس۔ تاریخِ ہندوستان: مورلینڈ۔

استدراک: مورلینڈ لکھتے ہیں کہ گندھارا کا خط وہ تھا جو جہلم سے لے کر مغرب کی طرف افغانستان تک پھیلا ہوا تھا مورلینڈ ہی لکھتے ہیں کہ بدھ کی تعلیمات میں اصلاً خدا کے وجود کی ضرورت نہ تھی لیکن ستم ظریفی دیکھیے کہ مرنے کے بعد اسی کو دیوتا یا خدا بنا دیا گیا، اس کے بت بنائے گئے، اس کے لئے معابد بنائے گئے، اس کے الفاظ کو وحی کا رتبہ دیا گیا۔ اس کے آثار کو محفوظ رکھا گیا۔ بدھ مت کی یہ شکل ہندوستان میں نظر نہیں آتی مگر وسط ایشیا کے ان علاقوں میں جہاں اسلام نہیں پہنچا بدھ مت کی یہی شکل نظر آتی ہے۔ بدھ مت کے انہی مقلدوں نے آرٹ کا ایک دبستان بھی قائم کیا جسے گندھارا دبستان بھی کہتے ہیں۔ پشاور کے قرب و جوار میں کچھ بت دریافت ہوئے ہیں۔ انھیں گندھارا آرٹ اس لئے کہتے ہیں کہ گندھارا اس خطہ کو کہتے ہیں جس میں پورا فرنٹیئر شامل تھا۔ اس سے پہلے سنگتراش بدھ کی زندگی کے حالات ضرور دکھاتے تھے لیکن اس کا بت نہیں بناتے تھے۔ گندھارا دبستاں میں بدھ کے بڑے خوبصورت بت بنائے گئے۔

"ادفقر فخری" علامہ کی مراد یہ ہے کہ اسلام میں دین اور دنیا میں یوں توازن رکھا گیا ہے کہ مسلمانوں کو تمام دنیوی نعمتوں سے بہرہ یاب ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔ کائنات کو مسخر کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا ہے کہ دنیا کی آنی اور فانی چیزوں سے دل نہ لگائے۔ ان کو اتنی اہمیت نہ دے کہ ان کی وجہ سے روح یا ذہن ملوث ہو جائیں۔ اسی بنا پر اس مرحلہ پر علامہ نے رسول پاکؐ کے متعلق یہ کہا کہ فقر ہو یا شاہی دونوں وارداتِ مصطفوی ہیں شامل ہیں۔ اسی فقر اور شاہی کے لئے پھر علامہ نے قیام اور سجود کے کلمات استعمال کئے۔ گویا سجود اس بات کی علامت ہے کہ انسان ماسوا اللہ کی نفی کر کے صرف احکامِ الٰہی کا پابند ہو جاتا ہے اور قیام اس امر کی کہ وہ دنیا کو ترک نہیں کرتا بلکہ تمام جائز لذات سے بہرہ یاب ہوتا ہے اور ایک نئے قسم کا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے جس میں انسان اقتصادی اعتبار سے خوش حال ہو اور روحانی اعتبار سے سعادت مند۔[۵]

لہ علامہ اقبال کے خطبات ۔ علامہ اقبال کے مکاتیب ۔

اقبال: عزیز احمد کراچی ۔

ک

(۱) **کتاب**: کتاب کے لغوی معنی تو ہیں نوشتہ مسودہ (عرب لغت نویس یہ بھی لکھتے ہیں کہ کتب کے معنی جمع کرنے کے بھی ہیں اور بہ طریقِ مجاز یہ بھی درست ہے کیونکہ کتاب مجموعۂ اوراق ہے)، اصطلاح میں کتاب اور الکتاب قرآن مجید کو کہتے ہیں مثلاً پہلے پارہ ہی میں خدائے کریم ارشاد فرماتا ہے کہ **ذالك الكتاب لاريب فيه** یعنی وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ یہاں الکتاب سے مراد قرآن حکیم ہی ہے۔ عوام و خواص کی نظر میں کتاب بڑی اہم باتوں پر مشتمل ہے یا ہونی چاہیے۔ اسی وجہ سے قرآن حکیم کو بھی الکتاب کہا گیا کہ اس میں دین معاشرت، معاش اور معاد کے متعلق واضح احکامات مندرج ہیں۔ بعض مفسر یہ بھی کہتے ہیں کہ مدت سے مختلف مذاہب کے رہنما پیش گوئیاں کر رہے تھے کہ ایک صحیفۂ آسمانی نازل ہوگا جو تمام کتبِ سماوی کا تکملہ ہوگا۔ قرآن کریم وہی تکملہ ہے اور اس وجہ سے الکتاب ہے۔ ال سے عربی میں تعمیم کے بجائے تخصیص کا مفہوم پیدا ہوتا ہے گویا یہ وہ خاص کتاب ہے جس کا ذکر

پہلی کتابوں میں اور پیش گوئیوں میں آیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی اشارہ ہے کہ یہی وہ خاص کتاب ہے جس میں تمام اسلامی تعلیمات بہ طریق اجمال مندرج ہیں۔

(۲) کعبہ: کعبہ کا مادہ ک ع ب (کعب) ہے اور گمان گذرتا ہے کہ انگریزی Cube اور اس کلمہ میں لسانی تعلق ہے۔ زبان کے زوال کی حالت دیکھئے کہ جن چیزوں سے جُوا کھیلا جاتا ہے انھیں کعبتین کہتے ہیں کہ کعبہ کا تثنیہ ہے۔ یاد پڑتا ہے کہ کعبہ کلمہ کے متعلق یہ تحقیقات نظر سے گذری ہے کہ اس کا تعلق حجر الاسود سے ہے جس کی شکل Cube کی تھی لیکن اس وقت اسناد مستحضر نہیں ہیں۔

بنائے کعبہ یا تعمیر کعبہ کی داستان بہت مشہور ہے اور مختصراً اس کی صورت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام فلسطین میں مقیم تھے۔ یہ کنعان کا موجودہ نام ہے جس کی نسبت سے حضرت یوسف مشہور ہیں۔ وہ حضرت اسمٰعیل سے ملنے کے لئے مکہ تشریف لایا کرتے تھے انہی دنوں اللہ کا حکم ہوا کہ کعبۃ اللہ کی تعمیر کرو۔ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ سے اس بات کا ذکر کیا اور دونوں پیمبر خانہ خدا کی تعمیر کی تدابیر سوچنے لگے۔ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں ایک روایت نقل کی ہے کہ بیت اللہ کی بنیاد حضرت آدم نے رکھی تھی لیکن یہ مقام بے نشان ہو چکا البتہ ایک ٹیلہ یا ابھری ہوئی شکل میں موجود تھا۔ قرآن مجید اس روایت کا مؤید نہیں ہے یعنی اس معاملہ میں خاموش ہے۔

حضرت ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ نے بیت اللہ کی تعمیر شروع کی۔ حفظ الرحمٰن لکھتے ہیں:-

"باپ بیٹے برابر اس کی تعمیر میں مصروف ہیں اور جب اس کی دیواریں اوپر اٹھتی ہیں تو بزرگ باپ کا ہاتھ اوپر تعمیر سے عاجز آجاتا ہے تو ایک پتھر کو اوبر باڑ بنا دیا جاتا ہے جس کو حضرت ابراہیم اپنے ہاتھ سے سہارا دیتے ہیں اور حضرت ابراہیمؑ

اوپر تعمیر کرتے جاتے ہیں۔ یہی وہ یادگار ہے جو آج مقام ابراہیم کے نام سے مشہور ہے۔ جب تعمیر اس حد تک پہنچی جہاں آج حجر اسود ہے تو جبریل امین نے ان کی رہنمائی کی اور حجر اسود کو ایک پہاڑی سے نکال کر دیا جو جنت سے نکالا ہوا پتھر کہلاتا ہے تاکہ اسے نصب کر دیا جائے۔ بیت اللہ تعمیر ہو گیا۔ اللہ نے فرمایا کہ یہ ملتِ ابراہیمی کا قبلہ اور ہمارے سامنے جھکنے کا مقام ہے اس لئے یہ توحید کا مرکز قرار دیا جاتا ہے............قرآن عزیز نے بیت اللہ کی تعمیر کے وقت ابراہیم و اسمٰعیل کی دعاؤں اقامتِ صلوٰۃ اور مناسکِ حج کی ادائیگی کے لئے شوق و تمنا کے اظہار اور مرکزِ توحید ہونے کا جگہ جگہ ذکر کیا ہے اور رنگے نئے اسلوب طرز ادا سے اس کی عظمت اور جلالت و جبروت کو ان آیات میں واضح فرمایا ہے۔"

اس کے بعد حفظ الرحمٰن صاحب نے آلِ عمران اور الحج کی سورتوں سے طویل اقتباسات نقل کئے ہیں۔

عرب مورخ لکھتے ہیں کہ حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی والدہ بیت اللہ کے قریب حرم میں مدفون ہیں لیکن تورات ایک موقع پر اشارہ کرتی ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی قبر فلسطین میں ہی ہے۔

حجر الاسود کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ یہ سیاہ رنگ کا پتھر ہے جسے حضرت ابراہیم کے علامتِ طواف کے طور پر نصب کیا۔ اس اعتبار سے یہ پتھر پیشوایانِ توحید کے ایک نہایت بزرگ فرد کی قدیم ترین تاریخی علامت ہے۔ یہاں تک کہ نصاریٰ اور یہود تک اس کا احترام کرتے ہیں۔ بیت اللہ کے درو دیوار کی وضع قطع بمرورِ زماں بدلتی رہی ہے لیکن حجر الاسود اسی جگہ نصب ہے۔

صدر الدین لکھتے ہیں کہ عمرو بن حارث نے حجرِ اسود کو چاہِ زمزم میں دفن کر دیا تھا اور

اپنا قبیلہ لے کر یمن چلا گیا تھا کیونکہ بنی بکر بن عبد مناف نے اسے مہاجرت پر مجبور کر دیا تھا۔ کچھ مدت کے بعد یہ پتھر پھر اپنی جگہ پر نصب کیا گیا۔ عبداللہ بن زبیر کے زمانہ میں حجر الاسود کے تین ٹکڑے ہو گئے۔ پھر چاندی کے پتروں سے ان ٹکڑوں کو باہم جوڑا گیا۔ ہارون الرشید کے زمانہ میں پھر یہ خدشہ ہوا کہ حجر الاسود کے ٹکڑے ہو جائیں گے چنانچہ ہارون الرشید نے حکم دیا کہ اوپر اور نیچے کے ٹکڑوں میں سوراخ کر دیا جائے اور ان میں چاندی بھر دی جائے۔
اس کے بعد ۳۱۹ھ میں ابو طاہر قرمطی نے مکہ پر حملہ کیا اور بہت سے حاجیوں کو ہلاک کر دیا۔ مورخ کہتے ہیں کہ ان کی تعداد تیس ہزار کے قریب تھی۔ ان میں سے اکثر بیت اللہ کے گرد و نواح میں مدفون ہیں۔ ابو طاہر نے حجر الاسود کو بھی اکھاڑ لیا اور اپنے ہمراہ لے گیا۔ آخر ۳۳۹ھ میں سنبر بن حسن قرمطی نے پھر پتھر کو اپنی جگہ پر نصب کر دیا۔

حضرت ابراہیم کی وفات کے بعد بیت اللہ کی عمارت کی کئی بار تجدید ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ کے زمانہ میں ایک سیلِ عظیم نے کعبہ کے ستونوں کو ہلا دیا اور قریش اس کی مرمت کی طرف متوجہ ہوئے۔ قریش نے کعبہ کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا اور ایک قبیلہ ایک حصہ کا مہتمم قرار دیا۔ اسی قبیلہ کا فرض تھا کہ اس حصہ میں اگر کوئی خرابی پیدا ہو تو فوراً مرمت کرائے۔ جن دنوں قریش کعبہ کی مرمت کرا رہے تھے رسولِ پاکؐ نے بھی اس مقدس کام میں شرکت کی اور کوہساروں سے خود پتھر اٹھا کر لاتے رہے۔ بیت اللہ کی اس تجدید کے موقع پر بھی قریش میں اختلاف پیدا ہوا اور قریب تھا کہ نوبت کشت و خون تک پہنچے۔ آخر یہ قضیہ رسول پاکؐ تک پہنچا اور انہوں نے خوش اسلوبی سے جھگڑا نپٹایا۔ ۶۳ھ میں جب یزید کے سپاہیوں نے کعبہ پر سنگ باری کی، عبداللہ بن زبیر نے بیت اللہ کی تجدید کی۔ اس کے بعد حجاج بن یوسف نے کوہِ ابو قبیس پر منجنیق نصب کر کے کعبہ پر سنگ باری کی اور اسے

ویران کر دیا لیکن اس کے بعد پھر در و دیوار از سرِ نو تعمیر کیے گئے۔ ایرانیوں کا عقیدہ تھا کہ اہورا مزدا کی روح کعبہ میں حلول کر گئی ہے چنانچہ وہ بھی پرانے وقتوں سے بیت اللہ کا طواف کرتے چلے آئے ہیں۔ مسعودی نے مروج الذہب میں لکھا ہے کہ صابئین بھی کعبہ کی بہت تعظیم کرتے تھے کہ یہ خانۂ زحل ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا۔ بلادِ مشرق کے لوگ بھی بیشتر بیت اللہ کو محترم گردانتے تھے۔ صدرالدین کا بیان تو یہ ہے کہ ہندو سمجھتے تھے کہ شیو کی روح حجرالاسود میں حلول کر گئی ہے۔

اوپر جو بیانات نقل کیے گئے ہیں وہ صدرالدین بلاغی کے ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہندوؤں کے عقیدہ کے مطابق شیو کی روح کسی پتھر میں حلول نہیں کرتی بلکہ ایک خاص وضع کا پتھر، جیسے حجرالاسود ہے، شیو کی عظمت کی علامت تصور کیا جاتا ہے۔ اب بھی ہندوؤں کے مختلف معابد میں ایک خاص وضع کا پتھر ہی شیو سے منسوب ہے۔ سومنات میں بھی جو شیو کا معبد مخصوص تھا اسی قسم کا پتھر نصب تھا۔ مستشرقین نے اور مغربی مفکروں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ جو پتھر شیو کی عبادت سے منسوب ہیں وہ دراصل جنسی علائم و رموز سے متعلق ہیں۔

رسول خداؐ کے مبعوث ہونے کے بعد مکہ معظمہ تمام مسلمانوں کی عقیدت اور احترام کا مرکز اور محور رہے اور ہر ذی استطاعت مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اس خانۂ مبارک کا طواف کرے، مغفرت کی دعا کرے اور دنیا کے باقی مسلمانوں سے میل جول پیدا کرنے کی تدبیر کرے۔ حج کی معاشری اہمیت یہی ہے کہ سال کے سال مسلمان جمع ہو کر ان مسائل پر غور کر سکیں جو مسلمانوں کو درپیش ہیں۔ یعنی حاجیوں کا مکہ میں جمع ہونا ایک بہت بڑی مجلسِ شوریٰ جیسی ہے۔ علاوہ ازیں اس اجتماع سے تہذیبی اور ثقافتی ہم آہنگی بھی پیدا ہوتی ہے۔ کچھ عرصہ

سے حج کا یہ عمرانی مقصد پورا نہیں ہو رہا۔ نہ کبھی یہ سنا گیا ہے کہ مسلمانوں نے اس تقریب سعید پر مل کر کبھی دینی مسائل پر غور کیا ہو یا شوریٰ کیا گیا ہو۔ اسلام کی تعلیمات جامد نہیں ہیں اور زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دے سکتی ہیں۔ اگر حج کے موقع پر شوریٰ ہو جائے تو بہت سے مسائل جن کو اسلامی ممالک فرداً فرداً حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں سلجھ سکتے ہیں۔[1]

---

[1] قصص القرآن: حفظ الرحمٰن۔ — قصص قرآن: صدرالدین بلاغی۔

غیاث اللغات۔ — فرہنگ آنندراج

بروکلمن: تاریخِ عالم اسلامی (انگریزی)۔

ل

(۱) **لطف اللہ آذر:** لطف اللہ آذر تاریخ ولادت شنبہ بیس ربیع الثانی سنہ ۱۱۲۳ھ اور مولد اصفہان ہے۔ ان کی تصنیف آتش کدہ (تذکرہ شعرائے فارسی) بہت مشہور رہی ہے۔

(۲) **لی خرقتان:** اشارہ ہے اس حدیث کی طرف:

لی خرقتان الفقر والجہاد

یعنی میرے دو لباس ہیں فقر اور جہاد

م

(۱) **محمود غزنوی**: جلوس ۳۸۸ھ وفات ۴۲۱ھ (میلادی ۹۹۸ء تا ۱۰۳۰ء) ایران میں جب آلِ سامان کی حکومت قائم ہوئی (۲۶۱ھ تا ۳۸۹ھ) تو بمرورِ زمان ترکی غلاموں کا نفوذ و اقتدار بڑھتا گیا یہاں تک کہ سامانی امرا نے ان غلاموں کو مختلف ریاستوں اور صوبوں کی فرماں روائی بھی عطا کر دی۔ ایک بڑا الجھا ہوا سوال ہے کہ اُس زمانے کے معاشری حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ترکی غلاموں کا حسن و جمال کس حد تک ان کے اقتدار میں معاون ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ قابوس نامہ میں مصنف امرد پرستی کو نہ صرف مباح قرار دیتا ہے بلکہ اس کے اصول و قواعد بیان کرتا ہے اور اپنے بیٹے کو نصیحت کرتا ہے کہ اس سلسلہ میں کون سے امور کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ یہ بھی جانتے ہیں کہ سامانی امرا نے اپنے غلاموں کے لئے ایک عظیم الشان تفرج گاہ تعمیر کرائی تھی جسے جوئے موالیاں کہتے تھے اور جسے بعد میں جوئے مولیاں کہنے لگے۔ یہ وہی جوئے مولیاں ہے جس کا ذکر رودکی نے بھی اپنے مشہور

قصیدہ میں کیا ہے۔ بہرحال سامانی غلاموں میں ایک غلام الپتگین بھی تھا جسے عبدالملک نے خراسان کے لشکر کا سپہ سالار مقرر کر دیا تھا۔ عبدالملک کے مرنے کے بعد الپتگین شہر غزنہ واپس آ گیا کہ اس کا وطنِ اصلی تھا۔ وہاں بیٹھ کر اس نے خود مختاری کا دم بھرنا شروع کیا لیکن جلد ہی مر گیا۔ اس کا بیٹا اسحاق ناقابل نکلا۔ البتہ اس کے ایک غلام سبکتگین نے جو اس کا داماد بھی تھا اپنی سلطنت کو وسیع کرنا شروع کیا۔ ایک طرف تو وہ ہندوستان کی سرحد عبور کر کے راجپوتوں کو تسخیر کرنے کے لئے بڑھا دوسری طرف خراسان پر قبضہ کر لیا۔ ۳۸۴ھ میں سامانی فرماں روا نوح نے اسے خراسان کی حکومت کا پروانہ بھی عطا کر دیا۔ سبکتگین کے مرنے کے بعد محمود غزنوی اس کا بیٹا تخت نشین ہوا۔ اس نے سامانیوں کی رسمی اطاعت شعاری بھی ترک کر دی اور خلیفۂ بغداد سے غزنی اور خراسان کی حکومت کا پروانہ حاصل کیا۔ اس کے بعد گویا خلافتِ عباسی محمود کو اپنا پشت و پناہ سمجھنے پر مجبور ہو گئی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے محمود نے سلطان کا لقب اختیار کیا لیکن یہ بات غلط معلوم ہوتی ہے۔ اس نے تخت پر جلوس کرنے کے بعد پہلے تو ایلک خانی فرماں رواؤں سے صلح کی (۳۸۹ھ تا ۳۹۶ھ) اس کے بعد ہندوستان کے مشرک باشندوں کے خلاف مہمات کا وہ سلسلہ شروع کیا جو تاریخ میں محمود کے حملوں کے نام سے مشہور رہیں۔ محمود نے اپنی سلطنت کشمیر اور پنجاب تک وسیع کر لی۔ پھر قنوج اور متھرا پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد سومنات اور گجرات کے پایۂ تخت کو بھی روند ڈالا۔

مشہور ہے کہ محمود نے سومنات کے مندر میں پجاریوں کی یہ پیش کش رد کر دی تھی کہ وہ سومنات کا بت توڑنے کے بجائے لاکھوں کے جواہرات منظور کر لے لیکن بعض مورخ اس بات کو محل نظر سمجھتے ہیں (دیکھئے کلمہ سومنات) محمود کے عہد کے قصیدہ گو شعرا نے اس کی مہمات کو نظم بھی کیا۔ ہندوستان کی طرف سے فراغت پائی تو محمود نے بلادِ غور کو مسخر کر لیا اور پھر بخارا اور سمرقند

کو بھی فتح کر لیا۔ اپنی سلطنت کے آخری دنوں میں محمود کو خطرہ تھا کہ سلجوقی ترکمان اسے ایران سے نکال دیں گے لیکن اس نے کمال تدبر و فراست سے کام لے کر سلجوقیوں کو اپنا مطیع بنا لیا۔

محمود غزنوی کے مرنے کے بعد سلاجقہ نے ایران اور ماوراء النہر کی تمام ولایات کو اس کے جانشینوں کے تصرّف سے نکال کر اپنی مقبوضات میں شامل کر لیا۔ آخر غوریوں نے غزنی کو بھی فتح کر لیا۔ پھر یہ حالت ہو گئی تھی کہ غزنویوں کے پاس صرف وہ علاقے رہ گئے تھے جو ہندوستان میں شامل تھے۔ آخر غوریوں نے غزنویوں کو ہندوستان سے بھی شکست دی اور اپنی سلطنت قائم کر لی۔

محمود غزنوی بڑے جاہ وجلال اور طمطراق کا بادشاہ تھا۔ اس کے دربار میں بڑے بڑے شعرا اور امرا شامل تھے۔ ان میں البیرونی خاص امتیاز رکھتا ہے۔ بعض مورخ تو یہ کہتے ہیں کہ محمود غزنوی اپنے دربار کو علما، اور فضلا کا مصدر بنانے پر اس قدر مصر تھا کہ ان لوگوں کو مجبور کرتا تھا کہ وہ ان کی ملازمت کریں۔ "چہار مقالہ" میں تفصیل مندرج ہے کہ بوعلی سینا نے محمود کے دربار میں جانے سے انکار کیا۔ اس کی وجہ غالباً مذہبی اختلاف تھا۔ محمود کے زمانہ میں جس دبستانِ شعر نے فروغ پایا ہے وہ خراسانی کہلاتا ہے۔ اس زمانہ کے قصیدہ نگاروں نے اس تفصیل سے محمود کی مہمات قلمبند کی ہیں کہ اگر آج تمام دوسرے تاریخی ماخذ ناپید ہو جائیں تب بھی ان قصائد کی مدد سے اس کے سوانح حیات مرتب کئے جا سکتے ہیں۔ جو شعرا اس کے دربار سے منسلک تھے ان سب میں فرخی عذب البیان اور شیریں مقال تھا۔ اس کے قصیدوں میں محمود کی بزمیہ مجالس کے متعلق بڑی خیرہ حکایتیں ملتی ہیں۔ یہ بھی طے ہے کہ ایک مرتبہ ایاز کے ہمراہ شراب نوشی کے جرم میں وہ محمود کے عتاب کا شکار ہوا۔ پھر بہت سے امرا کی سفارش کی وجہ سے وہ اس کے عتاب سے رہا ہوا۔ اس نے اس کا ذکر اپنے ایک قصیدہ میں کیا ہے جو اس طرح شروع ہوتا ہے :

اے ندیمان شہریارِ جہاں

محمود غزنوی اور فردوسی کے درمیان جو واقعات شاہنامہ کی ترتیب کے سلسلہ میں پیش آئے، اس کا تفصیلی ذکر فردوسی کے تحت دیکھئے۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ فردوسی محمود کے دربار سے محروم لوٹا۔ یہ سوال اور ہے کہ فردوسی کو محمود کی ہجو کرنے کا حق پہنچتا تھا یا نہیں اور اس نے ہجو کی یا نہیں۔ پروفیسر محمود شیرانی کی تحقیق یہ ہے کہ ہجو ایک بہت بڑی ادبی جعل سازی کا نتیجہ ہے۔[5]

(۲) مسجدِ اقصیٰ: بڑی مشہور مسجد ہے جو یروشلم میں واقع ہے۔ اس کی تعمیر ۶۹۱ء میں ختم ہوئی۔ تعمیر کا سہرا اُموی فرماں رواؤں کے سر ہے۔ اس کی محرابیں بڑی خوبصورت اور منقش ہیں۔ یہ مسجد جس تعمیری اصول پر بنائی گئی ہے وہی افریقہ اور اسپین کی مسجدوں میں ملحوظ رہے۔ یروشلم ہی میں ایک اور مسجد بھی ہے۔ جو مسجدِ عمر کے نام سے مشہور ہے۔ خشوستری لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی نظروں میں یہ مسجد اس لئے محترم ہے کہ رسول پاکؐ نے افلاک کو صعود اسی کے گرد و نواح سے کیا ہے۔ یہ پہلی مسجد ہے جس میں گنبد بنایا گیا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسجد اقصیٰ سے مراد معراج کے سلسلہ میں بیت المقدس ہے کہ مسجدیں تو یہاں معراج کے واقعہ کے بعد تعمیر ہوئی ہیں۔[6]

---

[5] تاریخِ ادبیاتِ ایران: براؤن جلد دوم (انگریزی)۔ — طبقاتِ سلاطینِ اسلام: ترجمہ عباس اقبال (طہران)
سلطان محمود غزنوی کی بزمِ ادب: غلام محی الدین زور۔ — تاریخِ عالمِ اسلام: بروکلمن۔
تاریخِ ہندوستان: مورلینڈ۔ — فردوسی پر چار مقالے: حافظ محمود شیرانی۔
تنقیدِ شعر العجم: حافظ محمود شیرانی۔ — تاریخِ ایران: سائیکس جلد دوم (انگریزی)۔
چہار مقالہ۔

[6] ثقافتِ اسلامی کا خاکہ: خشوستری۔ — قصص القرآن (جلد چہارم): حفظ الرحمٰن

۵

(۱) **ہندوستان**: دو کلمات سے مرکب ہے ہندو اور ستان. ستان کے معنی مقام کے ہیں. یہی کلمہ آستان میں بھی پایا جاتا ہے. اس میں الف کبھی گر پڑتا ہے اسی کی ایک پراکرتی شکل ستھان بھی ہے. ہندو سے مراد وہ قوم ہے جو دریائے سندھ کے اس پار بستی تھی (ایرانیوں کے نقطۂ نظر سے) کہ وہ لوگ اس دریا کو سندھ بھی کہتے تھے اور ہند بھی. س اور ہ کا تبادلہ فارسی میں عام ہے بلکہ آریائی زبانوں میں بھی یہ عمل جاری رہتا ہے تو اس کلمہ کا مطلب ہندوؤں کا ملک ہے یعنی وہ لوگ. جو دریائے سندھ کے اُس پار بستے ہیں۔

نئی اصطلاح میں یہ ملک برصغیر ہند پاکستان کہلاتا ہے اور جو علاقے ہندو اکثریت میں ہیں وہ انگریزی میں انڈیا اور ان کی سرکاری زبان میں بھارت کہلاتے ہیں۔ بھارت کے متعلق تفصیلات کے لئے دیکھئے قاموس سیاسیات عالم جس کا مصنف لکھتا ہے کہ

پہلے یہ ملک ایشیا کے اس حصے پر مشتمل تھا جس کا حدود اربعہ بتفصیل ذیل یہ ہے

شمال میں ہمالہ اور دوسرے پہاڑ

جنوب مغرب میں بحیرہ عرب

جنوب مشرق میں خلیج بنگال

اب اصطلاح میں اس ملک کا وہ خطہ انڈیا، بھارت یا ہندوستان ہے جو پاکستان سے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ اس حصہ میں بہت سی ریاستیں شامل تھیں جو اب بھارت میں مدغم ہو چکی ہیں رجواڑوں کو اور فرماں رواؤں کو وظیفے البتہ ملتے ہیں۔ مسلمانوں کے تمدنی اور ثقافتی آثار کثرت سے اسی حصے میں پائے جاتے ہیں اور پاکستان کی تاریخ اس حصہ کی تاریخ سے اس طرح دست و گریباں ہے کہ دونوں کا مطالعہ کئے بغیر بات نہیں بنتی۔ یہی بات فنون لطیفہ کی ہے۔ ان باتوں کا ذکر اس لئے ضروری تصور کیا گیا کہ یہ بات بخوبی ذہن نشین ہو جائے کہ علامہ کے ہاں ہندوستان سے مراد ہمیشہ غیر منقسم ہندوستان تھا اور اس کے مسائل موجودہ بھارت سے بالکل مختلف ہے[۱]

(۲) **ہاشم و محمود (نیز شاہ ولی خاں)**: جب نادر خاں مرحوم بچہ سقہ کی بپا کردہ بدامنی کو فرو کرنے کے لئے فرانس سے افغانستان پہنچے تو مختلف لڑائیاں لڑتے ہوئے آخر کار اگست ۱۹۲۹ء میں انھوں نے ایک آخری کانٹے کی تول لڑائی لڑی۔ اس کے باوصف ابھی باغیوں کے دم خم باقی تھے چنانچہ ستمبر کے وسط تک چھڑپیں ہوتی رہیں۔ آخر اکتوبر کی دس تاریخ کو کابل تسخیر کر لیا گیا، اور نادر خاں شہر میں داخل ہوئے۔ حبیب اللہ (بچہ سقہ) نے راہ فرار اختیار کی اور پھر نادر خاں سے گفت و شنید بھی شروع کر دی۔ قبائلی بچہ سقہ کی

---

[۱] قاموس سیاسیات عالم: فیبر اینڈ فیبر (انگریزی)

بداعمالیوں کی وجہ سے سخت برافروختہ تھے اور انھوں نے اسے ہلاک کردیا۔ جس وقت نادرشاہ نے اپنی حکومت قائم کی تو طبعًا ان آدمیوں پر بھروسہ کیا جو اس کے اقارب میں شامل تھے انھیں میں سردار ہاشم خاں بھی تھے جو فنونِ حرب میں خوب ماہر تھے اور نادرشاہ مرحوم کے بھائی تھے۔

شاہ محمود خاں نادرشاہ کی حکومت میں وزیرِ جنگ تھے اور انھوں نے مختلف بغاوتیں فرو کرنے میں بہت معرکہ کا کام کیا۔ جس کابینہ میں محمود خاں وزیرِ جنگ تھے۔ اس میں شاہ ولی خاں صدرِ اعظم یا وزیرِ اعظم کے عہدہ پر سرفراز تھے۔[لہ]

لہ تاریخِ افغانستان انگریزی؛ سائکس جلد دوم۔

ترقی بزیر افغانستان؛ محمد علی ایم۔اے استاد تاریخ حبیبیہ کالج کابل۔

تاریخِ ہندوستان؛ (انگریزی) مورلینڈ۔

مثنوی اسرارِ خودی

الف

(۱) اخوندِ روم: مولانا روم کی طرف اشارہ ہے۔

(۲) ادراک: نفسیات کی اصطلاح میں ادراک کے معانی ہیں فوری طور پر کسی شے کا شعور حاصل کرنا اور عام طور پر ادراک سے مراد وہ ادراک ہوتا ہے جس کا ماخذ حواس خمسہ ہوتے ہیں۔ جس شے کا ہمیں شعور حاصل ہوتا ہے وہ کسی حس کے ذریعے ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ ادراکِ حسی علامہ کی نظر میں کائنات کی حقیقت اور ماہیت دریافت کرنے کا اہل نہیں ہے حقیقت دریافت کرنے کے لئے بصیرت پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے جو ادراک تو کجا عقل سے بھی ماوراء ہے۔ امام غزالی نے بھی یہ لکھا ہے کہ حقیقت کشوف ہوتی ہے اور ادراک کے ذریعہ مفہوم کبھی نہیں ہوتی۔ اسرار میں علامہ ادراک کو حضرت موسیٰ سے تشبیہ دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جس طرح حضرت موسیٰؑ حضرت خضرؑ کی مدد کے محتاج تھے، ادراک بھی تمنا کی محتاج ہے۔ یہ تمنا وہی بصیرت ہے جو ماورائے عقل ہے اور جس کا سرچشمہ الہام و وحی ہو۔

علامہ کہتے ہیں :

ہے نورِ تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے[5]

(۳) **اشراق :** شیخ الاشراق شہاب الدین یحییٰ بن حبش بن امیرک سہروردی۔ سہرورد زنجان کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے امام فخر الدین رازی سے استفادہ کیا۔ ان کی ولادت کا سال ۵۴۹ھ ہے مسلّم ہے کہ وہ ۵۸۷ھ میں مقتول ہوئے اور یہ بھی طے ہے کہ ان کا جرم سوائے اس کے کچھ نہ تھا:

"کہ درسِ فلسفہ می داد و عاشقی ورزید"

(عشق سے یہاں مراد عشق لعلم ہے) البتہ اس معاملہ میں اختلاف ہے کہ وہ کس کے ایما پر مقتول ہوئے۔ عباس اقبال جو اصلاً مورخ ہیں اور پھر انشا پرداز لکھتے ہیں کہ انھیں سلطان صلاح الدین ایوبی (۵۳۲ھ۔۵۸۹ھ) کے اشارہ پر ہلاک کیا گیا لیکن محقق لکھتے ہیں کہ وہ ملک الظاہر پسرِ صلاح الدین ایوبی (۵۶۸ھ۔۶۱۳ھ) کے ایما پر مقتول ہوئے۔

---

[1] لغتِ نفسیات (انگریزی) : ڈریور۔
علامہ اقبال کے خطبات (انگریزی)۔
غزالی نامہ، جلال ہمائی۔
اقبال، نئی تشکیل : عزیز احمد۔
قرآن اور تصوف : میر ولی الدین۔
تاریخِ تصوف در اسلام : قاسم غنی۔

استدراک : منتخب اللغات نے بھی بالکل لغت نفسیات کی طرح ادراک کی صحیح تعریف کی ہے یعنی

دریافتن و رسیدن بچیزے

یہی تعریف فرہنگ آنندراج میں درج ہے لیکن صاحب غیاث لکھتے ہیں کہ غیر محسوس چیزوں کی دریافت کو ادراک کہتے ہیں معلوم ہوا کہ یا تو غیر یہاں کاتب نے بڑھا دیا ہے یا صاحب غیاث ادراک کو تصوف کے معانی میں استعمال کر رہے ہیں یعنی ادراکِ حقیقت بوسیلۂ بصیرت اور یہ بھی گمان گزرتا ہے کہ ان کی مراد تعقل سے ہو لیکن منتخب اور آنندراج دونوں متفق ہیں کہ ادراک دونوں قسم کی دریافتوں کو محیط ہے یعنی محسوس و غیر محسوس۔

صاحب طبقاتِ سلاطینِ اسلام نے ملک الظاہر کو ابو بیانِ حلب کا پہلا فرماں روا قرار دیا ہے کیونکہ صلاح الدین کی وفات کے بعد اس کی مقبوضات اس کے بھائیوں، بیٹوں اور بھتیجوں میں بٹ گئی تھیں۔

واضح رہے کہ اسی نام کے ایک اور بزرگ بھی گزرے ہیں یعنی شیخ شہاب الدین سہروردی صاحب عوارف المعارف ان کا شمار مشہور صوفیوں میں ہوتا تھا۔ سعدی نے "بوستان" میں ان کا ذکر کیا ہے اور انھیں دانائے عارف شہاب کہہ کر یاد کیا ہے۔ ان کی وفات ۶۳۲ھ میں ہوئی ہے۔ ان کا ذکر اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عام پڑھنے والے کو اشتباہ ہو جاتا ہے۔

شیخ الاشراق شیخ شہاب الدین یعنی شیخ مقتول جن کا ذکر علامہ نے کیا ہے پہلے ملک الظاہر نے ان کی بہت تکریم و تعظیم کی چنانچہ شیخ حلب میں مدتوں فلسفہ کا درس دیتے رہے لیکن بتدریج علما ان کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے اور آخر یہ فتویٰ دے دیا کہ انھیں ہلاک کرنا جائز ہے۔ یوں تو ان کی اور بھی تصانیف ہیں لیکن حکمۃ الاشراق بہت مشہور ہے۔ علامہ لکھتے ہیں کہ:

"یہ قدیم فلسفہ یونان کا ایک سکول ہے اور افلاطون کے فلسفہ کا نتیجہ ہے۔ مسلمانوں میں اس کے جامع اور مرتب شیخ شہاب الدین سہروردی مقتول تھے جن کو سلطان صلاح الدین نے علمائے وقت کے فتویٰ پر قتل کرا دیا تھا۔"

حکمۃ الاشراق نوفلاطونی تصورات و افکار کی ایک ترمیم شدہ صورت پیش کرتی ہے۔ شیخ کہتے ہیں کہ تکوین کی اصل نورِ مطلق ہے۔ اس نور کا جوہر تنویر ہے یا اشراق۔ اور اسی تنویر یا اشراق کے ذریعہ اس کا اظہار ہوتا ہے۔ جس چیز کو ارسطو کے فلسفہ میں مادہ کہتے ہیں اسے شیخ الاشراق "غیر نور" کہتے ہیں۔ روح طبعاً نورِ مطلق کی طرف گرم سفر رہتی ہے۔ اگر روح کی حرکت کا رُخ نور کی طرف ہو تو بصیرت اور

خیر وجود میں آتے ہیں۔ اگر یہ رُخ غیر نور کی طرف ہو تو شر بیدا ہوتا ہے۔ شر نور کی نفی ہے اور اس کے وجود کا انحصار ظلمت پر ہے۔ عناصر چار نہیں صرف تین ہیں یعنی پانی، ہوا اور مٹی۔ آگ بھی ہوا ہی ہے۔ فرق یہ ہے کہ یہ ہوائے مشتعل ہے۔ عناصر کے امتزاج سے اختلافِ صور بیدا ہوتا ہے۔ کائنات اس معنی میں ممکن الوجود ہے کہ نورِ مطلق کی کلّیت کا اظہار نہیں کرتی لیکن اس معنی میں غیر فانی ہے کہ اس کا ماخذ نورِ مطلق ہے۔

انسان کو ایک خاص ملکہ عطا کیا گیا ہے جس سے کام لے کر وہ نورِ مطلق تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سعی کے کئی مقام ہیں۔ انسان کی خودی تکمیلِ نفس میں حارج ہوتی ہے جس طرح حواسِ خمسہ ظاہری انسان کو عطا کیے گئے ہیں، اسی طرح پانچ باطنی حواس بھی اسے بخشے گئے ہیں[۱]۔

(۴) اصفہان: ایران میں اب انتظامی وحدتوں کو ولایات کہتے ہیں۔ اصفہان ایک ولایت بھی ہے جو کاشان اور خوزستان و فارس کے درمیان واقع ہے۔

اصفہان میں بارش کم ہوتی ہے لیکن آب و ہوا بہت معتدل اور لطیف ہے۔ اس ولایت کا مشہور پہاڑ زرد کوہ ہے اور دریا زائندہ رود ہے۔ زائندہ رود سے ولایت اصفہان کو بہت فائدہ پہنچا ہے۔ باغوں کو کھیتوں کو اسی دریا کا پانی دیا جاتا ہے۔ اس دریا پر بارہ[۱۲] پل بنائے گئے ہیں جو نہایت مضبوط ہیں۔ زائندہ رود اور اس کی نہروں کی وجہ سے ولایت اصفہان میں مختلف قسم کی چیزیں بیدا ہوتی ہیں۔ میوے کی اس قدر کثرت ہوتی ہے کہ سال میں دس مہینے نہایت سستا بکتا ہے۔ اس ولایت کا سب سے اچھا میوہ یا پھل خربوزہ ہے جو نہایت لذیذ اور معطر ہوتا ہے

---

[۱] تاریخ مفصل ایران: عباس اقبال۔
اسرار و رموز (دیکھیے)۔
تاریخ ادبیاتِ ایران: شفق۔
طبقاتِ سلاطینِ اسلام:
ثقافتِ اسلامی کا خاکہ (جلد دوم): شوستری۔
تاریخ تصوف در اسلام: قاسم غنی۔

زرد آلو اور سیب بھی یہاں کے مشہور ہیں۔ جو چیزیں دوسرے ممالک کو برآمد کی جاتی ہیں، ان میں تمباکو اور کپاس شامل ہیں۔

ولایتِ اصفہان کا دارالخلافہ شہر اصفہان ہے جو اپنی آبادی، تجارت اور صنعت و حرفت کے اعتبار سے ایران کا تیسرا شہر سمجھا جاتا ہے۔

اس شہر کے متعلق حسین سعادت نوری لکھتے ہیں کہ اصفہان نصفِ جہاں کہلاتا ہے۔ یہ کلمہ دراصل سپاہاں کا مرکب ہے یعنی وہ مقام جہاں بہت سے سپاہی موجود ہوں۔ اگر نوری کا یہ قیاس درست ہے تو یہ بات ظاہر ہے کہ پرانے وقتوں میں اصفہان بہت بڑا عسکری مرکز ہوگا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس شہر کے دو حصے تھے۔ ایک حصے میں ایران کے باشندے آباد تھے اور دوسرے میں باہر سے آنے والے یہودی۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا اور مزید عمارتیں بنتی گئیں، دونوں حصے ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ یہاں تک کہ ایک شہر وجود میں آگیا یہی اصفہان ہے۔

ناصر خسرو علوی نے اپنی سیر و سیاحت کے دوران میں اصفہان رہ کر بھی دیکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہاں کی عمارتیں بڑی بلند اور باشکوہ ہیں۔ آب و ہوا معتدل ہے۔ کارواں سرائیں پاکیزہ اور اعلیٰ درجہ کی ہیں۔

جب منگولوں نے ایران پر حملہ کیا تو اصفہان کے قریب بھی بڑے زور کی لڑائی ہوئی۔ آخر منگول شہر میں داخل ہو گئے، البتہ شہر ان کی غارت گری سے محفوظ رہا۔ چودھویں صدی کے آخر میں تیمور نے اصفہان پر قبضہ کر لیا۔ سوئے اتفاق سے اصفہان کے کچھ باشندوں نے تیمور کے سپاہیوں پہ حملہ کیا اور اس کی فوج کے کچھ آدمی مار ڈالے۔ اب تیمور نے قتلِ عام کا حکم جاری کیا اور سپاہیوں نے اپنے بھائی بندوں کا بدلہ لینے کے لئے ستر ہزار آدمیوں کو ہلاک کیا اور ان کی کھوپڑیوں سے

ایک مینار تعمیر کروا دیا۔

شاہ عباسِ اعظم (۱۵۸۸ء تا ۱۶۲۹ء) نے اصفہان کو اپنا پایۂ تخت قرار دیا۔ اس کے زمانہ میں یہاں بہت عالی شان عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ ان میں ایک سیرگاہ بہت مشہور ہے جسے چہار تاکستان یا چہار باغ کہتے ہیں۔

شاہ سلطان حسین کے زمانے میں اصفہان افغانوں اور ترکوں کی تاخت و تاراج کا شکار ہوا، اور جن دنوں افغان شہر کا محاصرہ کیے پڑے تھے یہ حالت ہو گئی کہ لوگ انسان کا گوشت کھانے پر مجبور ہوئے۔ افغانوں نے شہر میں قتلِ عام کا حکم دیا اور اب کے شہر کی ایسی بری حالت ہوئی کہ پرانی عظمت و شوکت حاصل نہ کر سکا۔

علامہ نے اصفہان کا ذکر حسنِ اندازِ بیان کے سلسلے میں کیا ہے۔

یوں تو اصفہان نے بہت سے ایسے شعرا پیدا کیے ہیں جن کے کلام کو مقبولیت نصیب ہوئی ہے اور جس کے اندازِ بیان کے حسن کی نقادوں نے تعریف کی ہے لیکن غالباً علامہ کی مراد صائب اصفہانی کے اندازِ کلام سے ہے۔ وہ اگرچہ اصلاً تبریزی ہے لیکن اس کا والد شاہ عباس کے زمانہ میں اصفہان آگیا تھا اور وہیں صائب ۱۰۱۰ھ میں متولد ہوا۔ اس اعتبار سے اسے اصفہانی کہا جا سکتا ہے۔ شاہ عباس ثانی نے اسے ملک الشعراء کا خطاب دیا تھا۔ صائب نے اور دوسرے ہندی فغانی شعراء میں یہ فرق ہے کہ صائب کے کلام میں محاورہ اور زبان کا وہ لطف اور روزمرہ کی وہ چاشنی موجود ہے جو اہل زبان سے مخصوص ہے۔ وہ بھی شفق کے قول کے مطابق، باریک اندیش مضمون ساز اور نازک کار ہے اور محسناتِ شعری میں مراۃ النظیر اور ارسال المثل کا استعمال بہت صناعانہ طریقہ پر کرتا ہے۔ تاہم روانی اور سادگی کی بدولت اس کا کلام دوسرے معاصر شعراء سے ممیز ہو جاتا ہے۔ تشبیہ تمثیل میں اسے کمال حاصل ہے۔ اگرچہ

اس قسم کی تشبیہ میں منطقی طور پر مغالطہ واقع ہوتا ہے لیکن اندازِ بیان کے حسن میں واقعی اضافہ ہوتا ہے۔[۵]

(۵) **اقرأ:** آیتِ قرآنی کی طرف اشارہ ہے دیکھئے ۹۶/۱-۵ -

ترجمہ یہ ہے:

(اے محمد) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو جس نے (عالم کو) پیدا کیا جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا اس کو علم نہ تھا۔

(۶) **الوقت سیفٌ:** حضرت امام شافعیؒ کا مقولہ۔

علامہ اقبال کے قول کے مطابق "الوقت سیفٌ" حضرت امام شافعی کا مقولہ ہے علامہ نے "اسرار" میں اسی مقولہ کو عنوان قرار دے کر بہت سے مطالب بیان کئے ہیں۔

یوں بھی کہا جاتا ہے کہ امام شافعی نے جو کلمات استعمال کئے تھے وہ یہ تھے "الوقت سیف قاطع" اور یہ کسی صوفی کا قول ہے۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ امام نے وقت کو تلوار ضرور کہا ہے

علامہ اقبال کے تصور زمان و مکان سے علیحدہ بحث ہو چکی ہے لیکن اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ عبدالحکیم نے ترجمانِ اسرار (منظوم ترجمہ "اسرار خودی" از جسٹس ایس اے رحمٰن) میں ان کلمات کی تشریح میں جو کچھ لکھا ہے، وہ نقل کر دیا جائے:

"اسرارِ خودی میں اقبال نے وقت یا ماہیتِ زمان کے مسئلہ کو بہت اہمیت دی ہے۔

۱؎ جغرافیۂ خلافتِ مشرقی۔
شعر العجم (جلد پنجم): شبلی۔
روابطِ ادبی ایران و ہند: علی اکبر شہابی۔
طبقاتِ سلاطینِ اسلام۔
تاریخ ادبیاتِ ایران: شفق۔
ادبیاتِ ایران: براؤن (جلد چہارم)۔

یہ مسئلہ ہمیشہ ایک معرکۃ الآرا، موضوعِ بحث رہا ہے۔ عامۃ الناس اور عام دیندار لوگ اس کو کوئی دینی مسئلہ نہیں سمجھتے لیکن حکمت پسند لوگ اس میں حیران اور سرگرداں رہتے ہیں کہ وقت کیا چیز ہے۔ وقت کو کوئی چیز بھی کہہ سکتے ہیں یا نہیں۔ دنیا میں یا تو اشیاء و اشخاص ہیں اور یا افعال و حوادث۔ وقت نہ کوئی شے ہے نہ کوئی شخص نہ کوئی فعل اور نہ کوئی حادثہ۔ سب کچھ وقت میں واقع ہوتا ہے لیکن وقت خود کوئی واقعہ نہیں۔ فلسفیوں کی زبان میں یوں کہیئے کہ یہ نہ تو جوہر ہے اور نہ عرض۔ ہر قسم کا وجود جن صفات سے متصف ہو کر وجود بنتا ہے ان میں سے کوئی صفت وقت میں نہیں پائی جاتی۔ کیا وقت ازلی و ابدی ہے یا یہ بھی کسی وقت خلق ہوا اگر یہ خود مخلوق ہے تو اس کے خلق ہونے سے قبل بھی تو آخر کوئی زمانہ تھا اور اگر کوئی زمانہ تھا تو وہ بھی زمانہ تھا۔ قرآن کریم کے ظاہری الفاظ یہ کہتے ہیں کہ خدا نے چھ ایام میں زمین و آسمان کو خلق کیا۔ لیکن ہمارے ذہن میں شب و روز اور ایام کا جو تصور ہے وہ تو گردشِ ارض و مہر و ماہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اجرامِ فلکیہ کے خلق ہونے اور ان کی گردشیں مقرر ہونے سے قبل ایام کے کچھ معنی نہیں ہو سکتے اقبال مردِ مومن بھی تھا اور مردِ حکیم بھی۔ یہ ناممکن تھا کہ ایسا اہم مسئلہ اس کے دماغ میں گردش نہ کرتا رہے، اور وہ اس کا حل تلاش کرنے کے لئے مضطرب نہ ہو۔ اپنے انگریزی خطبات میں بھی اقبال نے مسئلہ زمان کو یہ اہمیت دی ہے کہ اس کو مسلمانوں اور انسانوں کے لئے موت و حیات کا سوال قرار دیا ہے۔ یہ مسئلہ اتنا لطیف اور پیچیدہ ہے کہ اس مختصر سے مقدمہ میں اس کے چند اہم پہلوؤں کو واضح کرنا بھی ناممکن ہے۔ کانٹ جیسے حکیم کبیر نے کہا ہے کہ زمان و مکان دونوں فہم انسانی

کے سلنچے ڈھانچے ہیں۔ یہ دو رنگی عینک لگا کر انسان کا فہم آفاق کے مظاہر کو علائق و روابط میں منسلک کرتا ہے زمان و مکان دونوں کا وجود نفسی اور اعتباری ہے۔ ماہیتِ ہستی میں نہ زمان ہے نہ مکان بالفاظِ اقبال:

نہ ہے زماں نہ مکاں لاالٰہ الّا اللہ

اقبال کا خیال بھی کچھ اسی قسم کا تھا چنانچہ پیامِ مشرق کے ایک قطعہ میں فرماتے ہیں:

جہانِ ما کہ پایانے ندارد

چو ماہی در یمِ ایام غرق است

یہ ہماری ناپیدا کنار دنیا، یہ لامتناہی عالم، مچھلی کی طرح وقت کے سمندر میں تیر رہی ہے لیکن یہ وقت کا سمندر ہمارے نفس سے خارج کوئی مستقل حقیقت نہیں بلکہ اس کی یہ کیفیت ہے کہ:

یمِ ایام در یک جام غرق است

وقت کا یہ دریائے بے پایاں نفس کے کوزہ میں سمایا ہوا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اقبال وقت کے مسئلہ کو ایسا اہم کیوں سمجھتا تھا، اس کا جواب یہ ہے کہ وہ زمان کو ماہیت وجود اور عین خودی سمجھتا ہے لیکن یہ زمان شب و روز کا زماں نہیں بلکہ تخلیقی ارتقا کا نام ہے۔ یہ نظریہ زمان وہی ہے جسے برگساں نے بڑے دل نشیں انداز میں اپنے نظریۂ حیات کا اہم جزو بنایا۔ اقبال خود اس نتیجہ پر پہنچا تھا۔ علامہ نے اپنے بعض اہلِ علم دوست احباب سے بیان کیا کہ برگساں کا مطالعہ کرنے سے قبل میں حقیقت زماں کے متعلق آزادانہ طور پر یہ تصور قائم کر چکا تھا اور انگلستان میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں میں نے اس پر ایک

مختصر سا مضمون بھی لکھا جس کو میرے پروفیسر نے کچھ قابلِ اعتنا نہ سمجھا کیونکہ بات بہت انوکھی تھی۔ برگساں کے زورِ فکر اور قوتِ استدلال نے اس میں بہت وسعت اور گہرائی پیدا کر دی لیکن اقبال کے کلام کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اقبال اس مسئلہ میں برگساں سے کچھ کم نہیں۔ اقبال برگساں کا بڑا مداح تھا اور اس کے فلسفہ سے اقبال نے فیض بھی حاصل کیا۔

اس سے اقبال کے کمال پر کوئی دھبہ نہیں لگتا۔ ایسا بارہا ہوا ہے کہ بڑے بڑے سائنٹفک نظریات، فنی ایجادات اور حکیمانہ افکار ایک ہی زمانہ میں ایک سے زیادہ اشخاص کی طبیعتوں میں سے ابھرے۔ اس کے بعد مورخ اس بات پر جھگڑتے رہتے ہیں کہ اولیت کا سہرا کس کے سر ہے۔ کون موجد ہے اور کون نقال لیکن اقبال اور برگساں یا اقبال اور نطشے کے متعلق یہ بحث بے کار ہے۔

شعر میں گہرا اور پیچیدہ فلسفیانہ استدلال تو نہیں ہو سکتا اگر ایسا ہو تو شاعری محض منظوم منطق بن کر رہ جائے اور اپنی فطری تاثیر کو کھو بیٹھے۔ اس لئے "الوقت سیف" کا عنوان قائم کر کے اقبال نے اپنے تصور کے بعض اساسی خطوط کھینچ دئے ہیں ان کی تشریح و تعبیر سمجھنے والوں اور شارحوں کے لئے چھوڑ دی ہے۔ یہ عنوان اقبال نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک قول سے حاصل کیا ہے۔ اس کے تحت میں اقبال نے جو اشعار لکھے ہیں ان کا لب لباب یہ ہے کہ زمان یا دہر کوئی مجرد یا ساکن حقیقت نہیں بلکہ ایک تخلیقی حرکت ہے ایک حدیث قدسی ہے:

"لا تسبوا الدھر فانی انا الدھر"

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ زمانہ کو گالیاں نہ دو کیونکہ میں زمانہ ہوں۔ علامہ اقبال

فرماتے تھے کہ گول میز کانفرنس کے سفر کے دوران میں بر گساں سے ملا کہ اپنے اس ہم فکر اور ہم طبع مفکر سے تبادلہ خیالات کروں۔ دوران ملاقات میں حقیقتِ زماں پر گفتگو ہوئی جو اقبال اور برگساں کا واحد مضمون تھا۔ اقبال کہتے ہیں کہ میں نے برگساں کو بتایا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دہر کے متعلق یہ فرمایا ہے۔ فرماتے تھے کہ برگساں سن کر اچھل پڑا اور اس کی رُوح بے انتہا مسرت سے لبریز ہو گئی کہ ایک نبی علیم کے قلب پر وہی حقیقت وارد ہوئی جسے وہ استدلال اور ذاتی وجدان کی بنا پر دنیا کے سامنے عمر بھر پیش کرتا رہا۔ غرضیکہ اس نظریہ کے مطابق دہر خلّاق ایک شمشیر ہے جو خود اپنا راستہ کاٹتی ہوئی اور مزاحمتوں کو راستے سے ہٹاتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ دہر کی یہ ارتقائی اور خلاقی قوت کبھی کلیم کے اندر کارفرما ہوتی ہے اور کبھی حیدر کرار کے پنجۂ خیبر گیر میں۔ اس زمانِ حقیقی میں دوش و فردا نہیں ہیں، نہ انقلاب روز و شب ہے۔ لوگوں نے زماں کو مکاں پر قیاس کر لیا ہے اور یوں سمجھ لیا ہے کہ ایک لامتناہی لکیر ہے جو ازل سے ابد تک کھینچی ہوئی ہے۔ نافہم انسان وقت کو لیل و نہار کے پیمانوں سے ناپتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس طرح خدا کا وقت ہمارا وقت نہیں اسی طرح خودی میں ڈوب کر زندگی سے آگاہ ہونے اور زندگی کی قوتوں کو وسعت دینے والے انسان کا وقت بھی ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم شدہ کوئی مکانی انداز کی کوئی چیز نہیں۔ خودی کی ماہیت حیاتِ جاوداں ہے۔

تو کہ از اصل زماں آگہ نۂ

از حیاتِ جاوداں آگہ نۂ

زندگی وقت میں نہیں گزرتی بلکہ وقت زندگی کی تخلیقی قوت ہے۔ گردش خورشید

سے پیدا ہونے والا وقت مکانی اور مادی وقت ہے۔ حقیقی وقت کا اس سے کچھ تعلق نہیں لیل کا تسلسل ظلام ہوتا ہے۔ زندگی جب مردہ ہو جاتی ہے تو وہ لیل و نہار کا کفن پہن لیتی ہے اور انسان افسوس کرتا ہے کہ عمر گراں مایہ کے اپنے ایام گزر گئے اور اب گردش ایام مجھے موت کے قریب لے جا رہی ہے

اقبال مسئلہ زماں کو اس لئے اہمیت دیتا ہے کہ اس کے ہاں عبد اور حر کی تمیز کا معیار بھی یہی ہے کہ کوئی روح ایام کی زنجیر سے پا بجولاں ہے یا مکانی وقت سے آزاد ہو کر اور حقیقی زماں میں غوطہ لگا کر تسخیرِ مسلسل اور خلاقی کا شغل رکھتی ہے اقبال کا خیال ہے کہ ازل سے ابد تک بنی بنائی تقدیر کا تصور بھی زماں کے غلط تصور کی پیداوار ہے

عبد را ایام زنجیر است و بس

بر لبِ او حرفِ تقدیر است و بس

ہمتِ حُر با قضا گردد مشیر

حادثات از دست او صورت پذیر

جس انسان کے ہاتھ میں زمانے کی تلوار ہو وہی زندگی کے ممکنات کو نمایاں کر سکتا ہے زمانہ کی ظاہری صورت سے موافقت پیدا کرنے والا پست ہمت زمانہ ساز ہوتا ہے۔ مردِ حر زمانہ ساز نہیں ہوتا بلکہ زمانہ کے ساتھ ستیز کرنے کے لیے آمادہ ہوتا ہے اور اس پیکار میں اس کو کامیابی اسی حالت میں حاصل ہوتی ہے جب کہ حقیقت زماں کی شمشیر اس کے ہاتھ میں ہو[۱]

یاد ایامیکہ سیفِ روزگار ۔ با توانا دستیٔ ما بود یار[۲]

---

[۱] دیکھئے زمان و مکان کے حوالے ۔

[۲] دیباچہ ترجمان اسرار ۔

(۷) **ایران**: آزاد نے صحیح لکھا ہے کہ ایران آریاؤں کا ملک ہے اگرچہ یہ بات ابھی دریافت نہیں ہو سکی کہ آریاؤں کا اصلی ملک کون سا ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ وسط ایشیا سے نکل کر مختلف ملکوں میں پھیل گئے۔ جو لوگ ایران میں بسے وہ ایرانی کہلائے اور خود ایران کا نام بھی آریا ہی سے مشتق ہے۔ آزاد کے قول کے مطابق یونان کی کتب قدیمہ اس ملک کو آریان کہہ کر پکارتی ہیں، آزاد ہی کا قول ہے کہ ایران کے معنی پاک اور پاکیزہ کے بھی ہیں۔ آزاد اگرچہ قریب قریب صحیح نتیجہ پر پہنچے ہیں مگر موجودہ تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ لاطینی زبان میں اور سنسکرت میں "ار" کا لاحقہ اور "ایر" کا سابقہ شریف کے معنی دیتا ہے۔ سنسکرت میں اسی سابقہ سے کلمہ "آریا" برآمد ہوا ہے یہی سابقہ یعنی ار، ایر اور ریر مختلف آریائی زبانوں میں پایا جاتا ہے۔ انگریزی میں آئرلینڈ شرفا کا ملک ہے اور اس کلمہ میں پہلا کلمہ IRE وہی قدیم لاطینی سابقہ "ایر" ہے۔

ایران کو فارس اور پرشیا اس لئے کہتے ہیں کہ اس ملک کے بڑے بڑے دودمان صوبہ پارس ہی کی خاک سے اُٹھے ہیں۔ چنانچہ فارس کے صوبہ کو اتنی اہمیت حاصل ہوگئی کہ فارس یا پرشیا کہتے تھے اور ایران مراد لیتے تھے۔

موجودہ ایران کا رقبہ چھ لاکھ تیس ہزار مربع میل ہے۔ آبادی کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا مگر تخمینہ یہ ہے کہ ایک کروڑ اور ڈیڑھ کروڑ کے درمیان ہے[۱]۔

---

[۱] شبلی: لغتِ ماخذ الفاظ (انگریزی)۔ وائلڈ: لغت (انگریزی)۔
قاموسِ سیاسیات عالم (انگریزی)۔ سخندانِ پارس۔
تاریخِ ادبیاتِ ایران: براؤن (جلد اول)۔

ب

(۱) **بلبل :** بلبل اگرچہ تلمیحی حیثیت نہیں رکھتا لیکن علامہ نے اپنے کلام میں ان اذکار و تصورات کا ذکر کیا ہے جو صرف ایران کی بلبل سے منسوب کئے جا سکتے ہیں، اس لئے اس بات کی وضاحت ضروری سمجھی گئی کہ ایران میں بلبل کسے کہتے ہیں۔

ہندوستان میں ایرانی بلبل کا سرے سے وجود ہی نہیں۔ یہاں خوش نوا جانوروں میں مینا کا نام لیا جاتا ہے۔ ایک جانور البتہ ایسا ہے جسے غلطی سے بلبل سمجھ لیا گیا ہے۔ اس کے سر کا رنگ سیاہی مائل ہوتا ہے اسے ہندوستان کی بلبل کہہ سکتے ہیں۔ اسے کلچڑی بھی کہتے ہیں۔ سودا کہتے ہیں۔

خدا کی شان تو دیکھو کہ کلچڑی گنجی   حضورِ بلبل بستاں کرے نوا سنجی

چڑیل کی تو ہو شکل اور دماغ پریوں کا

ایران کی بلبل بہت خوش رنگ ہوتی ہے۔ اس کے چمکتے ہوئے رنگ رنگ کے پر ان شعروں میں بہار دیتے ہیں جن میں بلبل اور گلاب کے عشق کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہندوستان کی کلچڑی

گلاب پر عاشق نہیں ہوتی۔ ایران کی بلبل واقعی گلاب پر مرتی ہے اور آزاد نے اپنے مخصوص انداز میں اس کی تصویر یوں کھینچی ہے:

اُدھر گلاب کھلا اُدھر بلبلِ ہزار داستان اس کی شاخ پر بیٹھی نظر آئی یہ بلبل نہ فقط پھول کی ٹہنی پر بلکہ گھر گھر درختوں پر بولتی ہے اور چہچہے کرتی ہے اور گلاب کی ٹہنی پر تو یہ عالم ہوتا ہے کہ بولتی ہے، بولتی ہے، بولتی ہے۔ حد سے زیادہ مست ہوتی ہے تو پھول پر منھ رکھ دیتی ہے اور آنکھیں بند کر کے زمزمہ کرتی رہ جاتی ہے۔ تب معلوم ہوتا ہے کہ شاعروں نے جو اس کے اور بہار کے اور گل و لالہ کے مضمون باندھے ہیں وہ کیا ہیں اور کچھ اصلیت رکھتے ہیں یا نہیں۔ وہاں گھروں میں نیم کیکر کے درخت تو ہیں نہیں۔ سیب، ناشپاتی بہی، انگور کے درخت ہیں۔ چاندنی رات میں کسی ٹہنی پر آن بیٹھتی ہے اور اس جوش و خروش سے بولنا شروع کرتی ہے کہ رات کا کالا گنبد پڑا گونجتا ہے۔ وہ بولتی ہے اور اپنے زمزمہ میں تانیں لیتی ہے اور اس زور شور سے بولتی ہے کہ بعض موقع پر جب چہہ چہہ چہہ کر کے جوش و خروش کرتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سینہ پھٹ جائے گا۔ اہلِ درد کے دلوں میں سن کر درد پیدا ہوتا ہے۔ جی بے چین ہو جاتے ہیں۔ میں ایک فصلِ بہار میں اسی ملک میں تھا چاندنی رات میں صحن کے درخت پر آن بیٹھتی تھی اور چہکارتی تھی تو دل پر ایک عالم گزر جاتا تھا کیفیت بیان میں نہیں آسکتی۔ کئی دفعہ یہ نوبت ہوئی کہ میں نے دستک دے دے کر اُڑا دیا۔ یہ موسم دلوں میں جوش پیدا کرتا ہے چنانچہ جب چاندنی رات ہوتی ہے تو چند آشنا ہم طبع ہم نفس زندہ دلی کی اُمنگ میں آکر کہتے ہیں؛ "بیا ئید امشب غنب گل کنیم"

باغ جاتے ہیں۔ رات کو وہیں رہتے ہیں۔ بہار مناتے ہیں اور زندگی کی بہار لوٹتے ہیں۔"

بلبل کے خوش رنگ ہونے سے وہ تمام شعرا آگاہ ہیں جنھیں کلاسیکی علوم و فنون سے واقفیت ہے۔ مثلاً غالب کہتا ہے:

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
جو نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے[۵]

(۲) بنات آشیاں اندریم: علامہ خود لکھتے ہیں:

"سمندر کی تین پریاں جن کو عربی میں بنات البحر کہتے ہیں اور انگریزی میں سائرنز کہتے ہیں۔ ملاحوں کے توہمات کی رو سے ان کا آدھا جسم مچھلی کا ہے اور آدھا انسان کا اور جہاز راں ان کی خوش آوازی سے بے راہ ہو کر غرق ہوتے ہیں۔"

سائرنز کی اصل داستان یہ ہے کہ یہ سمندر کے ایک خاص حصہ میں ساحل کے قریب یا کسی جزیرہ پر میٹھی گیت گاتی تھیں۔ جو ملاح ان کے گیت سنتا تھا وہ دیوانہ ہو جاتا تھا اور ان کی طرف بے اختیار کھنچتا تھا۔ یہاں تک کہ کشتی جزیرہ کی ساحلی چٹانوں سے جا ٹکراتی تھی اور غرق ہو جاتی تھی۔

اوڈیسس کی داستان کی ضمن میں ان کا بھی تذکرہ ہوتا ہے جب ازمنۂ قدیم کا یہ بطل جلیل اس مقام سے گزرا جہاں یہ بنات البحر گا رہی تھیں تو اس نے اپنے ملاحوں کو حکم دیا کہ کانوں میں موم اور روئی ٹھونس لیں۔ اپنے متعلق یہ کہا کہ مجھے جہاز کے مستول سے باندھ دو۔ چنانچہ ادبیات کی تاریخ میں اوڈیسس واحد شخص ہے جس نے بنات البحر کا گانا سنا ہے اور زندہ رہا ہے۔

اس داستان کے خدوخال بعد میں کچھ اس طرح بگڑ گئے کہ اب یہ کہنا دشوار ہے کہ دراصل یہ بنات البحر عورتیں تھیں یا حقیقت یہ تھی کہ ان کا آدھا دھڑ مچھلی کا تھا اور آدھا انسان کا۔ یہ کہنا بھی

۵۔ سخندانِ پارس ۔ فارسی کی مختلف لغات ۔ دیوانِ غالب ۔

بقطع ویقین مشکل ہے کہ ان کی تعداد تین سے زیادہ نہ تھی۔ بعض لغت نویس کہتے ہیں سائرن (Siren) یا بنت البحر سے ایسا جاندار مراد ہے جس کا آدھا دھڑ پرندہ کا ہو اور آدھا انسان کا۔ ان ہی بنات البحر کا تعلق فنونِ لطیفہ کی دیویوں سے بھی ہے اور موسیقی سے ان کا ربط تو ظاہر ہے۔[۵]

(۳) بنارس: ہندوستان کا مشہور شہر ہے جو اپنے معابد کی وجہ سے بہت مشہور رہے۔ دریائے گنگا کے کنارے واقع ہے یہیں وہ متبرک مقام بھی ہے جسے ہندو "ہر کی پوڑی" کہتے ہیں یعنی ہر کی سیڑھی۔ شیخ علی حزیں نے اسی شہر کے متعلق لکھا ہے:

از بنارس نروم معبد عام است اینجا
ہر برہمن پسرِ لچھمن و رام است اینجا

(۴) بو علی قلندر: شیخ شرف الدین بو علی قلندر امام اعظم ابو حنیفہ کی اولاد میں سے تھے ان کے والد ماجد ۶۰۰ھ میں ہندوستان آئے۔ ان کا نکاح سید نعمت اللہ ہمدانی کی ہمشیر بی بی حافظہ جمال سے ہوا۔ یہی خاتون بو علی قلندر کی والدہ ہیں۔

شیخ کی ولادت کا سال ۶۰۵ھ ہے اور مولد پانی پت۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے کمسنی ہی میں علوم معقول و منقول میں کمال حاصل کر لیا لیکن اس سے تسکین نہ ہوئی آخر راہِ تصوف کے سالک ہو گئے۔

علاء الدین خلجی شیخ بو علی کے عقیدت مندوں میں تھا اور چاہتا تھا کہ ان کی خدمت کرے

---

[۵] اسرار و رموز (کیجا) حاشیہ ص۳۱۔ شبلی: لغتِ ماخذ الفاظ۔ واکلٹ: لغت انگریزی
مجلہ سال بھر کی روداد (انگریزی) مرتبہ چارلس ڈکنز مشہور مصنف کا لڑکا، ۱۸۹۵ء جلد اٹھائیس شمارہ نمبر ۶۸۳۔

کلاسیکی لغت:
Men and Gods; Warner,
Twelve Olympians; Seltman,
Men and Demons; Komroff

لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ وہ کوئی نذر قبول نہیں کرتے. آخر خلجی نے امیروں کے مشورہ پر امیر خسرو کو حضرت نظام الدین اولیا کی خدمت میں بھیجا کہ وہ بوعلی کو ترغیب دلائیں کہ وہ خلجی کی نذر قبول فرمالیں. نظام الدین اولیا نے کچھ تامل کے بعد اجازت دی اور آخر امیر خسرو نظام الدین اولیا کا پیغام لے کر بوعلی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی یہ غزل سنائی.

اے کہ گوئی ہیچ سختی درفراق یار نیست

گر امید وصل باشد آں چناں دشوار نیست

بوعلی نے بھی ایک غزل کے کچھ اشعار سنائے. اس کے بعد بادشاہ کی نذر قبول کرلی اور بادشاہ کو خط بھی لکھا.

شیخ بوعلی کا وصال ۷۲۴ھ میں رمضان المبارک کی تیرہ تاریخ کو ہوا. کرنال میں مدفون ہوئے لیکن اقربا نے پوشیدہ طور پر نعش نکال کر پانی پت میں دفن کیا. ان کی تاریخ وفات 'یا شرف الدین ابدالؒ' سے نکلتی ہے.

یہ مسلم ہے کہ پانی پت کے گرد و نواح میں جو مسلمان راجپوت ہیں خود حضرت بوعلی قلندر ہی کی تبلیغ کی بدولت حلقہ ایمانی میں داخل ہوئے.

ان سے حسب ذیل تصانیف منسوب ہیں.

(۱) مکتوبات بنام اختیارالدین

(۲) حکم نامہ شرف الدین

(۳) مثنوی کنزالاسرار

(۴) رسالہ عشقیہ

پہلی تصنیف میں توحید اور متعلقہ مسائل پر بہت تفصیل سے بحث کی گئی ہے.

مولانا عبدالحق محدث دہلوی کا خیال ہے کہ حکم نامہ شرف الدین ایک مجعول تصنیف ہے مثنوی کنز الاسرار ہیں اور رسالہ عشقیہ میں عرفان و اخلاق کے بہت سے مسائل دلپذیر انداز میں بیان کیے گئے ہیں. کنز الاسرار تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کمیاب ہے لیکن رسالہ عشقیہ ملتا ہے اور اس میں عشق کے متعلق کم و بیش ایسے ہی خیالات کا اظہار ملتا ہے جیسا کہ مولانائے روم نے اپنی مثنوی میں کیا ہے. عشق کے متعلق یہ اسلوبِ بیان علامہ کو بہت پسند آیا ہے کیونکہ بوعلی بھی اسی بات کے قائل ہیں کہ عشق ماورائے عقل ہے اور جب تک عقل زائل نہ ہو تب تک بصیرت اور چشمِ بینا حاصل نہیں ہوتی۔ بوعلی کہتے ہیں:

عشق کو تا تاج سلطانی نہند
عشق کو تا ملک سلیمانی دہد
عشق کو تا چشمِ دل بینا کند
عشق کو تا سینہ پر سودا کند
عشق کو تا عقل را زائل کند
عشق کو تا عقل را حاصل کند

آخری شعر سے معلوم ہوگا کہ اقبال کی طرح شیخ بوعلی بھی عقل کی دو سطحیں پہچانتے ہیں ایک عقل جزئی جو ادراک و حواس پر بھروسہ کرتی ہے اور ایک بصیرت. تو عشق پہلی عقل کو زائل کرتا ہے اور دوسری عقل کو حاصل کرتا ہے۔ علامہ نے بھی عقل کی ان سطحوں کے متعلق بہت دلپذیر اشعار لکھے ہیں[1]۔

---

[1] بزم صوفیاء: سید صباح الدین عبدالرحمن۔ قرآن اور تصوف: ڈاکٹر میر ولی الدین۔
فلسفۂ عجم یا مابعد الطبیعیات ایران پر علامہ اقبال کا مقالہ۔

پ

(۱) **پہلوی (حرف پہلوی)**: اس مشہور شعر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے

مثنوی مولوی معنوی

ہست قرآن در زبانِ پہلوی

یہاں پہلوی سے مراد "جدید" فارسی ہے یعنی اصطلاحاً وہ فارسی جو عربوں کی تسخیر ایران کے بعد، وجود میں آئی۔ اس فارسی کو پہلوی کہنے کی وجوہ بہت دلچسپ ہیں (پیام مشرق کی تلمیحات کے سلسلے میں اس کلمے سے بحث ہو چکی ہے۔ زرتشت کے ماتحت "ہزوارش" بھی دیکھیے)

مولانا روم نے مثنوی میں، قرآن مجید کے دقائق و رموز بیان کیے ہیں اور ایسی شگفتہ زبان اور ایسے دلپذیر انداز میں بیان کیے ہیں کہ ان کی مثنوی کو قرآن بہ زبان پہلوی کہا جاتا ہے۔

ت

(۱) تاجدارِ ملک لایبلیٰ شوی: علامہ لکھتے ہیں:

"ملک لایبلیٰ یعنی وہ ملک جو زمانہ کی دستبرد سے ہمیشہ محفوظ رہے"۔

نیابت الٰہی کے متعلق جو اشعار علامہ نے سپردِ قلم کئے ہیں اسی سلسلہ میں یہ مصرعہ بھی لکھا گیا ہے۔ اس سے پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ علامہ صرف اسی چیز کو امت محمدیہ کے لئے مفید تصوّر کرتے ہیں جو عمل کی قوتوں کو بیدار کرے اور انسان کو یہ سکھائے کہ اسے تسخیر کائنات کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں علامہ یہاں تک کہتے ہیں کہ فنونِ لطیفہ بھی وہی مفید ہیں جو تسخیرِ کائنات میں ممد ہوں ورنہ مردود اور نامقبول ہیں۔ نیابت الٰہی کے مقام تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنی تمام ممکنات جسم وجان سے کام لے۔ اگر نظام ایسا قائم ہو جو اللہ کے احکام کے خلاف ہے تو اسے درہم برہم کرکے ایک نیا نظام قائم کرے یہ نکتہ علامہ کے کلام کا مرکزی خیال ہے اور ان کی ہر تصنیف میں بار بار بڑے دلپذیر پیرایہ میں

اس کی توضیح کی گئی ہے مثلاً:

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے
مرے گلو میں ہے اک نغمہ جبرئیل آشوب
سنبھال کر جسے رکھا ہے لامکاں کے لئے

کتاب و شعر و سیاست، سرود و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسوں و افسانہ

گفتند جہان ما آیا بتو می سازد
گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

طرح نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم
این چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی
من ہیچ نمی ترسم از حادثۂ شب ہا
شب ہا کہ سحر گردد از گردشِ کوکب ہا

اس سلسلہ میں صاحبِ اخلاق جلالی نے بھی بہت عالی منزلت افکار کا بیان کیا ہے اور ان کی نیابت الٰہی کی بحث بھی پڑھنے کے قابل ہے۔[۵]

۵۔ سیاست نامہ: نظام الملک۔ اخلاقِ جلالی: جلال الدین دوانی۔ اخلاق ناصری: نصیر الدین طوسی

اخلاق محسنی: حسین واعظ کاشفی۔ لی کاک کی انگریزی کتاب سیاسیات پر۔

گلکرائسٹ کی کتاب علم السیاست پر۔ تاریخ فلسفہ: ڈیورانٹ۔

(۳) تخییل: تخییل کی تعریف، توجیہ و تشریح بہت دشوار ہے لیکن یہ کلمہ ہر بڑے شاعر
کی طرح علامہ کے کلام میں بھی بار بار آتا ہے۔ اس لئے اس کے صحیح معانی سے واقف ہونا لازمی
ہے اس میں ایسے اشارات مخفی ہیں کہ اسے تلمیح کی حیثیت عطا کر دیتے ہیں۔ تخییل کی حقیقت سمجھنے
سے پہلے اس بات پر غور کر لینا چاہئے کہ خدا نے انسان کو یہ قدرت بخشی ہے کہ حسی مہیجات
یا حواسِ خمسہ کے عمل فرما ہونے کے بغیر کسی چیز کا تصور کر سکے یا اس کی صورت ذہن میں
قائم کر سکے۔ انگریزی میں محاورہ ہے: "دل کی آنکھوں سے دیکھنا یا ذہن کی آنکھوں سے دیکھنا
اب تخییل میں یہ ہوتا ہے کہ گزرے ہوئے تجارب ادراک ذہن میں تصویریں بناتے ہیں یا اشیا
کا تصور پیدا کرتے ہیں۔ یہ تصویریں فکری سطح پر بنتی ہیں تو ہوتا یہ ہے کہ فکر انسانی اپنے گزشتہ
تجربات کو استعمال کر کے ایک نئی چیز تعمیر کرتا ہے جس کی بنا وہی تجربات حسی ہوتے ہیں جن کا
اوپر ذکر ہوا۔ اس نئی چیز کی بنیاد اگرچہ گزشتہ تجربات پر رکھی جاتی ہے لیکن یہ نہیں ہوتا کہ
نئی تعمیر فکری میں صرف گزشتہ تجربات کا احیاء ہو جائے۔

گزشتہ تجربات کو جو ادراک پر مبنی ہیں مواد کی طرح استعمال کر کے فکری سطح پر جب انسان
نئی چیز تعمیر کرتا ہے تو وہ دراصل اپنی قوتِ متخیلہ سے کام لیتا ہے۔ یہ تعمیر فکری یا تخلیق ہوگی
یا کسی کی نقل۔ نقل کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ذہن انسانی کسی اور کی تعمیر فکری کے مطابق تصور
سے کام لیتا ہے لیکن جب تخییل سے تخلیق کا کام لیا جاتا ہے تو دو شرطیں ضروری ہوتی ہیں ایک تو
یہ کہ اس عمل کا محرک خود خلاق کی ذات ہو اور دوسرے یہ کہ خلاق کی ذات ہی گزشتہ تجربات کے
مواد سے کام لے کر تصورات کی تعمیر کرے۔

یہ سوال کہ کیا انسان کے ذہن میں ایسے تصورات آ سکتے ہیں جن کا مبدا کوئی حسی تجربہ
نہ ہو ہمیشہ متنازعہ فیہ رہا ہے۔ صاحب لغت فلسفہ کا خیال ہے کہ اس بات کی شہادت موجود ہے

کہ ایسے تصورات انسان کے ذہن میں آتے ہیں ان کو وہ Imageless Thought کہتا۔

(۳) **تشکک**: یہاں علامہ کا اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ مولانائے روم جہاں اشراق کا درس دیتے تھے وہاں تشکک کے رموز سے بخوبی آگاہ تھے۔

تشکک ایک طریقِ فکر بھی ہے اور ایک طریقِ کار بھی۔ اخلاقی اقدار سے بھی اس کا تعلق ہے۔ ایک خاص رجحانِ ذہنی بھی اس سے عبارت ہوتا ہے۔ ان تمام معانی کو تفصیل سے بیان کرنا تو ناممکن ہے اجمالاً تشکک کے اہم ترین پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

۱۔ تشکک کے ایک معانی تو یہ ہیں کہ مفکر دعویٰ کرے کہ علمِ انسانی محدود ہے یا یہ کہ جو علم ہمیں حاصل ہوتا ہے وہ قابلِ اعتماد نہیں یا ماہیتِ اشیا کا علم ہمیں حاصل ہو ہی نہیں سکتا یا یہ کہ بعض تعقلات و تصورات کے متعلق ہمیں کسی طرح یقینی علم حاصل نہیں ہوتا مثلاً استدلال استخراج، مشاہدہ، تجربہ شعور اور کشف اس قابل نہیں کہ وہ کائنات کی ماہیت دریافت کرنے میں معاون بن سکیں۔ ان چیزوں کے متعلق ہمیں خود نفسِ انسانی، خارجی دنیا اور اقدار کے متعلق مستند معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔

۲۔ تشکک ایک طریقِ فکر کی حیثیت سے: اس اعتبار سے تشکک کے یہ معنی ہیں کہ طالب علم اپنے تمام دعووں کو برابر عقل اور مشاہدہ کی کسوٹی پر پرکھتا رہے۔ یہاں تک کہ وہ ایمانداری سے کہہ سکے کہ اب علم کا وہ مقام حاصل ہوگیا ہے جسے قطعی اور یقینی کہتے ہیں۔ جو لوگ مدعی ہیں کہ علم کا ہر ذریعہ کسی نہ کسی مرحلہ پر دلیل کے بغیر کسی مفروضہ کو تسلیم کرتا ہے انھیں بھی تشکیک کا قائل کہا جاتا ہے۔

لہ لغتِ نفسیات (انگریزی)، ڈریور۔ — شعر العجم جلد چہارم۔

تحلیل تخلیقی (انگریزی)۔ — لغتِ فلسفہ (انگریزی)، رونز۔

۳۔ تشکیک سے یہ بھی مراد ہوتی ہے کہ اخلاق انفرادی رجحان اور پسندیدگی پر مبنی ہوتے ہیں۔ ازلی اور ابدی اقدار کا کوئی وجود نہیں یا یہ کہ تمام اقدار زمان و مکان اور ماحول کی نسبت سے اضافی ہوتی ہیں۔

۴۔ وہ لوگ بھی تشکیک کے معتقد کہلاتے ہیں جن کا رجحان یہ ہوتا ہے کہ کسی حقیقت پر ایمان لانے سے پہلے اچھی طرح دیکھ لیا جائے کہ علم کے جن ذریعوں سے کام لیا گیا ہے وہ قابلِ اعتماد تھے یا نہیں۔ اسی مرحلہ پر یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ وہ لوگ بھی مشککین کے گروہ میں داخل ہیں جن کا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا میں خلوص اور دیانتداری کا کوئی وجود نہیں۔ انسان کے تمام افعال خود غرضی پر مبنی ہیں لیکن جب ان مشککین کا عقیدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان کی تمام کاوشیں بے معنی اور بے ثمر ہیں تو تشکیک اور کلبیت (Cynicism) کے ڈانڈے مل جاتے ہیں۔

لہ لغت فلسفہ (انگریزی) رونز۔

ج

(۱) **جوع الارض:** علامہ خود حاشیہ میں لکھتے ہیں "تسخیرِ ممالک" مقام یہ ہے کہ علامہ فرما رہے ہیں کہ اگر جہاد کا مقصد جوع الارض ہو تو وہ اسلام میں حرام ہے۔

جوع الارض نے عمل اور تصور کی بہت سی منزلیں طے کی ہیں۔ ابتدا میں تو غالباً یہی ہوتا ہوگا (بلکہ تاریخی شواہد اس بات کے موجود ہیں کہ ہوتا تھا) کہ کسی قبیلے کے سردار نے اپنی جسمانی طاقت کے بل پر دوسرے قبیلے کے فرماں روا کو مسخر کر لیا یا زیر کر لیا اور یوں دوسرے قبیلے کا حاکم بھی یہی فاتح قرار پایا۔ جوں جوں انسانوں کی آبادی کرۂ ارض پر بڑھتی گئی اور صحیح معنی میں ریاستیں اور مملکتیں عالمِ وجود میں آئیں توں توں تسخیرِ ممالک کے طریقوں میں بھی تغیر رونما ہوتا گیا۔ زمانۂ قدیم کی بڑی بڑی سلطنتوں کے سربراہ مثلاً فراعنۂ مصر اور شاہنشاہان ایران۔ فرماں روایانِ بابل تو ہمسایہ سلطنتوں کے وجود کو ہمیشہ اپنے لئے خطرناک تصور کرتے تھے اور ان کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ اپنی مقبوضات کا دائرہ جہاں تک ہو وسیع کر لیا جائے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ تجارتی ضروریات

یا تمدنی تقاضے لڑائی کی بنیاد بن جاتے تھے یونان اور ایران کی لڑائیاں اسی قبیل کی ہیں۔ بتدریج مذہب بھی سیاست میں ایک فعال عنصر کی حیثیت سے دخیل ہوگیا۔ فرماں روا، امرا اور پیشوایانِ مذہب کی مدد سے رعایا کو محکوم رکھتے تھے۔ آہستہ آہستہ مذہبی پیشواؤں نے اپنا اقتدار بڑھانے کے لئے چھوٹے چھوٹے مذہبی اختلافات کو بھی خوفناک لڑائیوں میں تبدیل کر دیا۔ صلیبی لڑائیوں کی رمز تو سمجھ میں آسکتی ہے کہ عیسائی مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے خوفزدہ تھے لیکن کیتھالک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کے مذہبی اختلافات پر جو لڑائیاں ہوئی ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ جزئی معاملات میں تعصب کیا گل کھلاتا ہے۔

بہرحال ازمنۂ قدیم میں جوع الارض یا تسخیر ممالک کی صورت یہ تھی کہ ایک طاقتور بادشاہ نے دوسرا ملک فتح کر لیا۔ وہاں کے لوگ مغلوب ہونے کے بعد اس کی رعایا بن گئے اور قصہ ختم ہوگیا۔ وقت کی رفتار نے جوع الارض کی رفتار اور اسلوب کو بھی متاثر کیا۔ ازمنۂ وسطیٰ کے آغاز ہی سے فرماں رواؤں پر یہ بات روشن ہوچکی تھی کہ محض مقبوضات کی وسعت کوئی معنی نہیں رکھتی جب تک نئے تسخیر شدہ ممالک سے اقتصادی فائدہ نہ اٹھایا جائے۔ مغرب کی بڑی بڑی طاقتوں نے جب مشرق کے مختلف خطوں کو فتح کیا تو اصلی مقصد مقبوضات میں وسعت کرنا نہ تھا بلکہ یہ تھا کہ مفتوح ممالک کے ذرائع دولت سے یوں فائدہ اٹھایا جائے کہ تقسیمِ دولت میں فاتح شریکِ غالب کی حیثیت رکھتے ہوں۔

بیسویں صدی کے آغاز میں جب تعلیم عام ہوگئی اور لوگوں کا سیاسی شعور بیدار ہوگیا تو تسخیر ممالک عملاً ناممکن ہوگئی۔ اب ایسے قوانین وضع کئے گئے کہ مفتوح قوموں کو اس بات کا شعور دلایا جائے کہ وہ حکومت کرنے کے نااہل ہیں لیکن بتدریج فاتح انہیں اس منزل کی طرف لے جا رہے ہیں جب وہ خود اپنے ملک پر حکومت کر سکیں گے۔ مغرب کی تمام نوآبادیات کی

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ نوآبادیوں کے ذرائع دولت سے اور وہاں کی پیداوار سے فاتحین نے پورا پورا فائدہ اٹھا اور بتدریج مفتوح ممالک کے لوگوں کو اقتصادی طور پر کھوکھلا کردیا۔

جب پہلی جنگ عظیم لڑی گئی تو اس کے فوراً بعد اشتراکیت کا نظریہ مقبول ہونے لگا اور اب بڑی بڑی سلطنتیں ٹھنڈی نظریاتی جنگ لڑنے لگیں پہلی جنگ عظیم سے لے کر دوسری جنگ عظیم تک دنیا ایک بحران میں مبتلا رہی۔ دوسری جنگ عظیم نے بڑی بڑی سلطنتوں کو کمزور کردیا۔ فرمانروا معزول ہوگئے۔ توازن قوت درہم برہم ہوگیا۔ ادھر لوگوں میں سیاسی شعور اور زیادہ بیدار ہوا ذرائع نقل و حرکت کی سہولتوں کی وجہ سے افکار و تصورات کو گویا پر لگ گئے۔ سائنس کے نئے انکشافات نے مستقبل کی جنگوں کے متعلق نوع انسانی کو سخت اضطراب کے عالم میں مبتلا کردیا۔ نظریاتی جنگ تیز تر ہوگئی اور نتیجتاً جوع الارض یا تسخیر ممالک نے ایک نیا روپ دھارا۔اب صورت یہ ہے کہ بڑی بڑی سلطنتیں چھوٹی سلطنتوں کو مالی مدد دے کر انھیں اپنا حلیف بنالیتی ہیں اور جہاں رائے شماری کی ضرورت ہوتی ہے وہاں یہ سیاسی گٹھ جوڑ کام آتا ہے۔آج کل تسخیر ممالک سے مراد یہ نہیں ہے کہ کوئی فرماں روا کسی خطہ زمین پر اپنی تسخیر کا جھنڈا گاڑ دے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ پسماندہ ملک یا کمزور سلطنتیں مجبور ہو جائیں کہ بڑی سلطنتوں سے مدد لیں۔ ان کے افکار و تصورات سے متاثر ہوں اور ان کی تہذیب و مدنیت کو معراج انسانیت تصور کریں۔

آج کل دنیا کے دو تین ممالک بڑے بڑے گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ ان گروہوں میں جو نظریاتی اختلاف ہے وہ تہذیب اور ثقافت کی تحریکات میں بھی عمل پیرا نظر آتا ہے۔ آج کل تسخیر ممالک یہ ہے کہ جو سلطنتیں جمہوریت کی کسی صورت پر سیاسی ایمان لے آئی ہیں وہ زیادہ سے زیادہ ایسے حلیف بنائیں جو سیاسی مسلک میں ان کے ہم نوا ہوں۔ دوسری طرف اشتراکیت کے حامی ایک معیاری جنت ارضی کا نقشہ پیش کر کے جمہوری اقدار اور جمہوری اسلوب حکومت کے

خلاف نبرد آزما ہیں۔ بہرحال علامہ یہ فرماتے ہیں کہ اگر تسخیرِ ممالک کا مقصد یہ ہو کہ ایک ایسا نظام حیات قائم کیا جائے۔ جو احکام الٰہی کا پابند نہیں وہاں تسخیر کی ہر کوشش حرام ہے۔ یہاں تک کہ جہاد بھی اسی وقت تک جہاد ہے جس حد تک وہ رضائے الٰہی کے تابع ہو انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر حق جنگ کی غرض ہے تو لڑائی اچھی ہے لیکن اگر باطل کا اثبات مقصود ہے تو صلح بھی شر ہی کا ایک روپ ہے۔

مغرب نے استعمار کے جو طریقے اختیار کئے تھے ان کی ناکامی اس بات میں مضمر تھی کہ مغربی طاقتیں اثبات حق نہیں چاہتی تھیں چنانچہ جب اٹلی نے ابی سینیا پر حملہ کیا ہے اور جمہوریت کی حامی مغربی اقوام نے نجاشی کی مدد نہیں کی تو علامہ اقبال نے صاف کہہ دیا تھا کہ :

یورپ کے کرگسوں کو ابھی تک نہیں خبر ہے کتنی زہرناک ابی سینیا کی لاش

"ضربِ کلیم" میں تو خیر علامہ نے بڑی کھری کھری باتیں کی ہیں۔ بانگ درا میں بھی انھوں نے مغرب کی جوع الارض اور استعمار کے خلاف احتجاج کیا تھا اور یہ پیش گوئی کی تھی کہ آخر پس ماندہ اور محکوم اقوام مغرب کے پھندے سے نکل آئیں گی۔ یہ پیش گوئی ان کی زندگی ہی میں پوری ہوئی بانگ درا میں علامہ نے کہا :

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکان نہیں ہے — کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
سفینۂ برگ گل بنائے گا قافلہ مورِ ناتواں کا — ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا

پھر بال جبریل میں کہا :

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے — ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے
ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ — کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ
گیا دورِ سرمایہ داری گیا — تماشا دکھا کر مداری گیا

۱۔ قاموس سیاسیات عالم۔ ۲۔ مکتوبات اقبال یا اقبالنامہ۔ ۳۔ تاریخ ایران (جلد اول) سائکس ایران بعہدِ ساسانیاں۔ گلکرائسٹ کی کتاب علم السیاست بھی۔

چ

(۱) چین و چین سے ایران کے ثقافتی تعلقات بہت پرانے ہیں ہخا منشیوں کے زمانہ سے ساسانیوں کے عہدِ حکومت تک تجارتی کارواں دونوں ملکوں سے آتے جاتے تھے۔

مانی (ایران قدیم کا مدعیٔ نبوت اور اردو ادبیات کا بے نظیر مصور) کے بیرو تورخان سے ہوتے ہوئے آخر کار چین پہنچے اور یہ مسلّم ہے کہ طلا کا خوبصورت کام جو مغلوں کی مصوری میں نظر آتا ہے مانوی فن کاروں کا مرہونِ منت ہے۔

مانی کی کتاب ارژنگ مشہور ہے اور اردو ادبیات اور فارسی کلاسیکی ادب میں اسے ارژنگِ چیں بھی کہتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ تصاویر کا مجموعہ تھی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مانوی فرقے کے فن کاروں کا اثر چین پر کتنا گہرا ہوا تھا۔

جب منگولوں نے چین کو مسخر کیا تو بہت سے مسلمان چین میں آباد ہو گئے پہلی جنگ عظیم سے پہلے ان کی تعداد کئی کروڑ تھی۔ منگولوں ہی کے عہد حکومت میں چینی مصوری کا اثر نمایاں

ہوا۔ خطوط کی نزاکت اور نوک پلک میں چینی مصور بے نظیر تھے۔ ایران کا مشہور مصوّر رضا عباسی چینی دبستان سے متاثر ہے اور ہندوستان میں مغلوں کے عہد میں جو مصوری کے شہکار تیار ہوئے ہیں ان پر بھی چینی مصوری اثر دکھائی دیتا ہے۔

مولانا روم نے مثنوی میں بار بار چینیوں کی مصوری کا ذکر کیا ہے اور ایسی حکایات لکھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مصوری میں چینی شہرۂ آفاق تھے ملحوظ خاطر رہے کہ منگول چین کو اپنی زبان میں خطا کہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی ادب میں خطا، ختن اور تاتار کا ذکر اس طرح کیا جاتا ہے جیسے ہمسایہ ممالک ہیں۔ سعدی کا مصرعہ ہے:

از خطا تا کش نبا شد وا ز تتار

اردو ادبیات میں چینی مصوری "بت چین" کی شکل میں ابھی تک جلوہ گر ہے۔ قائم چاندپوری کا شعر ہے:

نہ دوم دم ہو کیوں میرا خوش کہ وہ بت چیں ‏ یہ کہہ گیا ہے کہ آؤں گا آج میں سر شام

شبلی اس بات کا بھی ذکر کرتا ہے کہ ظروف چینی انگلستان میں ایران کے ذریعہ پہنچے ہیں۔

اُن دنوں جمہوریہ چین کا رقبہ چونتیس لاکھ مربع میل ہے اور آبادی پینتالیس کروڑ ہے چین اندرونی (جو درحقیقت چین سے عبارت ہے) کا رقبہ ستائیس لاکھ مربعہ میل ہے اور آبادی چالیس کروڑ ہے۔[۵]

---

[۵] قاموس سیاسیاتِ عالم (انگریزی)۔

تاریخِ ایران، جلد ثلثہ رازی۔

ایران بعہدِ ساسانیان۔

اسلام اور مصوری (انگریزی) آرنلڈ۔

ہندوستانی آرٹ (انگریزی)، ہیول۔

لغت مأخذ الفاظ (انگریزی) شبلی۔

تاریخِ ادبیاتِ ایران، براؤن (جلد اول)۔

غیاث اللغات۔

تاریخ عالم اسلامی (انگریزی)، ہیملٹن۔

فرہنگ آنندراج۔

خ

(۱) خاضعین : قرآن کی آیات کی طرف تلمیح ہے۔ دیکھئے ۲۶/۶-۲

ترجمہ یہ ہے:

یہ کتاب روشن کی آیات ہیں۔ (اے پیغمبر) شاید تم اس (رنج) سے کہ لوگ ایمان نہیں لاتے اپنے تئیں ہلاک کردو گے۔ اگر ہم چاہیں تو ان پر آسمان سے نشانی اتار دیں۔ پھر ان کی گردنیں اس کے آگے جھک جائیں اور ان کے پاس (خدائے) رحمٰن کی طرف سے کوئی نصیحت نہیں آتی مگر اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ سو یہ تو جھٹلا چکے۔ اب ان کو اس چیز کی حقیقت معلوم ہوگی جس کی ہنسی اڑاتے تھے۔

(۲) ختن : لی اسٹرینج دریائے سیحون کے صوبوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مقدسی نے اوزکند سے ترکوں کے ملک میں اور چین کی سرحد تک پہنچنے والی سڑک کا ذکر بھی کیا ہے۔ مقدسی کے اس بیان کو سمجھنا بھی مشکل ہے لیکن ابن خورداذبہ اور مقدامہ کی طرح سڑک کلاآخری

پڑاؤ نوشجان یا برسخانِ بالا بیان کیا گیا ہے جو ختن کے مطابق سمجھا جاتا ہے۔ ختن سے چین جو راستہ جاتا تھا اس کا ذکر اکثر سیاحوں نے کیا ہے۔ غالباً شاہرخ نے نویں صدی ہجری میں جو سفارت چین بھیجی ہے۔ وہ اسی راستہ گئی ہے۔ اس سفارت کا قائد عبدالرزاق تھا جو ہندوستان بھی آیا ہے اور اس نے اس سفر کے حالات بڑی تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ اس کی تصنیف کا نام مطلع السعدین ہے عبدالرزاق نے وجے نگر کی سلطنت کے حالات نسبتاً زیادہ تفصیل سے لکھے ہیں اور غالباً بعد کی تمام تاریخوں کا ماخذ یہی کتاب ہے۔ واضح رہے کہ منگولی زبان میں خطا چین کو کہتے تھے انگریزی CATHAY اور ختن چین کی شاہراہ پر ایک نہایت اہم پڑاؤ تھا۔ یہاں کا مشک نافہ بھی مشہور رہے اور حسین لوگ بھی[1]۔

(۳) خوانسار (خانسار) خانسار کے پہاڑی سلسلے دریائے قم اور دریائے اصفہان کے بالائی کنارے والے معاون دریاؤں کے درمیان ایسے مرتفع مقامات ہیں جہاں سے تمام ندیاں نکل کر نیچے بہتی ہیں خانسا گاؤں جس کے نام سے یہ علاقہ موسوم تھا۔ یاقوت کی تحریر کے مطابق ... قریب ہی واقع ہے"۔

علامہ نے خوانسار کا ذکر جو اصفہان کے ساتھ کیا ہے اور ساتھ ہی اصفہان کا ذکر بھی کیا ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مختلف دبستانوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ خوانسار صوبہ جبال یا عراق عجم میں واقع ہے اور اسی صوبہ سے ایرانی شعر کا وہ دبستان منسوب ہے جس کے علمبردار نظامی، انوری اور خاقانی ہیں۔ ان کے ہاں بھی حسن بیان کا انداز عجیب کیفیت رکھتا ہے بلکہ بعض مغربی نقاد تو یہ کہتے ہیں کہ ان کے ہاں حسن بیان اصل ہے اور مطلب اور معانی کو ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ یہ بات بالبداہت غلط ہے کہ خاقانی اور نظامی کے ہاں مطالب دقیق اور

---

[1] تاریخ مفصل ایران: عباس اقبال۔ جغرافیہ خلافت مشرقی: لی اسٹرینج (صفحات ۵۹، ۵۸)۔
تاریخ ادبیات ایران: شفق۔ قصائد انوری۔
مطلع السعدین تالیف عبدالرزاق۔

معانی بلند کی کمی نہیں ہاں یہ اور بات ہے کہ موسیقی اور ترنم کے اعتبار سے بھی نظامی کا فارسی شعراء میں کوئی حریف نہیں۔ خاقانی اگرچہ اپنی مشکل گوئی کے لئے مشہور ہے لیکن اس کے ہاں جیسیوں قصیدے ہیں، جو مطالب بلند پر بھی مشتمل ہیں۔ بہرحال یہاں علامہ فارسی کے عراقی دبستان کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔[۱]

(۴) خود فرود آ از شترِ مثلِ عمرؓ

خود علامہ اسرار ہی میں لکھتے ہیں کہ:

بحالتِ سواری اشتر جناب فاروقؓ کا تازیانہ ہاتھ سے گر گیا تو اسے زمین پر سے اٹھانے کے لئے آپ خود اونٹ سے اُترے اور اس معمولی کام کے لئے بھی کسی کا احسان گوارا نہ فرمایا۔ اس شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔"

دیکھئے اسرار و رموز مبارک علی ۱۹۴۸ء

۱۔ دیکھئے حوالے اصفہان کے۔ گنجینۂ گنجوی: مرتبہ وحید دستگردی۔

دیوانِ خاقانی: مرتبہ علی عبد الرسولی۔ خاقانی پر مختلف مضامین مطبوعہ مجلہ اقبال لاہور۔

د

(۱) دروازۂ شہر علوم: حدیث نبوی کی طرف اشارہ ہے:

انا مدینۃ العلم وعلیؑ بابہا

یعنی میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہاں علم سے مراد بصیرت ہے منطق اور فلسفہ نہیں۔ اسی بصیرت سے کام لے کر حضرت علی نے بعض معرکہ کے فقہی اصول مدون کیے گویا ان کا تفقہ ان کی بصیرت ہی کا نتیجہ تھا۔

(۲) دری: آزاد کی تحقیقات کے مطابق:

"دری کسی زمانہ میں دربار کی زبان تھی اس لئے اسے دری کہتے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ درّہ کوہ کے لوگوں کی زبان تھی اور اس کی اصلیت میں فصاحت شہر کی ترمیم نے عمل نہیں کیا تھا۔ جس طرح کبک دری کہتے ہو اسی طرح دری سمجھو۔ بندۂ آزاد کہتا ہے شیخ بوعلی سینا نے حکمت فارسیہ کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ میں اس کو دری فارسی میں

لکھتا ہوں۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ جس فارسی کو دربار نے شستہ و رفتہ کرکے محاورہ کا سکہ لگایا ہو وہی دری زبان ہے اور نظامی کے اشعار جا بجا اس کی تائید کرتے ہیں:

نظامی کہ نظم دری کار اوست

دری نظم کردن سزاوار اوست"

آزاد نے کچھ الفاظ بھی دئے ہیں مثلاً:۔

عام زبان	دری	عام زبان	دری
سپند	اسپند	شتر	اشتر
شکم	اشکم	رو	برو
دو	برو		

ملک الشعرا بہار کی تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ فارسی دری پہلوی کی شستہ اور مہذب صورت ہے انھوں نے پہلوی اور دری الفاظ کی ایک طویل فہرست دی ہے

پہلوی	دری	پہلوی	دری
ایسم	ہیزم	اوش	ہوش
تشہ	تیشہ	نپشتک	نوشتہ
پتیام	پیغام	تاپ	تاب
افراسیاک	افراسیاب		

ان کا خیال ہے کہ فارسی زبان میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں ان کی صورت یہ ہے کہ پہلے اوستا نے پہلوی کی شکل اختیار کی ہے پھر پہلوی دری کے قالب میں اتری ہے البتہ

تبدیل کلمات کے جو اصول پہلوی میں تھے وہ کم و بیش دری میں بھی قائم رہے۔ علاوہ ازیں عربوں کی تسخیر ایران کے بعد فارسی زبان میں تازہ الفاظ اور کلمات داخل ہو گئے انھیں بھی دری شمار کرنا چاہیے۔ یہ کلمات کچھ تو وہ ہیں جن کا بدل پہلے فارسی میں موجود نہ تھا اور کچھ وہ جو دری کلمات سے زیادہ مقبول ہو گئے۔ علاوہ ازیں عربی الفاظ کی آمیزش سے پہلوی کی صورت بدل گئی جسے آج کل فارسی جدید کہتے ہیں وہ دراصل فارسی دری ہے۔ اس زبان میں ادبی شعور چوتھی صدی کے شروع میں پیدا ہوا۔ دری کے بڑے بڑے مرکز فرغانہ، سغد اور خراسان تھے اور یہیں سے یہ زبان دوسرے حصوں میں پھیلی اور فارسی کہلائی۔ علامہ کی مراد دری سے آج کل کی شستہ اور مہذب فارسی ہے۔[5]

---

[1] سخندان فارس: آزاد۔

سبک شناسی: ملک الشعراء بہار۔

جلال ہمائی: تاریخ ادبیات ایران۔

براؤن: تاریخ ادبیات ایران (جلد اول)۔

سائیکس: تاریخ ایران (جلد اول)۔

ایران باستان: حسن پیرنیا (جلد اول)۔

ز

(۱) **زرتشت**: زرتشت ایرانِ قدیم کا پیغمبر جس کا مسلک اصطلاح میں مزدیسنا کہلاتا ہے۔ فارسی میں مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ یہ نام دراصل ایک ہی کلمہ کی مختلف شکلیں ہیں۔ مثلاً فردوسی نے اسے زردشت کہہ کر بھی یاد کیا ہے۔ دقیقی اسے زردہشت کہتا ہے اور زرتہشت بھی کہتا ہے۔ اس کی مشہور غزل بہشتی کنشتی کے یہ دو شعر زبان زد خاص و عام ہیں۔

دقیقی چار خصلت برگزیدست
بعالم از ہمہ خوبی و زشتی
لب یاقوت رنگ و نالہ چنگ
مے چوں لعل و کیش زرتہشتی

زرتشت کے صحیفوں میں قدیم ترین کتاب گاتھا ہے۔ یہ وہی کلمہ ہے جس نے کتھا کی صورت اختیار کی ہے اور جو گیتا کی شکل میں بھی نظر آتا ہے گاتھا میں زرتشت کا نام زرتواشترہ

درج ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کلمہ مرکب ہے۔ شروع سے اس مسئلہ میں اختلاف رہا ہے کہ اس کلمہ کی اصل کیا ہے لیکن اب یہ بات قریب قریب مسلم سمجھنی چاہیے کہ یہ کلمہ دو جزو سے مرکب ہے یعنی زرت اور اشتر۔ اس معاملہ میں بھی بڑا اختلاف ہے کہ زرت اشتر کے کیا معنی ہیں۔ محمد معین صاحب مولینا اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس کلمہ کے معنی ہیں دارندہ شتر زرد یعنی زرد اونٹوں کا مالک۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام زرتشت کے قبیلے کو عطا کیا گیا ہے۔ اصل نام بامتداد زماں غائب ہو گیا ہے اور قبائلی نام زرت اشتر باقی رہ گیا ہے۔ گاتھا میں اور دوسرے مذہبی صحیفوں میں زرتشت کے نام کے ساتھ ایک اور کلمہ کا اضافہ کرتے ہیں یعنی سپیتمہ۔ سپیتمہ کے معنی ہیں وہ شخص جو سفید نسل سے تعلق رکھتا ہو۔ یہ کلمہ بھی ظاہر ہے کہ مرکب ہے۔ سپیت وہی لفظ ہے جسے ہم سپید اور سفید کے کلمات سے پہچانتے ہیں اور مہ غالباً مان کا مخفف ہے۔ مان خاندان کو اور گھر کو کہتے ہیں۔ بعد کے مصنفوں نے بالخصوص عربوں نے سپیتمہ کی جگہ سپیت مان استعمال کیا ہے۔ اس سے ہمارے قیاس کو تقویت پہنچتی ہے۔

پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ زرتشت کا مولد بلخ ہے (یعنی باختر) لیکن اب یہ بات پایۂ تحقیق تک پہنچ گئی ہے کہ وہ ایران کے مغربی حصہ کا رہنے والا تھا اور اس کا مسقط الراس گزن تھا جو آذربائیجان میں واقع ہے۔ گزن کو عرب شیز کہتے تھے۔ گزن وہی لفظ ہے جس نے موجودہ فارسی میں گنز کی صورت اختیار کی ہے۔ واضح رہے کہ قدیم زمانوں سے تین شہر گزن کے نام سے مشہور ہیں

۱۔ غزنی یا غزنہ اس کلمہ میں اور اصل کلمہ میں بہت کم فرق ہے۔

۲۔ گنجہ جو حقیقت میں گنج ہے۔ یہ وہی شہر ہے جو مشہور شاعر نظامی کا وطن ہے۔ اس کے آثار بھی ملتے ہیں۔ یہ دریافت کرنا بہت مشکل ہے کہ وہ شہر گنز، گزن یا گنج جو زرتشت کا مولد تھا واقعی اب اس کے آثار باقی ہیں یا نہیں۔ اسی شہر گنز کا ایک آتشکدہ بہت مشہور تھا کہ آذر غشنسپ

کے نام سے موسوم تھا اور اسی لئے محترم تھا کہ زرتشت کے مولد میں واقع تھا۔ انجمن آرائے ناصری میں مندرج ہے کہ زرتشت کا مولد گزن یا شیز مراغہ اور زنگان کے درمیان واقع تھا۔

اس مسئلہ میں بھی شدید اختلاف رائے ہے کہ زرتشت کا زمانہ کونسا ہے بعض مورخ تو یہ کہتے ہیں کہ اس کا زمانہ چھ ہزار سال قبل مسیح ہے۔ بعض مورخ یہ کہتے ہیں کہ اس کی ولادت چار پانچ سو سال قبل مسیح میں ہوئی مختلف عالموں کے بیانات اور دلائل پڑھنے کے بعد آخر کار ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ زرتشت کو گزرے کم از کم تین ہزار سال ہو چکے ہیں۔ (تقریباً گیارہ سو سال قبل مسیح)۔

مورخوں نے زرتشت کے والدین کے ناموں کا ذکر بھی کیا ہے۔ بعین نے زرتشت کے خاندان کا ایک شجرہ مزدیسنا میں درج کیا ہے۔ جو جیکسن (امریکی مستشرق) کی تحقیقات پر مبنی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زرتشت نے کم از کم تین شادیاں کی تھیں۔ فروردین لیشت میں زرتشت کے تین بیٹوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی کتاب میں اس کی بیٹیوں کا تذکرہ بھی موجود ہے۔

مسلم ہے کہ زرتشت کو ایک تورانی نے جس کا نام تاریخ میں براتروک رش درج ہے ہلاک کر دیا۔ (پروفیسر جیکسن لکھتے ہیں کہ زرتشت ۷۷ سال کی عمر میں مارا گیا) اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زرتشت نے اپنے مسلک کی تبلیغ کا یہ ڈھنگ رکھا تھا کہ تورانی طبعاً اس کے دشمن ہو گئے تھے۔

زرتشت کے متعلق بہت سے افسانے کتابوں میں درج ہیں لیکن سب سے دلچسپ بات بات یہ ہے کہ ادبیات میں اس کی شخصیت کو اس طرح مشتبہ کر دیا گیا ہے کہ یہ پہچان نہیں پڑتی فارسی کی قدیم ادبی روایت کا دعویٰ ہے کہ زرتشت حضرت ابراہیم خلیل اللہ ہی کا لقب ہے۔ اسدی لغتِ فرس میں کلمۂ وستا کے ماتحت لکھتا ہے (ترجمہ) یہ زند کی تفسیر ہے اور زند حضرت ابراہیم کے صحیفہ کا نام ہے۔ شہرستانی نے بھی ملل و نحل میں اس قسم کے اشارے کئے ہیں۔ برہانِ قاطع میں درج ہے کہ اس کا اصلی نام ابراہیم ہے۔ حافظ ایک غزل میں کہتا ہے:

باغ تازہ کن آئین دین زردشتی
کنوں کہ لالہ برافروخت آتش نمرود

مسلّم ہے کہ آتش نمرود کا تعلق حضرت ابراہیم سے ہے لیکن پہلے مصرعہ میں "آئینِ دینِ زردشت" کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے صاف ہو گیا کہ حافظ بھی یہ خیال کرتا ہے کہ زرتشت اور ابراہیم ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں معلوم نہیں اس عقیدہ کو ایران میں کس طرح فروغ حاصل ہوا کیونکہ بظاہر حضرت ابراہیم اور زرتشت میں کوئی بھی چیز مشترک نہ تھی تا اینکہ وہ مختلف النسل بھی تھے۔ مسلّم ہے کہ حضرت ابراہیم سامی ہیں اور زرتشت آریائی۔ حضرت ابراہیم کلدانیوں کی مملکت میں پیدا ہوئے اور زرتشت آذربائیجان میں۔ پھر یہ کہ حضرت ابراہیم حضرت موسیٰ پر تقدم زمانی رکھتے ہیں اور حضرتِ موسیٰ کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ ان کا زمانہ پندرہ سو سال قبل مسیح سے متعلق ہے۔ (حضرت ابراہیم کے تولد کی تاریخ ۱۹۹۶ ق م بتائی جاتی ہے) آخر میں یہ کہ حضرت ابراہیم اپنی طبعی موت مرے اور زرتشت کو ایک تورانی نے موت کے گھاٹ اتارا۔

زرتشت کی تعلیمات اوستائی زبان میں لکھی گئی تھیں۔ اس زبان کا رسم الخط بھی اوستائی کہلاتا ہے اور ایران قدیم اور پہلوی کے رسم الخط سے مختلف ہے۔ زرتشت کی تعلیمات کا مجموعہ بھی اوستا ہی کہلاتا ہے۔ جب سکندر نے ایران پر حملہ کیا اور ایران کے مذہبی صحیفے جل کر راکھ ہو گئے تو زرتشتی وید اور معلم اوستا کے کچھ حصے سینے سے لگائے پھرتے رہے۔ اس وقت اوستا کے جو اجزا محفوظ ہیں، وہ بہ تفصیل ذیل ہیں:

۱۔ یسنا: اس کلمہ کے معنی ستائش اور نماز اور جشن ہیں۔ جشن کا کلمہ یسنا ہی کی ایک بگڑی ہوئی صورت ہے۔ مذہبی مراسم کی بجا آوری کے وقت یسنا کے حصے پڑھ کر سنائے جاتے تھے۔ یسنا ہی میں گاتھا بھی ہیں۔ بعض محقق یہ لکھتے ہیں کہ گاتھا کے اسلوب بیان اور اوستا کے

دوسرے حصوں کے اسلوب میں بڑا فرق ہے۔ ان کا خیال ہے کہ گاتھا میں جو اشعار ہیں وہ اوستا کا قدیم ترین حصہ ہیں۔

۲۔ ویسپرد: اوستا کا یہ جزو دراصل یسنا کے ملحقات پر مشتمل ہے۔

۳۔ وندیداد: ایک مرکب کلمہ ہے جس کے معنی ہیں وہ قانون جو شیطانوں سے چھٹکارا دلانے میں ممد و معاون ہو۔ اس حصہ میں بہت سی داستانیں درج ہیں۔ مثلاً آفرینش زمین کی داستان۔ داستانِ جم (جم وہی لفظ ہے جو سنسکرت میں یمہ ہے)۔

۴۔ یشت: اوستا کا یہ حصہ آفریدگار کی تعریف اور حمد پر مشتمل ہے۔ پارسی فرہنگوں میں لکھا ہے کہ یشتن کے معنی ہیں عبادت کرنا اور گانا۔ یہ مسلم ہے کہ پہلے یشت کلام منظوم پر مشتمل تھا بمرورِ زمان مندرجات میں تغیر پیدا ہوتا چلا گیا اور شعری موزونیت غائب ہو گئی۔ اس حصہ میں بہت عالی منزلت مطالب مندرج ہیں۔

۵۔ خردہ اوستا: اوستا کا یہ حصہ شاپور دوم (۳۱۰ء۔ ۳۷۹ء) کے زمانہ میں مدون کیا گیا۔ اس میں مختلف تقاریب کے لئے دعائیں مندرج ہیں۔ علاوہ ازیں آدابِ محفل اور طرزِ معاشرت کے متعلق بھی ہدایات پائی جاتی ہیں۔

واضح رہے کہ اوستا کی جو موجودہ شکل ہم تک پہنچی ہے وہ اصل مذہبی صحیفہ سے مختلف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل اوستا تو سکندر کے حملہ ایران میں ضائع ہو گئی تھی جب ساسانی بادشاہ مسند نشین جاہ و جلال ہوئے تو انھوں نے اوستا کی ترتیب و تدوین کا کام موبدوں کے سپرد کیا۔ جب عربوں نے ایران پر حملہ کیا تو ساسانی اوستا کے کچھ حصے بھی ضائع ہو گئے۔

اوستا کے سلسلہ میں بعض کلمات اکثر استعمال ہوتے ہیں اس مرحلہ پر ان کی تشریح بھی مناسب معلوم ہوتی ہے۔

زند: پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اوستا ایک خاص زبان میں لکھی گئی ہے جسے اوستائی کہتے ہیں (اوستا بھی کہتے ہیں) ساسانیوں کے عہد میں جب پہلوی زبان میں اوستا کی تفسیر کی گئی تو اسے زند کہا گیا۔ پہلے اسدی کا قول نقل کیا جا چکا ہے کہ وستا زند کی تفسیر ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ اس معاملہ میں کتنے اشتباہات پیدا ہو چکے تھے۔ زند کی ایک صورت زند بھی ہے چنانچہ غالب کہتا ہے:

امشب آتشیں روئے گرم زند خوانی ہاست

کز لبش نوا ہر دم در شرر فشانی ہاست

اسی کلمہ سے ادیبوں نے بہت سے مرکب کلمات بنائے ہیں۔ مثلاً زندباف یعنی زند خواں اور زند خواں بمعنی بلبل و فاختہ و ہر جانور خوش آواز۔

پازند: پازند زند کی تفسیر ہے۔ فرق یہ ہے کہ پازند میں ایک ایسی زبان استعمال کی گئی ہے جو پہلوی اور موجودہ فارسی کے بین بین ہے۔ پازند کا متن کبھی اوستائی رسم الخط میں لکھتے تھے اور کبھی فارسی میں بعض محققوں کا خیال ہے کہ پازند میں بھی پہلوی استعمال کی جاتی تھی فرق یہ ہے کہ اس میں ہزوارش کا عنصر مفقود ہوتا تھا۔ ہزوارش سے مراد یہ ہے کہ پہلوی لکھنے والے دیگر سامی کلمات پر خالص فارسی لحقات کا اضافہ کر دیتے تھے اور ایک ایسا عجیب و غریب لفظ وجود میں آتا تھا جس کا مطلب سمجھنا دشوار ہو جاتا تھا۔ مثلاً سامی کلمہ یکتبوں پر تن کا اضافہ کرتے تھے اور یوں مصدر یکتبوں تن پیدا ہوتا تھا اس کے معنی لیتے تھے نوشتن یعنی لکھنا۔ ہزوارش کا اشکال رسم الخط سے مخصوص تھا یعنی دبیر لکھتے یکتبون تن تھے اور پڑھتے نوشتن تھے۔ البتہ عام آدمیوں کے لئے یہ رمز دریافت کرنا ناممکن تھا کہ یکتبون تن کس زبان کا لفظ ہے اور اس کے کیا معنی ہیں۔ اسی طرح کلمہ لحم لکھتے تھے اور گوشت پڑھتے تھے۔ ملکانِ ملک لکھتے تھے شاہان شاہ پڑھتے تھے۔

زرتشت کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ اہورہ مزدا خدائے متعال ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کلمہ

مرکب ہے۔ پہلا جزو یعنی آہورہ سنسکرت مادے اسورسے برآمد ہوا ہے۔ یہ اسور اوستا میں اہو کی شکل اختیار کرتا ہے اور اس کلمے کے معنی ہیں مولا اور سرور۔ مزدا بھی ایک سنسکرت کلمے سے ماخوذ ہے یعنی مزس اس کی پراکرتی شکل مت ہے۔ اس کے معنی دانش و ہوش ہیں۔ پہلوی میں دانا کو بھی مزدا کہتے ہیں تو معلوم ہوا کہ آہورمزدا کے معنی سرور دانا کے ہیں یعنی وہ رب جلیل جو دانشمندی کی تمام صفات سے متصف ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ زرتشت سے پہلے بھی آہورمزدا کا کلمہ کتبوں پر منقوش پایا جاتا تھا لیکن زرتشت کے مسلک میں اس کلمے کو اصطلاحی معنی کا حامل بنادیا گیا۔

آہورہ مزدا جلیل القدر فرشتوں اور یزدانوں کا خالق ہے۔ فرشتوں کو امشاسپنداں اور یزدانوں کو یزتاں کہتے تھے (یزت اور ایزد اس کا واحد ہے)۔

یہ تو ظاہر ہے کہ آہورہ مزدا خیر کا خالق اور مصدر ہے۔ اس کے مقابلہ میں اہرمن ہے۔ یہ بھی ایک مرکب کلمہ ہے جس کے معنی ہیں خرد خبیث، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ابلیس کا تصور اہرمن کے تصور سے بہت مشابہ ہے کہ ابلیس بھی دانش و ہوش رکھتا تھا لیکن خبث نے اس کی خوبیوں پر پانی پھیر دیا۔ امشاسپنداں یعنی جلیل القدر فرشتے تعداد میں سات ہیں۔ ان میں بہمن شہریور بہت مشہور رہیں۔ یزتاں یعنی ایزداں جلیل القدر فرشتوں کی طرح خیر، نیکی اور خوبی کی طاقتوں کے علمبردار تھے۔ اب ہم یزداں کہہ کر محض خدا مراد لیتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں یہ کلمہ ایزداں تھا اور اس سے مسلکِ زرتشت کی وہ قوتیں مراد تھیں جن سے آہورہ مزدا کام لیتا ہے۔ یہ جو ایرانی لغت میں درج ہے کہ یزداں خدا کا نام ہے اور ایک فرشتہ بھی ہے جو خیر کا فاعل ہے اور آفرینندۂ نور ہے غلط ہے۔ اسی طرح اہرمن کو آفرینندۂ ظلمت لکھنا بھی غلط ہے۔ اوستا میں ہزاروں ایزدوں کا ذکر آیا ہے۔

قوائے خیر کے مقابلے میں قوائے شر ہیں جنہیں دیو کہتے ہیں دیہ وہی دیو ہے جس کے معنی

سنسکرت میں خدا یا دیوتا کے ہیں) اہرمن نے جو شر کی علامت ہے اپنا کام کرنے کے لئے چھ عامل پیدا کئے ہیں جنھیں اصطلاح میں کماریکان کہا جاتا ہے۔

ڈاکٹر محمد معین جنھوں نے زرتشت کے بارے میں بہت تحقیقات کی ہے یہ لکھتے ہیں کہ خیر وشر کی متحارب قوتوں کے وجود سے یہ نہ تصور کیا جائے کہ زرتشت کے مسلک میں دوئی یا بیگانگی پائی جاتی ہے۔ حقیقت میں زرتشت خدائے متعال کی وحدت کا قائل ہے۔ البتہ جب زرتشتی مسلک کی اصلی تعلیمات نظروں سے اوجھل ہو گئی ہیں تو بلاشبہ دوئی اور بیگانگی کے تصورات بھی اس مذہب میں داخل ہو گئے۔ خاص طور سے جب ساسانیوں کے زمانے میں زروان کی پرستش شروع ہوئی تو دوئی اور دوگانگی کے عقیدے کو بڑی تقویت پہنچی۔ زروان پرست کہتے ہیں کہ اہرمن اور آہورہ مزدہ دو متحارب قوتیں ہیں زروان ان دونوں کا خالق اور پدر ہے۔ دراں حال کہ زرتشت کے مسلک میں بتصریح کہا گیا ہے کہ زروان بھی آہورہ مزدا کی تخلیق ہے۔ (زروان کیلئے دیکھئے تلمیحات جاویدنامہ) بہرحال زرتشتی مسلک کی اصل شکل کچھ ہی کیوں نہ ہو ایرانی ادبیات میں اہرمن اور یزداں کو برسرپیکار دکھایا گیا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے دوئی یا دوگانگی ہی کی روش زرتشت کے مذہب کی اساس ہے۔

زرتشتی مسلک میں آتش کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یوں بھی شروع ہی سے مختلف اقوام میں آتش کو بزرگی اور جلال کی علامت سمجھا گیا ہے اور اس کی پرستش کی گئی ہے۔ جس زمانے میں ایران اور ہندوستان کے آریہ مل کر رہتے تھے، ان دنوں بھی آگ کی اہمیت قائم تھی اور جب دونوں شاخوں میں جدائی ہو گئی تو بھی آگ کی اہمیت کو برابر فروغ حاصل ہوتا رہا۔ زرتشتی اصطلاح میں آتش یا آذر ایزدوں کے گروہ میں شامل ہے (یعنی آتش خود ایک ایزد ہے) یہی وجہ ہے کہ ایران میں آتش کدوں کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ محمد معین لکھتے ہیں کہ آج بھی سال کے ختم

ہونے پر چہار شنبہ کی رات کو آگ روشن کرتے ہیں اور جب چراغوں میں بتی پڑتی ہے تو جھک کر نور کو سلام کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ ایرانیوں نے اسلام قبول کر لینے کے بعد اپنی بہت سی ملی عمارتوں کو حضرت سلیمان سے منسوب کر دیا تھا تاکہ مسلمان انہیں گرا نہ دیں۔ مثلاً کوروش کے مقبرہ کو مشہدِ مادرِ سلیمان کہتے تھے۔ یہی اور عمارتوں کی حالت ہے تو معین لکھتے ہیں کہ ایرانی آج بھی سلیمان کی قسم کھاتے ہیں جس سے مقصود شعلہ آتش یا چراغ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں رات کو جب چراغ روشن کیے جاتے ہیں تو رسول پاک پہ درود بھیجا جاتا ہے۔ ادبی اصطلاح میں آتش کو قبلہ زرتشت کہتے ہیں اور آتش کدوں کو کعبہ زرتشت۔ فردوسی اکثر ان کا ذکر کرتا ہے۔ ان میں کوئی شک نہیں کہ آگ کی اہمیت زیادہ تھی لیکن آئین زرتشت کے مطابق چاروں عناصر یعنی آب و خاک و آتش و باد حمد و ثنا کے سزاوار تھے

زرتشتی آتش کدوں میں آگ روشن کرنے کے قوانین پر بڑی سختی سے عمل کیا جاتا تھا اور سوائے آتربان کے کسی کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ مقامِ آتش کے قریب پہنچے یا آتش افروزی کا فرض ادا کرے یا آگ کے جلتے رہنے کی تدابیر اختیار کرے۔ آتربان دراصل آتش کدے کا محافظ ہوتا تھا۔ اس کلمہ میں آتر بر جوڑ ہے۔ آتر، آذر کی ایک شکل ہے اور بان محافظ کو کہتے ہیں معین نے مزدیسنا میں لوازم آتش گاہ کی تصویریں دی ہیں۔ جن حضرات کو تفصیلی معلومات حاصل کرنے کا اشتیاق ہو وہ اصل کتاب ملاحظہ فرمائیں۔

ایران قدیم میں تین آتشکدے بہت مشہور تھے۔

(۱) آذر گشسپ، یہ آتش کدہ شیز میں واقع تھا اور شیز وہی مقام ہے جس کا ذکر زرتشت کی ولادت کے سلسلہ میں آ چکا ہے۔ آذر گشسپ کی غیر معمولی تقدیس و احترام کی وجہ یہ تھی کہ خود زرتشت اسی آتشکدے کے گرد و نواح میں متولد ہوا تھا۔ ۹۲۵ء تک اس آتش کدے کے آثار موجود تھے۔

(۲) آذر برزین مہر۔ یہ آتش کدہ خراسان میں واقع تھا۔

(۳) آذر فرنبغ۔ تحقیق سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ آتش کدہ کہاں واقع تھا۔ ہرتسفلڈ نے یہ کہا ہے کہ آذر فرنبغ کا محل وقوع کنار زنگ کے گرد و نواح میں تھا۔ پروفیسر جیکسن کہتے ہیں کہ یہ کاریان میں واقع تھا۔

یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ان تین بڑے آتش کدوں کے علاوہ ایران میں اور اہم اور جلیل القدر آتش کدے موجود نہ تھے۔ ساسانیوں کے زمانے میں کم از کم چھ سات ایسے آتش کدوں کا سراغ ملتا ہے جو بہت عظیم المرتبت سمجھے جاتے تھے۔

آئین زرتشتی کے تمام پیرو کمر میں ایک کپڑا لپیٹتے تھے جسے کستی کہتے تھے۔ یہ وہی کلمہ ہے جس نے آخر کشتی کی شکل اختیار کی۔ ایرانی فرہنگ نویس لکھتے ہیں کہ کستی دراصل ایرانی زنار ہے۔ جس طرح ہندوستان کے آریہ جنیو پہنتے تھے ایران کے زرتشتی کستی پہنتے تھے۔ قاعدہ تھا کہ جب بچہ پندرہ سال کا ہو جاتا تھا اور گویا زندگی کی جد و جہد کے لئے مستعد ہوتا اُسے کستی پہنا دیتے تھے۔ اس موقع پر ایک جشن ترتیب دیتے تھے۔ آئین زرتشت کو مے سے بھی خاص تعلق ہے۔ اوستا میں یہ کلمہ "مذۃ" کی صورت میں ملتا ہے۔ یہ وہی کلمہ ہے جو پراکرت میں "مدھ" بن جاتا ہے۔ پھر اس سے مرکبات پیدا ہوتے ہیں مثلاً مدھ بھری انکھیاں۔ اس کی ایک صورت مت بھی ہے۔ جیسے متوالا یعنی مدھوالا[۱]۔

پہلوی میں مے کو مد کہتے تھے۔ اب واضح ہو گیا ہوگا کہ اس کی ہندی پراکرتی شکل پہلوی شکل سے کس قدر قریب ہے۔ آئین زرتشت میں نہ شراب نوشی کی تلقین کی گئی نہ اسے اچھا سمجھا گیا ہے لیکن اسے حرام بھی نہیں کیا گیا۔ بتدریج بادہ نوشی زرتشتیوں کے مسلک کا ایک ضروری جزو بن گئی جب کسی کے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوتا تھا تو اس کے نام کی شراب خم میں ڈال دیتے تھے۔ جب وہ

---

[۱] بعض عالموں نے متوالا میں مت کے معنی عقل سمجھے ہیں اور پھر یہ کہا ہے کہ اخلاقی زوال کے ثبوت کے طور پر کلمات بھی پیش کئے جاتے ہیں۔ مثلاً جو نشے میں ہو اُسے ہم متوالا کہتے ہیں یعنی ہوش میں ہے (حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مت یہاں ہوش نہیں بے ہوشی ہی ہے۔ جیسے کہ اوپر تصریح کی گئی)۔

بچہ بیاہا جاتا تھا تو شب عروسی کے جشن میں وہ شراب پیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ رفتہ رفتہ مے سے آئینِ زرتشت کا تعلق اتنا گہرا ہوگیا کہ اسے مے مغاں کہنے لگے اور ساقیوں کو مغ بچے۔ روایات ملی یہ بتاتی ہیں کہ مے کا کاشف یا دریافت کرنے والا، دراصل جمشید تھا۔ اس سلسلہ میں ایک نہایت دلچسپ قصہ بیان کیا جاتا ہے (تفصیلات کے لئے دیکھئے مزدیسنا) منوچہری دامغانی نے اپنے ایک قصیدے میں اسی اعتبار سے مے کو دخترِ جمشید کہا ہے۔ خیام نے اپنی کتاب نوروز نامہ میں یہ لکھا ہے کہ شراب شمیران کے زمانے میں دریافت ہوئی جو ہرات کا بادشاہ تھا۔ بہرحال مے مغاں کا تعلق فارسی ادبیات سے اتنا گہرا ہوگیا کہ جب تغزل کی اصطلاحات تصوف کے دائرے میں مستعمل ہوئیں تو مے اور مئے مغان کو محبت حقیقی کے معنی عطا کئے گئے۔ اس سلسلے میں بہت سی تلمیحات پیدا ہوئیں مثلاً جامِ جم اور جامِ کیخسرو، خرابات وغیرہ۔

اس بات کے متعلق ہمیشہ شکوک رہے ہیں کہ ایران میں شعر سب سے پہلے کب کہا گیا۔ معین کا خیال ہے کہ اوستا کا وہ حصہ جو گاتھا کہلاتا ہے اشعار پر مشتمل ہے۔ اس حصے کے ہر شعر کو گاس کہتے ہیں۔ گاتھا کے اشعار کا وزن آج کل کے اوزان کے مطابق نہیں بلکہ سنسکرت کے مشہور صحیفے رگ وید کے وزن سے مشابہ ہے۔ گاتھا میں شعری اصطلاحات بھی مستعمل ہوئی ہیں۔ مثلاً پد کا لفظ اگیت کے معنی میں آیا ہے۔ یہ وہی لفظ ہے جس کے معنی پا بھی ہیں یا پے بمعنی اندازہ۔ یشت میں اشعار موجود ہیں اور ظاہر ہے کہ ان اشعار کا وزن آج کل کے اشعار سے مختلف ہے۔

زرتشت کی تعلیمات کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ خدائے متعال آہورہ مزدا ہے۔ خیر و شر کی قوتیں دنیا میں برسرپیکار ہیں۔ انسان خیر کی قوتوں کی مدد سے شر پر فتح پا سکتا ہے اور اپنی روح کو عمر جاوداں عطا کر سکتا ہے۔ انسان کے لئے جائز ہے کہ وہ زندگی کی تمام نعمتوں سے بہرہ یاب ہو پھلے پھولے برومند ہو پروان چڑھے، شادی بیاہ کرے۔ ایک چھوٹا سا نظام خانوادگی قائم کرے اور بڑے

معاشرتی نظام کے قیام میں معاون ہو۔ ترکِ دنیا بے کار ہے۔ اس سے انسان کی قوتیں زائل ہو جاتی ہیں۔ اس کی بجائے انسان کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ وہ دنیا کی تسخیر کرے۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ زرتشت کی اصلی تعلیمات اسلام کی تعلیمات سے مشابہ تھیں لیکن بمرورِ زماں جوں جوں موبدوں کی جماعت بر سرِ اقتدار آتی گئی اور حکومت کے ساتھ تعاون کر کے رعایا کو محکوم رکھنے کے کام میں شریک ہوتی گئی۔ زرتشتی تعلیمات کی اصل صورت نظروں سے اوجھل ہو گئی اور ایک کلیسائی نظام سا قائم ہو گیا۔ جس کے افراد اپنے آپ کو معمولی بندوں سے برتر تصور کرتے تھے۔ یہ لوگ مغ ہربد یا موبد تھے اور ان کا سردار موبدِ موبداں کہلاتا تھا۔ مذہبی مراسم کا ادا کرنا انہیں موبدوں کا کام تھا۔ عام انسان اپنے مذہب کے دقائق سے بے خبر تھے۔ زرتشت نے خود کوئی کلیسائی نظام کی سی چیز قائم نہیں کی تھی لیکن اس کے پیرؤوں نے اپنے مفاد اور اربابِ حکومت کی فرمائش پر ایک ایسی جماعت پیدا کی جو مذہبی معاملات میں عوام کی رہنمائی کرنے کا فرض ادا کرتی تھی۔ ہمیشہ مذہبی رہنما اور جابر بادشاہ مل کر رعایا کو حسبِ منشا اپنے سانچے میں ڈھال لیتے تھے۔ یہی ایران میں ہوا۔ ایرانی فرماں رواؤں نے موبدوں سے کام لیا اور موبدوں نے فرماں رواؤں سے۔ پھر جب آئینِ زرتشت کی اصل تعلیمات نظروں سے اوجھل ہو گئیں تو اسی آئین کی مختلف شکلیں اور شاخیں بھی قائم ہو گئیں۔ ان میں زروانیت اور مہر پرستی کو بہت اہمیت حاصل تھی۔[۱]

---

[۱] مزدیسنا: محمد معین (فارسی)۔

زرتشت، ایرانِ قدیم کا پیغمبر: ولیم جیکسن (انگریزی)۔ Legacy of Persia

تاریخِ ادبیاتِ ایران، براؤن جلد اول (انگریزی)۔

تاریخِ ایران: سرپرسی سائیکس جلد اول (انگریزی)۔

تاریخِ ایران: عبداللہ رازی (فارسی)۔ ایرانی سلطنت (انگریزی)۔

(۲) زیں سخن آتش بہ پیراہن شدم
مثل نے ہنگامہ آبستن شدم

اگرچہ لفظ نے کے استعمال سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ علامہ نے مولانائے روم کا شعر

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند

ملحوظ خاطر رکھا ہے لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے اور دراصل نظامی گنجوی کا یہ شعر ملحوظ ہے :

ضمیرم نہ زن بلکہ آتش زن است
کہ مریم صفت بکر و آبستن است

س

(۱) سبزہ پامال است و روید بار بار
خوابِ مرگ از دیدہ شوید بار بار

یہ مولانا روم کے شعر کی طرف اشارہ ہے یعنی

ہم چو سبزہ بارہا روئیدہ ام
ہفصد و ہفتاد قالب دیدہ ام

یہ مسلّم ہے کہ دنیا میں قوت یا انرجی کی مقدار ہمیشہ یکساں رہتی ہے، نہ گھٹتی ہے نہ بڑھتی ہے۔ جس قانون کو قانون تعلیل کہتے ہیں اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ علت کی انرجی یا قوت معلول کی قوت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ یہ نظریہ بھی ملحوظ خاطر رکھئے کہ مادہ اس معنی میں غیر فانی ہے کہ وہ محض اپنی صورت تبدیل کر لیتا ہے کلیتہً اس کا استیصال ناممکن ہے۔

علامہ کے اس شعر میں پہلے تو یہ بات بیان کی گئی ہے کہ سبزہ پامال جو بار بار اُگتا ہے

وہ بھی گویا ارتقاء کے ایک سلسلہ کا پابند ہے۔ مولانا روم نے یہ کہا تھا کہ ارتقائی حرکت کے معنی یہ ہیں کہ اشیاء کا جوہر نمو پاکر آخر کار روحِ انسانی کے مقام تک جا پہنچے۔ اس مرحلہ پر گوسفند شیر کو یہ سبق دیتا ہے کہ سبزہ اس لئے پامال ہے کہ نمو پانے کی کوشش میں مصروف ہے اور جو لوگ اپنے نفس کو ہلاک کر دیتے ہیں وہ زندگی کے جھگڑے جو دکھوں سے عبارت ہے چھوٹ جاتے ہیں۔

گویا مولانا روم کے شعر کا جو صحیح مطلب تھا گوسفند اسے مسخ کر دیتا ہے اور شواہد خارجی سے ایسے نتائج اخذ کرتا ہے جو بقائے روحِ انسانی کے لئے مہلک ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک شیر کو یہ تعلیم نہ دی جائے کہ آزار پہنچانا بری بات ہے اس وقت تک وہ مسلک گوسفندی پر کاربند نہیں ہو سکتا (دیکھئے مسلکِ گوسفندی[1])

(۲) **سلمائے عرب**: دیکھئے سلمیٰ، یہاں سلمائے عرب سے مراد فکرِ صالح ہے کہ ادبیات سے متعلق ہو علامہ نے بہ شدت اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اسلام اور اسلام کی تمام ثقافتی تحریکات جزیرہ نمائے عرب سے نکلیں تو ان کی صورت بدل گئی عرفان و اخلاق نے عجمی تصوف کی صورت اختیار کی مضامین بلند کی جگہ عجمی صورت پرستی نے لے لی۔ پھر عربوں میں جو انکشاف، تحقیق کا مادہ تھا وہ دوسری قوموں تک کم منتقل ہوا ان تمام باتوں کی بنا پر علامہ کہتے ہیں کہ عجمی تصورات و افکار اور ہندی فلسفہ کی بجائے مسلمانوں کو عرب کے ادب کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ جو صالح افکار کا مخزن و معدن ہے ظاہر ہے کہ علامہ کی مراد عربی شاعری کا وہ صحتمند حصہ ہے جو عجمی تصوف کے مقابلہ میں ذوقِ عمل کو فکر پر ترجیح دیتا ہے۔ تہذیبی اعتبار سے بھی وہ ہمیں بار بار متنبہ کرتے ہیں کہ ہمیں خلافتِ راشدہ کے علمی اور ثقافتی کوائف سے سبق حاصل کرنا چاہئے بالاختصار ان کا مطلب یہ ہے کہ اسلام نے جو زندگی کا نظام پیش کیا تھا وہ اپنی جامع ترین صورت میں عرب ہی میں ظاہر ہوا مسلمانوں کو چاہئے کہ اسی نظامِ حیات کو اپنا معیار بنائیں اور ابتدائی عربی ثقافت کی طرف لوٹیں، اسی بنا پر بعض غلط پندار نقادوں نے انھیں رجعت پرست کہا ہے[2]۔

---

[1] عمر خیام: سید سلیمان ندوی۔ مثنوی مولانا روم۔ اسرار و رموز (مجتبیٰ)۔ لغت فلسفہ: رونز (انگریزی)

[2] اقبال نامہ (مکتوبات اقبال)۔ میراث اسلام (انگریزی)۔ ثقافت اسلامی کا خاکہ: شوستری۔ خطباتِ اقبال۔

استدراک: غلط پندار اسم فاعل ترکیبی وضع کیا گیا ہے جس کا اسلوبِ فکر غلط ہو جیسے غلط کار و خطا کار۔

ش

(۱) **شافعی:** امام شافعی کا نام محمد کنیت ابو عبداللہ اور لقب ناصر الحدیث ہے۔ شافعی نسبت ہے کہ ان کے جد اعلیٰ کا نام شافع تھا۔ ان کا سلسلہ نسب عبد مناف تک یوں چلتا ہے۔

محمد بن ادریس۔ بن عباس۔ بن عثمان۔ بن شافع۔ بن سائب۔ بن عبید بن عبد یزید بن ہاشم بن عبدالمطلب۔ بن عبد مناف۔

امام کے والد حجاز کے رہنے والے تھے لیکن انھوں نے آغاز کار ہی میں عسقلان میں سکونت اختیار کر لی تھی کہ شام میں واقع ہے۔

قریب قریب مسلّم ہے کہ ان کی ولادت کا سال ۱۵۰ھ ہے اور مہینہ رجب کا۔ امام شروع سے روایت حدیث کی طرف مائل تھے لیکن ان کی والدہ نے ان کو ترغیب دلائی کہ وہ ادب و تاریخ میں بھی ملکہ بہم پہنچائیں۔ امام نے ایسا ہی کیا اور پھر فقہ کی طرف متوجہ ہوئے۔

جب امام شافعی نے اکتساب علوم کر لیا تو امام مالکؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ امام مالک

نے امام کی پیشانی میں آثار رشد و ہدایت پائے اور بڑی توجہ سے ان کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ امام مالک کے اصول فقہی سے بکلی آگاہ ہونے کے بعد انھوں نے فقہ حنفی کے رکن رکین امام محمد سے استفادہ کیا اور احناف کے اصول و فروع میں بھی دستگاہ کلی حاصل کی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ امام کو قرات، حدیث، فقہ، کلام، لغت، طب، تاریخ، انساب، ادب، نحو، عروض، اور فراست میں کمال کا درجہ حاصل ہوگیا تھا۔ بہت خوش الحان تھے، اور جب تلاوت قرآن مجید فرماتے تھے لوگوں کا جی چاہتا تھا کہ وہ تلاوت ہی فرماتے رہیں۔

عباسیوں نے جن حالات میں خلافت حاصل کی تھی ان کا تقاضا یہ تھا کہ شیعان علی ان سے بدگمان رہتے تھے اور سمجھتے تھے کہ انھوں نے اولاد علی کا حق غصب کرلیا ہے۔ علاوہ ازیں عباسی خلفاء بیشتر عجمی اثرات کے ماتحت عربی معاشرت سے بیگانہ ہوتے چلے جا رہے تھے اور انھوں نے اپنے دربار میں وہی طریقے رائج کردئے تھے جو ایوانِ کسریٰ سے مخصوص تھے کچھ تو یہ کہ خلفائے عباسی اکثر ایسے کام کرتے تھے جنھیں دین دار اور متقی مسلمان خلاف شرع سمجھتے تھے اور کچھ اس لئے کہ شیعانِ علی برابر ان کے خلاف خروج کرتے رہتے تھے۔ عباسیوں کے عہد حکومت میں ہمیشہ خلفاء اور آل علی کے درمیان دائماً مخاصمت کی فضا قائم رہی منصور عباسی کے زمانہ میں جب نفس زکیہ نے خروج کیا تو امام مالک نے فتویٰ دیا کہ منصور نے جبراً بیعت لی ہے اور خلافت نفس زکیہ کا حق ہے۔ اسی طرح ہارون الرشید کے زمانہ میں عبداللہ بن الحسن بن الحسین بن علی نے اپنے طرفداروں کی جمعیت فراہم کرکے خلافت کا دعویٰ کیا امام شافعی نے ان کے حق میں فتویٰ کیا۔ اس مرحلہ پر امام یمن میں تھے۔ والی یمن نے ہارون الرشید کو لکھا کہ جب تک امام شافعی کو تادیب مناسب نہ کی جائے گی۔ ہنگامہ برپا رہے گا۔ ہارون کے حکم سے امام کو اور بہت سے سادات علوی کو پابجولاں رقہ بھیجدیا گیا۔ ہارون نے حکم دیا کہ ہر روز دس سید مقتول کئے جائیں جب امام کے قتل کا دن آیا

تو انھوں نے ایسا موثر خطبہ پڑھا کہ رشید لرز گیا اور ان کی ہلاکت کا حکم منسوخ کر دیا۔

امام کی وفات ایسے حالات میں ہوئی کہ اسباب موت کا بقطع و یقین متعین کرنا دشوار ہے۔ یہ تو تمام مصنفین لکھتے ہیں کہ امام کو بواسیر کا عارضہ تھا اور وفات سے پہلے مرض نے شکل شدید اختیار کی تھی مگر شیخ ابن حجر کا یہ قول ہے کہ فتیان مصری اور امام کے درمیان مناظرہ ہوا اور اس جھگڑے نے اتنا طول کھینچا کہ مقدمہ بازی کی نوبت آئی۔ فتیان کو سزا ہوئی اس نے موقع پاکر امام کے سر پر گرز مارا اور اسی کی ضرب سے امام کی موت واقع ہوئی۔

مولانا نجم الدین صاحب "سیرۃ الشافعی" اس واقعہ کو مورد اعتماد گردانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دوسرے شواہد بھی اس بات پر دال ہیں کہ امام شافعی کی وفات گرز ہی کی ضرب سے ہوئی ہے۔

صاحب "مخبر الواصلین" نے ان کی ولادت اور وفات کا قطعہ تاریخ یہ لکھا ہے:

روزِ آدینہ بود سلخِ رجب — کہ شدہ شافعی بحضرتِ رب

سالِ میلادِ او "بعلی" دان — سالِ ترحیلِ او "مقدس" خواں

اس سے ۱۵۰ھ سنِ ولادت اور ۲۰۴ھ سنِ وفات برآمد ہوتا ہے تفصیلِ ذیل:

م + ع + ل + ی

۴۰ ۷۰ ۳۰ ۱۰ = ۱۵۰ھ

اور م + ق + د + س

۴۰ ۱۰۰ ۴ ۶۰ = ۲۰۴ھ

امام شافعی کے اخلاق و عادات کے متعلق مولانا نجم الدین لکھتے ہیں:

"امام شافعی کے اخلاق و عادات کی اجمالی تصویر یہ ہے کہ نہایت خلیق، فیاض دل، حلیم الطبع انسان تھے۔ رضا جوئی خدا اور اتباعِ سنتِ نبوی کے عاشق و شیدا تھے۔ ان کے زہد و اتقا

کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ عبادت میں ان کو بے حد لطف و مزہ آتا تھا اور بڑے ذوق و شوق اور خلوص نیت سے عبادتِ الٰہی میں مصروف ہوتے تھے۔ ابو عبید قاسم بن سلام جو حدیث، فقہ، لغت، قرأت میں یکتائے روزگار تھے اور امام صاحب کے ہم عصر تھے کہا کرتے تھے کہ میں نے کوئی شخص امام شافعی سے زیادہ متقی اور پرہیزگار نہیں دیکھا۔

محمد بن عبداللہ بن عبدالحکم سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ ہم زہد و تقویٰ کا ذکر کر رہے تھے یہاں تک کہ ہمارے درمیان ذوالنون کا ذکر آیا۔ اتفاقاً اسی وقت عمرو بن نباتہ ہمارے پاس آیا اور پوچھنے لگا کہ تم کیا باتیں کر رہے تھے۔ ہم نے کہا کہ زہد و تقویٰ کا ذکر کر رہے تھے اور اس میں ہم نے ذوالنون کا ذکر کیا تھا۔ عمرو بن نباتہ نے کہا میں نے تو امام شافعی سے زیادہ کسی کو متقی اور پرہیزگار نہیں پایا۔ چنانچہ ایک مرتبہ میں اور وہ اور حارث صالح مزنی کا غلام صفا پر جا رہے تھے۔ اتفاقاً حارث نے یہ آیت پڑھ دی:

هذا يوم الفصل جمعنٰكم والاولين

امام شافعی پر اس آیت کو سن کر ایسی حالت طاری ہو گئی کہ سخت مضطرب اور بے چین ہو گئے اور زار زار رونے لگے۔ ان کے دل پر خوف خدا نہایت غالب تھا۔ ربیع بن سلیمان کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ میں نے امام شافعی کے ساتھ حج کیا۔ راستہ میں میں نے ان کی یہ کیفیت دیکھی کہ جب وہ کسی بلند جگہ پر چڑھتے یا کسی نشیب میں اترتے تو نہایت زار زار روتے اور یہ شعر نہایت موثر لہجہ میں پڑھتے تھے:۔

آل النبی ذریعتی   وھم الیہ وسیلتی
ارجوا بان اعطی غداً   بیدی الیمین صحیفتی

یعنی فقط آلِ نبی ہی میرا بھروسہ ہے اللہ خدا کے دربار میں فقط وہی میرا وسیلہ ہیں مجھے

اس بات کی قوی امید ہے کہ آپ کے ذریعہ سے قیامت کو میرے داہنے ہاتھ میں مجھے نامۂ اعمال عطا کیا جائے گا۔

امام صاحب کے مزاج میں قناعت اعلیٰ درجہ کی تھی۔ خود ان کا قول ہے کہ میں نے اپنے طمع کو ترک کر کے قناعت کو اختیار کر لیا اور اس کے ذریعہ سے اپنی جان کو نہایت آرام پہنچایا میں نے مردہ قناعت کو زندہ کیا اور اس کی زندگی کی وجہ سے میری آبرو ذلت سے محفوظ ہو گئی۔ امام صاحب لکھتے ہیں کہ بیس برس سے میں نے کبھی شکم سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا۔

امام شافعی ابوحنیفہ کی طرح عہدۂ قضا سے سخت متنفر تھے۔ ہارون الرشید نے ایک مرتبہ ان سے نہایت اصرار سے کہا کہ میں تم کو کسی شہر کا قاضی کر دوں لیکن امام صاحب نے منظور نہ کیا۔

تلاوتِ کلام اللہ سے نہایت شوق تھا اور اس کے پڑھنے میں ان کو ایسی کیفیت معلوم ہوتی تھی کہ اس کے چھوڑنے کو مطلقاً دل نہیں چاہتا تھا۔ اکثر روزانہ ایک ختم کر لیتے تھے اور ماہ رمضان میں تو بالکل اسی طرف متوجہ رہتے تھے اور ہر روز دو ختم کلام اللہ کے کر لیتے تھے۔ اگرچہ امام صاحب نہایت درجہ کے زاہد اور مرتاض تھے لیکن عام صوفیہ اور زہاد کی طرح حدِ اعتدال سے بڑھ کر عبادت کرنا اور اس کو رہبانیت کی حد تک لے جانا نہایت ناپسند کرتے تھے۔ حسین بن علی کرابیسی امام صاحب کے شاگرد سے منقول ہے کہ میں قریب تین ماہ کے متواتر ان کے پاس رہا۔ اس عرصہ میں میں نے ان کو رات کا تہائی حصہ نماز میں صرف کرتے دیکھا اور ایک رکعت میں تقریباً پچاس آیتیں پڑھتے تھے۔

امام صاحب نہایت انصاف پسند اور طالبِ حق تھے جس وقت کسی سے مناظرہ کرتے

نہایت نرمی اور آہستگی سے گفتگو کرتے۔ ان کو اس بات کی مطلقاً پروا نہ ہوتی کہ وہ غالب ہوں یا ان کا مدمقابل۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ میں نے کبھی کسی شخص سے اپنی بڑائی اور اظہارِ فضیلت کی غرض سے مناظرہ نہیں کیا اور جب میں نے کسی سے مناظرہ کیا اس کی کچھ پروا نہیں کی کہ حق بات میری زبان سے ظاہر ہو یا میرے حریف کی زبان سے۔ اپنے شاگردوں کو ہمیشہ اس بات کی تاکید کرتے تھے کہ دینی مناظروں اور مباحثوں میں کبھی اپنی بڑائی اور اظہارِ فضیلت کا خیال نہ کرنا اور اگر میرا کوئی قول اپنی عقل کے مخالف پاؤ تو خبردار اسے ہرگز قبول نہ کرنا کیونکہ حق بات وہی ہے جو عقل کے مخالف نہ ہو۔

امام صاحب کو اپنی بات کی مطلقاً پچ نہ ہوتی تھی۔ اگر کسی مسئلہ میں ان کی غلطی ثابت ہو جاتی تو فوراً اس سے رجوع کرتے چنانچہ اپنے رسالہ بغدادی کی نسبت جس میں ان سے حدیث نہ پہنچنے کی وجہ سے بعض مسائل میں مجبوری چوک اور خطا ہو گئی تھی۔ اپنے شاگردوں کو یہ حکم دیا کہ میں تمہارے لئے اس کتاب کی روایت کرنا جائز نہیں رکھتا۔ امام احمد بن حنبل سے کہا کرتے تھے کہ تمہاری نظر احادیثِ صحیحہ پر ہم سے زیادہ ہے۔ اگر کوئی صحیح حدیث جو مجھے معلوم نہیں آپ کو پہنچے تو مجھے اطلاع دینا تاکہ میں اسی کے مطابق اپنا مذہب قائم کروں۔

ملا متقدمین کے حالات سے ہمیشہ عبرت پکڑنے اور مناظرے میں آہستگی اور نرمی اختیار کرنے کی خوبی اور فضیلت میں یہ حکایت بیان کیا کرتے تھے کہ حضرت امام ابوحنیفہ نے ایک شخص سے مناظرہ کیا اتفاق سے مناظرہ کرتے ہوئے امام ابوحنیفہ کی آواز بلند ہو گئی اور زور سے چیخ اٹھے۔ عین مناظرے میں کسی شخص نے کہا:

اخطاءت یا اباحنیفہ یعنی اے ابوحنیفہ تم نے خطا کی۔ امام ابوحنیفہ نے کہا کہ

تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں نے خطا کی ہے۔ اس شخص نے جواب دیا کہ آپ کا بیٹھنا آپ کی خطا کی دلیل ہے۔

جھوٹ بولنے سے امام صاحب کو سخت نفرت تھی وہ خود کہتے ہیں کہ میں نے اپنی مدت العمر میں کبھی کسی بات میں جھوٹ نہیں بولا اور نہ میں نے کبھی کسی معاملہ میں جھوٹی یا سچی قسم کھائی۔

امام صاحب کا ہر عمل خاص خدا کی رضا کے واسطے ہوتا تھا۔ ان کو شہرت دنیا بالکل مطلوب نہ تھی۔ اپنی تصانیف کی نسبت ہمیشہ یہی تمنا کرتے رہتے تھے کہ کاش لوگ ان سے فائدہ اٹھائیں اور میری جانب ان میں سے ایک حرف بھی منسوب نہ ہو۔

اتباع سنت میں امام صاحب کا قدم نہایت مضبوط اور راسخ تھا اکثر اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھے کہ میں نے اپنی تصانیف میں حتی الوسع پوری کوشش کی ہے مگر ممکن ہے کہ بعض جگہ مجھ سے غلطیاں ہوئی ہوں کیونکہ غلطیوں سے محفوظ رہنا صرف خدا ہی کی شان ہے پس تم جو مسئلہ میری کتابوں میں خلاف کتاب وسنت کے پاؤ تو خوب سمجھ لو کہ میں نے اس سے رجوع کیا اور اگر حدیث صحیح میرے پاس پہنچے اور میں اس پر عمل نہ کروں تو جان لو کہ میری عقل کھوئی گئی۔

امام احمد کہتے ہیں کہ امام شافعی جب کوئی ایسی حدیث سنتے جو انہیں پہلے سے معلوم نہ ہوتی تو حدیث کے مطابق عمل کرتے اور اپنے پہلے قول کو چھوڑ دیتے اور کہتے میں رجوع کرتا ہوں خلاف حدیث سے اپنی زندگی میں اور بعد اپنی موت کے۔

امام احمد سے یہ بھی روایت ہے کہ کسی شخص نے امام شافعی سے ایک مسئلہ دریافت کیا۔ امام صاحب نے اسے مسئلہ بتلا کر اس کے ثبوت میں ایک حدیث پڑھی۔ اس شخص نے

ازراہِ تعجب دریافت کیا کہ کیا آپ بھی اس حدیث پر عمل کرتے ہیں؟ امام صاحب کو یہ سن کر نہایت غصہ آیا اور کہنے لگے کہ کیا تو نے مجھے کبھی بت خانہ سے نکلتا ہوا پایا یا تم نے مجھے زنار باندھے دیکھا۔ جو حدیث صحیح ہو وہی میرا مذہب ہے۔

امام صاحب کو تحصیل علم میں بڑی سرگرمی تھی اور اس میں ان کو بڑی لذت محسوس ہوتی تھی۔ ایک ایک حدیث کے لئے کئی دن رات کا سفر کرتے اور کتابوں کے مطالعہ میں ہمیشہ مصروف رہتے تھے۔ نہایت مشقت سے حضرت سفیان بن عینیہ اور امام محمد کا کتب خانہ جمع کیا اور تمام کتابوں سے فائدہ اٹھایا۔ امام محمد کہتے ہیں کہ ایک روز امام شافعی نے مجھ سے ایک کتاب مانگی اور ایک رات میں وہ کل حفظ کرلی۔

امام کو تحصیلِ علم میں اپنے سے کم رتبہ کیا بلکہ مخالف مذہب اشخاص سے بھی عار نہ تھی حتیٰ کہ انھوں نے حسین الشخ کو بھی جو ان سے عمر میں بہت چھوٹے تھے بڑی خوشی سے اپنا استاد بنایا اور ان سے استفادۂ علمی کیا۔ اسی طرح ابراہیم بن یحییٰ مدنی معتزلی سے بھی انھوں نے کمال رغبت اور بڑے شوق سے علم حاصل کیا۔

امام شافعی اپنے اساتذہ کا نہایت ادب کرتے تھے اور ان کا بڑی تعظیم و تکریم سے نام لیتے تھے۔ حضرت سفیان بن عینیہ اور امام مالک کا جس وقت ذکر آجاتا تو کہتے لولاهما لذهب علم الحجاز یعنی اگر یہ دونوں نہ ہوتے تو حجاز سے علم نابید ہوجاتا۔ جس وقت امام مالک کا کوئی قول نقل کرتے تو اس کی روایت ان الفاظ سے بیان کرتے: هذا قول استاذنا الامام مالك یعنی یہ ہمارے استاد حضرت امام مالک کا قول ہے۔

ایک روز کسی شخص نے ان سے دریافت کیا کہ تم نے کوئی شخص امام مالک جیسا

بھی دیکھا ہے۔ امام صاحب نے جواب دیا کہ ہم نے ان لوگوں کو بھی، جو ہم نے علم اور عمر دونوں میں بڑھے ہوئے ہیں یہی کہتے پایا کہ ہم نے کوئی شخص امام مالک جیسا نہیں دیکھا۔ پھر ہم کیوں کر ان کی مثل دیکھ سکتے ہیں۔

استادوں کے سوا امام صاحب صحابہ اور تابعین کا بھی ذکر ہمیشہ خیر اور بھلائی سے کرتے تھے اور ان کا نہایت تعظیم کے ساتھ نام لیتے تھے۔ صحابہ کی نسبت اپنے رسالہ قدیمہ میں لکھتے ہیں: والصحابۃ رضی اللہ عنہم فوقنا فی کل علم واجتہاد ورع وعقل۔ یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم ہم سے ہر ایک علم اور اجتہاد اور تقویٰ اور عقل میں بڑھے ہوئے ہیں اور ہم پر فوقیت رکھتے ہیں۔

ایک مرتبہ کسی شخص نے مسئلہ دریافت کیا کہ اگر کسی نے کعبہ تک پیدل چلنے کی نذر کی اور پھر اس کو پورا نہ کیا تو کیا حکم ہے؟ امام صاحب نے اس کو جواب دیا کہ اس صورت میں قسم کا کفارہ لازم آتا ہے۔ پھر اس شخص سے کہا کہ عطا ابن ابی رباح جو مجھ سے بہت افضل اور بہتر تھے ان کا بھی اس مسئلہ میں یہی قول ہے۔

فیاضی اور سخاوت میں امام ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ان کی سخاوت اور فیاضی لوگوں میں ضرب المثل تھی۔ بے شمار حکایتیں ان کی سخاوت اور فیاضی کی مشہور ہیں۔ جس وقت امام صاحب تحصیلِ علم و فراست سے فراغت پا کر یمن سے مکہ واپس آئے تو انھوں نے مکہ میں داخل ہونے سے پہلے اول اپنا خیمہ شہر کے باہر قائم کیا اور پہلے دس ہزار دینار فقراء اور مساکین پر تقسیم کر دیئے پھر شہر میں داخل ہوئے۔

مزنی کا بیان ہے کہ میں نے کوئی شخص امام شافعی سے زیادہ سخی اور کریم نہیں دیکھا۔ ایک مرتبہ عید کی رات کو میں ان کے ساتھ مسجد سے نکلا اور ایک مسئلہ میں گفتگو

کرتا ہوا ان کے مکان کے دروازہ تک گیا۔ اتنے میں غلام روپیوں کی ایک تھیلی لایا اور امام سے کہنے لگا کہ میرے آقا نے آپ کو سلام کہا ہے اور یہ تھیلی آپ کی نذر کی ہے۔ امام صاحب نے سلام کا جواب دے کر وہ تھیلی لے لی اور ابھی تک وہ مکان کے اندر داخل نہیں ہوئے تھے کہ ایک شخص آیا اور اس نے ظاہر کیا کہ اے ابوعبداللہ میری عورت کو ابھی وضع حمل ہوا ہے اور میرے پاس اس کا خرچ اٹھانے کو کوئی شے نہیں۔ امام صاحب نے وہ تھیلی بدرہی کی پوری اس کو دے دی اور اس میں سے کچھ اپنے پاس نہ رکھا اور پھر اندر داخل ہوئے۔

ایک مرتبہ عید کے روز ان کے پاس کھانے پینے کا کوئی سامان موجود نہ تھا اس وقت ان کی اہلیہ نے نہایت مجبور ہو کر یہ بات کہی کہ تم اپنی قوم کے ساتھ بڑی صلہ رحمی کیا کرتے ہو۔ آج ہمیں سخت تکلیف ہے کسی شخص سے کچھ قرض ہی لے آؤ امام صاحب نے مجبور ہو کر کسی شخص سے ستر دینار قرض لئے۔ ان میں سے کل بیس دینار اپنے پاس رکھے اور باقی تمام فقراء اور مساکین کو تقسیم کر دئے۔ اتنے میں ایک قریشی ان کے پاس اپنی حاجت لے کر آیا۔ امام صاحب نے اپنا سارا حال بیان کر کے وہ بیسوں دینار اس کے آگے رکھ دئے اور کہا کہ ان میں سے جس قدر تمہارا جی چاہے لیجاؤ۔ اس شخص نے وہ بیسوں دینار لے لئے اور یہ کہہ کر چلدیا کہ ابھی تو مجھے اور ضرورت ہے۔ امام صاحب کہتے ہیں کہ اس کی تھوڑی دیر بعد ہی میرے پاس جعفر بن یحییٰ برمکی وزیر خلیفہ ہارون الرشید کی طرف سے ایک قاصد آیا اور مجھے اپنے ساتھ جعفر بن یحییٰ برمکی کے پاس لے گیا۔ جب میں جعفر کے پاس پہنچا تو مجھ سے نہایت اخلاق سے پیش آیا اور کہنے لگا کہ مجھے اپنا صحیح صحیح حال سناؤ آج شب جب مجھے

نیند آئی خواب میں برابر ہاتف غیبی سے آپ ہی کا تذکرہ سنا کیا۔ امام صاحب کہتے ہیں کہ میں نے اس سے اپنی ساری کیفیت بیان کی، اس نے ہزار دینار میری نذر کئے

امام صاحب اپنے دوست آشناؤں اور ملنے والوں سے نہایت محبت اور خاطرداری اور تواضع سے پیش آتے تھے۔ شیخ ابن حجر لکھتے ہیں کہ انھوں نے ایک کنیز جو حلوہ بنانے میں نہایت کمال رکھتی تھی، خاص اسی غرض سے خریدی تھی کہ دوست و آشنا اس سے حلوہ بنوا کر کھایا کریں۔ ان کے مکان پر احباب کا ہجوم رہتا تھا، ان کو وہ حلوہ بنوا کر کھلاتے تھے اور حلوہ سے بھی زیادہ میٹھی اور دل خوش کن باتیں کرتے اور نہایت خوش ہوتے۔ امام صاحب کے ساتھ اگر کوئی شخص ذرا سا بھی احسان کرتا تو وہ ہمیشہ اس کے احسانمند اور شکرگذار رہتے اور دہ چندسے بھی زیادہ اس کو بدلہ دیتے۔ اگر اتفاقاً راستہ میں ان کے ہاتھ سے چابک گر پڑتا اور کوئی شخص اسے اُٹھا دیتا تو وہ اُس کو چھ چھ سات سات دینار دے دیتے۔ اگر کسی شخص سے کوئی کام یا خدمت لیتے تو عام لوگوں کی بہ نسبت اس کو دوگنی چوگنی اجرت دیتے۔ ایک بار ایک حجام کو بالوں کی اصلاح کرانے کی اجرت میں انھوں نے پچاس دینار دیدئے۔

اہلِ ہنر اور اہلِ کمال کی نہایت قدر کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کہیں کو جا رہے تھے۔ راستہ میں ایک تیرانداز پر گذر ہوا جو تیراندازی میں اپنی مشق بڑھا رہا تھا۔ اس وقت اتفاق سے ایک تیر اس کا نشانہ پر جا پہنچا۔ اس وقت امام صاحب کے پاس کل تین دینار موجود تھے وہی اس کی نذر کر دئے اور نہایت حسرت و افسوس کے ساتھ دیر تک کمی کا عذر کرتے رہے۔

امام صاحب کو خدا نے جس قدر حسن سیرت عطا فرمایا تھا۔ اسی قدر جمال صورت بھی مرحمت فرمایا تھا۔ نہایت خوبصورت، میانہ قد موزوں اندام تھے، بظاہر دیکھنے میں کسی قدر ذرا اونچے معلوم ہوتے تھے۔ چہرہ بہت بھاری نہ تھا۔ رخساروں پر گوشت کم تھا۔ گردن اور بازو اور رانیں اور پنڈلیاں یہ سب اعضا لانبے اور کسی قدر دراز تھے۔ گندمی رنگ تھا۔ نہایت خوش گلو تھے۔ چہرے سے ہیبت اور وقار ٹپکتا تھا۔ جسم کی جلد باریک تھی۔ کشادہ پیشانی اور اعلیٰ درجہ کے جمیل تھے۔ پیشانی پر نہایت خفیف خفیف سی چیچک کے نشان تھے۔ دانت چھدرے اور بھویں جدا جدا تھیں عنفقہ پر بال نہ تھے، داڑھی کو مہندی سے رنگتے تھے۔

امام صاحب لباس اور نفقہ اہل وعیال میں ہمیشہ میانہ روی رکھتے تھے۔ روزمرہ کے خرچ میں بھی نہ بہت کمی کرتے تھے اور نہ اسراف۔ کسی کتاب سے اگرچہ اس امر کا مفصل ثبوت نہیں ملتا کہ ان کا یومیہ یا ماہواری خرچ کس قدر تھا لیکن شیخ ابن حجر کی تحریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نفقہ اہل وعیال میں کسی قسم کی کمی نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ لکھتے ہیں کہ امام صاحب کا نفقہ اہل وعیال اس زمانہ کے ذی وسعت تاجروں اور ذی عزت اشخاص کا سا تھا۔ لباس میں بھی امام صاحب کا یہی حال تھا کہ نہ اسراف کرتے تھے اور نہ بہت کمی۔ بسا اوقات نہایت بیش قیمت سوتی اور کتانی لباس پہنتے تھے۔

امام صاحب اپنے کنبے قبیلے اور اہل وعیال کے ساتھ نہایت خوش اخلاقی اور خندہ روئی سے پیش آتے تھے۔ بعض اوقات اپنی اہلیہ سے خوش طبعی اور مزاح بھی کیا کرتے تھے۔

معمول تھا کہ بعد نماز صبح مجلس درس و تدریس میں بیٹھتے اور طلوع آفتاب تک اہل عراق کو فقہ کا درس دیتے۔ اس کے بعد تھوڑی دیر تک حدیث کا درس رہتا پھر تھوڑی دیر تک مجلس وعظ و مناظرہ گرم رہتی۔ پھر دوپہر تک ادب، اشعار، عروض نحو وغیرہ کی تعلیم میں مصروف رہتے، بعد دوپہر مکان کو جاتے اور تھوڑی دیر تک آرام کرتے باقی دن تلاوت قرآن و ذکر الٰہی اور دیگر متفرق امور میں صرف کرتے۔ رات کے تین حصے کر رکھے تھے، ایک حصہ عبادت خدا میں صرف کرتے اور ایک حصہ میں سوتے اور اپنے جسم کو آرام دیتے اور ایک حصہ امور متعلقہ دنیا اور کتابت حدیث وغیرہ میں صرف کرتے

ابتدا میں تو امام صاحب نہایت غریب اور مفلوک الحال تھے حتی کہ معلم کی اجرت دینے پر بھی کسی قسم کی مقدرت نہ رکھتے تھے مگر بالآخران پر فتوحات دنیا نے اس قدر ہجوم کیا تھا جس کا کچھ حد و پایاں نہیں۔ اکثر خلیفۂ وقت اور دیگر امراء و وزراء ان کے پاس نذریں لاتے اور ہر ایک شخص ان کے قبول کرنے میں اصرار کرتا ایک مرتبہ ہارون رشید نے ان کو پچاس ہزار درہم نذر کئے ابوحسان زیادی نے ایک بار چھ ہزار دینار ان کے نذر کئے اور قبول کرنے میں از حد اصرار کیا جعفر بن یحییٰ برمکی نے ایک مرتبہ ایک ہزار دینار ان کی نذر کیے۔ غرض امام صاحب کی خدمت میں اکثر لوگ نذرانے پیش کرتے اور امام صاحب بمجبوری ان کو قبول کرتے تھے۔ جس وقت ان کے پاس مال آتا وہ ہمیشہ اس کو اسی وقت فقراء و مساکین کو تقسیم کر دیتے اور اپنی حاجت سے زائد کبھی اپنے پاس جمع نہیں کرتے تھے"۔

امام کی تصانیف کی تعداد ایک سو تیرہ بیان کی گئی ہے (ابن ذولاق کا قول ہے کہ

وہ ایک سو چودہ کتابوں کے مصنف ہیں تفصیل ذیل:

اصولِ دین .... ۱۴ فروعِ دین .... ۱۰۰)

عام طور پر یہ مشہور رہے کہ یہ مشہور ہے کہ ان کی دقیق ترین تصنیف کتاب الام ہے. نجم الدین. لکھتے ہیں کہ شاہ ولی اللہ کا تمام تر مبلغ علم یہی تھا اور انھوں نے استنباط مسائل میں ہر جگہ اسی کتاب کے اصول مد نظر رکھے ہیں اور انھوں نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔

بعض مشہور تصانیف کے نام یہ ہیں:

رسالہ قدیمہ	رسالہ جدیدہ
اختلاف الحدیث	احکام القرآن
اختلاف مالک والشافعی	کتاب المبسوط

مولانا نجم الدین ہی کا قول ہے کہ امام کی کتابیں ہندوستان میں بالکل ناپید ہیں:

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ روایت احادیث کے سلسلہ میں کافی مفید کام ہو چکا تھا لیکن امام شافعی کے زمانہ تک تنقید احادیث کے اصول بھی مدون نہ ہو پائے تھے۔ امام نے اس فن کی طرف خاص طور پر توجہ کی اور کچھ اصول مدون کیے جن کا اجمالاً ذکر کیا جاتا ہے

۱۔ امام شافعی سے پہلے روایت حدیث کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ صحابی یا تابعی یوں بیان کر دیتے تھے کہ آنحضرت کے زمانہ میں ہم یوں کیا کرتے تھے، اس لئے یہ بات بھی سنت ہے امام نے یہ قرار دیا کہ رسولِ خدا کے زمانہ میں محض کسی فعل کا وقوع اس کے سنت نبوی ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔ ہو سکتا ہے کہ راوی جس واقعہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے وہ جاہلیت کے رسم و رواج کے مطابق عمل میں آیا ہو اور واقعتاً سنتِ نبوی اس کے برخلاف ہو۔

۲۔ امام نے پہلی بار بالقطع و یقین طے کر دیا کہ حدیثِ مرسل ناقابل اعتبار ہے۔

۳۔ جو حدیث صریحاً مخالفِ عقل ہو وہ کسی طرح بھی قابلِ اعتبار نہیں اور اسے حدیثِ نبوی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ظاہر ہے کہ یہاں خلافِ عقل ہونے سے مراد کوئی ایسی بات ہے جس کے متعلق باتفاق رائے کہا جا سکے کہ وہ خلافِ عقل ہے۔ جہاں تاویل کی گنجائش ہو وہاں اس اصول کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

۴۔ اگر دو حدیثوں میں تعارض یا اختلاف ہو تو بدون دلیل کسی حدیث کو مسترد نہ کرنا چاہیئے بلکہ تطبیق کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اسی موضوع پر انھوں نے کتاب بھی لکھی جس کا نام اختلاف الحدیث ہے۔

تدوینِ اصولِ فقہی کے سلسلہ میں بھی امام نے بہت قابلِ قدر کام کیا۔ ان کا مسلک یہ تھا کہ :

۱۔ دین میں اصل قرآن و حدیث ہے اور اگر دونوں کسی مسئلہ میں خاموش ہوں تو پھر قرآن مجید اور احادیثِ مستند کی روشنی میں قیاس سے کام لینا چاہیئے۔

۲۔ جب کوئی حدیث رسول پاک سے متصل ہو اور اس کی اسناد بھی بقطع یقین ثابت ہو جائیں تو وہ سنت ہے۔

۳۔ اجماع خبرِ مفرد سے بڑھ کر ہے یعنی اسے خبرِ مفرد پر تفوق حاصل ہے۔

۴۔ حدیث ہمیشہ اپنے ظاہر معنی پر معمول ہونی چاہیئے۔ جب اس میں چند معنی کا احتمال ہو تو ان میں جو معنی ظاہر حدیث کے زیادہ مشابہ ہوں تو وہ معنی سب معنی سے اولیٰ ہیں۔

یہ تو ممکن ہے کہ فقہی اصول کی تدوین میں اور روایتِ احادیث میں امام کی رائے سے دوسرے ائمہ کبار اکابر علما کو اختلاف ہو لیکن یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص ان کی جلالتِ قدر کا معترف نہ ہو۔

(۲) شعور: شعور ایک ایسا کلمہ ہے جس کی تعریف بہت مشکل ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ

سیرتِ شافعی: مولوی نجم الدین۔ دارالاشاعت لاہور ۱۸۹۶ء۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام۔

امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی: مناظر احسن گیلانی۔ سیرت النعمان: شبلی نعمانی۔

شعور میں جاننے کے یا علم حاصل کرنے کے یا آگاہی حاصل کرنے کے تمام طریقے شامل ہیں مثلاً ادراک، حافظہ، تصور، تعقل، تحکم، استدلال۔ علامہ نے شعور کی تین سطحوں کا یا اس کے تین عالموں کا ذکر کیا ہے:

شاہدِ اول شعورِ خویشتن — خویش را دیدن بنورِ خویشتن

شاہدِ ثانی شعورِ دیگرے — خویش را دیدن بنورِ دیگرے

شاہدِ ثالث شعورِ ذاتِ حق — خویش را دیدن بنورِ ذاتِ حق

ملحوظِ خاطر رہے کہ کلمہ شعور کے اصل معنی دانستن و دریافتن کے ہیں لیکن واضح رہے اس کا مادہ شعر ہے اور صاحبِ غیاث لکھتے ہیں کہ شعر "معرفت چیزہائے باریک کو کہتے ہیں"۔ اس سے معلوم ہوا کہ شعور میں دانستن یا معرفت کی تمام سطحیں مخفی ہیں۔[۱]

(۳) شمس تبریز: مولانا شمس تبریزی کے متعلق مستند معلومات بہت کم دستیاب ہوتی ہیں انھوں نے مولانا روم پر اتنا گہرا اثر ڈالا ہے کہ جب تک ان کی شخصیت کی گرہ کشائی نہ ہوگی مولانا روم کے کلام کی معنویت بھی کماحقہ روشن نہ ہوگی۔

شمس تبریز سے مولانا روم کا جو تعلق قلبی تھا وہ اس بات سے ظاہر ہے کہ انھوں نے اپنی غزلیات کا دیوان دیوان شمس تبریز کے نام سے موسوم کیا۔ یہ وہ روایت نقل کی گئی ہے جو عام طور پر تاریخ اور ادب کی کتب میں مذکور ہے لیکن دیوان شمس تبریز کے سرسری مطالعہ سے بھی معلوم ہو جائے گا کہ غزلیات کا مصنف شمس نہیں بلکہ کوئی اور شخص ہے جو شمس کو اپنا پیر و مرشد اور ہادی تصور کرتا ہے۔ دیوان شمس تبریز میں غزلوں کی غزلیں ایسی ہیں جن میں شمس تبریزی کو مخاطب کیا گیا

---

[۱] لغتِ فلسفہ (انگریزی): ادیومز۔ منتخب اللغات۔

غیاث اللغات۔ تصانیفِ اقبال۔

ہے اور ان کے متعلق گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ ان کا مصنف خود شمس تبریز ہے۔

جب پروفیسر نکلسن نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ دیوان شمس تبریز ایک مجہول کتاب ہے اس کا مصنف شمس تبریز نہیں بلکہ خود مولانا روم ہیں تو انھوں نے جو تحریریں اس سلسلہ میں شائع کیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے گویا رومی نے دانستہ یہ جعل کیا ہے (معاذ اللہ) مستشرقین ابھی تک یہی بیان کرتے ہیں کہ اس تصنیف کو مولانائے روم اپنی طرف منسوب کرنا گوارا نہیں فرماتے تھے اس لئے انھوں نے اس کا نام دیوان شمس تبریز رکھا اور یہی وجہ ہے کہ بتدریج اصل مصنف لوگوں سے مخفی ہو گیا اور شمس تبریز ہی شاعر قرار پائے۔

بظاہر مستشرقین کی یہ دلیل بڑی باوزن معلوم ہوتی ہے لیکن ذرا غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ مستشرقین کے دلائل جتنے وزنی نظر آتے ہیں اتنے ہی ہلکے اور بے ثمر ہیں۔

۱۔ اگر کتاب دانستہ شمس تبریز سے منسوب کی گئی ہے اور اس کا مجہول ہونا ایک فعل ارادی کا نتیجہ ہے تو لازم آئے گا کہ ہم یہ تسلیم کریں کہ مولانائے روم نے اس بات کی کوئی پروا نہیں کی کہ غزلوں کی اندرونی شہادت سے یہ بات بتصریح ثابت ہو جائے گی کہ مصنف شمس تبریز نہیں۔ یہ بات کتاب کے دانستہ طور پر مجہول ہونے کے خلاف جاتی ہے۔ علاوہ ازیں مولانائے روم کا یہ مقام بھی نہیں کہ وہ کسی تصنیف کے متعلق اخفاسے کام لیں۔

۲۔ غزلوں کی اندرونی شہادت سے قطع نظر یہ بات بالکل مسلّم ہے کہ جب مولانائے روم اور شمس تبریزی کی ملاقات ہوئی تو رومی سماع کی طرف مائل ہو گئے خود غزلیں کہنے لگے اور قوال ان کی غزلیں گانے لگے۔ یہ غزلیں وہی ہیں جو دیوان شمس تبریز میں موجود ہیں تو یہ باور کرنا مشکل ہے کہ ایک طرف تو رومی اس تصنیف سے تبرا کریں اور دوسری طرف وہی غزلیں اپنے تمام معاصروں اور شاگردوں کے سامنے پڑھیں اور اقرار کریں کہ یہ میری تصنیف ہیں۔

دیوان کی اندرونی شہادت اتنی قاطع ہے کہ سرسری مطالعہ سے بھی یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اس دیوان کا مصنف شمس تبریز نہیں بلکہ ایک ایسا شخص ہے کہ جو شمس "بر بزرے تعلق رکھتا ہے۔ قاسم غنی نے سماع اور متعلقہ مباحث کے سلسلہ میں اس قسم کی بہت سی غزلیں نقل کی ہیں۔ علاوہ ازیں سلطان ولد نے اپنی مثنوی میں بھی اس بات کی توضیح کی ہے کہ مولانا شمس تبریزی کے فراق میں غزلیں کہتے تھے، سماع کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے اور اکثر ان پر وجد کی سی کیفیت طاری ہوتی تھی۔

مولانا کے دیوان میں جو غزلیں پائی جاتی ہیں ان سے یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ شمس تبریزی مولانا سے روٹھ کر چلے گئے ہیں اور رومی ان کے فراق میں ایک ایسے عالم میں ہیں جہاں کبھی وجد کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور کبھی سخت تکدّر پیدا ہوتا ہے۔ بعض غزلوں کے مطلعے درج کیے جاتے ہیں۔ ان کے مطالب پر غور کر لینا چاہیے:

ناگہاں موجے ز بحرِ لامکاں آمد پدید

کز نہیبش ایں ہمہ شور و فغاں آمد پدید

اے آں کہ طلبگار خدائید خدائید

بیروں زشما نیست شمائید شمائید

اس کا مقطع بھی شنیدنی ہے:

شمس الحق تبریز چو سلطان جہاں است

آنہا کہ طلبگار شمائید کجائید

ما ز بالائیم بالا می رویم

ما ز دریائیم دریا می رویم

اس کا مقطع ہے:

شمس تبریزی بیا ہمراہ ما

ما بکوہ قاف عنقا می رویم

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم

چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

اور وہ غزل خاص طور پر معنی خیز ہے جس کا مصرعہ ہے:

فاش بگفتم این سخن، شمس من و خدائے من

اس غزل میں "شمس من و خدائے من" ردیف ہے۔ ظاہر ہے کہ اس غزل میں شمس کا لفظ قطعاً تخلص کے لئے نہیں آیا۔ غزل کہنے والا کوئی اور ہے۔ شمس تبریزی سے اسے اتنی عقیدت ہے کہ کہتا ہے کہ "شمس من خدائے من"۔

میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ دیوان شمس تبریز کے مجہول ہونے کی داستان خود بھی مجہول ہے۔ مستشرقین کو غلط فہمی ہوئی کہ مولانا نے یعنی رومی نے غزلیات کا دیوان لکھ کر شمس تبریز سے منسوب کر دیا۔ بعد میں جو عام لوگوں نے یہ سمجھا کہ کلیات شمس تبریز عبارت ہے شمس تبریزی کی غزلیات سے تو اس میں نہ کوئی رومی کا قصور تھا نہ شمس تبریز کا۔ جب تک کوئی مستند شہادت اس بات کی دستیاب نہ ہو کہ اس ادبی جعل سازی کے پیچھے ارادہ بھی کارفرما ہے یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ مولانائے روم کو یا شمس تبریز کو یہ علم تھا کہ غلط فہمی پیدا ہوگی اور لوگ بات کا بتنگڑ بنائیں گے۔

اگرچہ رومی کے سلسلہ میں شمس تبریز سے اجمالاً بحث کی جا چکی ہے مگر اب کہ علامہ نے تصریح ان کا نام لیا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شمس کے متعلق جو معلومات مستند معلوم ہوئی

ہیں وہ سب یکجا کر دی جائیں اور جہاں تک ممکن ہو سکے متعلقہ روایات کی تطبیق کر دی جائے۔

ئیفق کے قول کے مطابق شمس تبریزی کا پورا نام شمس الدین بن علی بن ملک داد تبریزی ہے اور وہی لکھتے ہیں کہ ان کا شمار اکابر صوفیہ میں ہوتا تھا۔ ان میں بڑی کشش تھی۔ ان کا بیان موثر تھا۔ وہ سیر و سیاحت کرتے تھے۔ تا اینکہ سنہ ۶۴۲ھ میں جلال رومی کو ڈھونڈتے ہوئے قونیہ تشریف لے آئے ئیفق کا یہ کہنا کہ وہ علی کے لڑکے اور ملک داد کے پوتے ہیں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام روایتوں کے مطابق وہ اسماعیلیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ شبلی لکھتے ہیں کہ ان کے والد کا نام علاؤ الدین تھا اور وہ کیا بزرگ کے خاندان سے تھے جو فرقۂ اسماعیلیہ کا امام تھا لیکن انھوں نے اپنا آبائی مذہب ترک کر دیا تھا۔ اس کے برخلاف براؤن کا دعویٰ یہ ہے کہ شمس تبریزی فرقۂ باطنیہ یا اسماعیلیہ کے چوتھے فرماں روا جلال الدین حسن متوفی سنہ ۶۱۸ھ کے لڑکے تھے اس میں کوئی شک نہیں کہ جلال الدین حسن عامۂ مسلمین سے میل جول رکھتا تھا اور سب قرائن اس کے موید ہیں کہ اس نے عقائد اسماعیلیہ سے توبہ کر لی تھی۔ روایتوں کا بیان یہ بھی ہے کہ اس کی بہن کے اشارہ پر جو اپنے مذہب میں سخت تعصب رکھتی تھی اس کی بیویوں ہی نے اسے زہر دے کر مار ڈالا۔

اب تین مختلف روایات ہم تک پہنچتی ہیں:

ا۔ ئیفق تو سرے سے اس بات کا مدعی ہی نہیں کہ شمس تبریزی کو باطنیہ سے کوئی نسبت ہے اور جو شجرۂ نسب ان کا بیان کرتا ہے اس کے مطابق کوئی نسبت ہو بھی نہیں سکتی۔

۲۔ براؤن کا بیان یہ ہے کہ شمس تبریز جلال الدین کے لڑکے ہیں جو اسماعیلیہ کا چوتھا فرمانروا ہے لیکن وہ اپنے بیان کو یہ کہہ کر خود مشکوک بنا دیتے ہیں کہ شمس تبریزی کی ولدیت کے متعلق یوں کہا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے لوگوں کے عام عقیدہ کا اظہار کیا ہے تحقیق کے

مدعی وہ نہیں ہیں۔

۳۔ شبلی کا بیان یہ ہے کہ وہ علاء الدین کے لڑکے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ علاء الدین وہی ہے جو جلال الدین کی وفات کے بعد تخت پر بیٹھا۔ یہ جلال الدین کا لڑکا تھا اور اس نے ۶۵۳ھ میں وفات پائی۔ یہ بھی درست ہے کہ اس کی نسبت کیا بزرگ[1] سے مسلّم ہے کہ وہ حسن بن صباح کی وفات کے بعد باطنیہ کا فرماں روا ہوا (م ۵۱۸ھ) عام روایات اور تاریخی کتابیں بھی یہ بیان کرتی ہیں کہ شمس تبریزی کا تعلق کبھی اسماعیلیہ سے رہا ہے۔ اگر براؤن اور شبلی میں اختلاف رائے ہوتا تو شفیق کو بدون تامل ترجیح دی جاسکتی تھی لیکن اس صورت میں کہ براؤن اور شبلی دونوں متفق ہیں کہ شمس تبریزی اسماعیلی فرمانرواؤں کے خانوادہ سے ہیں شفیق کے بیان کو ترجیح دینے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی بالخصوص جبکہ انھوں نے اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا۔

قاسم غنی اس معاملہ میں خاموش ہیں لیکن یہ گمان گذرتا ہے کہ اگر وہ شمس تبریزی کے متعلق جو عام روایت ہے اسے غلط سمجھتے تو اس کی تردید ضرور کرتے۔

ان باتوں کو ملحوظ خاطر رکھ کے اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ مزید شہادت کی عدم موجودگی میں بھی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ شمس تبریزی کا تعلق اسماعیلی فرماں رواؤں سے ہے تو ناروا نہ ہوگا۔ ایک اور بات اس گمان کو تقویت پہنچاتی ہے وہ یہ کہ جہاں مذہبی احکام کی عقلی توجیہ کے مختلف سررشتے باطنی تحریک سے جاملتے ہیں وہاں باطنیوں کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ اصل حقیقت سے سوائے امام کے اور کوئی آگاہ نہیں ہوسکتا بلکہ اس دعویٰ پر اسماعیلیوں ہی کی نہیں شیعیت کی اساس بھی قائم ہے۔ ممکن ہے کہ شمس تبریزی اسماعیلی عقائد سے تائب ہوجانے کے بعد جب تصوف

---

[1] صاحب نظام الملک طوسی یعنی عبدالرزاق کانپوری نے حسن بن صباح کے حالات قلمبند کرنے کے سلسلے میں اس کے جانشینوں کے سنین وفات بھی درج کیے ہیں لیکن جہاں کشائے جوینی میں انھیں لوگوں کے جو سنین درج ہیں کہیں کہیں عبدالرزاق ان سے اختلاف کرتے ہیں۔ میں نے بوجوہ ظاہر جوینی کو زیادہ مستند ماخذ خیال کیا ہے۔

یے کوچے میں داخل ہوں تو یہ اصل اصول قبول کر لینے میں ان کو کوئی تامل نہ ہوا ہو کہ حقیقت کی جستجو میں عقل کام نہیں دیتی اور ایک مرشد سے استفادہ لازمی ہے۔ یہ مرشد یا پیر یا پیر مغاں دراصل امام ہی کی ایک دوسری صورت ہے۔ مجھے عرض کر دینا چاہیے کہ یہ قیاس ہے لیکن مجھے قوی احتمال گذرتا ہے کہ یہ قیاس صداقت پر مبنی ہے اور جب تک مزید شہادت اثبات یا تردید کی فراہم نہ ہو یہ مان لینے میں کوئی ہرج نہیں کہ شمس تبریز نے پہلے تربیت باطنیہ کے حلقہ میں حاصل کی۔ پھر تصوف نے ان پر رنگ چڑھایا۔ تصوف اور اسمٰعیلی عقائد میں جو عناصر مشترک تھے انہیں شمس کی طبیعت نے جلد قبول کر لیا کہ پرانی تربیت کا اثر دیر سے زائل ہوتا ہے۔

اب شمس تبریزی اور رومی کی ملاقات کی داستان سنئے جس کی طرف علامہ نے اپنے اشعار میں اشارہ کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے شمس تبریزی نے علم ظاہری کی تحصیل کے بعد بابا کمال الدین جنیدی سے استفادہ کیا۔ شبلی کا قول تو یہ ہے کہ وہ ان کے مرید ہو گئے۔ انہی کا اشارہ ہوا کہ قونیہ میں ایک شخص ہے جو گداز قلب کا متمنی ہے اور جس کے سینہ کو نور کمال سے منور کرنا مقصود ہے اس سے جا کر ملو۔

یہاں تک تو مسئلہ صاف ہے آگے کیا ہوا اس کے متعلق اختلاف رائے ہے۔ مولانا شبلی کا بیان یہ ہے:

> ”قونیہ پہنچے تو رات کا وقت تھا۔ برنج فروشوں کی سرائے میں اترے۔ سرائے کے دروازے پر ایک بلند چبوترہ تھا۔ اکثر امرا اور عمائد تفریح کے لئے وہاں آ بیٹھتے تھے۔ شمس بھی اسی چبوترے پر بیٹھا کرتے تھے۔ مولانا کو ان کے آنے کا حال معلوم ہوا تو ان کی ملاقات کو چلے۔ راہ میں لوگ قدمبوس ہوتے جاتے تھے۔ اسی شان سے کارواں سرا کے دروازہ پر پہنچے۔ شمس نے سمجھا کہ یہی شخص ہے جس کی نسبت بشارت ہوئی ہے۔ دونوں بزرگوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور دیر تک زبان حال سے باتیں ہوتی رہیں۔ شمس نے مولانا سے پوچھا کہ

حضرت بایزید بسطامی کے ان دو واقعات میں کس طرح تطبیق ہو سکتی ہے کہ ایک طرف تو یہ حال تھا کہ تمام عمر اس خیال سے خربزہ نہیں کھایا کہ معلوم نہیں کہ جناب رسول اللہؐ نے اس کو کس طرح کھایا ہے۔ دوسری طرف اپنی نسبت یوں فرماتے تھے کہ سبحانی ما اعظم شانی (یعنی اللہ اکبر میری شان کس قدر بڑی ہے) حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باایں ہمہ جلالتِ شان فرمایا کرتے تھے کہ میں دن بھر میں ستر دفعہ استغفار کرتا ہوں۔ مولانا نے فرمایا کہ بایزید اگرچہ بہت بڑے پایہ کے بزرگ تھے لیکن مقام ولایت میں وہ ایک خاص درجہ پر ٹھہر گئے تھے اور اس درجہ کی عظمت کے اثر سے ان کی زبان سے ایسے کلمات نکل جاتے تھے بخلاف اس کے جناب رسولِ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منازل تقرب میں برابر ایک پائے سے دوسرے پائے پر چڑھتے جاتے تھے اس لیے جب بلند پائے پر پہنچتے تھے تو پہلا پایہ اس قدر پست نظر آتا تھا کہ اس سے استغفار کرتے تھے۔

"مناقب العارفین" کی روایت میں جزئی اختلافات کے ساتھ تصریح ہے کہ یہ سنہ ۶۴۲ھ کا واقعہ ہے۔ اس بنا پر مولانا کی مسند نشینی فقر کی تاریخ اسی سال شروع ہوتی ہے۔

سپہ سالار کا بیان ہے کہ چھ مہینے تک برابر دونوں بزرگ صلاح الدین زرکوب کے حجرہ میں چلّہ کش رہے۔ اس مدت میں آب و غذا قطعاً متروک تھی اور بجز صلاح الدین زرکوب کے اور کسی کو حجرہ میں آمد و رفت کی مجال نہ تھی۔ "مناقب العارفین" میں اس مدت کو نصف کر دیا ہے۔ اس زمانہ سے مولانا کی حالت میں ایک نمایاں تغیر جو پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ اب تک سماع سے محترز تھے اب اس کے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ چونکہ مولانا نے درس و تدریس اور وعظ و پند کے اشغال دفعتہً چھوڑ دیے اور

حضرت شمس کی خدمت سے دم بھر کو جدا نہیں ہوتے تھے۔ تمام شہر میں ایک شورش مچ گئی۔ لوگوں کو سخت رنج تھا کہ ایک دیوانہ بے سر و پا نے مولانا پر سحر کر دیا کہ وہ کسی کام کے نہیں رہے۔ یہ برہمی یہاں تک پھیلی کہ خود مریدانِ خاص اس کی شکایت کرنے لگے۔ شمس کو ڈر ہوا کہ یہ شورش فتنہ انگیزی کی حد تک نہ پہنچ جائے۔ چپکے گھر سے نکل کر دمشق کو چل دیے۔ مولانا کو ان کے فراق کا ایسا صدمہ ہوا کہ سب لوگوں سے قطع تعلق کر کے عزلت اختیار کی۔ مریدانِ خاص کو بھی خدمت میں بار نہیں مل سکتا تھا۔ مدت کے بعد شمس نے مولانا کو دمشق سے خط لکھا۔ اس خط نے شوق کی آگ اور بھڑکا دی۔ مولانا نے اس زمانہ میں نہایت رقت آمیز اور پُر اثر اشعار کہے۔ جن لوگوں نے شمس کو آزردہ کیا تھا ان کو سخت ندامت ہوئی۔ سب نے مولانا سے آکر معافی کی درخواست کی۔

چنانچہ اس واقعہ کو مولانا کے صاحبزادے سلطان ولد نے اپنی مثنوی میں درج کیا ہے ......اب رائے یہ قرار پائی کہ سب مل کر دمشق جائیں اور شمس کو منا کر لائیں۔ سلطان ولد اس قافلہ کے سالار بنے۔ مولانا نے شمس کے نام ایک منظوم خط لکھا اور سلطان ولد کو دیا کہ خود پیش کرنا..... سلطان ولد قافلہ کے ساتھ دمشق پہنچے۔ بڑی مشکل سے شمس کا پتہ لگا۔ سب سامنے آکر آداب و تسلیم بجا لائے اور پیش کش جو ساتھ لائے تھے نذر کر کے مولانا کا خط دیا۔ شمس مسکرائے۔

بہ دام و دانہ نگیرند مرغِ دانا را

پھر فرمایا کہ ان خزف ریزوں کی ضرورت نہیں۔ مولانا کا پیام کافی ہے چند روز تک اس سفارت کو مہمان رکھا پھر دمشق سے سب کو لے کر روانہ ہوئے۔ تمام لوگ سواریوں پر تھے لیکن سلطان ولد کمال ادب سے شمس کے رکاب کے ساتھ دمشق سے قونیہ

تک پیادہ آئے۔ مولانا کو خبر ہوئی تمام مریدوں اور حاشیہ نشینوں کو ساتھ لے کر استقبال کو نکلے اور بڑے تزک و احتشام سے لائے۔ مدت تک بڑے ذوق و شوق کی صحبتیں رہیں۔ چند روز کے بعد حضرت شمس نے مولانا کی ایک پروردہ کے ساتھ جس کا نام کیمیا تھا شادی کر لی۔ مولانا نے مکان کے سامنے ایک خیمہ نصب کرا دیا کہ حضرت شمس اس میں قیام فرمائیں۔ مولانا کے ایک صاحبزادہ جن کا نام علاء الدین چلپی تھا جب مولانا سے ملنے آتے تھے تو حضرت شمس کے خیمہ میں سے ہو کر جاتے۔ شمس کو ناگوار ہوتا چند بار منع کیا لیکن وہ باز نہ آئے۔ علاء الدین نے لوگوں سے شکایت کی۔ حاسدوں کو موقع ملا۔ سب نے کہنا شروع کیا کہ کیا غضب ہے کہ ایک بیگانہ آئے اور یگانہ کو گھر میں نہ آنے دے۔ یہ چرچا بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ شمس نے اب کی دفعہ عزم کر لیا کہ جا کر پھر کبھی نہ آئیں چنانچہ دفعتہً پھر غائب ہو گئے۔ مولانا نے ہر طرف آدمی دوڑائے لیکن کہیں پتہ نہ چلا۔ آخر تمام مریدوں اور عزیزوں کو ساتھ لے کر خود تلاش کو نکلے دمشق میں قیام کر کے ہر طرف سراغ رسانی کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ آخر مجبور ہو کر قونیہ کو واپس چلے آئے۔

یہ تمام واقعات سپہ سالار نے بہ تفصیل لکھے ہیں۔ مناقب العارفین میں کیمیا سے شادی کرنے کا واقعہ منقول نہیں لیکن اس قدر لکھا ہے کہ حضرت شمس کی زوجہ محترمہ کیمیا خاتون تھیں وہ بے اجازت ایک دفعہ باہر چلی گئی تھیں اس پر حضرت شمس ناراض ہوئے۔ وہ اسی وقت بیمار ہوئیں اور تین دن کے بعد مر گئیں۔ ان کی وفات کے بعد حضرت شمس دمشق کو چلے گئے۔ مناقب العارفین میں یہ بھی لکھا ہے کہ یہ واقعہ شعبان ۶۴۴ھ میں پیش آیا۔ اگر یہ روایات صحیح ہیں تو مولانا اور شمس کی صحبت کل دو برس رہی۔

مثنوی کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ شمس اول دفعہ جب ناراض ہو کر چلے گئے تو اپنے وطن تبریز پہنچے اور مولانا خود جا کر ان کو تبریز سے لائے چنانچہ خود مثنوی میں اس واقعہ کی طرف ان اشعار میں اشارہ کیا ہے:

ساربانا بار بکشا ز اشتراں　　شہر تبریز است و کوئے دلستاں

فر فردوس است ایں پالیز را　　شعشعہ عرش است ایں تبریز را

ہر زمانے فوج روح انگیز جاں　　از فراز عرش بر تبریزیاں

یہ عجیب بات ہے کہ سپہ سالار نے جو بقول خود چالیس برس تک مولانا کی خدمت میں رہے، شمس تبریز کی نسبت صرف اس قدر لکھا ہے کہ وہ رنجیدہ ہو کر کسی طرف نکل گئے اور پھر ان کا پتہ نہ لگا لیکن اور تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ ان کو اسی زمانہ میں جبکہ قونیہ میں مولانا کے پاس مقیم تھے مولانا کے بعض مریدوں نے حسد کی وجہ سے قتل کر دیا۔ نفحات الانس میں ہے کہ خود مولانا کے صاحبزادہ علاؤ الدین محمد نے یہ حرکت کی۔

"نفحات الانس" میں شمس کی شہادت کا سال ۶۴۵ھ لکھا ہے۔ غرض شمس کی شہادت یا غیبوبیت کا زمانہ ۶۴۴ھ اور ۶۴۵ھ کے بیچ بیچ ہے۔"

اس اقتباس سے یہ ظاہر ہو گیا ہو گا کہ شمس تبریز کی وفات یا غیبوبیت کے متعلق بھی شدید اختلاف رائے ہے۔ محقق یہ لکھتے ہیں کہ ۶۴۲ھ کے بعد رومی بتدریج شمس کے مسلک کے قائل ہوتے چلے گئے اور انھوں نے یہ نکتہ پا لیا کہ حقیقت بصیرت کے ذریعہ مکشوف ہوتی ہے عقل کے وسیلہ سے دریافت نہیں ہوتی۔ یہ ایسا مقام پُر اسرار ہے کہ انسان اس منزل پر پہنچ کر ضرور اپنی حیرت، استعجاب اور مسرت کا اظہار کرتا ہے۔ مولانا روم نے اپنی غزلوں میں تصوف کے دقیق ترین

نکات بیان کیے اور اس بات کا بصراحت اظہار کیا کہ تواجد احوال اور مقامات کی کن کن منزلوں سے میں گذر رہا ہوں۔ مولانا روم ظاہر ہے کہ اپنی پہلی تربیت کی بنا پر حدود و اعتدال کو ملحوظ رکھتے تھے اور شریعت و طریقت کے درمیان توافق پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن بقول شفق شمس تبریزی مقام وجد و شوق میں بے اختیار ہو جاتے تھے۔ جو دل میں ہوتا تھا زبان پر لے آتے تھے اسرار فاش کر دیتے تھے اور عوام کے معتقدات کچھ اس سے مجروح ہوتے تھے۔ پھر شمس تبریزی ہنگامہ سماع کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے یہی وجہ ہے کہ آخر کار (شفق سے استفادہ جاری ہے) قونیہ کے عوام ایک دن برانگیختہ ہو گئے اور ۶۴۵ھ میں شمس تبریزی کو شہید کر دیا۔ اسی ہنگامہ میں مولانا علاؤالدین جو مولانائے روم کے خلف الرشید تھے مجروح ہوئے اور آخر زخموں کی تاب نہ لا کر فوت ہو گئے۔

شفق نے خود اس روایت کے متعلق یہ کہہ کر کہ یوں مشہور ہے پھر واقعہ کو مشکوک بنا دیا ہے۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ غزلیات کی اندرونی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک دن شمس تبریزی غائب ہو گئے اور رومی دو سال تک ان کے فراق میں بیتاب اور مضطرب رہے لیکن ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔

اگر اس بات کی طرف دیکھا جائے کہ تذکرہ نویسوں کی اور مورخوں کی اکثریت کا بیان کیا ہے تو ماننا پڑے گا کہ شمس تبریزی نے شہادت کا مقام حاصل کیا لیکن اگر غزلوں کی اندرونی شہادت پر اعتبار کیا جائے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ شمس ناگہاں ایک دن غائب ہو گئے۔ اس معاملہ میں بھی میں غزلیات کی اندرونی شہادت کو زیادہ وقیع تصور کرتا ہوں۔ یہ ممکن ہے رومی کے ان معتقدوں نے جو شمس اور ان کے روابط کی وجہ سے کبیدہ خاطر ہو چکے تھے یہی مشہور کیا ہو کہ شمس کی شہادت واقع ہو گئی، تا آنکہ مولانا ان کی ملاقات سے مایوس ہو کر بیٹھ جائیں اور پھر درس و تدریس کی طرف

متوجہ ہوں۔

شمس تبریزی اور مولانائے روم کے روابط کے متعلق قاسم غنی نے بھی تفصیل سے بحث کی ہے لیکن وہ یہ لکھتے ہیں کہ ۶۴۵ھ میں شمس تبریز غائب ہو گئے اور مولائے روم نے ان کے فراق میں اپنے وقت کا اکثر حصہ یوں بسر کرنا شروع کیا کہ محفلِ سماع میں شرکت فرماتے تھے۔ اس بیان سے بھی اس گمان کو تقویت پہنچتی ہے کہ شمس تبریزی شہید نہیں ہوئے بلکہ یہ دیکھ کر کہ عوام کبیدہ خاطر ہیں اور خود رومی کے مقربانِ خاص بھی ان سے آزردہ ہیں، ایک دن غائب ہو گئے۔

ان تمام باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں:

۱۔ ۶۴۲ھ تک مولانائے روم عام علما کی طرح درس و تدریس میں مشغول رہے۔

۲۔ اسی سال شمس تبریز حضرت شیخ کمال الدین جنیدی کے ایما پر قونیہ آئے اور ان کے ذریعہ مولانائے روم نے تصوف کے نکاتِ دقیق پر آگاہی حاصل کی۔

۳۔ کچھ عرصہ کے بعد جب مولانا سماع کی محفلوں میں بہت شرکت فرمانے لگے اور علومِ ظاہر کی طرف سے بے پروا ہو گئے تو عوام کی کبیدہ خاطری کی بنا پر شمس تبریز ایک دن چپ چاپ رخصت ہو گئے اور بظنِ غالب سیر و سیاحت میں زندگی بسر کرتے رہے البتہ کچھ عرصہ شام میں ضرور گذارا کہ رومی کہتے ہیں:

شنیدہ ام کہ بشام است شمس تبریزی
چہ صبح ہا کہ نماید اگر بشام بود

۴۔ شمس ۶۴۵ھ سے پہلے پھر کسی وقت لوٹ آئے لیکن عوام کی کبیدہ خاطری بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ وہ ۶۴۵ھ میں پھر ایسے غائب ہو گئے کہ پھر ان کا سراغ نہ ملا۔ ان کے مقتول ہونے کی داستان کے اثباتِ قطعی کے لئے ابھی مزید شہادت کی ضرورت ہے جو بدیع الزمان فروزاں فر کو بھی

مہیا نہیں ہو سکی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شمس تبریزی سے رومی نے کیا حاصل کیا۔ مستشرقین کی آرا شمس کی شخصیت کے متعلق مختلف ہیں مثلاً ریڈہاؤس یہ لکھتا ہے کہ :

اُن کے تکلم کا طریقہ ایسا تھا گویا مخاطب کو مرعوب کرنا چاہتے ہوں"۔

سپرینگر یہ لکھتا ہے کہ کلبی تھے" (اس نے ایک اور صفت کا بھی اضافہ کیا ہے جس کا ذکر شمس کے سلسلہ میں کرنا اربابِ علم کو زیب نہیں دیتا۔

پروفیسر براؤن نے خود کسی قطعی رائے کا اظہار نہیں کیا بلکہ یہ کہا ہے کہ نکلسن نے ان کے کردار کی جو تصویر کشی کی ہے وہ بہت اچھی ہے یعنی یہ کہ شمس نسبتاً ناخواندہ تھے لیکن ان میں روحانی ذوق وشوق کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ انھیں یقین تھا کہ ان کی ذات کو الہام سے نوازا گیا ہے اور اسی اعتماد علی النفس کی بنا پر جو لوگ ان کے حلقہ میں بیٹھتے تھے وہ اس طرح متاثر ہوتے تھے کہ گویا ان پر کسی نے جادو کر دیا ہو۔ انھیں نکلسن کے قول کے مطابق سقراط سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ سقراط نے بھی ایک جوہر قابل کو اس طرح متاثر کیا تھا کہ آخر سقراط کے افکار شاگردہی کی بدولت ایسے خوبصورت سانچے میں ڈھلے جسے تخلیق کا شاہکار تصور کیا جاتا ہے۔ سقراط بھی شمس ہی کی طرح علم ظاہر کو بے ثمر خیال کرتا ہے۔ تزکیہ قلب پر زور دیتا ہے اور عشق کو دنیا کی قدرِ اصلی قرار دیتا ہے اس تعریف کے باوصف نکلسن نے بھی یہ لکھا ہے کہ شمس قوانین وضوابط کی پروا نہیں کرتے تھے (مراد یہاں غالباً قوانینِ شرعی ہیں)۔

یہ طے ہے کہ شمس تبریز کی غیبت کے بعد رومی نے درویشوں یا قلندروں کی ایک جماعت قائم کی جنھیں مستشرقین درویشانِ وجد کناں کہتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ شمس تبریز اور مولانا روم کی ملاقات کے بہت دوررس اثرات مرتب

ہوئے، جب تک رومی شمس سے نہیں ملے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ علوم ظاہری کی تحصیل سے انسان نجات حاصل کر سکتا ہے لیکن شمس کے ملنے کے بعد انھیں یہ معلوم ہوا کہ ادراک حقیقت کے مختلف طریقے ہیں۔ تزکیۂ قلب اور تصفیۂ باطن بہت ضروری چیز ہے۔ احکام الٰہی کی صداقت کو تہِ قلب میں محسوس کرنا مسلمان کے لئے ضروری ہے یہی اصل تصوف ہے۔ شمس کی ملاقات کا یہ اثر ہوا کہ مولانا نے غزلوں میں اور مثنویوں میں جہاں تک ان سے بن پڑ سکتا تھا شریعت اور طریقت میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی، ظاہر اور باطن میں تطبیق کی عقل کو اور عشق کو اپنا اپنا صحیح مقام بخشا لیکن اس کے باوصف انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ صوفی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ خدانخواستہ شریعت کے احکام کو ساقط گردانے۔ اس کے برخلاف انھوں نے یہ کہا کہ عشق کے ذریعہ تمام شرعی احکام کی صداقت محسوس ہوتی ہے۔ یہی احساس پھر شعور میں تبدیل ہو جاتا ہے گویا انسان کامل تبھی بنتا ہے کہ وہ تحصیل علم کے دونوں ماخذوں کو کھنگالے اور ان سے کام لے یعنی عقل اور وجدان و بصیرت، ادراک اور کشف و الہام۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے مثنوی میں منطقی مباحث پر توجہ مرکوز کرنے کی بجائے پڑھنے والوں کے دل کو متاثر کرنا چاہا اور جو بات کہی اسے دلپذیر انداز سے کہی کہ سننے والے کے ذہن نشیں بھی ہو گئی اور دل نشیں بھی۔ انھوں نے عرفانی اور اخلاقی مطالب بھی بیان کئے اور شرع اسلامی کے اصول سے بھی بحث کی لیکن غایت یہی مدنظر رکھی کہ پڑھنے والا مرعوب نہ ہو۔ بلکہ حقیقت کا احساس و شعور حاصل کرے۔ انبیا کا یہی طریق کار تھا۔ مثنوی میں بھی مولانا نے حکایات اور تمثیلات کے ذریعہ حقائق صرف ذہن نشیں ہی نہیں کئے بلکہ پڑھنے والوں کے تہِ قلب میں ایمان اور ایقان کی شمع روشن کی ہے جس کی روشنی میں منطق کا چراغ کم ضیا معلوم ہوتا ہے اور عقل کی کارفرمائیاں کمہناب۔ مولانا نے علوم معقول و منقول کی جو تربیت حاصل کی تھی اس سے انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا اور ادھر شمس تبریزی کے ذریعہ جو کچھ معلوم ہوا تھا اس سے بھی استفادہ کیا۔

یوں بھی ان کی مثنوی شریعت و طریقت، عقل و بصیرت اور عرفان و اخلاق کے مطالب پر مشتمل ایک ایسی سود مند کتاب ہوگئی جس کی نظیر آج تک کسی زبان کے ادب میں مہیا نہیں ہو سکی۔[1]

(۳) شیرِ خدا (اسد اللہ حضرت علی ابن ابی طالب): ۶۳۲ء میں رسول پاکؐ کی وفات کے بعد چار جلیل القدر افراد کی حکومت خلافتِ راشدہ کہلاتی ہے یعنی حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان ذوالنورین اور حضرت علی۔

یہ مسلم ہے کہ حضرت علی رسول پاکؐ سے قریباً تیس برس چھوٹے تھے۔ آپ کے والد ابو طالب رسول پاک کے چچا تھے۔ ان کے ہاں اولاد کی اتنی کثرت تھی کہ کبھی کبھی ہاتھ بہت تنگ ہو جاتا تھا چنانچہ رسول اللہؐ نے حضرت علی کو شروع ہی سے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا بلکہ بالفاظِ دیگر یوں کہنا چاہیے کہ بچپن ہی سے حضرت علی نے اس فضا میں تربیت پائی تھی جو خلقِ محمدی کے نور سے منور تھی۔

جب قریش نے فیصلہ کیا کہ معاذ اللہ رسول پاکؐ کا قصہ ہی تمام کر دیا جائے کہ وہ ان کی راہ میں حائل ہوتے ہیں تو رسول پاک نے حضرت علی کو حکم دیا کہ وہ ان کے بستر پر لیٹ جائیں۔ خود رسول پاک غارِ ثور کی منزل طے کر کے مدینہ پہنچ گئے۔

شروع سے یہ ظاہر تھا کہ حضرت علی کی طبیعت میں جیالا پن اور شجاعت کے جوہر اس طرح بھرے ہیں جس طرح چقماق میں آگ ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ رسول پاک کے ساتھ بہت سی لڑائیوں میں

---

[1] اسرار و رموز (بکیا)۔ — تاریخِ تصوف در اسلام۔

تاریخ ادبیات ایران شفق۔ — تاریخ ادبیات ایران (جلد دوم): براؤن۔

ثقافتِ اسلامی کا خاکہ: شوستری۔ — سوانح مولانا روم: شبلی۔

فلسفۂ اسلام ادورڈی، مترجمہ مولوی احسان احمد ۱۹۲۶ء حیدر آباد۔ — حکمتِ رومی: ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم۔

طبقاتِ سلاطینِ اسلام: عباس اقبال۔ — مذاہبِ اسلامیہ: خواجہ عباد اللہ اختر: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔

مثنوی کے منتخب اشعار کا انگریزی دیباچہ؛ ونفیلڈ ۱۸۹۸ء لندن۔

صوفیائے اسلام (انگریزی): نکلسن۔

شریک ہوئے اور ہر لڑائی میں انھوں نے اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے۔

جنگِ خیبر کے موقع پر حضرت علی کی شجاعانہ صلاحیتیں بہت نمایاں ہوئیں اور اس موقع پر انھیں کے ہاتھوں یہودیوں کا مشہور پہلوان مرحب بھی مارا گیا۔

جب حضرت عثمان بقضائے الٰہی شہید ہو گئے تو کچھ دنوں تک اس بات کا فیصلہ نہ ہو سکا کہ خلافت کا بارِ گراں کس کے سپرد کیا جائے۔ آخر حضرت علی کو خلیفہ مقرر کیا گیا۔ آپ نے صرف پونے پانچ برس حکومت کی اور آپ ہی کے عہد میں ایسے اسباب پیدا ہو گئے کہ مسلمان خانہ جنگی میں مبتلا ہو گئے۔ اس کے باوجود حضرت علی نے ہر موقعہ پر تدبّر، فراست، تحمّل اور دور اندیشی سے کام لیا۔

اپنی خلافت کے زمانے میں انھوں نے بیت المال کے اخراجات پر بڑی کڑی نگرانی رکھی اور جن لوگوں پر غصب یا غبن کا شبہ تھا، حساب لیتے وقت ان سے کوئی رعایت روا نہیں رکھی گئی۔ ہاں نہ بے قصور کو سزا دی گئی، نہ قصوروار کو معاف کیا گیا۔

ہندوشاہ نخجوانی صاحب تجارب السلف (مرتبہ آقائے عباس اقبال) لکھتے ہیں کہ تین خارجی یعنی برک بن عبداللہ، عمرو بن بکر، عبدالرحمٰن بن ملجم، کوفہ کی مسجد آدینہ میں بیٹھ کر ان خارجی مقتولین کا ماتم کیا کرتے تھے جو نہروان میں حضرت علی کے ہاتھوں مارے گئے۔ یہ لوگ (معاذاللہ) حضرت علی، امیر معاویہ اور عمرو بن العاص پر لعنت بھیجتے تھے اور کہتے تھے کہ دنیا میں جو خرابی واقع ہو رہی ہے اس کی ذمہ داری ان ہی تینوں پر ہے۔ چنانچہ تینوں نے طے کیا کہ حضرت علی، امیر معاویہ اور عمرو ابن العاص کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔ طے یہ ہوا کہ رمضان میں یہ کام ہوگا۔ برک بن عبداللہ نے دمشق میں امیر معاویہ پر حملہ کیا لیکن وہ مہلک نہ تھا۔ عمرو بن بکر نے مصر پہنچ کر خارجہ نامی ایک شخص کو عمرو بن عاص سمجھ کر ہلاک کر دیا۔

ابنِ ملجم کے متعلق صاحبِ "تجارب السلف" اور تفصیلات بھی بیان کرتے ہیں مثلاً

قطام نامی ایک عورت کا یہ کہنا کہ حضرت علی کو موت کے گھاٹ اتار دو تو میں تم سے راضی ہو جاؤں گی وغیرہ وغیرہ۔ بہرحال ابن ملجم نے حضرت علی کے سر پر ایک مہلک زخم لگایا۔ یہی زخم حضرت کی شہادت کا باعث بنا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ابن ملجم نے تلوار زہر میں بجھائی تھی اس لئے زہر کا اثر تمام جسم میں سرایت کر گیا۔ اُن دنوں جسم کو سمّی عناصر سے پاک کرنے کے لئے ایسی دوائیں موجود نہ تھیں جیسی آج کل بالعموم مہیا ہو جاتی ہیں چنانچہ ہجرت کے چالیسویں سال رمضان کی بیسویں تاریخ کو ابن ملجم کے حملہ کے تیسرے دن حضرت علی کی شہادت واقع ہو گئی۔

صاحب تجارب السلف لکھتے ہیں کہ حضرت علی کے بیس لڑکے تھے اور اٹھائیس لڑکیاں۔ آپ کی اولاد کا سلسلہ پانچ بیٹوں سے چلا ہے یعنی حضرت امام حسن، حضرت امام حسین جناب محمد بن حنفیہ، جناب عمر اطرف اور جناب عباس۔ اگرچہ حضرت علی کے زمانہ میں مسلمانوں کے داخلی انتشار کی وجہ سے ارباب مناصب کو وہ سہولتیں مہیا نہیں تھیں جو پہلے تین خلفا کے وقت میں تھیں اس کے باوجود ملک کا انتظام نہایت احسن طریقہ پر ہوتا رہا۔

حضرت علی کے علم و فضل کے متعلق تمام مورخ مفسر اور متکلم بالاتفاق لکھ رہے ہیں کہ اس معاملہ میں وہ اپنی نظیر آپ تھے۔ آپ کو جو دینی بصیرت حاصل ہوئی تھی اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ زندگی کا اکثر حصہ رسول پاک کی معیت میں گذرا تھا تعلیمات قرآنی کے صحیح مفہوم کے متعلق کبھی اشتباہ پیدا ہو جاتا تو لوگ عموماً حضرت علی ہی سے رجوع کرتے۔

بہت سے جلیل القدر مفکروں اور صوفیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ تصوف کے معارف و رموز کا سرچشمہ حضرت علی کی ذات گرامی ہے۔

حضرت علی کو رسول پاک سے جو قرابت داری حاصل تھی کچھ اس کی بنا پر اور کچھ ان کی ذاتی شجاعت اور اوصاف کی بنا پر ان کی ذات ہمیشہ عقیدت اور محبت کا محور رہی ہے۔ ایسا بھی ہوا ہے

ہے کہ عقیدت نے غلط راستہ اختیار کرلیا ہے چنانچہ ایک ایسا غالی فرقہ بھی وجود میں آگیا تھا جو حضرت علی کو معاذ اللہ خدا تسلیم کرتا تھا۔ علاوہ ازیں جب بنو عباس اور بنو معاویہ کے درمیان چپقلش کا آغاز ہوا اور عباسی دعوت ایران میں پہنچی تو ایرانیوں نے یہ سمجھ کر عباسیوں کا ساتھ دیا کہ شاید حضرت علی کی اولاد میں سے کسی کو مسند نشین کیا جائے گا۔ اس سے بڑے فتنے پیدا ہوئے۔ یہاں تک کہ مہدی کے زمانے میں (۱۵۸ھ۔ ۷۷۵ء) جب مقنع نے (ایران کا نام نہاد نقاب پوش پیغمبر) خروج کیا تو اس نے یہ دعویٰ کیا کہ خدا نے پہلے آدم کی صورت میں ظہور کیا اور پھر اسی طرح ظہور کرتا ہوا ابو مسلم تک آپہنچا اور ابو مسلم کے بعد خدا نے مجھ میں ظہور کیا ہے۔

ان باتوں کے بیان کرنے سے مقصد یہ ہے کہ حضرت علی سے مسلمانوں کو بالعموم اور ایرانیوں کو بالخصوص جو عقیدت تھی اس نے عجیب عجیب روپ دھارے۔ سی. بروک مے اپنی تصنیف "جہاتِ عرب" میں شام کے دروزیوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کے عقائد کا مطالعہ بھی اس سلسلہ میں بہت عبرت آموز ہے۔

علامہ نے اسرار خودی کے شروع میں جلال الدین رومی کے جو اشعار نقل کئے ہیں، ان میں حضرت علی کو ان کے لقب شیرِ خدا سے یاد کیا گیا ہے اور ساتھ ہی رستم دستاں کا بھی تذکرہ ہے۔ تیسرے شعر میں اس حقیقتِ کبریٰ و مطلقہ کی جستجو کی تمنا کا اظہار ہے جس کا شعور کسی طرح حاصل نہیں ہوتا تو سیاق اور سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانائے روم اپنے سست عناصر ہم سفروں سے دل برداشتہ ہو کر ایک ایسے شخص کی اعانت کے متمنی ہیں جو شجاعت کی صفت سے بھی متصف ہو اور اس بات سے بھی مایوس نہ کہ منکروں نے جو حقیقت مطلقہ دریافت کرنے کی کوشش کی ہے اس میں ناکامی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس سفر میں جو مولانائے روم کو ملحوظِ خاطر

ہے کہ حضرت علی کا فیض شامل حال ہو تو کامیابی کی امید ہے اور یہ اشارہ تو صاف ہے کہ صوفی حضرت علی کو اپنا مرشدِ اولیں تصور کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ معارفِ تصوف کے خزینہ دار دراصل وہی ہیں۔[1]

۱؎ تجارب السلف: ہندو شاہ نخجوانی (مرتبہ عباس اقبال)۔ (بعض نسخوں میں برک بن عبداللہ کی جگہ مبارک بن عبداللہ لکھا ہے)۔

قاموس سیاسیاتِ عالم (انگریزی)۔
تاریخ عالم اسلامی: براکلمین (انگریزی)۔
طبقاتِ سلاطینِ اسلام: عباس اقبال (فارسی)۔
تصوفِ اسلام: عبدالماجد دریابادی۔
تاریخِ تصوف در اسلام: قاسم غنی۔
مشاہیر: غلام رسول مہر۔
تاریخ اسلام: سید امیر علی (انگریزی)۔
کشف المحجوب: سید علی الہجویری۔
مہماتِ عرب (انگریزی) سی. بروک (Seabrooke)۔
ثقافتِ اسلام کا خاکہ (انگریزی) شوستری۔

ع

(۱) **علی مرتضیٰ** (شرح اسرار اسماء۔ بوتراب، ید اللہ) ۔

علامہ نے حضرت علی کو جو بوتراب کہا جاتا ہے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ درحقیقت مٹی سے مراد تن ہے (تراب عربی میں مٹی کو کہتے ہیں) آدمی جب تن کے دھندوں میں پھنس جاتا ہے تو من کی دنیا ویران ہو جاتی ہے۔ حضرت علی نے اس خاک تن کو تسخیر کر لیا۔ اسی اعتبار سے وہ ابوتراب کہلاتے ہیں کہ ان کے تمام افعال و اعمال بصیرت اور احکام خداوندی سے مربوط تھے۔ نفسانی خواہشات سے نہیں کہ تن کی طرف توجہ دینے سے پیدا ہوتی ہیں یداللہ بھی حضرت علی کا لقب ہے یعنی خدا کا ہاتھ۔ علامہ نے اس کی توجیہ کی ہے کہ حضرت علی نے جو جہاد کیا ہے اس سے حق کا اثبات کیا ہے۔ ان کی تلوار علامہ کے الفاظ میں حق کو روشن کرتی تھی۔ اسی اعتبار سے وہ یداللہ ہیں کہ حق کا اثبات ان کے دست قدرت میں ہے۔ حضرت علی کو یداللہ کہ کر جہاد کی اہمیت اور عظمت کی طرف کی ~~بات~~ توجہ دلائی گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے رسول پاک کو جن

حالات میں اپنی ابتدائی زندگی بسر کرنا پڑی وہ اس بات کا تقاضا کرتے تھے کہ مسلمان ہمہ وقت جہاد کے لئے آمادہ رہیں اور حضرت علی کا اشتیاق جہاد مشہور رہے۔

کرّار کے لغوی معنی ہیں بار بار حملہ کرنے والا اور اس لقب سے بھی جہاد اور شجاعت کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اسی سلسلہ میں علامہ نے یہ بھی کہا ہے کہ جو شخص بوتراب ہو جاتا ہے یعنی اس دنیا کو تسخیر کر لیتا ہے اس کے لئے یہ ممکن ہے کہ آفتاب کی معمولی حرکت میں تغیر پیدا کر دے۔ مشہور ہے کہ حضرت علی نے آفتاب کو مغرب سے لوٹا دیا تھا۔

(۴) **عندہ حسن المآب**: آیتِ قرآنی کی طرف اشارہ ہے۔ حوالہ بہ تفصیلِ ذیل ہے ۳/۱۴-۱۵

ترجمہ یہ ہے:

"رجھایا ہے لوگوں کو مزوں کی محبت پر، عورتیں اور بیٹے، اور ڈھیر جوڑے ہوئے سونے کے اور روپے کے اور گھوڑے پلے ہوئے اور مواشی اور کھیتی۔ یہ برتنا ہے دنیا کی زندگی میں، اور اللہ جو ہے اسی پاس ہے اچھا ٹھکانا۔"

ق

(۱) قاتلِ فحشاء و بغی و منکر است: اشارہ ہے آیت قرآنی کی طرف، دیکھئے قرآن حکیم ۲۹/۴۵

ترجمہ یہ ہے:

"تو پڑھ جو اتری تیری طرف کتاب، اور کھڑی رکھ نماز بے شک نماز روکتی ہے بے حیائی سے اور بری بات سے اور اللہ کی یاد ہے سب سے بڑی، اور اللہ کو خبر ہے جو کرتے ہو۔"

(۲) قال و حال: تصوف کی اصطلاح میں حال وقت کی ایک کیفیت ہے یا صفت ہے اور اس کا تعلق وقت سے وہی ہے جو رُوح کا جسم سے ہے جب کسی سالک کو نعمتِ حال نصیب ہو جاتی ہے تو اس کے نفس میں تغیر پیدا نہیں ہوتا دوسرے الفاظ میں جب حال وقت پر وارد ہوتا ہے تو سالک زوال سے محفوظ ہو جاتا ہے اور بالفاظ اصطلحاتِ صوفیہ جملہ روزگارش وقت گردد۔ جب یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو سالک سکوتِ مطلق اختیار کرتا ہے اور صاحبِ حال کے لئے بلا اور نعمت یکساں ہے مرید کے لئے وقت کا درجہ مقرر ہے لیکن حال حصولِ مراد ہے (ہجویری)۔

ابن عربی کہتے ہیں کہ حال ایک کیفیت خاص ہے جو ارادہ اور جہد کے بعد قلب پر وارد ہوتی ہے قاسم غنی لکھتے ہیں کہ تصوف کی اصطلاح میں حال ایک کیفیت خاص ہے جس سے سالک کا دل متکیف ہوتا ہے اور یہ صرف بتوفیقِ ایزدی حاصل ہوتی ہے اس میں اور مقام میں یہ فرق ہے کہ مقام جہد اور کوشش سے حاصل کیا جاتا ہے اور حال عطیۂ خداوندی ہوتا ہے۔ جب ایک بار یہ کیفیت طاری ہو جائے تو سالک کے لئے یہ ممکن نہیں کہ عمداً اسے رفع کر دے نہ یہ ممکن ہے کہ اس کیفیت کے مٹ جانے کے بعد تکلف اور جہد کے ساتھ پھر وہی کیفیت حاصل کر لے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ (جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا) حال بغیر پذیر نہیں۔

یہ تو خالص اصطلاحی توجیہ ہے۔ عموماً صوفیوں کی وارداتِ قلبی کو بھی حال کہتے ہیں اور جو لوگ کشف و الہام کے ذریعہ حقیقت کی جستجو کرتے ہیں اصحابِ حال کہلاتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں جو لوگ علومِ معقول کے ذریعہ حقیقت کی جستجو کرتے ہیں اصحابِ قال کہلاتے ہیں۔ چنانچہ ابو سعید ابو الخیر کی ملفوظات میں درج ہے کہ شیخ بو علی سینا تین دن ان کے ساتھ رہے اس کے بعد جب وہ چلے گئے تو شیخ ابو سعید نے کہا کہ "جو کچھ میں دیکھتا ہوں وہ جانتا ہے" اور بو علی نے اسی صحبت کے متعلق کہا کہ "جو کچھ میں جانتا ہوں وہ شیخ دیکھتا ہے"۔

اس سے پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ علامہ حال و قال کے امتزاج کے قائل ہیں۔ مراد یہ ہے کہ وہ کشف و الہام کے ساتھ ادراک و عقل سے بھی کام لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ ایران والوں نے حال کو ایک اور معنی بھی بخشے ہیں یعنی وجد و سرمستی کی حالت میں رقص کرنا، اردو میں بھی حال آنا، حال آ گیا محاورات مستعمل ہیں اور پنجابی میں حال کھیلنا بھی محاورہ ہے۔ یہ تمام معانی اسی اصل معنی سے نکلے ہیں یعنی صوفی پر وجد کی سی کیفیت کا طاری ہونا۔ اس عالم میں صوفی سے کبھی کبھی حرکاتِ اضطراری سرزد ہوتی ہیں جنہیں فارسی میں دست و پا افشاندن کہتے ہیں۔ ان حرکات کا تعلق سماع سے ہے[1]۔

---

[1] تاریخ تصوف در اسلام: قاسم غنی۔ مصطلحاتِ صوفیہ: ملحق از قاسم غنی۔ کشف المحجوب ہجویری۔ غیاث اللغات۔ اقبال نامہ (مکتوباتِ اقبال)۔

ک

(۱) **کوچک ابدال:** علامہ خود لکھتے ہیں کہ اصطلاح فقرا میں کوچک ابدال مرید پیش دست کو کہتے ہیں۔

صاحب غیاث لکھتے ہیں کہ قلندروں کی اصطلاح میں اس مرید کو کہتے ہیں جو عمر میں دوسروں سے کم ہو چراغ ہدایت اور چار شربت کا حوالہ دیتے ہیں

چار شربت میں لکھا ہے

"باصطلاح قلندراں مرید خورد سال را گویند۔ وحید گوید در تعریف قلندر؛

بخورشید تاباں زند روئے نکو

بزرگی کند کوچک ابدال او

اس مرحلہ پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ابدال کے اصطلاحی معانی بھی بیان کر دیے جائیں اپنے وقت کا بزرگ ترین صوفی قطب کہلاتا ہے۔ قطب کے بعد ان مقربان بارگاہ خداوندی کا

مقام ہے جنھیں اخیار کہتے ہیں۔ اس کے بعد چالیس بزرگواروں کا درجہ آتا ہے انہیں ابدال کہتے ہیں۔ سات بزرگ ابرار کہلاتے ہیں اور چار اوتاد اور تین نقیب قطب کو غوث بھی کہتے ہیں[۱]۔

(۲) **کیف و کم**: اصطلاح میں "چگونہ و چند" کو کہتے ہیں۔ کیف کی اصطلاحی تعریف یوں کی گئی ہے کہ یہ عرض ہے کہ بالذات تقسیم نہیں ہوتا۔ مثلاً سیاہی و سپیدی اور کم وہ عرض ہے جو بالذات تقسیم ہو جاتا ہے۔ جیسے خط اور سطح اور جسم۔

صاحب غیاث لکھتے ہیں کہ دوسرے الفاظ میں یہ بات یوں بھی بیان کی جا سکتی ہے کہ کیف کسی چیز کا وہ وصف ہے جس کی نوعیت (شدت و ضعف) دریافت کرنا تعقل کے ذریعہ ممکن ہے۔ مثلاً کسی چیز کا ذائقہ یا اس کی خوشبو، یا اس کا رنگ یا خوبی یا درشتی۔ علم جہالت وغیرہ اور کم اپنی ذات میں تقسیم ہو جاتا ہے اور اس کی مقدار کا دریافت کرنا، وزن یا عدد یا پیمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہاں علامہ کی مراد یہ ہے کہ انسان کائنات کی ماہیت سے کما حقہ آگاہ ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ ان پیمانوں اور اعداد پر بھی عبور رکھتا ہے جن سے چیزوں کی مقدار دریافت ہوتی ہے واضح رہے کہ منطق میں (مغربی) کیفیت (quality) کی تعریف و تشریح بطریق دگر کی گئی ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہاں علامہ نے کیف و کم کا مشرقی تصور ملحوظ خاطر رکھا ہے اور مراد اس سے اشیاء کی ماہیت لی ہے کہ ماہیت اشیا دریافت کرنے ہی سے اس عالم کے کیف کا عالم ہو جاتا ہے۔

شکوے میں علامہ کہتے ہیں (اور انسان کا ذکر ہو رہا ہے)۔

عالم کیف ہے دانائے رموز کم ہے   ہاں مگر عجز کے اسرار سے نامحرم ہے

کیف و کم عالم سے آگاہی پانے کا سلسلہ اس زمان پر اسرار سے بھی جا ملتا ہے جب خدا نے انسان کو فرشتوں پہ ترجیح دے کر خلیفۃ الارض مقرر کیا تھا[۲]۔

---

[۱] کشف المحجوب، ہجویری منقول از تاریخ تصوف در اسلام، قاسم غنی (فارسی)، غیاث اللغات، چہار شربت، اسرار و رموز (حاشیہ)

[۲] بانگ درا۔ لغت فلسفہ (انگریزی نیویارک)۔ غیاث اللغات۔ فرہنگ آنند راج۔ مقالات شبلی۔

گ

(۱) **گرگ باراں دیدہ:** ناصر نذیر فراق لال قلعہ کی ایک جھلک میں لکھتے ہیں

ایک دن جہاں پناہ خاصہ نوش فرما رہے تھے اور چلمن کے پیچھے میں اور میری ساس حاضر تھیں۔ ملکہ زینت محل نے کہا، حضور یہ جو گرگ باراں دیدہ کہلاتا ہے تو کیا بھیڑیے کے بارہ آنکھیں ہوتی ہیں؟ اس بات کو سن کر بادشاہ سلامت خوب ہنسے اور فرمایا نہیں نہیں یہ بات غلط ہے بلکہ بڑوں سے ایسا سنا ہے کہ جب برسات بہت برستی ہے اور جل تھل بھر جاتے ہیں۔ جنگل اور میدانوں میں پانی ہی پانی ہوتا ہے تو گیدڑ، لومڑیاں اور بھیڑیے اپنے اپنے بھٹوں میں اور اپنے اپنے گھروں میں چھپ جاتے ہیں۔ ایسا بھی موقع ہوتا ہے کہ ایک کھوہ میں دس پندرہ بھیڑیے گھس کر بیٹھ جاتے ہیں اور مینھ اور پانی کے مارے باہر نکل نہیں سکتے۔ بھوک کے مارے بولاتے ہیں۔ ان میں جو نڈھال ہو جاتا ہے اور ناتوانی سے آنکھیں بند کر لیتا ہے تو اور بھیڑیے اسے تکہ بوٹی کر کے کھا لیتے ہیں اور

اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں۔ اسی طرح ہر روز ایک بھیڑیا ادھ موا ہوتا رہتا ہے اور بھیڑیے اسے کھاتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان میں سے بچ بچا کر ایک بھیڑیا رہ جاتا ہے اور اب بھید بھی کھل جاتا ہے جبر موقوف ہو جاتی ہے۔ اپنے سایہ سے بھڑکتا ہے، پتہ سے بھڑکتا ہے اور جب کوئی آدمی ایسی ہی ہوشیاری کر لیتا ہے تو کہتے ہیں کہ گرگ باراں دیدہ ہے"۔[1]

اسی سلسلہ میں "گرگ آشتی" کے متعلق بھی کچھ سن لیجیے۔ آزاد سخندانِ پارس میں رقم طراز ہیں:

"بھیڑیوں کو اس موسم میں سخت مشکل ہوتی ہے۔ وہ گوشت کے سوا اور کچھ کھاتے نہیں اور کسی قسم کا ذخیرہ رکھتے نہیں۔ باہر برف کی کثرت سے کتا تک نہیں نظر آتا۔ گلے سب بند ہو جاتے ہیں۔ یہ دس دس بیس بیس جمع ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ مگر ہر بھیڑیا اس طرح بیٹھتا ہے کہ اس کی آنکھ سب پر پڑے۔ ہر چند بھوک پیاس تھکن سے تنگ ہوتے ہیں مگر ایک کو دوسرے پر اعتبار نہیں، اس لئے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھے رہتے ہیں۔ آخر نیند تو ظالم ہے کسی کی ذرا آنکھ جھپکی اور جتنے بیٹھے تھے جھٹ اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں، فوراً پھاڑ چیر تکا بوٹی کر کے کھا ہی جاتے ہیں۔ اسی سے اہل ملک نے اصطلاح نکالی ہے "گرگ آشتی" یعنی اس بدذات جانور کے ملاپ کا بھی اعتبار نہیں۔"[2]

---

[1] لال قلعہ کی ایک جھلک: ناصر نذیر فراق۔ [2] سخندان فارس: آزاد۔

ل

(۱) لاتثریب علیکم: دیکھئے قرآن مجید ۱۲/۹۲

علامہ خود اسرار میں لکھتے ہیں:

"اگرچہ کفار عرب نے نبی کریمؐ کو بہت ایذا دی تھی مگر فتح مکہ کے بعد جبکہ فاتح کو انتقام کا حق اور قوت حاصل تھی حضور علیہ السلام نے لاتثریب علیکم فرما کر سب کو معاف فرمایا شعر بالا میں، اسی آیہ شریفہ کی طرف تلمیح ہے"۔

(۲) لاتسبوا الدہر: دیکھئے الوقت سیف

(۳) لالہ: (آتشے دارد مثال لالہ سرد)

علامہ کے ہاں بمرور زمان مصطلحات و علامات کے معانی میں تغیر پیدا ہوتا رہا ہے اور ایسا ہونا ایک طبعی امر ہے۔ ذہن انسانی سہولت اسی میں دیکھتا ہے کہ پرانے کلمات کو نئے معنی عطا کرے اور بتدریج استعمال سے ان کلمات کی تمام نئی دلالتیں واضح کردے۔ اس کی وجہ یہ ہے

کہ انسان کے ذہن میں جیسے جیسے دقیق تصورات اور افکار پیدا ہوتے ہیں ان کے لئے صحیح لفظ نہیں ملتے کہ واردات قلب کا تعلق ذہن اور روح کی دنیا سے ہے۔ جو بیکراں ہے۔ پرانی علامات کو نئے معنی عطا کرنے میں سہولت بھی ہے اور دشواری بھی۔ یہ دشواری پڑھنے والے کی ہے جو دقیق مطالعہ کے بغیر اس بات سے آگاہی حاصل نہیں کرسکتا کہ کسی بڑے شاعر کے کلام میں علائم و رموز کے استعمال نے آہستہ آہستہ کیا شکل اختیار کی ہے۔

انہی علائم و رموز میں کلمہ لالہ بھی شامل ہے۔ اس سے میں تفصیلی بحث کرتا ہوں۔

مسلّم ہے کہ ہر جلیل القدر شاعر روایات ادبی کے اس ذخیرہ سے ضرور استفادہ کرتا ہے جو معنی خیز تلمیحات و استعارات اور تشبیہات و علامات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اکثر و بیشتر ادبی روایات کے علائم و رموز لکھنے والے اور پڑھنے والے کے درمیان وہ اشتراک ذہنی پیدا کر دیتے ہیں جو افہام و تفہیم اور ابلاغ کے لئے ضروری ہے لیکن شاذو نادر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی شاعر کے یہاں قدیم ادبی روایات کی تمام مصطلحات یا ان کا بہت بڑا حصہ ایک جدید معنویت اختیار کرتا ہے۔ اس صورت میں پڑھنے والے کے لئے نہایت ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ان علائم و رموز کے جدید معانی سے اپنے آپ کو آگاہ کرے ورنہ ظاہر ہے کہ شاعر کا مطلب خبط اور قاری کا ذہن پریشان ہوگا۔

اقبال ان شعرا میں سے ہے جو نہ صرف اپنے کلام کی ادبی خوبیوں کی وجہ سے جاذب توجہ ہوتے ہیں بلکہ جو اپنے مطالب و معنی کے اعتبار سے بھی تحقیقی مطالعہ کا موضوع بنتے ہیں۔ اس کے یہاں یہ بات بھی ہے کہ اس نے تغزل اور تصوف کے ذخیرۂ تلمیحات و مصطلحات میں سے اکثر الفاظ و تراکیب کو اپنے قدیم معانی سے جدا کر کے گویا بہ جبر و قہر سینۂ الفاظ میں ایک روح نو پھونکی۔ علائم و رموز کو سمجھنا یوں بھی دشوار ہوتا ہے لیکن جب یہ الجھن بھی پیدا ہو جائے کہ کوئی لفظ یا ترکیب

ایک علامتی شکل اختیار کرے اور پھر اپنی علامتی اہمیت سے ہٹ کر ایک اور علامتی معنویت پیدا کرے تو یہ پیچ در پیچ استعارہ کی صورت پڑھنے والے کے لئے اکثر و بیشتر گمراہی کا موجب بن سکتی ہے۔ اقبال کے ہاں بعض علائم صاف اور سامنے کی چیز ہیں، دیگر رموز پیچدار اور پُراسرار ہیں۔ ان علائم و رموز کی فہرست طویل ہے۔ اس مضمون میں صرف لالہ کی علامتی اہمیت کا ارتقا دکھاتا ہوں۔ اقبال کی تصانیف کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ بانگ درا کے حصہ اول یعنی ۱۹۰۵ء تک جو غزلیں اور نظمیں کہی گئیں ان میں لالہ کا لفظ ایک بار بھی استعمال نہیں کیا گیا۔

اقبال کے کلام یہ دور بیشتر سیاحت فکری کا دور ہے۔ اس دور میں وہ اپنے آپ کو دریافت کرنے میں مصروف ہیں دوسرے دور میں یعنی ۱۹۰۵ء سے لے کر ۱۹۰۸ء تک ان کی فکر کا ارتقا بہت سی منزلیں طے کر چکا تھا۔ اگرچہ اسلامیان ہند و پاکستان سے جو کچھ ان کو کہنا تھا ان کے نقوش و خطوط بھی متحجر نہیں ہوئے تھے لیکن اس کی جھلک ان کے اسلوب فکر میں نظر آنی شروع ہو گئی تھی۔ ساتھ ہی لالہ کا ذکر شروع ہو گیا تھا۔ اس دور میں وہ اپنی نظم "کوششِ ناتمام" میں کہتے ہیں:

سوتوں کو ندیوں کا شوق بحر کا ندیوں کو عشق
موجۂ بحر کو تپش ماہ تمام کے لئے
حسنِ ازل کہ پردۂ لالہ و گل میں ہے نہاں
کہتے ہیں بے قرار ہے جلوۂ عام کے لئے

واضح رہے کہ ابھی تک لالہ ایک دل آویز پھول ہے لیکن یہ بات معنی خیز ہے کہ اس دور ہی میں یہ پھول حسنِ ازل سے مخصوص اور منسوب کر دیا گیا ہے اس کی گرہ کشائی آگے ہو گی۔ اس دور کی غزل میں اقبال کہتے ہیں:

چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو
یہ جانتا ہے کہ اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا

واضح ہے کہ اس شعر میں اقبال کا دھیان ابھی تک لالہ کی اسی علامتی اہمیت میں الجھا ہوا ہے جو اردو کی قدیم ادبی روایت کا جزو ہے۔ لالہ اس وقت تک جگر سوختگانِ عشق کی اور شہیدانِ محبت کی علامت ہے لیکن نامکمل اور ناقص ہے۔ اس کا دل سوختہ دکھاوا ہے۔

۱۹۰۸ء کے بعد اقبال اپنے آپ کو دریافت کر چکا ہے۔ شکوہ، جوابِ شکوہ، شمع اور شاعر، والدۂ مرحومہ کی یاد میں، اور طلوعِ اسلام اسی دور کی پیداوار ہیں۔ اس دور میں اقبال تغزل و تصوف کی مصطلحات و تلمیحات کو از سرِ نو برکھنے اور جانچنے کا کام شروع کرتا ہے۔ اسی دور میں لالہ کی ایک نئی علامتی اہمیت اس کے شعور میں ابھرتی ہے لیکن پرانی روایت کا لالہ اور نئی معنویت کا حامل لالہ ابھی تک جدا جدا ہیں۔ اس دور میں اقبال لالہ کی علامتی اہمیت کی توضیح کے لئے اسے صحرائی کی صفت سے متصف کر کے روایت کے قدیم لالہ سے متمیز کرتا ہے۔ بلادِ اسلامیہ میں کہتا ہے:

یہ چمن وہ ہے کہ تھا جس کے لئے سامانِ ناز
لالۂ صحرا جسے کہتے ہیں تہذیبِ حجاز

واضح ہو کہ اس دور میں لالہ صحرا سے اقبال کی مراد حجاز کی مخصوص تہذیب تھی اور ظاہر ہے کہ اقبال کی نظر میں مذہب بھی ذخیرۂ تہذیب و تمدن کا ضروری جزو ہے۔ صحرا کی تخصیص کی توجیہ بھی آسان ہے۔ عرب کا بیشتر حصہ صحرا ہے۔ اس مرحلہ تک اقبال لالہ صحرا کو عرب کی اور فقط عرب کی مخصوص ثقافت کی علامت کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا اقبال کے شعور کے افق پر اس علامت کی معنوی اہمیت پہلے بلال بن کر ابھری اور پھر ماہ کامل بن گئی رفتہ رفتہ اسے امتِ محمدی اور لالہ کے درمیان بہت سی مشابہتیں نظر آنے لگیں لیکن ان مشابہتوں سے

قطع نظر لالہ کے پھول ہیں پھول کی حیثیت سے بھی انہوں نے وہ کیفیت پائی جو کسی اور پھول میں نصیب نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ وہ جو احساس تھا کہ لالہ جگر سوختگانِ عشق کا مظہر کامل نہیں ہے وہ آہستہ آہستہ کم ہونے لگا۔ لالہ کو اقبال نے رفتہ رفتہ ذاتی اور علامتی طور پر سب پھولوں سے زیادہ پراسرار اور دلآویز سمجھنا شروع کر دیا۔ شکوہ میں انہوں نے کہا:

اس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں
داغ جو سینہ میں رکھتے ہیں وہ لالے ہی نہیں

واضح ہے کہ یہاں لالہ کی علامتی اہمیت قائم ہے۔ میں نے کہا تھا کہ اس دور میں لالہ کی علامتی اہمیت سے قطع نظر اقبال کو لالہ کا پھول نہایت دل آویز اور پراسرار معلوم ہوا۔ ان کے کلام کے سرسری مطالعہ سے بھی واضح ہو گا کہ سُرخ رنگ کی کوئی شکل کیوں نہ ہو، عنابی، قرمزی، گہرا خونی، سرخ، ہلکا سرخ، سیاہی مائل سرخ، شفقی سرخ رنگوں کے اس تمام سلسلہ کی مختلف لہروں کو دکھانے کے لیے وہ ہمیشہ تشبیہ کے لیے لالہ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

بزم انجم میں شفق کے رنگوں کا متنوع سلسلہ ظاہر کرنے کے لیے وہ لالہ ہی کے رنگ کا انتخاب کرتے ہیں:

سورج نے جاتے جاتے شام سیہ قبا کو
طشتِ افق سے لے کر لالے کے پھول مارے
محمل میں خامشی کے لیلائے ظلمت آئی
چمکے عروس شب کے موتی وہ پیارے پیارے

اسی دور میں وہ اپنی معرکہ کی نظم طلوع اسلام کے آخری بند میں کہتے ہیں۔

بیا ساقی نوائے مرغ زار از شاخسار آمد　　بہار آمد نگار آمد نگار آمد قرار آمد

سرِ خاکِ شہیدے برگہائے لالہ می پاشم ‏ ‏ ‏ ‏ کہ خونش با نہالِ ملت ما سازگار آمد

ملاحظہ فرمایئے گا اب لالہ کی علامتی اہمیت واضح ہوتی چلی جا رہی ہے۔ شہید کے ساتھ لالہ منسوب کر دیا گیا ہے اور شہید نہال ملت کی سازگاری ہے اب لالہ کے ساتھ صحرا کی تخصیص نہیں ہے اقبال کے ذہن میں جو وہ پرانی علامت اور جدید معنویت کے درمیان کش مکش سی جاری رہتی تھی ختم ہو چکی ہے۔ اب ہم وہ درمیانی کڑیاں بھی دیکھ سکتے ہیں جن کی وساطت سے لالہ ملت اسلامیہ کا یا امت محمدیہ کی علامت بنا ہے۔ یعنی سرخی رنگ لالہ خونِ شہیداں آبیاری نہال ملت، لالہ امت محمدی۔

لالہ کے پھول میں اور دل آویزیاں اور رعنائیاں ہیں جن کا ذکر اقبال آگے چل کر تخصیص اور توضیح سے کریں گے۔ پیام مشرق میں لالہ کے ساتھ اقبال کی وابستگی بڑھ جاتی ہے اب لالہ حسن ازل کا ترجمان اور راز داں معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ پیام مشرق کی مشہور رباعیات کا عنوان لالہ طور ہے۔ پیام مشرق کی بیشتر نظموں اور غزلوں میں لالے کے ساتھ اقبال کی دلبستگی شیفتگی کی حد تک پہنچ جاتی ہے اور جہاں اب لالہ کا پھول علامت بن کر نہیں بلکہ پھول بن کر ظاہر ہوتا ہے وہاں بھی اقبال کے بیان میں ایسی کیفیت اور سرشاری ہوتی ہے کہ باید و شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال کو محمدؐ سے جو عشق ہے اور امت محمدی سے جو محبت ہے وہ لالہ سے شیفتگی کے روپ میں جھلکتی ہے۔ پیام مشرق میں وہ کہتے ہیں :

نہ ہر کس از محبت مایہ دار است
نہ با ہر کس محبت سازگار است
بر وید لالہ بر داغ جگر تاب
دل لعل بدخشاں بے شرار است

پھر کہتے ہیں :

بادِ بہاراں وزید مرغ نوا آفرید

لالہ گریباں درید حسن گل تازہ چید

عشق غمِ نو خرید

خیز کہ در باغ و راغ قافلۂ گل رسید

لالہ کمر در کمر نیمۂ آتش بہ بر

می چکدش بر جگر شبنم اشک سحر

در شفق انجم نگر

دیدۂ معنی کشا اے زعیاں بے خبر

اسی دور میں لالہ کے متعلق اقبال نے نہایت دلآویز اور دلفریب شعر کہے ہیں۔ اب ذہن میں کوئی کش کش نہیں ہے۔ لالہ علامت بن کر فکر و شعور کا ضروری جزو بن چکا ہے اس لئے اقبال امت محمدی کے اس نشان کو جہاں دیکھتے ہیں بے تاب ہو جاتے ہیں۔ اپنے دقیق سے دقیق معانی اسی پھول کی وساطت سے ادا کرتے ہیں عجیب شیفتگی اور دل باختگی سے اس پھول کا ذکر کرتے ہیں۔ کچھ اشعار سنیئے:

شبے بہ میکدہ خوش گفت پیرِ زندہ دلے

بہ ہر زمانہ خلیل است آتش نمرود

بہار برگ پراگندہ را بہم بربست

نگاہ ماست کہ بر لالہ رنگ و آب افزود

خرد افزود مرا درس حکیمانِ فرنگ ۔۔۔ سینہ افروخت مرا صحبت صاحب نظراں

در چمن قافلۂ لالہ و گل رخت کشود ۔۔۔ از کجا آمدہ اند ایں ہمہ خونیں جگراں

بیا کہ ساقی گل چہرہ دست بر چنگ است

چمن ز باد بہاراں جواب ارژنگ است

حنا ز خون دل نو بہار می بندد

عروس لالہ چہ اندازہ تشنہ رنگ است

بالِ جبریل میں اقبال خود دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو کالا دریافت کر چکا ہے اس دور میں اس کی تمام علامات واصطلاحات منتج ہوتی ہیں۔ اس دور میں وہ اپنے مفہوم کو نہایت قطعیت سے اور بہ کمال حسن وجمال ادا کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

دیا اقبال نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا

یہ اک مرد تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا

اسی اقبال کی میں جستجو کرتا رہا برسوں

بڑی مدت کے بعد آخر وہ شاہیں زیر دام آیا

اب اس دور میں لالہ کی علامتی اہمیت کے مختلف پہلو نہایت خوبی سے روشن ہوتے ہیں۔ یہ نکتہ کہ اسلام دین فطرت ہے ایک اور حقیقت کی نقاب کشائی کے ضمن میں یوں بیان کیا گیا ہے:

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو

کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنا بندی

اس دور میں اقبال نے نہایت وضاحت سے بیان کر دیا کہ لالہ میں اسے کیا خصوصیت نظر آتی ہے۔ اب تک وہ لالہ کی دل آویزی کا شیفتہ تھا لیکن یہ تجزیہ نہیں کر سکتا تھا کہ لالہ کے پھول میں کیا بات ہے جس کی وجہ سے وہ بے ساختہ اس کی طرف کھنچتا ہے۔ شاہین کو زیرِ دام لانے کے بعد اس نے اپنی شیفتگی کا تجزیہ کرکے خود اپنے نفس پر واضح کیا کہ لالہ خاموش ہے، دلسوز ہے اور دل ہی کی

وساطت سے آفاق کو مسخر کیا جاتا ہے۔ سرمست و رعنا ہے۔ خود رو ہے۔ بیابان کی ہوا اسے راس آتی ہے۔ ذرا امتِ محمدی سے مشابہتیں دیکھیے۔ اس امت کی تہذیب اس بیابان نشین کی مرہون منت ہے۔ اس بیابان میں خلافت راشدہ کا مکمل نظام سلطنت قائم ہوا ہے۔ جہاد مسلمان کا موقف ہے۔ شہادت اس کا منصب ہے۔ لالہ خونی کفن ہے اور شہید ہونے کا خود شاید امتِ محمدی کا کوئی وطن نہیں، ہر جگہ پہنچتی ہے۔ لالہ بھی ہر جگہ ظہور کرتا ہے۔ لالہ کی یہ مشابہتیں امت محمدی سے اور لالہ کی دلاویزی کا تجزیہ "لالہ صحرا" نامی نظم میں پایا جاتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں:

تو شاخ سے کیوں پھوٹا میں شاخ سے کیوں ٹوٹا
اک جذبۂ پیدائی اک لذت یکتائی
خالی ہے کلیموں سے یہ کوہ و کمر ورنہ
تو شعلۂ سینائی، میں شعلۂ سینائی
اے بادِ بیابانی مجھ کو بھی عنایت ہو
خاموشی و دلسوزی سرمستی و رعنائی

بادِ بیابانی کا استعارہ لالے کے سلسلہ میں نہایت معنی خیز ہے۔ امتِ محمدی کا تمدن، اس کی ثقافت، اس کی تہذیب، اس کا دین و مذہب، اس کے افکار و عقائد، اس کے تصورات و میلانات اسی وقت تک صحتمند اور توانا رہے جب تک عرب کے بیابان میں محدود رہے: جوں جوں یہ تمدن دور دور کے ملکوں میں پھیلتا رہا اس کا سرچشمہ گدلا ہوتا گیا۔ ترکانِ آل عثمان سے قطع نظر کر لیجیے اور غور کیجیے کہ عجم عراق اور ہندوستان میں اس لالۂ صحرائی پر کیا بیت گئی ہے۔ نام نہاد تصوف کی بے عملی نے ویدانت کے فلسفہ کی بے ثمری نے، اس نامراد مرض نے جسے اقبال دوئی کہتا ہے اور جو آریائی اقوام سے مخصوص ہے اس لالۂ صحرا کی شکل کیسے معین کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال ہندوستان میں بیٹھ کر اس

بادِ بیابانی کے متمنی ہیں جس کے اثر سے لالۂ صحرائی پنپتا ہے۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے ان تمام پہلوؤں کی توضیح اقبال نے بالِ جبریل میں بار بار کی ہے مثلاً:

پنپ سکا نہ خیاباں میں لالۂ دل سوز
کہ ساز گار نہیں یہ جہانِ گندم و جو

چمن میں رختِ گل شبنم سے تر ہے — سمن ہے سبزہ ہے بادِ سحر ہے
مگر ہنگامہ ہو سکتا نہیں گرم — یہاں کا لالہ بے سوزِ جگر ہے

بالِ جبریل میں انھوں نے کہا اور نہایت گداز سے کہا:

عروسِ لالہ مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب
کہ میں نسیمِ سحر کے سوا کچھ اور نہیں

طارق کی دعا میں اقبال نے پھر اس بات کی توضیح کی ہے کہ عرب ثقافتِ اسلامی کا اصل سرچشمہ ہے اور امتِ محمدی کو صحت مندانہ اور توانا افکار کے لئے اسی سرچشمہ کی طرف لوٹنا ہے۔

انھوں نے کہا:

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو — عجب چیز ہے لذتِ آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن — نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے
قبا چاہیے اس کو خونِ عرب سے

ضربِ کلیم میں رموز و علائم بہت کم استعمال ہوتی ہیں یہ اعلانِ جنگ ہے واضح اور صریح اور صاف اس لئے استعارے اور تشبیہ کا متحمل نہیں ہے اس تصنیف میں اقبال نے دانستہ علائم و رموز کے استعمال سے پرہیز کیا ہے یعنی لسبتاًبات نہایت صاف اور واضح کی ہے۔ اس کے باوصف جب

مسلمان کا ذکر آتا ہے۔ اقبال لالہ کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔" مردِ مسلمان" میں کہتے ہیں:

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

اس دور میں اقبال کو اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ اس نے اپنا پیغام بہ تمام و کمال عموماً مسلمانوں تک اور خصوصاً ہند و پاکستان کے مسلمانوں تک پہنچا دیا ہے تحیّر کا عنصر جو اس کے ابتدائی کلام میں ملتا ہے۔ اب مفقود ہو گیا ہے۔ بالِ جبریل میں راز داں اور بھی پیدا ہو گئے تھے لیکن ضربِ کلیم میں اقبال کو معلوم ہوا کہ اس کا کلام، اس کا پیغام وقت کے موثرات کا جزو بن چکا ہے اور اسلامیانِ ہند و پاکستان کی ملی اور اجتماعی تعمیر میں سنگِ بنیاد کا کام دے رہا ہے۔ اب وہ افتخار کے انداز میں کہتے ہیں:

مری نوا سے گریبانِ لالہ چاک ہوا
نسیمِ صبح چمن کی تلاش میں ہے ابھی
مری خودی بھی سزا کی ہے مستحق لیکن
زمانہ دار و رسن کی تلاش میں ہے ابھی

اسی زمانہ میں اقبال نے بوثوق محسوس کیا کہ فرنگی تخیلات و تصورات کے برخلاف اس نے جو جہاد کیا ہے عموماً ممالکِ اسلامیہ اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے ایک وطن کی تحریک آگ کی طرح پھیلتی جا رہی ہے اور تمام ممالکِ اسلامی اس تحریک سے متاثر نظر آتے۔ چنانچہ ابلیس اپنے سیاسی فرزندوں کے نام فرمان جاری کرتا ہے:

اہلِ حرم سے ان کی روایات چھین لو

آہو کو مرغزارِ ختن سے نکال دو

اقبال کے نفس سے ہے لالہ کی آگ تیز

ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو

ظاہر ہے کہ اس فرمان کی پیروی کی گئی لیکن اس غزل سرا کو چمن سے نہ نکلوایا جا سکا۔ اور آخر اس کی نغمہ سرائی نے کبوتر کے تنِ نازک میں شاہین کا جگر پیدا کر کے وہ معجزہ کر کے دکھا دیا جسے آج ہم احیائے ملی کہتے ہیں اور جس کا ایک مظہر پاکستان ہے۔

علامہ نے جب اسرار خودی لکھی تو لالہ کی نئی معنویت ابھی ان کے افق شعور پر نہیں ابھری تھی۔ چنانچہ اسرار کے مصرعہ میں وہ فلسفہ کی آگ کو لالہ کی آگ کی طرح سرد قرار دیتے ہیں۔[1]

(۴) لالۂ صحرا: اسرار کی تلمیحات میں یہ عرض کیا گیا تھا کہ لالہ کی نئی معنویت ابھی علامہ کے افقِ شعور پر نہیں ابھری کتاب کے آخر میں انھوں نے جو مصرعہ لکھا ہے کہ:

من مثالِ لالۂ صحرا ستم

تو یہ گمان گزرتا ہے کہ نہاں خانۂ قلب میں یہ خیال کہیں ضرور نمو پا رہا تھا کہ لالہ کی برائی علامت سے نیا کام لیا جا سکتا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ لالہ میں قطعاً کوئی خوبی نہ ہوتی تو علامہ اپنے آپ کو[2] اس سے تشبیہ نہ دیتے۔ بظاہر صرف لالہ کی تنہائی کا ذکر ہے اور نا قدردانی کا لیکن یہی تصور[3] آگے چل کر یہ شکل اختیار کریں گے کہ لالہ پنپتا ہی صحرا میں ہے۔

---

[1] انتقاد: سید عابد علی عابد، ادارہ فروغِ اردو لاہور۔ "اقبال کے کلام میں لالہ کی علامتی اہمیت کا ارتقا"

[2] اقبال نامہ (مکاتیبِ اقبال)۔

[3] اقبال جدید تشکیل: عزیز احمد۔

م

(۱) ماہ از انگشتِ او شق می شود

علامہ لکھتے ہیں کہ تلمیح ہے معجزہ شق القمر کی طرف۔ بیان کیا جاتا ہے کہ رسول پاک نے انگلی کے اشارہ سے چاند کے دو ٹکڑے کر دیے تھے۔[۱]

(۲) ماہ را روزی رسد از خوانِ مہر

اب مسلّم ہے کہ چاند بذاتِ خود مستنیر نہیں بلکہ سورج سے اکتسابِ نور کرتا ہے۔ چاند میں جو داغ سے نظر آتے ہیں ان کو بطریقِ تعبیرِ شاعرانہ علامہ نے "داغِ احسانِ مہر" کہا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ داغ کیسے ہیں بعض سائنسدان کہتے ہیں کہ یہ بہت گہرے گڑھے ہیں اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ چاند کی غاریں ہیں۔ چاند پر آبادی کا ہونا مشکوک ہے اگرچہ مستبعد نہیں۔ یہ بھی مسلّم ہے کہ چاند زمین ہی کا ایک ٹکڑا تھا اور اس سے جدا ہو کر اس کا طواف کر رہا ہے۔[۲]

---

[۱] اسرار و رموز، مبارک علی سنہ ۱۹۴۳ء [۲] چاند کے کوائف کے متعلق ویلز نے ایک عجیب ناول لکھا ہے یعنی First Men in the moon! - چاند تک پہنچنے والے انسان اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ ویلز نے چاند کے متعلق مختلف بیانات کی کیا توجیہ کی ہے۔

(۳) **مخدوم علی ہجویری (ریند):** حضرت شیخ ابوالحسن علی ہجویری جیسا کہ ان کے پورے نام سے ظاہر ہے۔ پہلے ہجویری میں قیام پذیر تھے کہ غزنی کے نواح میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ مشہور ہے کہ سال ولادت ۴۰۰ھ ہے۔ آپ کا سلسلہ نسب امام حسن بن علی مرتضیٰ تک پہنچتا ہے۔ تحصیلِ علوم و فنون کے متعلق معلومات بہت کم دستیاب ہوئی ہیں۔ خود انھوں نے اپنی تصنیف کشف المحجوب میں جہاں اپنے اساتذہ کا ذکر کیا ہے وہاں ابوالعباس بن محمد کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ ان کے متعلق حضرت لکھتے ہیں کہ وہ علم اصول و فروع میں امام تھے اور ان کا شمار اکابر اہل تصوف میں ہوتا تھا۔

یہ بھی مسلم ہے کہ انھوں نے شیخ ابوالقاسم عبدالکریم سے بھی استفادہ کیا۔ ابواحمد المظفر بن احمد کی تصنیفات اور تعلیمات کا ان پر بہت گہرا اثر ہوا ہے۔ ان کے مجاہدہ اور مشاہدہ کی بہت تعریف کرتے ہیں۔

علمِ تصوف کے دقائق و رموز انھوں نے ابوالفضل محمد بن حسن سے سیکھے کہ سلسلہ جنیدیہ سے منسوب تھے۔ جب حضرت شیخ تصوف کے رموز و دقائق سے آگاہ ہوئے تو طبعاً دل میں یہ اشتیاق پیدا ہوا کہ ممالک اسلامیہ کے دوسرے شیوخ و اکابر سے مل کر فائدہ اٹھانا چاہیے۔ چنانچہ وطن سے نکلے اور سیر و سیاحت شروع کی۔ شام، عراق، بغداد، آذربائیجان، طبرستان ماوراء النہر کو کھنگال ڈالا اور جہاں کوئی صاحبِ کمال ملا اس سے استفادہ کیا۔ شیخ ابویزید کے مزار پر تین مہینے تک مجاہدہ میں مشغول رہے۔

کشف المحجوب ہی میں بہت بے تکلفی سے بیان کرتے ہیں کہ کسی پر غائبانہ عاشق ہو گئے تھے لیکن جب عشق فسق میں تبدیل ہونے کا امکان پیدا ہوا تو خدا نے ان کو توفیق ارزانی فرمائی کہ اس فتنہ سے بچ جائیں۔ اس واقعہ کے بعد عشق تو کجا کسی کے نکاح کی نوبت بھی نہیں آئی۔ آخر

ان کے پیر نے (فوائد الفواد میں شیخ نظام الدین اولیا۔ کی زبانی یہ روایت بیان کی گئی ہے) کہا کہ لاہور جاؤ۔ ان دنوں شیخ حسین زنجانی جن کا شمار اکابر صوفیہ میں ہوتا ہے لاہور ہی میں مقیم تھے، ہجویری، نے کہا کہ میں لاہور جا کر کیا کروں گا زنجانی جو ہیں۔ حکم ہوا نہیں ضرور جاؤ چنانچہ لاہور آئے۔ اتفاق کی بات ہے۔ رات کو وہ لاہور پہنچے صبح زنجانی کا وصال ہو گیا۔

ہندوستان میں بہت خوش نہ تھے اور ایک جگہ تو یہ بھی لکھتے ہیں کہ مجھ پر صحبتِ ناجنس کی بلا نازل ہو چکی ہے۔ مرتے دم تک لاہور ہی میں قیام پذیر ہوئے۔ یہیں وصال ہوا۔ سالِ وفات ۴۶۵ھ ہے۔ عام طور پر داتا گنج بخش کے نام سے مشہور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے جب ان کے مرقد مبارک کے قریب چلّہ کاٹا تو رخصت ہوتے وقت یہ شعر پڑھا:

گنج بخشِ ہر دو عالم مظہرِ نورِ خدا

کاملاں را نورِ کامل ناکساں را رہنما

لیکن اس شعر کی یہ صورت زیادہ مشہور ہے:

گنج بخشِ فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا

ناکساں را پیرِ کامل، کاملاں را رہنما

بعض تذکرہ نگار یہ کہتے ہیں کہ جب خواجہ نے انھیں گنج بخش کہا تو اس کے بعد عام لوگ بھی انھیں داتا گنج بخش کہنے لگے۔ لوگوں کو ان سے کتنی عقیدت تھی اور وہ ہر طبقہ میں کس قدر مقبول تھے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ خود دارا شکوہ بھی ان کے متعلق لکھتا ہے کہ جو شخص چالیس روز ان کے روضہ کا طواف کرتا ہے اس کی ہر حاجت پوری ہوتی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ فقیر نے بھی (یعنی میں نے) ان کے روضہ منورہ کی زیارت کی ہے۔

ان سے جو کتابیں منسوب ہیں ان میں مشہور ترین یہ ہیں۔

(۱) منہاج الدین (۲) کتاب الفناء والبقا

(۳) بحر القلوب (۴) کشف المحجوب

افسوس ہے کہ ان تصانیف میں سے ہم تک صرف کشف المحجوب پہنچی ہے۔ اس کی تصنیف کا سبب یہ ہے کہ ابو سعید ہجویری نے تصوف کے رموز و اشارات سے آگاہ ہونا چاہا اور اس سلسلہ میں کچھ استفسارات کئے۔ حضرت شیخ نے جواب میں جو کچھ لکھا ہے وہ کشف المحجوب کے نام سے مشہور ہے۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن لکھتے ہیں:

"اس کے ذریعہ گویا پہلی مرتبہ اسلامی تصوف کو ہندوستان میں پیش کیا گیا ہے"۔

اس تصنیف میں عرفان و اخلاق اور تصوف کے حقائق و رموز سے بحث کی گئی ہے۔ یہ جو بعض لوگ سمجھتے کہ تصوف میں ترک شریعت وعبادات جائز ہے تو ان کو متنبہ کرتے ہوئے حضرت شیخ لکھتے ہیں:

"ظاہر بغیر باطن کے منافقت ہے اور باطن بغیر ظاہر کے زندقہ۔ علم باطن حقیقت اور علم ظاہر شریعت ہے"۔

کشف المحجوب میں فقر کے مطالب و معانی سے بھی بحث کی گئی ہے اور اس سلسلہ میں مشائخ عظام کے جو اقوال ہیں ان کی تشریح و توضیح بھی کی گئی ہے۔

حضرت شیخ نے صوفی اور تصوف کے متعلق بھی بہت دقیق بحث کی ہے لیکن وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ صوفی نہ صوف سے ہے نہ صفّہ سے

بلکہ صوفی وہ ہے جس کا دل کدورت سے پاک اور صاف ہو کہ تصوف باب تفعّل سے ہے اور اس کا خاصہ تکلف ہے اور ظاہر ہے کہ صوفی اپنے نفس پر تکلیف اٹھاتا ہے اور یہی تصوف کے اصلی معنی ہیں"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ کا خیال ہے کہ صوفی کا تعلق صفا سے ہے لیکن محققین نے یہ کبھی تسلیم نہیں کیا .... اور اب اس بات پر قریب قریب اتفاق رائے ہے کہ صوفی کا مادہ صوف ہے یعنی وہ لباس مخصوص جو صوفی پہنتے تھے۔

چودھویں باب میں صوفیوں کے مختلف فرقوں اور ان کے عقائد سے بحث کی ہے۔ یہ بہت اہم باب ہے اور اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ارباب تصوف کے اختلافات کا ماخذ کیا ہے۔

آخر میں سماع کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ سماع جائز ہے مگر شرط یہ ہے کہ سالک ان پابندیوں سے محفل سماع میں شریک ہو:

۱۔ جب تک وجد وحال کی ضرورت محسوس نہ کرے سماع نہ سنے۔

۲۔ طویل وقفوں کے بعد محفل سماع میں شرکت کرے تاکہ سماع کی تعظیم دل میں قائم رہے۔

۳۔ محفل میں مرشد موجود ہوں۔

۴۔ عوام شریک نہ ہوں۔

۵۔ قوال فاسق اور فاجر نہ ہوں۔

۶۔ سماع کے وقت دل علائق دنیوی سے خالی ہو اور طبیعت لہو ولعب کی طرف مائل نہ ہو۔

۷۔ وجد طاری ہو تو تکلف سے اس کیفیت کو نہ روکے۔

۸۔ محفل سماع میں کمسن لڑکے نہ ہوں۔

۹۔ رقص ہرگز نہ ہو کہ بہرحال ناجائز وحرام ہے۔

نکلسن نے قاموس مذاہب واخلاق میں تصوف پر جو مقالہ لکھا ہے اس میں بھی اس بات کی تشریح کی ہے کہ صوفیوں کے مختلف فرقوں کے اختلافات اس قدر بڑھ گئے تھے کہ ایک

گروہ دوسرے گروہ کو صوفی کہہ کر پکارتا تو اس سے مراد تحقیر ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ صوفی سے حافظ نے مردِ ریاکار مراد لیا ہے۔

سماع کے سلسلہ میں بھی محققین نے عموماً حضرت ہجویری کی شرائط کو تسلیم کر لیا ہے۔ کمسن لڑکوں کی موجودگی والی شرط بہت اہم ہے کیونکہ اس سے بہت سی خرابیاں ہونے کا امکان ہے۔ یوں بھی صوفیوں کے بعض گروہ عشق مجازی کے ذریعہ عشق حقیقی کی منزل تک پہنچتے ہیں اور کمسن لڑکوں کو مظہرِ حسن سمجھ کر ان سے عشق کرتے ہیں۔ اس مسلک کے خلاف سعدی نے شدید قلمی جہاد کیا ہے۔ اس نے بوستان میں یہ کہا ہے کہ جو لوگ کمسن لڑکوں میں خدا کا جلوہ دیکھتے ہیں انہیں دودھ پینے والے بچے میں یہ جلوہ کیوں نظر نہیں آتا ہمیشہ خوبرو امردوں میں کیوں نظر آتا ہے۔ ان اشعار کا سلسلہ یوں شروع ہوتا ہے:

گروہے نشیند با خوش پسر — کہ ما پاک بازیم و اہلِ نظر[۱]

(۴) مردِ کاسب را حبیب اللہ گفت

خود علامہ لکھتے ہیں کہ حدیث کی طرف اشارہ ہے "الکاسب حبیب اللہ" یعنی کما کر کھانے والا اللہ کی بارگاہ میں مقبول ہوتا ہے۔

(۵) **مسلکِ گوسفندی (از گروہِ گوسفندانِ قدیم)**: اس تلمیح کی توضیح کے لئے ضروری ہے کہ وہ روایت بھی مختصراً بیان کر دی جائے جو مسلک گوسفندی کا ماخذ ہے۔ علامہ اسرار

---

[۱] تصوفِ اسلام: عبدالماجد دریابادی۔ — بزمِ صوفیا: صباح الدین عبدالرحمٰن۔

نکلسن کا مقالہ تصوف پر قاموس مذاہب و اخلاق میں۔ — نکلسن کی انگریزی تصنیف مسلمان صوفی۔

ثقافتِ اسلامی کا خاکہ: شوستری (انگریزی)۔ — تاریخ ادبیات ایران (جلد اول) براؤن۔

تصوف اور اردو شاعری: صفی حیدر۔ — غزالی نامہ: جلال ہمائی۔

دہلی بارھویں صدی میں: مرتبہ مظفر حسین (متن فارسی میں ہے)۔ — اہلِ مسجد: عبدالسبحان۔

غیب و شہود: ایڈ نگٹن کی انگریزی کتاب کا ترجمہ از سید نذیر نیازی (لاہور)۔

ہیں لکھتے ہیں کہ ایک گوسفند نے شیران خون آشام کے سامنے یہ وعظ کیا کہ گوسفند کا شکار کرنا کوئی بڑی بات نہیں، اپنے نفس کو ذبح کرو۔ یہ دنیا اور کائنات ہیچ ہے۔ شیر اس تقریر دلپذیر سے متاثر ہوکر شکار سے باز آگیا اور گھاس کھانے لگا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ دانت تیز رہے نہ دل میں تقاضائے عمل قائم رہا۔ بے ہمتی پیدا ہوئی اور اس سے کوتاہ دستی، بے دلی اور دون فطرتی وجود میں آئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ ہر اس مفکر کو یا فلسفی کو جو انسان کو عمل سے محروم کرنا چاہتا ہے مسلک گوسفندی کا مبلغ خیال کرتے ہیں۔ پہلے ایڈیشن میں حافظ کا ذکر بھی گوسفندوں ہی میں تھا اس کی تفصیل آگے آتی ہے لیکن سب سے مقدم علامہ نے افلاطون کو رکھا ہے جو معقول و نامحسوس کی تاریکیوں میں کھو گیا جس نے اس عالم اسباب کو افسانہ سمجھا اور جس نے ہنگامہ کائنات کی نفی کر کے اعیان نامشہود کا نظریہ پیش کیا۔

افلاطون کہتا ہے کہ انسان کا فرض ہے کہ صحیح طور پر فکر کرنا سیکھے اور اس کی صورت یہی ہے کہ وہ اعیان کے نظریہ کا مطالعہ کرے۔ وہ کہتا ہے کہ تمام مظاہر، تمام تجارب حسی اور تمام ادراکات کے پیچھے کچھ تعمیمات ہیں کلیات ہیں لہٰذا تقاضے رجحانات ہیں ان تعمیمات اور رجحانات کا ادراک نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا صرف تعقل کیا جا سکتا ہے۔ یہ تعمیمات، قوانین یا اعیان زیادہ پائدار ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان تمام مظاہر پر فائق ہیں جنھیں ہم اپنے حواس کے ذریعہ پہچانتے ہیں۔ زید، عمرو، بکر فانی ہیں لیکن انسان پائدار ہے۔ میں ایک دائرہ بناتا ہوں اور پھر خود ہی ربڑ سے اسے مٹا دیتا ہوں لیکن اس کے باوجود دائرہ کا تعقل دائماً باقی رہتا ہے۔ درخت گرتے ہیں اور نشو و نما پاتے ہیں لیکن درختوں کے نمو اور ان کے زوال کی اصل وہ قوانین ہیں جو ازل اور ابد سے بکنا رہیں۔

سپائنوزا نے یہ بات یوں کہی ہے کہ خدا اور فعالیت اور مساحت کے قوانین ایک ہی

حقیقت کے دو نام ہیں اسی بنا پر افلاطون نے یہ کہا تھا کہ ریاضی تحصیل کیے بغیر فلسفہ کی تحصیل ناممکن ہے اور وہ اس بات کا بھی مدعی تھا کہ ریاضی ہی میں فلسفہ کی کامل ترین صورت کا اظہار ہوتا ہے۔

تو معلوم ہوا کہ افلاطون یہ کہتا ہے کہ اس دنیائے محسوس و مشہود کو ناپائدار اور وہمی تصور کرو اور صرف تعقلات کو حقیقت پر مبنی سمجھو۔ اس تعلیم کا نتیجہ عملاً یہ ہوتا ہے کہ انسان بجائے اس کے کہ تسخیر کائنات کی طرف متوجہ ہو علم برائے محض علم کی خاطر حاصل کرتا ہے۔ اس کی قوت عمل مردہ ہو جاتی ہے۔ ارسطو نے اس نظریہ کو مورد انتقاد بنایا ہے، خود علامہ لکھتے ہیں:

اس شعر میں افلاطون کے مشہور مسئلہ اعیان کی طرف اشارہ ہے جس پر ارسطو نے نہایت عمدہ تنقید کی ہے۔ افسوس ہے کہ اس مسئلہ کی توضیح اس جگہ ناممکن ہے۔ فارابی نے الجمع بین الرائین میں ارسطو اور افلاطون کو ہم خیال ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جو میرے نزدیک ناکام رہی ہے۔ ملّا ہادی سبزواری نے جو حال کے ایرانی حکما میں سے ہیں اپنی کتاب اسرار الحکم میں زیادہ تر افلاطون کا تتبع کیا ہے۔ عربی اور فارسی جاننے والے ناظرین ان کتب کی طرف توجہ کریں۔ انگریزی دانوں کو فلسفۂ مغرب کی کسی انگریزی تاریخ سے ان مسائل کی حقیقت مختصر طور پر معلوم ہو جائے گی۔"

تصوف نے افلاطون کے اس نظریہ کو اپنا لیا اور اس عالم اسباب کو عالم وہم و گمان گردانا یہاں تک کہ تصوف میں کائنات کی حیثیت وہی ہو گئی جو "مایا" کی ہوتی ہے (عرف عام میں، یعنی فریب، دھوکا)، اس سے مسلمانوں کے ذوقِ عمل کو سخت ضعف پہنچا۔ انسان جسے تسخیر کائنات پر مامور کیا گیا تھا، یہ سمجھ بیٹھا کہ کمال تسخیر انفس و آفاق میں نہیں بلکہ اس میں ہے کہ اپنے نفسِ امارہ کو کچل دے اس ضمن میں قوائے عمل بھی کچلے گئے۔ فنا تصوف کا آخری مقام ہمارا سرار بنا جہاں

صوفی تمام خواہشات نفسانی سے پاک ہو کر عالمِ وہم و گمان سے تعلقات منقطع کر لیتا ہے۔ غالب نے کہا

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

حافظ شیرازی نے بھی عجمی تصوف کے اس منفی پہلو کو اپنے اشعار میں نمایاں کیا تھا اور کہا تھا کہ یہ دنیا وہم و گمان سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بادۂ ناب کو فرار کا سبب بھی بنایا تھا کہ عالمِ سرخوشی کے عالم میں اس دنیا کی تکلیفات کو بھول جائے۔ ماحول سے بے نیاز ہو جائے اپنی آنکھیں بند رکھے۔ خارجی واقعات سے قطعاً متاثر نہ ہو اور واردات قلب کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا پھرے۔ علامہ نے اکثر اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ایک زوال پذیر فن کار چنگیز سے زیادہ مہلک ثابت ہو سکتا ہے کہ وہ روح کا ذوقِ عمل سلب کر لیتا ہے۔ حافظ کے کلام کی رنگینی نے اس کی تعلیمات کو اور بھی زیادہ مہلک اور موثر بنا دیا تھا۔ اسی لئے علامہ نے اسرار خودی کے پہلے ایڈیشن میں مسلکِ گوسفندی کی تشریح کرتے وقت حافظ کا نام بھی لیا۔ خود علامہ اقبال نے مثنوی کے دیباچہ میں لکھا:

"مغربی ایشیا میں اسلامی تحریک بھی ایک نہایت زبردست پیغامِ عمل تھی۔ گو اس تحریک کے نزدیک انا ایک مخلوق ہستی ہے جو عمل سے لازوال ہو سکتی ہے۔ مگر مسئلہ انا کی تحقیق و تدقیق میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی ذہنی تاریخ میں ایک عجیب مماثلت ہے اور وہ یہ کہ جس نقطۂ خیال سے سری شنکر نے گیتا کی تفسیر کی، اسی نقطۂ خیال سے شیخ محی الدین ابن عربی اندلسی نے قرآن شریف کی تفسیر کی جس نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر نہایت گہرا اثر ڈالا ہے۔ شیخ اکبر کے علم و فضل اور ان کی زبردست شخصیت نے مسئلہ وحدت الوجود کو جس کے وہ انتھک مفسر تھے اسلامی تخیل کا ایک لاینفک عنصر بنا دیا۔ اوحد الدین کرمانی

اور فخر الدین عراقی ان کی تعلیمات سے نہایت متاثر ہوئے اور رفتہ رفتہ چودھویں صدی کے تمام عجمی شعراء اسی رنگ میں رنگین ہو گئے۔ ایرانیوں کی نازک مزاج اور لطیف الطبع قوم اس طویل دماغی مشقت کی کہاں تک متحمل ہو سکتی تھی جو جزو سے کل تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے۔ انھوں نے جزو اور کل کا دشوار گذار درمیانی فاصلہ تخیل کی مدد سے طے کر کے "رگ چراغ" میں "خون آفتاب" کا اور "شرار سنگ" میں "جلوہ طور" کا بلا واسطہ مشاہدہ کیا۔ مختصر یہ کہ ہندو حکماء نے مسئلہ وحدۃ الوجود کے اثبات میں دماغ کو اپنا مخاطب کیا مگر ایرانی شعراء نے اس مسئلہ کی تفسیر میں زیادہ خطرناک طریق اختیار کیا یعنی انھوں نے دل کو اپنی آماجگاہ بنایا اور ان حسین و جمیل نکتہ آفرینیوں کا آخر کار یہ نتیجہ ہوا کہ اس مسئلہ نے عوام تک پہنچ کر قریباً تمام اسلامی اقوام کو ذوق عمل سے محروم کر دیا۔"

علامہ نے حافظ کے متعلق جو کچھ لکھا تھا وہ ایسا نہ تھا کہ اس پر ہنگامہ بپا ہوتا لیکن ہوا۔ اب کہ امتداد زماں نے بہت سے الجھے ہوئے مسئلے صاف کر دئے ہیں اور یہ بات مسلم ہے کہ حافظ کی غزل کتنی ہی دلپذیر کیوں نہ ہو لیکن اس کا تصوف ذوق عمل کے لئے مضر ہے۔ ہم کچھ اشعار نقل کرتے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ علامہ کو حافظ کے کلام کے کن عناصر پر اعتراض تھا۔

ہوشیار از حافظ صہبا گسار
جامش از زہر اجل سرمایہ دار
رہن ساقی خرقہ پرہیز او
مے علاج ہولِ رستاخیز او
آں فقیہ ملتِ مے خوارگاں
آں امام امتِ بے چارگاں

بے نیاز از محفلِ حافظ گذر
الحذر از گوسفنداں الحذر

جب ان اشعار کے خلاف ہنگامہ برپا ہوا تو علامہ نے بھی اپنی مدافعت میں کچھ مضامین لکھے اور اس کے بعد بھی اپنے خطوط میں بعض گتھیاں سلجھائیں۔

انھوں نے لکھا کہ:-

"شاعرانہ اعتبار سے میں حافظ کو نہایت بلند پایہ سمجھتا ہوں۔ جہاں تک فن کا تعلق ہے یعنی جو مقصد اور شعراء پوری غزل میں بھی حاصل نہیں کر سکتے، خواجہ حافظ اسے ایک لفظ میں حاصل کرتے ہیں۔ اس واسطے کہ وہ انسانی قلب کے راز کو پوری طور پر سمجھتے ہیں۔ لیکن فردی اور ملی اعتبار سے کسی شاعر کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لئے کوئی معیار ہونا چاہیے۔ میرے نزدیک وہ معیار یہ ہے کہ اگر کسی شاعر کے اشعار اغراضِ زندگی میں ممد ہیں تو وہ شاعر اچھا ہے اور اگر اس کے اشعار اغراضِ زندگی کے منافی ہیں یا زندگی کی قوت کو کمزور اور پست کرنے کا میلان رکھتے ہیں تو وہ شاعر خصوصاً قومی اعتبار سے مضرت رساں ہے۔ ہر شاعر کم و بیش گرد و پیش کی اشیاء عقائد، خیالات و مقاصد کو حسین و جمیل بنا کر دکھانے کی قابلیت رکھتا ہے اور شاعری نام ہی اس کا ہے کہ اشیاء و مقاصد کو اصلیت سے حسین تر بنا کر دکھایا جائے تاکہ اوروں کو ان اشیاء و مقاصد کی طرف توجہ ہو اور قلوب ان کی طرف کھنچ کر آئیں۔ ان معنوں میں ہر شاعر جادوگر ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ کسی کا جادو کم چلتا ہے کسی کا زیادہ۔ خواجہ حافظ اسی اعتبار سے سب سے بڑے ساحر ہیں مگر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ وہ کون سے مقاصد یا حالت یا خیال کو محبوب بناتے ہیں اس کا جواب اوپر آ چکا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ وہ ایک ایسی کیفیت کو محبوب بناتے ہیں جو اغراضِ زندگی کے منافی ہو بلکہ زندگی کے لیے مضر ہے۔ جو حالت خواجہ حافظ اپنے پڑھنے والے کے دل میں پیدا کرنا چاہتے ہیں (یعنی بحیثیت صوفی ہونے کے) وہ حالت ان افراد و اقوام کے لئے جو زمان و مکان کی دنیا میں رہتے ہیں نہایت خطرناک ہے۔ حافظ کی دعوت موت کی طرف ہے جس کو وہ اپنے کمالِ فن سے شیریں کر دیتے ہیں تاکہ مرنے والے کو اپنے دکھ کا احساس نہ ہو۔[۵]

---

[۱] داستانِ فلسفہ (انگریزی) ڈیورانٹ۔ اسرار و رموز (یکجا ۱۹۴۸ء)۔

مجلہ اقبال لاہور اکتوبر ۱۹۵۳ء و اپریل ۱۹۵۴ء محمد عبداللہ قریشی کا مضمون "معرکۂ اسرارِ خودی"۔

قرآن اور تصوف: میر ولی الدین۔ اقبال نامہ (مکتوباتِ اقبال)۔

تاریخِ فلسفہ اسلام: ڈی اولیری (انگریزی)۔ فلسفۂ اسلام: بوئر (انگریزی)۔

ثقافتِ اسلامی کا خاکہ: شوستری (انگریزی)۔ "حافظ شیرازی": مجلہ اقبال جولائی ۱۹۵۵ء۔

رومی: افضل اقبال مطبوعہ بزم اقبال لاہور۔ اقبال جدید تشکیل: عزیز احمد۔

غزالی نامہ: جلال ہمائی۔ تاریخِ تصوف در اسلام: قاسم غنی۔

فرہنگ مصطلحاتِ صوفیہ منقول در تاریخ تصوف در اسلام۔ شاہ ولی اللہ کی تصانیف۔

موجِ کوثر: محمد اکرام۔ رودِ کوثر: محمد اکرام۔

مقدمہ مرقع چغتائی از اقبال۔ دیباچہ اسرارِ خودی، انگریزی ترجمہ نکلسن۔

نکلسن کا مقالہ تصوف پر، قاموس مذاہب و اخلاق۔ اردو شاعری میں تصوف: اعجاز حسین۔

کشف المحجوب: ہجویری۔ گلشنِ راز: محمود شبستری۔

شرحِ گلشنِ راز: لاہجی۔ نکات بیدل۔

بیدل: خواجہ عباد اللہ اختر مطبوعہ ثقافت اسلامیہ لاہور۔ شعر العجم (جلد پنجم) شبلی۔

نکلسن کا مقالہ تصوف پر، میراث اسلام (انگریزی) مرتبہ آرنلڈ، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔

لغتِ فلسفہ۔ ریونز (انگریزی) نیویارک۔ لغتِ نفسیات: ڈریور (انگریزی)۔

علامہ اقبال کے خطبات (انگریزی)۔ مکالماتِ افلاطون (انگریزی) بالخصوص جمہوریت در انتقادہ

استدراک: اس سلسلہ میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ علامہ نے افلاطون کی تعلیمات کا جو تصور پیش کیا ہے اس سے قارئین کو مغالطہ ہو سکتا ہے۔ اس مغالطہ کی حقیقت ان ہی کے الفاظ میں قابلِ دید ہے:

"اس نظریہ سے افلاطون اور ارسطو دونوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ عقل یا علم اصلی چیز ہے (باقی صفحہ آئندہ پر)

(۶) **ملت بیضا:** مسلمان مراد ہے۔ ملت دین کو بھی کہتے ہیں اور گروہ اور شریعت کو بھی اور بیضا کے معنی ہیں روشن اور سپید۔ تو ملت بیضا کے معنی وہ قوم یا گروہ ہے جس کی تعلیمات اور جس کا مستقبل روشن ہو۔

(۷) **میاں میر (حضرت):** شیخ محمد میر (جو حضرت میاں میر کے نام سے زیادہ مشہور ہیں) کے متعلق مستند حالات بہت کم ملتے ہیں۔ نور احمد چشتی اپنی مشہور کتاب تحقیقاتِ چشتی میں لکھتے ہیں:۔

(بقیہ استدراک صفحہ گزشتہ) اور عمل اس کے مقابلہ میں ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ بہترین زندگی عمل اور مقاصد آفرینی کی زندگی نہیں بلکہ عقلِ کل کا تماشائی ہونا ہے۔ خدا جو تمام وجود کا ماخذ اور نصب العین ہے وہ بھی غیر متحرک اور غیر فاعل ہے۔ دنیا کی زندگی حقیقت کا سایہ ہے یا ہندوؤں کی اصطلاح میں یوں کہیئے کہ مایا ہے یا حقیقت کے مقابلہ میں بے مایہ ہے۔

اقبال افلاطون کے اس نظریہ وجود کا شدید مخالف ہے۔ وہ اس کو اساسی طور پر غلط قرار دیتا ہے اور اس کا خیال ہے کہ اسی نظریہ وجود کی زیر اثر زندگی سے فرار کے نظریات پیدا ہوئے ہیں جن سے انسانی زندگی ارتقاء اور تخلیق سے محروم ہو گئی ہے۔ اقبال کے نزدیک وجود کی حقیقت عقل نہیں بلکہ عمل ہے۔ عقل عمل سے پیدا ہوتی اور اس کی آلہ کار بنتی ہے۔ اصل حیات تسخیر و تخلیق اور مقاصد آفرینی ہے۔ وجود کی حقیقت ایک انائے مطلق ہے۔ جو خلاق ہے اور یہ انا اپنی مسلسل خلاقی میں لا تعداد انا یا نفوس مقاصد کوش پیدا کرتا ہے۔ زندگی جذبۂ آفرینش ہے عمل آفرینش ہی سے اس کو اپنا عرفان حاصل ہوتا ہے اور عمل ہی اس کی لا متناہی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ سکون سے زندگی کا تماشا کرنے سے زندگی کی ماہیت معلوم نہیں ہو سکتی کیونکہ زندگی ایک مسلسل حرکت ہے اور عقل کے تصورات ازلی طور پر ساکن اور جامد ہیں۔ ساحل افتادہ نہ اپنی ماہیت سے آگاہ ہو سکتا ہے اور نہ اس دریا کی حقیقت سے جو اس کے آغوش میں متلاطم ہے۔ اقبال نے اپنا یہ نظریہ کس خوبصورتی اور بلاغت سے بیان کیا ہے:

ساحل افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم　　ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من کیستم
موج ز خود رفتۂ تیز خرامید و گفت　　ہستم اگر میروم گر نہ روم نیستم

افلاطون کے ہاں موج متحرک ہے لیکن موج کا عقلی تصور ساکن ہے اور یہ ساکن عقلی تصور متحرک موج کے مقابلہ میں زیادہ حقیقی ہے۔

تموج کے مقابلہ میں اس کا محض تصور قائم کرنا ایک الٰہی اغواز ہے۔

"تولد ان کا شہر سپتان میں سال ۹۵۷ھ ہوا اور وفات آپ کی بروز سہ شنبہ وقت نماز ظہر ساتویں ربیع الاول ۱۰۴۵ھ کے ہوئی اور قریب ساٹھ سال رونق افزائے لاہور رہے۔"

مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ شہر سپتان کہاں واقع ہے۔ اگر سپتان سے پہلے شہر کا کلمہ نہ ہوتا تو گمان ہو سکتا تھا کہ یہ کتابت کی غلطی ہے اور اصل کلمہ سیستان ہے۔ ہو سکتا ہے کہ صاحب تحقیقات چشتی نے ولایت سیستان کو شہر سپتان لکھ دیا ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خود بھی لکھتے ہیں کہ جناب میاں میرؒ

(بقیہ استدراک صفحہ گزشتہ) عاقل کا وظیفہ حیات بھی ہونا چاہیے کہ وہ خود تھپیڑے نہ کھائے بلکہ عقل کے ساحل پر بیٹھا ہوا یکسار رہ کر اس کے غیر متغیر اور غیر متموج تصور میں اپنے نہیں کھو کر اپنی حقیقت کو پائے۔ اقبال کے ہاں زندگی مقدم ہے اور عقل موخر۔ زندگی جو کچھ پیدا کرتی ہے عقل بعد میں اس کا جائزہ لے کر اس میں قواعد و ضوابط کو ڈھونڈتی ہے۔ حریم حیات میں عقل حلقہ بیرون در ہے وہ آستاں سے دور نہیں ہے لیکن اس کی تقدیر میں حضور نہیں ہے۔ زندگی آپ اپنا نور پیدا کرتی ہے لیکن اس نور کو اگر عقل نار حیات سے الگ کر کے ایک ازلی مجرد حقیقت سمجھ لے تو معقولات ظلمت کدہ بن جاتے ہیں۔ زندگی کا آب حیات ظلمت میں گم ہو جاتا ہے اسی لئے اقبال افلاطون کی بابت کہتا ہے

رخش او در ظلمت معقول گم ۔۔۔ در کہستان وجود افگندہ سم
آں چناں افسون نامحسوس خورد ۔۔۔ اعتبار از دست و چشم و گوش برد

ترجمہ:۔ ہوا رہوار اُس کا فلسفہ کی ظلمتوں میں گم
نہ کوہستان ہستی میں جمے اس کے کہیں پر سم
کیا یوں سر پہ نامحسوس کا جادو سوار اس نے
کہ چھینا ہاتھ، کان اور آنکھ سے سب اعتبار اس نے

اقبال کہتا ہے کہ محسوس کو نامحسوس کے مقابلہ میں بے حقیقت قرار دینا انسان کو عالم رنگ و بو سے بے تعلق کر دیتا ہے اسی سے فرار و گریز پیدا ہوتا ہے اور رہبانیت کو تقویت حاصل ہوتی ہے جس کی نفس کشی حیات کشی تک پہنچ جاتی ہے اور اسی لئے اسلام نے مرد مومن کو اس سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ قرآن کریم کی تعلیم ہے کہ مظاہر و حوادث انفس و آفاق آیات اللہ ہیں یہ سراسر حقیقت ہیں۔ نہ باطل ہیں، نہ فریب ادراک اور نہ اس سے گریز کر کے عرفان نفس یا عرفان خدا حاصل ہو سکتا ہے۔ تصوف کے ایک حصہ پر افلاطونی رنگ چڑھ گیا (باقی صفحہ آئندہ پر)

مرید اور خلیفہ شیخ خضر سیستانی کے۔ لیکن لطیف لاہور میں لکھتے ہیں کہ شیخ محمد میر جنھیں عام طور میاں میر کہتے تھے لاہور کے قریب ایک گاؤں غیاث پور میں پیدا ہوئے اس کے لئے وہ شاہجہاں نامہ کے مندرجات کی سند پیش کرتے ہیں۔ انہیں کا بیان ہے کہ وہ دارا شکوہ کے روحانی استاد تھے تحقیقات چشتی میں حضرت کے حالات نسبتاً تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تاریخ وفات اس مصرعہ سے نکلتی ہے:

بفردوس والا میاں میر شد

(بقیہ استدراک صفحہ گزشتہ) اور صوفی نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ:

چشم بند و لب بہ بند و گوش بند
گر نہ بینی نور حق بر من بخند

اقبال اس افلاطونی تصوف کے خلاف آواز بلند کرتا ہے جو عالم محسوسات کو مایا قرار دے اور خلقت کو باطل ٹھہرائے۔

بر تخیل ہائے ما فرماں رواست	جام او خواب آورد گیتی رباست
گوسفندے در لباس آدم است	حکم او بر جان صوفی محکم است

ترجمہ:- تخیل پر ہمارے حکمراں ہے آب و تاب اس کی
سلا کر دور کر دیتی ہے دنیا سے شراب اس کی
نہیں تھا آدمی کے بھیس میں اک بھیڑ سے بڑھ کر
مسلط ہیں مگر افکار اس کے قلب صوفی پر

مسلمانوں کے متصوفانہ فلسفہ نے افلاطون کے اعیان ثابتہ یا ازلی غیر متغیر معقولات کو اپنے فکر کا جزو لاینفک بنا لیا جس کا نتیجہ اقبال کے نزدیک یہ ہوا کہ صوفی بھی ہنگامۂ موجود کا منکر اور اعیان نامشہود کا پرستار ہو کر بود کو نابود اور نابود کو بود کہنے لگا لیکن اس قسم کا گیتی گریز تصور خود سقراط، افلاطون اور ارسطو کی زندگیوں پر کوئی سلبی اثر نہ ڈال سکا یہ تینوں مفکرین، اخلاقیات اور سیاسیات پر گہری بحثیں کرتے رہے اور اپنے اپنے انداز میں کوشاں رہے کہ معاشرہ کو عاقلانہ اور عادلانہ اصول پر از سر نو تعمیر کیا جائے۔ جماعت کی حکمرانی اور نگرانی سقراط اور افلاطون ایک ایسے منتخب گروہ کے حوالے کرنا چاہتے ہیں جو عقل اور ایمان سے گراں حقہ تحقق کے ساتھ ساتھ اعمال صالحہ سے تزکیۂ نفس کر چکے ہیں (باقی صفحہ آئندہ)

(دارا شکوہ نے یہی تاریخ وفات بقول صاحب تحقیقات چشتی اپنی تصنیف سکینۃ الاولیاء میں نقل کی ہے)

حضرت میاں میر کا طریقہ قادریہ تھا۔ سلوک اور عرفان کی تربیت شیخ خضر کی خدمت میں حاصل کی جو قلندرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ پھر انہی کی اجازت سے لاہور آئے اور یہیں قیام پذیر ہو گئے "تمام رات شب بیدار رہتے تھے اور حبس نفس یہاں تک حاصل کیا تھا کہ اکثر ایک دم یا دو دم میں تمام رات گزارتے تھے۔ جب عمر آپ کی اسی برس کی ہوئی اور ضعف غالب آیا تو چار دموں میں رات بسر کرتے تھے[۱۵]۔

(بقیہ استدراک صفحہ گزشتہ) اقبال نے اسرار خودی میں افلاطون کے نظریۂ حیات کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ افلاطون کے وسیع عالم فکر کا فقط ایک پہلو ہے۔ جو قارئین افلاطون کی زندگی اور اس کی وسعت فکر سے ناآشنا ہیں ان کو اسرار خودی کے ان اشعار سے یہ مغالطہ ہو سکتا ہے کہ افلاطون فرد اور جماعت کے مسائل اور معاملات کو بے حقیقت سمجھتا ہے اور عالم انسانی کو اعیان ثابتہ یا مجرد معقولات کی افیون کھلا کر بے حس اور بے عمل بنانا چاہتا ہے: تاریخی لحاظ سے واقعات اس کے بالکل برعکس رہے ہیں۔ اس مختصر سی تمہید میں اس کی گنجائش نہیں کہ اس حقیقت کو کھول کر بیان کیا جائے کہ افلاطون سے لے کر آخری معاشرتی انقلاب یعنی اشتراکیت تک سوسائٹی کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کی جو فکری یا عملی کوششیں ہوئی ہیں، وہ کم و بیش افلاطونی افکار سے متاثر ہیں۔ اقبال نے عالم شباب میں اپنے متعلق یہ کہا تھا:

اٹھائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری
اڑا لی طوطیوں نے، قمریوں نے، عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرز فغاں میری

بعینہٖ یہی کچھ افلاطون کے ساتھ ہوا، مشرقی فلسفہ کے متعلق خواہ کچھ کہیے لیکن مغربی فلسفہ کے متعلق تو یہ کہنا نادرست ہوگا کہ وہ تمام کا تمام دنیا سے گریز کا تعلیم دیتا ہے لیکن مغرب کے منظم نظامات فکر کے متعلق ہارٹ رکرٹ جیسے جرمن مفکر اور وہائٹ ہیڈ جیسے انگریز فلسفی کی رائے یہ ہے کہ یہ سب کے سب افلاطون ہی کی تشریحات ہیں۔ مارکس، لینن، مسولینی اور ہٹلر جیسے (باقی صفحہ آئندہ پر)

[۱۵] نور احمد: تحقیقات چشتی صفحہ ۲۵۲۔

نور احمد صاحب نے حضرت میاں میر کی متعدد کرامات کا تذکرہ کیا ہے وہ بھی لطیف کے ہمنوا ہیں کہ دارا شکوہ نے حضرت میاں میر سے فیض اُٹھایا ہے۔

لطیف نے بھی اور نور احمد نے بھی آپ کے مرقدِ منور کے متعلق تفصیلی معلومات مہیا پہنچائی ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ مزار سے بحث کرتے ہوئے لطیف نے خود اپنے قول کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ وہ سیستان میں ۹۵۷ھ میں پیدا ہوئے۔ اس مرحلہ پر لطیف نے دارا شکوہ کی تصنیف "سکینۃ الاولیا" پر بھروسہ کیا ہے جس میں حضرت میاں میر کے سوانح مندرج ہیں۔

(بقیہ استدراک صفحہ گزشتہ) معاشرتی انقلاب کے آرزومند، اور اپنے عمل سے دنیا کو تہ وبالا کرنے والے خواہ اس کا نتیجہ تخریب ہو یا تعمیر ——— افلاطون ہی کی کتاب سے کچھ ورق اڑاتے رہے ہیں۔ دوسری طرف رومن کیتھولک کلیسا کی تنظیم بھی بہت کچھ اس کے افکار کا عکس ہے۔ سقراط جس کی زبان سے افلاطون نے اپنا نظریۂ حیات بیان کیا ہے اصلاح معاشرت کی کوشش میں شہید ہو گیا۔ میری ناچیز رائے یہ ہے کہ اقبال نے افلاطون کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ اقبال نے فقط یہ دیکھا کہ افلاطونی افکار کا اثر بعض لوگوں پر اچھا نہیں ہوا اور اس کے نظریۂ وجود سے فرار من الحیات کا نتیجہ از روئے منطق حاصل ہوتا ہے جس قسم کے حیات گریز تصوف کو اقبال نے مسلمانوں کے لئے افیون قرار دیا وہ افلاطون سے زیادہ فلاطینوس اسکندروی سے حاصل کردہ ہے جس کے افکار کا اسلامی فلسفۂ اشراق اور عیسوی تصوف پر گہرا نقش نمایاں ہے۔ افلاطون راہب نہیں تھا اور نہ زندگی کے تمام پہلوؤں سے متوازی اور متناسب طور پر لطف اٹھانے والے یونانی اس مزاج کے تھے۔ وہ خود بھی اپنے مجرد تصورات میں گم ہو کر علائق حیات سے بے تعلق نہیں ہوا۔ اس کا گھرانا ایشیا کی تمام علمی اور عملی زندگی کا مرکز تھا۔ ایسے شخص کے متعلق جو عدل کا ایک انقلابی تصور قائم کر کے اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش میں سائرا کیوز کی ریاست سے خارج کیا گیا ہو اور بحری ڈاکوؤں کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا ہو یہ کہنا ناانصافی معلوم ہوتی ہے کہ:

ذوقِ روئیدن ندارد دانہ اش — از طپیدن بے خبر پروانہ اش
راہبِ ما چارہ غیر از رم نداشت — طاقتِ غوغائے ایں عالم نداشت
دل بسوزِ شعلۂ افسردہ بست — نقشِ آں دنیائے افیوں خوردہ بست

(باقی صفحہ آئندہ)

لطیف لکھتے ہیں کہ دارا شکوہ نے سکینۃ الاولیا میں حضرت میاں میر کے متعلق لکھا ہے:

"میرے دادا (یعنی جہانگیر بادشاہ) فقیروں کے بہت معتقد نہ تھے لیکن اس کے باوجود وہ حضرت میاں میر بالا پیر کا احترام کرتے تھے۔ایک بار ان کی اور شیخ میاں میر کی ملاقات جو ہوئی تو شیخ نے دنیا کی ناپائداری کے متعلق ایسے موثر کلمات کہے کہ جہانگیر نے دنیا ترک کرنے کے ارادہ کا اظہار کیا لیکن شیخ نے انھیں روکا اور کہا کہ بادشاہوں پر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔آپ کے لئے ضروری ہے کہ وہ فرائض پورے کریں۔اس کے بعد جہانگیر نے ان سے کہا کہ اگر کوئی خواہش ہو تو بیان فرمایئے تاکہ پوری کر دی جائے۔شیخ نے کہا کہ تمنا یہ ہے کہ اس کے بعد آپ مجھے طلب نہ فرمائیں۔جہانگیر نے وعدہ کیا کہ انھیں آئندہ سفر کی زحمت نہیں دی جائے گی۔"

(بقیہ استدراک صفحہ گزشتہ) ترجمہ: جسے کچھ ذوق اُگنے کا نہیں وہ دانہ ہے اس کا

تڑپنے کے مزے سے بے خبر پروانہ ہے اس کا

جہاں کے شور و غوغا سے سراسیمہ ہوا ایسا

سوائے بھاگ جانے کے نہ اس راہب کو کچھ سوجھا

ہوا افسردہ شعلے سے حرارت کا تمنائی

اسے افیون کی پروردہ اک دنیا پسند آئی

حقیقت یہ ہے کہ اس نے زندہ قوموں کو ذوقِ عمل سے محروم نہیں کیا اور نہ تندرست ملتوں کو مسموم کیا بلکہ جو قومیں مختلف اسباب سے زندگی سے محروم اور بے عملی یا بد عملی سے مسموم ہو چکی تھیں انھوں نے افلاطونی افکار کی انحطاط انگیز تاویل کر لی۔افلاطونی فلسفہ کا بھی اسی قسم کا حشر ہوا جو اسلام میں نظریۂ تقدیر کا ہوا۔جب تک مومنوں میں قوتِ ایمان، قوتِ عمل اور تنظیم حیاتِ صالحہ موجود تھی اس وقت تک تقدیر کا تصور ان کی قوتِ عمل، و ایثار کو تقویت پہنچاتا تھا۔اس کے بعد عشرت پسندوں اور تن آسانوں نے ترکِ سعی کو توکل سمجھ لیا اور سب کچھ مقدر ہونے کی وجہ سے سعی کو بیکار جاننے لگے۔اس میں قرآن کریم کی تعلیم تقدیر کا قصور نہ تھا۔بے عملی نے اپنی غلط تاویلوں کو اسلام بنا لیا تھا۔[1]

---

[1] دیباچہ ترجمانِ اسرار مطبع کارواں پریس لاہور۔

لطیف ہی لکھتے ہیں کہ بادشاہنامہ میں منقول ہے

"والد حضرت شاہجہاں فرمایا کرتے تھے کہ عمر میں میں صرف دو آدمیوں سے ملا ہوں جنھیں حقیقت کا علم تھا۔ ایک حضرت میاں میر اور دوسرے شیخ محمد فضل اللہ برہانپوری"۔

تاریخی اعتبار سے مسلّم ہے کہ جہانگیر اور شاہجہاں دونوں حضرت میاں میر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کی خدمت میں استدعا کی کہ ہماری کامیابی کے لئے دعا ملنگیے۔[1]

(۸) **میر نجات نقشبند (المعروف بہ بابائے صحرائی)**، سیاق و سباق سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر نجات نقشبند سے مراد خود علامہ اقبال ہیں۔

(۹) **می شود از جبر پیدا اختیار**

دیکھیے جبر و اختیار اور جبر و قدر، علامہ خود اسرار کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

"اس شعر میں الٰہیات اسلامیہ کے مشہور مسئلہ جبر و اختیار کی طرف اشارہ ہے مقصود یہ ہے کہ اعلیٰ اور سچی حریت اطاعت یعنی پابندی فرائض سے پیدا ہوتی ہے"۔

---

[1] تحقیقات چشتی: لاہور: عبداللطیف۔

تاریخ پنجاب: عبداللطیف۔ فرہنگ آصفیہ۔

استدراک: یہ تحقیق نہیں کیا جا سکا کہ جس شہ ہندوستان کا ذکر متعلقہ اشعار میں آیا ہے۔ اس سے شاہجہاں مراد ہے یا جہانگیر، دکن کی لڑائیوں کا ذکر ہو رہا ہے اس لئے گمان یہ ہے کہ شاہجہاں ہے۔ اورنگ زیب کا دل ظاہر ہے کہ حضرت کی طرف سے بالکل صاف نہ ہوگا اس لئے یہ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ شہ ہندوستان سے مراد اورنگ زیب ہو۔ حضرت میاں میر کی تاریخ وفات اور اورنگ زیب کے جلوس میں بھی اتنا بُعد ہے کہ یہ خیال کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ شہ ہندوستان سے وہی بادشاہ مراد ہے جسے علامہ نے خود اس شعر میں سراہا تھا:

در میان کارزار کفر و دیں
ترکش ما را خدنگ آخریں

ن

(۱) نعرہ زد اے قوم کذابِ اشر — بے خبر از یوم نحس مستمر

دیکھئے آیاتِ قرآنی ۵۴/۱۷-۲۶ -

ترجمہ یہ ہے :

"اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے۔ سو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے۔ عاد نے (بھی) اپنے پیغمبر کی تکذیب کی (سو اس کا قصہ سنو) میرا عذاب اور میرا ڈرانا کیا ہوا۔ ہم نے ان پر ایک تند ہوا بھیجی۔ ایک دوامی نحوست کے دن میں، وہ ہوا لوگوں کو اس طرح اکھاڑ اکھاڑ کر پھینکتی تھی کہ گویا وہ اکھڑی ہوئی کھجوروں کے تنے ہیں۔ سو (دیکھو) میرا عذاب اور ڈرانا کیسا (ہولناک) ہوا۔ اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے سو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے۔ ثمود نے (بھی) پیغمبروں کی تکذیب کی، اور کہنے لگے کہ کیا ہم

ایسے شخص کا اتباع کریں گے. جو ہماری جنس کا آدمی ہے اور اکیلا ہے تو اس صورت میں ہم بڑی غلطی اور (بلکہ) جنون میں پڑ جاویں. کیا ہم سب میں سے اس پر وحی نازل ہوئی ہے (ہرگز ایسا نہیں) بلکہ یہ بڑا جھوٹا اور بڑا شیخی باز ہے. ان کو عنقریب (مرتے ہی) معلوم ہو جائے گا کہ جھوٹا شیخی باز کون تھا"

(۲) **نیستاں:** از نیستاں ہجوں نے پیغام (ہ)

مولانا روم کے مشہور شعر کی طرف اشارہ ہے:

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند

دیکھئے تلمیحات بانگ درا۔

ہجوں نے...........

۵

(۱) **ہارون**: حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کا ذکر قرآن مجید میں متعدد بار آیا ہے اور مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب قصص القرآن جلد اول صفحہ ۳۳۶ تا ۴۳۷ میں ان آیات کی تفصیل درج کر دی ہے جو موسیٰ اور ہارون سے متعلق ہیں۔

حضرتِ ہارون کا ذکر بقرہ، نسا، انعام، اعراف یونس، طٰہٰ، انبیا، مومنون، فرقان اور قصص کی سُورتوں میں آیا ہے۔

فرعون کے دربار میں جو مناظرہ ہوا ہے اس میں حضرت ہارون بھی حضرت موسیٰ کے ساتھ تھے اور یہ مسلّم ہے کہ یہ دونوں انبیائے کرام بھائی بھائی تھے۔[1]

(۲) **ہندی**: ظاہر ہے کہ ہندی سنسکرت کی وہ شکل ہے جو عام لوگ استعمال کرتے ہیں پہلے ہندی کا اطلاق سنسکرت کی پراکرتوں پر ہی ہوتا تھا مگر جب مسلمان ہندوستان میں وارد

---

[1] قصص القرآن جلد اول: حفظ الرحمٰن۔ قصص القرآن: صدر الدین بلاغی۔

ہوئے تو اس کلمہ کے معنی بدل گئے۔ چنانچہ محمود شیرانی نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ مسعود سعد سلمان کے دیوان ہندی میں بھی موجود تھے تو اس سے مراد اردو ہے۔

بہرحال ہندی زبان (یعنی سنسکرت کی ایک پراکرت کی حیثیت سے اپنی عذوبت، روانی اور لچک کے لئے مشہور ہے۔ گریرسن نے ہندی کا تعلق سنسکرت سے یوں دکھایا ہے۔

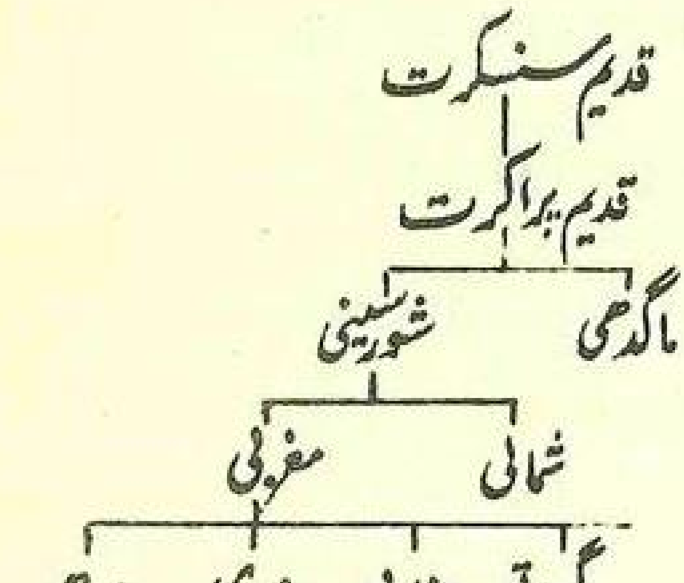

برج وہی شاخ ہے جسے برج بھاشا کہتے ہیں اور جسے اردو کی اساس بیان کیا جاتا ہے۔

ہندی شاعری میں محبوبہ عاشق بھی ہوتی ہے اور اپنے پیا کے متعلق تاثرات کا اظہار کرتی ہے اس لئے جو درج، نزاکت اور نرمی ہندی شاعری میں ہے وہ ہندوستان کی کسی اور زبان میں کم پائی جاتی ہے ناسخ نے بڑی باقاعدگی سے ہندی الفاظ کو اردو سے خارج کیا لیکن عصر حاضر کے ادیب جن میں حسرت موہانی مرحوم پیش پیش تھے کہتے ہیں کہ بعض ہندی الفاظ اور کلمات خواہ متروک قرار دئے گئے ہیں مثال کے طور پر کلمہ "سو" پر غور کریجئے گا مثلاً:

ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سو وہ بھی نہ ہوا

یہاں سو کی جگہ اور کوئی کلمہ کام نہیں دیتا پنجابی میں سو بڑا معنی خیز کلمہ ہے اور لہجہ کے اتار چڑھاؤ کے ذریعہ معانی کی مختلف تہیں دکھاتا ہے۔[۱]

---

[۱] اردو زبان کا ارتقاء شوکت سبزواری۔ ہندوستانی لسانیات: غلام محی الدین زور۔ پنجاب میں اردو: محمود شیرانی۔ تنقید شعرالعجم: محمود شیرانی۔ جذبات بھاشا نیاز فتحپوری۔

رموزِ بے خودی

الف

(۱) ابنِ مسعودؓ: عبداللہ بن مسعودؓ ان صحابہ میں شمار کئے جاتے ہیں جو اپنے علم وفضل کے اعتبار سے نہایت ممتاز ہیں۔ انھوں نے آیاتِ قرآنی کی جو تفسیر کی ہے اس کا حوالہ اکثر تفسیر کی کتابوں میں ملتا ہے۔ بعض مورخ تو یہ لکھتے ہیں کہ دراصل فقہ کے بانی اور موسس وہی ہیں۔

سال وفات ۳۲ھ ہے[1]۔

(۲) ابیکم: اشارہ ہے آیت قرآن کریم کی طرف اور حوالہ یہ ہے: ۲۲/۷۸

تمہارے باپ ابراہیم کے مذہب کو (تمہارا مذہب بنا دیا ہے) اس نے پہلے سے

تمہارا نام مسلمان رکھا ہے اور اس کتاب میں بھی تمہیں اسی لقب سے یاد کیا ہے۔

(۳) اخلاص (سورۃ): قرآن کی سورت کا نمبر ۱۱۲ ہے۔ بسم اللہ سے قطع نظر اس میں چار آیتیں ہیں یعنی۔

---

[1] مہاجرین: معین الدین ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ۔

(۱) قل ھو اللہ احد (۲) اللہ الصمد

(۳) لم یلد ولم یولد (۴) ولم یکن لہ کفوا احد

علامہ نے مثنوی کے مطالب کا خلاصہ سورۂ اخلاص کی تفسیر کے سلسلے میں بیان کردیا ہے

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت سے بحیثیت مجموعی بحث کی جائے۔

قُل ھُوَ اللہُ اَحَدٌ (دیکھئے وحدت، وجود، ثنویت، دوئی)

اسلام نے وحدت بسیط یا وحدت محض کا جو تصور پیش کیا ہے وہ اسی سے مخصوص ہے

اس سے پہلے یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ آریائی اقوام حقیقت کو منتشر اور پارہ پارہ کرکے دیکھتی ہیں۔

اسی سے دوئی یا ثنویت کا مرض پیدا ہوتا ہے۔ اس مرض کو علامہ بہت خوفناک سمجھتے ہیں۔

خلیفہ عبدالحکیم فکر اقبال میں لکھتے ہیں کہ "مسلمان اس توحید سے بیگانہ ہوگئے جو وحدت آفریں

تھی"۔ اسلام نے نسل اور قومی امتیازات کو مٹا کر ایک ملت بنائی تھی گویا اس وحدت کا تصور اللہ

کی وحدت کے تصور سے متاثر تھا اور اس کا منطقی نتیجہ تھا۔

(۲) اللہُ الصَّمَدُ : خلیفہ عبدالحکیم فکر اقبال میں فرماتے ہیں

"تخلقو باخلاق اللہ کی تعلیمات کے مطابق مسلمان کو بھی اپنے اندر یہ بے نیازی کی

صفت پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ انسان کو حاجات کا شکار نہیں ہونا چاہیئے

احتیاج انسان کے نفس کو کمزور کر دیتی ہے۔ ...... بے نیازی مال و جاہ سے حاصل

نہیں ہوتی۔ یہ طبیعت کا ایک انداز ہے جو نادار کو قارون پر فضیلت بخشتا ہے۔ ...

سفر زندگی میں بھی فراوانی سامان سے آسائش کی کوشش نہ کرو۔ یہ سامان تمہارے لئے

گلے کا طوق اور زنجیر پا ہوجائے گا۔ ..... حکیم سقراط کا بھی یہ قول مشہور ہے کہ کم احتیاج انسان

الوہیت کی صفات سے بہرہ اندوز ہوتا ہے کیونکہ خدا بھی بے احتیاج ہونے کی وجہ سے

بے نیاز ہے ..... بے نیازوں کی جائز ضرورتیں پورا کرنے کا مشیت الٰہی میں ایک پنہاں قانون موجود ہے۔"

اس قسم کی بے نیازی کو اصطلاح میں فقر اور درویشی کہتے ہیں۔ چنانچہ سعدی کہتا ہے:

اے دل اگر بدیدۂ تحقیق بنگری
درویشی اختیار کنی بر تونگری

(دیکھئے فقر تلمیحاتِ زبورِ عجم میں)۔

جب انسان خدا کو صمد تسلیم کرتا ہے اور اپنی احتیاجات پوری کرنے کے لئے کسی دوسرے کے سامنے دست سوال دراز نہیں کرتا تو وہ درویشی اور قلندری کی صفات سے متصف ہو جاتا ہے۔ سعدی نے بھی اس اسلوب حیات کو بہت سراہا ہے اس کی ایک غزل یوں شروع ہوتی ہے:

خلاف راستی باشد خلاف رائے درویشاں

علامہ کے کلام میں بھی درویشی کا کلمہ علامت کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور اس سے مراد وہی بے نیازی ہوتی ہے جو اللہ کی صمدیت پر ایمان لانے سے پیدا ہوتی ہے۔

حافظ اگرچہ مجاز اور حقیقت کو ملا کر شعر کہتا ہے لیکن اس نے بھی درویشوں کی تعریف میں جو غزلیں کہی ہیں ان سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ ایک اسلوبِ حیات کا ذکر کر رہا ہے۔

اس بات کی صراحت کرنے کی ضرورت نہیں کہ درویشی سے مراد ترک دنیا ہرگز نہیں کہ یہ اسلامی نظامِ حیات کے منافی ہے اور عیسائیوں کی رہبانیت اور ہندوؤں کے تیاگ سے مشابہ ہے۔

اب صمد کے لغوی معنی پر بھی غور فرما لیجئے:

صاحبِ غیاث لکھتے ہیں:

"بفتحتین، مہتر و بے نیاز و بلند و دائم و مردے کہ تشنہ و گرسنہ نباشد۔"

اور صاحبِ منتخب لکھتے ہیں:

"بفتحتین: مہتر و آنکہ آہنگ با و کنند در مہمات و حاجات و بے نیاز و بلند و دائم۔"

اب ظاہر ہے کہ انسان جس قدر صفاتِ خداوندی حاصل کرے گا اسی قدر منزلِ حقیقت سے قریب تر ہو گا یہی وجہ ہے کہ درویشی کی زندگی کو علامہ نے اتنی اہمیت دی ہے کہ اوراء رموزِ بے خودی کی ایک اہم رمز قرار دیا ہے۔

لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ: خلیفہ عبدالحکیم فرماتے ہیں:

"خدا کے ہاں صلبی پیدائش کا کوئی سوال نہیں ...... جسمانی ولدیت بہت ثانوی چیز ہے حضرت سلمان فارسی سے لوگوں نے ان کا شجرۂ نسب پوچھا تو انھوں نے جواب دیا سلمان بن اسلام۔ مسلمانوں کی اصل نسبت اسلام سے ہے۔ اَب و اُم سے نہیں ... لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ کا رنگ اگر مومن کی زندگی پر پڑے تو اس کے اساس ملی میں نسل کو کوئی مقام حاصل نہ ہو۔"

جامی نے مجاز کی اصطلاحوں میں یہ مضمون بڑی خوبصورتی اور سلیقہ سے باندھا ہے

بندہ عشق شدی ترکِ نسب کن جامی

کہ دریں راہ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

(۴) وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ: خلیفہ عبدالحکیم فرماتے ہیں:

"تمام موجودات میں خدا کا کوئی ہمسر نہیں، یہ صفت بھی مردِ مومن میں پیدا ہو جاتی ہے۔ لالۂ سرِ کوہسار کی طرح وہ کسی گلچیں کے دامن میں نہیں پڑتا۔ وہ جہاں کے اندر رہے لیکن جہاں سے الگ اور بالاتر ہے۔ مومنوں کی ملت اسی طرح بے ہمتا ہو سکتی ہے کہ اس انداز کی کوئی اور ملت نہ ہو۔ ...... مردِ مومن کی پرواز تو ایسی فلک رس ہونی چاہئے کہ

اس کا طائر روح ستاروں میں دانہ چینی کرے بلکہ اپنی بلند پروازی میں افلاک کو تیچھے چھوڑ جائے لیکن اس وقت مسلمان کا یہ حال ہے کہ جیسے مٹی کے اندر رہنے والا کیڑا ہو، جو فضائے ارضی سے بھی ناآشنا ہے۔ اپنے آپ کو پسماندہ اور ذلیل پاکر گردشِ ایام کا شکوہ کرتا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ قرآن کو ترک کرنے کی وجہ سے اس کی یہ گت بنی ہے...... ویسے تو اقبال کا تمام کلام خلوص سے لبریز ہے اور اس کی دلدوز تاثیر اسی خلوص کی بدولت ہے محض فن اور صناعی سے یہ دل رسی پیدا نہیں ہو سکتی لیکن اس عرض حال میں خلوص اور عشقِ رسول کا ایک ایسا ولولہ ہے کہ پڑھنے والے حساس انسان کی آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں...... اقبال کے نزدیک ملت کا حال اس زمانہ میں ایک جسدِ بے روح کی طرح ہے۔

شروع یہاں سے کرتا ہے کہ جب سے میری نظر کے سامنے رسول صلعم کی ہستی آئی تب سے میری یہی کیفیت ہے کہ رسول صلعم مجھے ماں باپ سے زیادہ محبوب ہو گئے ہیں......

اقبال جو اپنی بے عملی کا مسلسل اعلان کرتے رہے، راقم الحروف اس سے متفق نہیں۔ گیا انسانوں کی بصیرت افروزی، ملت کی ہمت افزائی، عشق کی فراوانی اور ارزانی، تفکر کی وسعت اور ثروت اعمالِ صالحہ میں داخل نہیں۔ میرے نزدیک یہ عمل ہزار ہا لاکھوں عابدوں زاہدوں اور صوفیہ کی ریاضتوں سے زیادہ باقیمت ہے۔ معلوم نہیں کہ علامہ اقبال اس کو کیوں عمل شمار نہ کرتے تھے۔ میرے نزدیک اقبال کے عارفانہ اور عاشقانہ کلام کا ہر شعر عبادت میں داخل ہے، اس سے زیادہ خدمت خلق اور کیا ہو سکتی ہے کہ رہتی دنیا تک لوگ اس کے کلام سے بلند ترین افکار و تاثرات حاصل کرتے رہیں گے یہ صدقۂ جاریہ ہے۔ مومن کی زندگی کا نصب العین علامہ اقبال کے نزدیک اتنا بلند تھا کہ وہ اس عرش بوس بلندی کے مقابلہ میں اپنے تئیں پستی میں محسوس کرتے

تھے مقصود کی بلندی کسی اعلیٰ درجے کے محسن انسان کو کبھی اپنی زندگی سے مطمئن نہیں ہونے دیتی۔ خوب تر کے مقابلے میں خوب بھی ناخوب دکھائی دیتا ہے۔ اقبال کے کلام سے بعض افراد کی زندگی میں ایک انقلاب آفریں ہیجان پیدا ہوا۔ آئندہ بھی ملت اسلامیہ کے ہر انقلاب میں اقبال موجود ہوگا۔ جس شخص کا پیغام سراپا پیغام عمل ہو، کیا وہ سرچشمۂ عمل خود عمل سے محروم ہے؟ لوگوں نے جس چیز کو عمل سمجھ رکھا ہے وہ اس حیات افزا پیغام و تلقین کے مقابلہ میں اکثر پست ہی ہوتا ہے۔ اقبال کو اپنی بے عملی پر جو افسوس ہے وہ اس کی علو ہمت اور رفعتِ مقاصد کا نتیجہ ہے۔ جن لوگوں کے مقاصد پست ہوتے ہیں وہ ان مقاصد کے حصول میں سرگرم عمل رہتے ہیں اور جو کچھ حاصل ہو جائے اس سے مطمئن بھی ہو جاتے ہیں لیکن گناہوں سے پاک اور اگلی پچھلی خطائیں بخشا ہوا نبی اپنی روحانی ترقی میں کسی موجودہ حالت پر قانع نہیں ہوتا اور گنہگاروں سے زیادہ استغفار اس کا صبح و شام کا وظیفہ ہوتا ہے۔ عمل میں کوتاہی کا احساس ایمان کی قوت اور مقصد کی بلندی کا شاہد ہے۔ ادنیٰ درجے کے لوگ جن اعمال کو حسنات شمار کرتے ہیں بلند مقصد اور بلند حوصلہ انسانوں کو ان میں سیئات کا رنگ جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔"

(۴) از سخن آئینہ سازم کردہ اند و. ز سکندر بے نیازم کردہ اند

اس شعر میں بہت سی تلمیحات اور علامات جمع ہو گئی ہیں۔ ادبی روایت کہتی ہے کہ آئینہ سے طوطی کا تعلق ہے اور ظاہر ہے کہ شعرا "طوطیانِ نغز گو" کہلاتے ہیں۔ حافظ کہتا ہے:

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

علاوہ ازیں آئینہ میں چیزوں کا عکس جلوہ افگن ہوتا ہے۔ علامہ کہتے ہیں کہ میرا سخن جہاں

ماضی کے حقائق کا آئینہ دار ہے۔ وہاں مستقبل کے امکانات بھی اس میں جھلکتے ہیں۔ خود ان کا قول ہے:

بنتے ہیں مری کارگہِ فکر میں انجم
لے اپنے مقدر کے ستارہ کو تو پہچان

تصوف کی اصطلاح میں، اس دل کو آئینہ کہتے ہیں جو خواہشات نفسانی سے پاک ہو کر مجلیٰ ہو چکا ہو اور علامہ کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ ان کے حلقہ سخن میں وہ لوگ زیر تربیت ہیں جنھیں انسان کا منصب جلیل حاصل کرنا ہے پھر سخن کو آب و تاب کی وجہ سے بھی آئینہ سے تشبیہ دیتے رہیں۔

ادبی روایت اس بات کی بھی مدعی ہے کہ آئینہ کا موجد سکندر تھا یا یہ کہ آئینہ اس کے عہد میں بحسن اتفاق دریافت ہو گیا، اور اس کی صورت یہ ہوئی کہ ایک سپاہی اپنی ڈھال صاف کر رہا تھا کہ اسے ڈھال کی سطح میں اپنا عکس نظر آیا۔ شاد کہتا ہے۔

تا قیامت رہے آئینہ سلامت یا رب
ہر حسیں کو ہے یہ دعویٰ کہ سکندر سم ہیں

اور حافظ کہتا ہے: نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند

حقیقت یہ ہے کہ آئینہ کا تعلق سکندر سے نہیں بلکہ آئین سے ہے جس کے معنی قانون اور روش کے ہیں۔ یہ کلمہ آذین کی دوسری صورت ہے۔ آذین کے معنی زیب و زینت کے ہیں تو آئینہ وہ چیز ہے جس کے وسیلہ سے انسان اپنی زینت کرے۔ اس کی قدیم فارسی شکل آئیناک ہے۔ فارسی کے مختلف لہجوں میں اس کلمہ کی مختلف صورتیں ہیں۔

کلمہ آدینہ بھی آذین ہی سے مشتق ہے کہ جمعہ کے دن لوگ اچھے کپڑے پہنتے ہیں، نہاتے دھوتے ہیں اور سنگار کرتے ہیں۔ ارباب لغت نے اس معاملہ میں بہت ٹھوکریں کھائی ہیں اور وہ عموماً نہ اس بات سے آگاہ ہیں کہ آدین اور آذین ایک ہی کلمہ کی مختلف صورتیں ہیں۔ نہ یہ جانتے

ہیں کہ آدینہ اور آئینہ دراصل ایک ہی کلمہ ہے۔ فارسی میں 'د' اور 'ذ' کی بحث بڑی دراز ہے۔ محقق طوسی کی رباعی اس سلسلہ میں نقل کی جا چکی ہے[1]

(۵) آفل: تارکِ آفل براہیم خلیل

دیکھیے آفلین، زبورِ عجم۔

(۶) اکبر (شہنشاہ) "تخم الحادے کہ اکبر پرورید
باز اندر فطرتِ دارا دمید"

جلال الدین اکبر بادشاہ (جلوس ۹۶۳ھ) تخت نشین ہوا تو اس نے علما کی بڑی قدردانی کی اور چاہا کہ طالبانِ علم کو تحصیلِ علم میں ہر طرح کی سہولتیں میسر ہوں۔ خواجہ اجمیری سے اسے عقیدت بھی بہت تھی مختصر یہ کہ سیدھا سادھا مسلمان تھا۔ مذہبی معاملات میں شروع ہی سے بڑی گہری دلچسپی لیتا تھا۔ ۱۵۷۵ء میں اس نے شیخ سلیم چشتی کی خانقاہ کے پاس ایک عمارت بھی تعمیر کرائی جس کا نام ہی عبادت خانہ رکھا گیا۔ اکبر تو یہ چاہتا تھا کہ عبادت خانہ میں علما کے ارشادات سے مستفید ہو اور راہِ حق پر چلے لیکن اتفاق دیکھیے کہ جو ذی مرتبت علما یہاں جمع ہوتے تھے وہ ایک دوسرے کو شکست دینے کے درپے ہو گئے تاکہ وہی اکبر کی نظروں میں مقبول ہو جائیں۔ اس وقت کے علما کے سرخیل مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطان پوری اور شیخ عبدالنبی صدرالصدور تھے۔ مخدوم الملک نے بے شک امورِ شرعیہ کے نفاذ میں سرگرمی دکھائی لیکن اس سلسلہ میں بعض مخلص اور دیانت دار لوگوں کو بھی ان کا معتوب ہونا پڑا۔ جن علما سے مخدوم الملک کا اختلاف ہو جاتا تھا، انھیں ذلیل کروانے میں اور سزا

---

[1] دیکھیے تلمیحاتِ اقبال، کلمہ سکندر۔ تاریخِ تصوف در اسلام۔
انتقاد: سید عابد علی عابد، ناشر ادارہ فروغِ اردو: مضمون کلمہ آئینہ کی تحقیق صفحہ ۱۲۴ تا صفحہ ۱۳۸۔
لغت مأخذ الفاظ: شبلی (انگریزی) کلمہ Mirror۔ غیاث اللغات۔ فرہنگ آنندراج۔ بہارِ عجم۔
برہانِ قاطع: ابتدائی ایڈیشن (اس لغت میں مؤلفین نے پرانے لغت نویسوں کے تمام تسامحات رفع کر دیے ہیں اور کلمہ آئینہ کی پرانی شکلیں اور اس کا تعلق آذین و آدینہ سے واضح کر دیا ہے)۔

دلوانے میں یہ کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے تھے۔ ادھر صدر الصدور جن کا فرض یہ تھا کہ مسجدوں کے اماموں کو جاگیریں عطا فرمائیں، اس فرض منصبی کی بجا آوری میں کوتاہی کرتے تھے علما اکثر شاکی رہتے تھے کہ صدر الصدور کے ہاں شنوائی نہیں ہوتی اور برسوں سرنیاز ان کے آستان جلال پر رکھنے تو جاگیر ملتی ہے۔ یہ باتیں ہی کچھ کم نہ تھیں کہ صدر الصدور اور مخدوم الملک میں ٹھن گئی۔ دونوں چاہتے تھے کہ اکبر کو ایسا مطیع و منقاد بنائیں کہ ان سے پوچھے بغیر کوئی کام نہ کر سکے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف ناروا باتیں کیں۔ حاسد اور مفسد ٹوہ میں رہتے ہیں۔ انھوں نے جلتی آگ پر تیل ڈالا۔ عبادت خانہ میں جو کھلی لڑائی ہونے لگی۔ اکبر نے جو علما کو یوں دست و گریبان دیکھا تو ان سے سخت متنفر ہو گیا۔ آخر (شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں) ۱۵۷۹ء میں شیخ عبدالنبی نے ایک شخص کو جو اکبر کی رانی جودھ بائی کا پروہت بھی تھا۔ بادشاہ کی اجازت کے بغیر قتل کرا دیا۔ اکبر کو طبعاً ناگوار گذرا۔ ادھر مصاحبوں اور رانیوں نے کان بھرے اتفاق سے انھیں دنوں شیخ مبارک کہ ابوالفضل اور فیضی کے والد ہیں حضور ہیں آئے۔ اکبر نے دل کے جلے پھپھولے جو پھوڑے تو شیخ مبارک نے کہا کہ بادشاہ عادل کو اجتہاد کا حق حاصل ہے جب کسی مسئلہ میں اختلاف واقع ہو تو حالات کے اقتضا کے مطابق جو حکم وہ دے وہی شرع و آئین ہے اور علما کی رائے پر بادشاہ عادل کی رائے کو برتری حاصل ہے۔ اس مضمون کا محضر مرتب کیا گیا علما کی مہریں حاصل کی گئیں۔ صدر الصدور اور مخدوم الملک کو حج کے لئے روانہ کر دیا گیا (یعنی یہاں اب آپ کی ضرورت نہ رہی)

جس محضر کا ذکر کیا گیا ہے اس میں بصراحت یہ مندرج تھا کہ:

"امام عادل کو مجتہدین اور علماء سے انہیں باتوں میں زیادہ اختیار ہوں گے جو نص شرعی سے مخالف نہ ہوں، مگر اب اکبر شرعی معنوں میں امام عادل نہ رہا تھا۔ وہ اپنی حکومت

اور رعب و دبدبہ کے نشے میں بہت اونچا اڑ رہا تھا اور اسلام سے روز بروز دور ہوتا جاتا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ:

"جب ملا مبارک کے خاندان کو عروج ہوا..... حکمت و تحقیق جدید کے نام سے آزاد خیالی اور مطلق العنانی کی ہوائیں چلنے لگیں۔ پہلے افراط تھی اب تفریط ہو گئی پہلے تعصب و اوہام تھے اب ان کی جگہ الحاد و بے قیدی نے نشو و نما پائی.......

پہلی جماعت علمائے دنیا پرست اور متعصبین جاہلین کی تھی .... دوسری جماعت ان کے مدمقابل مدعیانِ تحقیق جدید و اجتہاد و فکر کی تھی جنھوں نے...... طریق حکمانہ کے نام سے الحاد و بے دینی اور اباحت و بے قیدی کی گرم بازاری کر رکھی تھی۔"

یہ حقیقت ہے کہ جب یہ محضر تیار ہو چکا اور بڑے بڑے علما نے اس پر دستخط کر دیے تو اکبر کو بہت تسلی علمار کی طرف سے بدگمان تو تھا ہی۔ اب جو علما ہی نے اپنی موت کے فرمان پر دستخط کر دیے تو انھیں کی تلوار سے انھیں ہلاک کرنے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ جونپور کے قاضی ملا محمد یزدی کو معلوم ہوا کہ اکبر کا حال دگرگوں ہے تو انھوں نے فتویٰ دیا کہ بادشاہ مذہب کے صراطِ مستقیم سے منحرف ہو گیا ہے: اس کے خلاف جہاد کرنا واجب ہے۔ اکبر کو یہ معلوم ہوا تو بہانہ سے مُلا یزدی اور ان کے ایک ہم خیال عالم معز الملک کو آگرہ بلوا بھیجا۔ ابھی وہ فیروز آباد پہنچے تھے کہ گوالیار پہنچا دینے کا حکم ملا۔ پھر اکبر کے اشارہ سے گوالیار کے پہرہ داروں نے دونوں کو ڈبو کے ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد دوسرے علما پر بھی ظلم شروع ہوا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سلطنت کے طول و عرض میں فساد شروع ہو گیا۔ اکبر اور اس کے ہوا خواہوں نے بزورِ شمشیر تمام تحریکوں کو سختی سے کچل ڈالا۔

اس طرف سے فارغ ہوا تو ۱۵۸۲ء میں دین الٰہی کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس نئے مذہبی پیرہن کی بُنت میں کیسے کیسے صنعت گروں نے اپنی ہنروری کے کرشمے دکھائے تھے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دین کے سرخیل اور اکبر کے خلیفہ شیخ ابوالفضل تھے کہ ذہانت میں یگانۂ روزگار تھے اور مطالعہ کی وسعت میں بے نظیر زماں۔ کہتے ہیں کہ دین الٰہی کے معتقد السلام علیکم کی جگہ اللہ اکبر کہتے تھے اور جواب میں جل جلالہ سنتے تھے۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ یہ شعر مشہور ہوا:

شاہ ما امسال دعوائے نبوت کردہ است

گر خدا خواہد پس از سالے خدا خواہد شدن

بہر حال مشہور یہ ہے کہ دین الٰہی کے پیرو اخلاص کے چار مدارج طے کرتے تھے یعنی

۱۔ ترک مال ۲۔ ترک جان

۳۔ ترک ناموس ۴۔ ترک دین

جانی خاں نے جو ٹھٹھے کا حاکم تھا لکھ بھیجا کہ میں نے دین اسلام مجازی و تقلیدی سے تبرا کیا اور دین الٰہی اکبر شاہی بطوع و رغبت قبول کیا۔ اسی طرح اور لوگوں نے بھی اقرار نامے لکھ لکھ کر بھیجے۔ انہی دنوں اکبر کے ہوا خواہوں نے یہ بھی کہا کہ بادشاہ کو سجدۂ تعظیمی بھی جائز ہے۔

اکبر نے دانستہ اس نئے مذہب میں کئی ایسی باتیں شامل کیں جن سے ہندوؤں کی دلجوئی مقصود تھی لیکن فطرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ صرف ایک مسخرہ یعنی بیربل یا بیربر دین الٰہی کے حلقہ میں داخل ہوا۔ اس کے سوا تمام ہندو راجے مہاراجے اور جاگیردار اپنے مذہب پر بدبختی سے قائم رہے۔ محمد اکرام تو لکھتے ہیں کہ راجہ بھگوان داس نے یہ کہا تھا:

"خوبیاں تو سب مذہبوں میں ہیں لیکن یہ بتایئے کہ ایسا کونسا مذہب ہے جو ہندومت

اور اسلام سے بہتر ہو۔"

واہ راجہ صاحب !

مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

محمد اکرام لکھتے ہیں کہ مرتے وقت اکبر نے کلمۂ شہادت دہرایا، سورۂ یٰسین پڑھوا کر سنی اور بطور راسخ الاعتقاد مسلمان کے مرا۔

علامہ یہ فرماتے ہیں کہ دارا کی تصانیف میں جو شعلے خرمن دین و ایمان کو خاکستر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ان کے لئے چنگاریاں اکبر ہی کے زمانہ میں مہیا ہو گئی تھیں اسی لئے انھوں نے اکبر اور دارا کا ایک ساتھ نام لیا ہے اور یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں دارا کے حالات بھی بیان کر دیئے جائیں۔

شاہجہاں کے زمانہ میں تصوف کے اسرار و رموز سے واقفیت رکھنے کے مدعی بہت پیدا ہو گئے تھے اور یوں بھی تصوف کو بہت فروغ نصیب ہو رہا تھا خود شاہجہاں حضرت میاں میر کا عقیدت مند اور مداح تھا۔

محمد اکرام کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت شیخ میاں میر کا اصلی نام میر محمد تھا اور وہ سندھ کے قدیمی شہر سیوان میں پیدا ہوئے۔ آپ کی والدہ نے خود آپ کو سلسلہ قادریہ کے رموز سے آگاہ کیا۔ پچیس سال کی عمر میں لاہور آئے۔ دارا شکوہ نے آپ کے اور آپ کے ممتاز خلفا کے تفصیلی حالات سکینۃ الاولیا میں لکھے ہیں (اس سے پہلے حضرت میاں میر کے متعلق چشتی اور لطیف کے مندرجات کا خلاصہ بیان کیا جا چکا ہے دیکھئے میاں میر اسرار خودی زیادہ مستند روداد ہی کو تصور کرنا چاہیئے اور ان بیانات کو شیخ محمد اکرام کے بیانات کے ساتھ ملا کر پڑھنا چاہیئے۔

دارا شکوہ شاہجہاں کا سب سے بڑا بیٹا تھا جب شاہجہاں کے ہاں متعدد بیٹیاں پیدا

ہوئیں تو اس نے خواجہ معین الدین اجمیری کے آستانہ پر حاضر ہو کر دعا مانگی۔ قبول ہوئی اور ۱۰۲۴ھ میں ماہ صفر کی ۲۹ تاریخ کو داراشکوہ بمقام اجمیر متولد ہوا۔ شاہ جہاں داراشکوہ کو بہت چاہتا تھا اور اسے شاہ بلند اقبال کہہ کے پکارتا تھا۔ مختلف مکاتیب میں اسے ثمین پور خلافت کہہ کر یاد کیا گیا ہے۔ خود داراشکوہ کا بیان ہے کہ میں اوائل نوجوانی میں اتنا بیمار ہوا کہ زندگی کی آس نہ رہی۔ شاہجہاں مجھے لے کر حضرت میاں میر کی خدمت میں پہنچے۔ انھوں نے میرے لئے دعا کی اور میں اچھا ہو گیا۔

غالباً دارا کی عقیدت صوفیہ کے گروہ سے اسی دن سے استوار ہوئی۔ اتفاق دیکھئے کہ ابتدا میں روحانی فیض تو دارا نے حضرت میاں میر سے حاصل کیا لیکن بیعت ان کے خلیفہ شاہ محمد المعروف ملا شاہ قادری سے کی۔ یہ غالباً ۱۶۳۹ء کا واقعہ ہے۔ شیخ ملا شاہ گرمیاں کشمیر میں گذارتے تھے اور داراشکوہ وہیں ان کے ارشادات سے مستفید ہوتا تھا۔ جہاں آرا بھی ان کے فیوض کی معتقد تھی۔ ملا شاہ قادری شاعر بھی تھے اور وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ داراشکوہ نے سکینۃ الاولیا میں ان کے کلام کا انتخاب جمع کیا ہے۔ شیخ محمد اکرام کا خیال ہے کہ ملا محمد شاہ کی ایک رباعی نے دارا کو مذاہب و ادیان کی تحقیق و تطبیق کی طرف مائل کیا اور اس نے یہ سمجھنا شروع کیا کہ حقیقت ہر جگہ جلوہ افگن ہے۔ ملا صاحب کی وہ رباعی یہ ہے:

آں را کہ بجا است بر سر ایماں جنگ
او مومن و زایمان من او را صد ننگ
مومن نشود تا کہ برابر نشود
با بانگ نماز، بانگ ناقوس فرنگ

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

"آخری شعر میں ملا شاہ نے جس خیال کا اظہار کیا ہے، اسی پر داراشکوہ نے عمل کیا

اور دوسرے مذاہب بالخصوص ہندو ویدانتیوں کی کتابوں میں حقیقت کی اس طرح
تلاش کی کہ گویا وہ اس کے اپنے طریقے کی کتابیں ہیں اور اسلامی تصوف اور ویدانت
میں ہم آہنگی ثابت کی۔"

بعض دفعہ تو ملا شاہ کی وارستہ گوئی اس حد تک بڑھ جاتی کہ اعتراضات کی زبانیں بے محابا کھل جاتیں۔ ایک دفعہ اس نے ایک شعر لکھا (نقلِ کفر کفر نباشد):

من چہ پروائے مصطفیٰ دارم ۔۔۔ پنجہ در پنجۂ خدا دارم

اس پر علمائے کشمیر نے ملا شاہ کے کافر اور واجب القتل ہونے کا فتویٰ دے کر شاہجہاں سے استدعا کی کہ وہ اس کے خلاف حد شرعی جاری کرے۔ شاہجہاں یہ فیصلہ کرنے والا تھا اور کشمیر کے گورنر ظفر خاں کے نام فرمان لکھا جا چکا تھا مگر داراشکوہ نے سفارش کی کہ اس معاملہ میں جلدی نہیں کرنی چاہئے اور کسی اور بزرگ مثلاً حضرت میاں میر سے استصواب کیا جائے۔ بادشاہ نے یہ بات قبول کر لی اور حضرت میاں میر سے ملا شاہ کے بارے میں دریافت کیا۔ حضرت میاں میر نے فرمایا کہ احوال کے تابع ملا شاہ ایسی باتیں کہہ جاتا ہے جن سے پرہیز واجب ہے لیکن اسے ان کی بنا پر قتل کرنا نامناسب اور ناموزوں ہوگا۔ بادشاہ نے یہ مشورہ قبول کر لیا اور ملا شاہ کے خلاف قدم نہ اٹھایا۔

سرمد سے بھی دارا کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اسے سرمد سے عقیدت تھی اور غالباً یہی عقیدت بعد میں بقول شیخ محمد اکرام، سرمد کی جان جانے کا باعث ہوئی۔

بہر حال داراشکوہ کی تصنیفات و تالیفات حسب ذیل ہیں:

۱۔ سفینۃ الاولیاء (تاریخ تکمیل تالیف ۲۷ رمضان ۱۰۴۹ھ) اس میں قریباً چار سو بزرگان دین کے حالات اجمالی طور پر قلمبند کئے گئے ہیں۔ مصنف اپنے آپ کو حنفی قادری لکھتا ہے۔

کتاب کے ماخذوں میں نفحات بھی شامل ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی کے حالات بھی اس کتاب میں تفصیلاً بیان کئے گئے ہیں یعنی نسبتاً۔

۲۔ سکینۃ الاولیا، (سال تالیف ۱۰۵۲ھ) اس میں حضرت میاں میر اور ان کے خلفا، کے حالات مندرج ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہلی اور دوسری کتاب کے زمان تالیف کے دوران میں دارا نے شعر کہنا بھی شروع کر دیا تھا اور قادری تخلص اختیار کیا تھا۔

۳۔ شطحیات یا حسنات العارفین سال تالیف ۱۰۶۲ھ) اس کتاب میں دارا نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ صوفی بعض اوقات حالتِ جذب و سرور میں ایسے کلمات کہہ جاتے ہیں جو بظاہر قابل اعتراض معلوم ہوتے ہیں لیکن در اصل ان کا مقصد اہانت شرع نہیں ہوتا (اس سلسلہ میں دیکھئے مولانا ابوالکلام آزاد کے بیانات تذکرہ میں کہ جن لوگوں کی نیک کرداری مسلم ہے ان کے متعلق حسن ظن رکھنا چاہیے)

۴۔ مجمع البحرین (سال تالیف ۱۰۶۵ھ): یہی کتاب ہے جس کی بنا پر دارا کو ملحد اور واجب القتل قرار دیا گیا ہے۔ دارا اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ وحدت وجود کے مسلک کو ملحوظ خاطر رکھا جائے تو اسلامی تصوف کے بنیادی عناصر میں اور ویدانت کی تعلیمات میں کوئی اساسی اختلاف نظر نہیں آتا (اور یہ درست ہے کہ جو لوگ وحدت الوجود کے قائل ہیں ان کے لئے اس نتیجہ تک پہنچنا کہ تمام ادیان و مذاہب میں ایک ہی حقیقت نے مختلف روپ دھارے ہیں کچھ مشکل نہیں) خود دارا کہتا ہے کہ ویدانت کے عالموں سے جو کچھ میں نے سنا ہے اور متعلقہ کتابوں میں جو کچھ میں نے پڑھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وحدت الوجود میں اور ویدانت میں اگر کچھ اختلاف ہے تو وہ لفظی ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ ان اختلافات کو رفع کر کے دونوں مسلکوں کی وہ مشابہتیں دکھلاؤں جن سے ان کی تطبیق ممکن ہے۔ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں یہ کتاب مسلمان صوفیوں اور ہندو یوگیوں کے عقائد کا مجموعہ ہے اس لئے اس کا نام مجمع البحرین رکھا گیا۔

علامہ کو وحدت وجود کے نظریہ میں جو خرابیاں نظر آتی تھیں۔ ان کا اظہار وہ اپنے مکاتیب میں اور مضامین اکثر کر چکے ہیں۔ اس مسلک کا ایک مخصوص شیوہ یہ ہے کہ انسان میں بے عملی پیدا کرتا ہے اور ان قوتوں کو بیکار کر دینا چاہتا ہے جن سے کام لے کر انسان اپنے مقصد تک پہنچتا ہے یعنی تسخیر نفس و آفاق۔ علامہ کی نظر میں اصل الحاد یہی ہے کہ اسلام کو جو جہاد عمل اور سخت کوشی کو مستحسن سمجھتا ہے بلکہ فریضے گردانتا ہے، اس صورت میں پیش کیا جائے کہ انسان بجائے تسخیر کائنات کے ترک دنیا کی طرف مائل ہو۔

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ دارا شکوہ کی تصنیفات میں "تلاش و تفتیش کے باوجود کوئی ایسا اندراج نظر نہیں آتا جس سے اس کا الحاد ثابت ہو سکے۔

۵۔ رسالہ حق نما: شیخ محمد اکرام اس کا سال تالیف ۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ایک مختصر سا صوفیانہ رسالہ ہے۔ صاحب بزم تیموریہ نے یہ کتاب نہیں دیکھی۔

۶۔ شیخ محمد اکرام نے انھیں کتابوں سے نسبتاً تفصیلی بحث کی ہے جن کا ذکر اوپر ہوا لیکن وہ ایک اور مختصر سے رسالہ کا بھی ذکر کرتے ہیں یعنی مکالمہ دارا شکوہ و بابا لال۔ اس تصنیف کا مرتب دارا شکوہ کا میر منشی چندر بھان ہے۔ اس کے علاوہ شیخ صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ

۷۔ دارا شکوہ نے سرِ اکبر کے نام سے بنارس کے پنڈتوں کی مدد سے اپنشدوں کے قریباً پچاس ابواب کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

۸۔ انھی کے قول کے مطابق دارا شکوہ نے بھگوت گیتا کا بھی فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔

صاحب بزم تیموریہ نے جہاں سرِ اکبر کے متعلق نسبتاً تفصیلی معلومات بہم پہنچائی ہیں وہاں دارا شکوہ کی کچھ اور تصانیف کا سراغ دیا ہے۔

۱۔ نادر النکات: پروفیسر محفوظ الحق کا خیال ہے کہ شاید رسالہ حق نما یا مکالمہ دارا شکوہ

بابا لال کا دوسرا نام نادر النکات ہے اسے مخزن نکات کہہ کر بھی پکارا گیا ہے۔

۲۔ رسالہ معارف: صاحب بزم تیموریہ نے یہ رسالہ دیکھا نہیں۔ وہ صاحب خزینۃ الاصفیا کی سند پر اسے دارا سے منسوب کرتے ہیں۔

۳۔ بیاض یعنی شہزادہ دارا شکوہ کی ذاتی بیاض۔ مخزن الغرائب کے مولف نے اس کتاب سے استفادہ کیا ہے۔

۴۔ دیباچہ: پیرس کے قومی کتب خانہ میں ایک مخطوطہ نگارستان منیر نامی ہے جس کے آخر میں ایک مرقع کا دیباچہ ہے۔ یہ دارا شکوہ سے منسوب ہے۔

۵۔ اکسیر اعظم: دارا شکوہ کے دیوان کا نام ہے۔ اس میں دارا کی ۱۴۳ غزلیں اور ۴۸ رباعیاں ہیں۔

صاحب بزم تیموریہ بھی لکھتے ہیں کہ مخزن ستمبر ۱۹۰۷ء میں دارا کی ایک فارسی مثنوی کا ذکر موجود ہے اور پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی جرنل جلد دوم نمبر ۱ میں دارا کی ایک تزک کا ذکر موجود ہے مگر ان کتابوں کے نام کسی اور تذکرہ میں نہیں پائے جاتے[1]

(۷) اکرم او نزد حق اتقائے او: اشارہ ہے آیتِ قرآنی کی طرف۔ دیکھئے $\frac{49}{13}$

ترجمہ یہ ہے:

اے لوگو بے شک ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہاری جماعتیں اور قبیلے بنائے ہیں تاکہ تم باہم پہچان رکھو (قائم رکھو) مگر نسب پر غرہ نہ کرنا، بیشک اللہ کے نزدیک تم سب میں بزرگ وہ ہے۔ جو تم سب میں زیادہ پرہیزگار

---

[1] رود کوثر: شیخ محمد اکرام۔
دربارِ اکبری: آزاد۔
فکرِ اقبال: خلیفہ عبدالحکیم، بزم اقبال ۱۹۵۷ء۔
ائمہ تلبیس۔
تحقیقاتِ چشتی۔
بزمِ تیموریہ ۱۹۵۷ء۔

ہو، بے شک اللہ دانا باخبر ہے۔"

(۸) اِلیٰ شَیءٍ نُکُر: اشارہ ہے آیت قرآنی کی طرف۔ دیکھئے ۵۴/۶ ۔

ترجمہ یہ ہے:

"سو تو ہٹ آ ان کی طرف سے جس دن پکارے پکارنے والا ایک اَن دیکھی چیز کو۔"

یوں بھی ترجمہ کیا گیا ہے:۔

پس اے نبی تم ان سے اعراض کرو جس دن پکارنے والا ان سب کو ایک ناگوار چیز یعنی حساب کی طرف پکارے گا۔"

یہاں علامہ کی مراد یہ ہے کہ مسلمان بھی فرقہ بندی کی وجہ سے ایسی راہ پر چل رہے ہیں کہ حشر کے دن جب ان کے اعمال کا محاسبہ کیا جائے گا تو ان کا شمار کافروں میں ہوگا جو کسی طرح رسول پاک کی باتوں کی طرف کان نہیں دھرتے تھے۔

(۹) اَمَنّ النّاس: حدیثِ نبوی کی طرف اشارہ ہے۔ پوری حدیث یہ ہے:

امنّ الناس علی فی صحبتہ ومالہ ابوبکر

ترجمہ یہ ہے:

"میں لوگوں میں ابوبکرؓ کی صحبت اور مال کا سب سے زیادہ ممنون ہوں۔"

اس حدیث سے رسول پاک اور حضرت ابوبکر صدیق کے روابط قلبی کا سراغ ملتا ہے۔

(۱۰) اُمّیئے پاک از ہوا گفتارِ او   شرحِ رمز ما غویٰ گفتارِ او

آیاتِ قرآنی کی طرف اشارہ ہے۔ حوالہ بہ تفصیلِ ذیل ہے۔ ۵۳/۲-۴

ترجمہ حسبِ ذیل ہے:

(۳) (پہلے مصرعے میں) اور نہ اپنی خواہش (علامہ حضرت عبدالقادر محدث دہلوی خواہش

کی جگہ "چاؤ" کا کلمہ استعمال کرتے ہیں) سے کوئی بات کرتے ہیں۔

(۲) (دوسرے مصرعے میں) تمہارے صاحب نہ گمراہ ہیں اور نہ کج رو ہیں (محدث

دہلوی مذکورہ: بہکا نہیں تمہارا رفیق اور بے راہ نہیں چلا) -

مراد یہ ہے کہ رسولِ پاک کا ہر قول ایمائے ربانی کا تابع ہوتا ہے اور یہی حالت فعل کی ہے۔

(۱۱) آں خدائے لم یزل را آیتے
داشت در دل آرزوئے ملتے

اشارہ ہے آیت قرآنی کی طرف۔ دیکھئے $\frac{۲}{۱۲۸}$ ترجمہ یہ ہے:

"اے رب! اور کر ہم کو حکم بردار اپنا اور ہماری اولاد میں بھی ایک امت حکم بردار اپنی۔ اور جتا ہم کو دستور حج کرنے کے اور ہم کو معاف کر، تو ہی ہے اصل معاف کرنے والا، مہربان۔"

(۱۲) آں کہ حفظِ جانِ او موعود بود

اشارہ ہے آیتِ قرآنی کی طرف۔ دیکھئے $\frac{۵}{۶۷}$ ترجمہ یہ ہے:

"اے (میرے برگزیدہ) رسول جو کچھ تمہارے پروردگار (کے ہاں) سے تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے اس کو تم (ان لوگوں تک) پہنچا دو اور اگر تم (ایسا) نہ کرو گے تو (سمجھ لو کہ) تم نے خدا کا پیغام نہیں پہنچایا۔ اور (تمہیں کسی کا کیا خوف) اللہ تم کو لوگوں (کے شر) سے بچائے گا۔ بے شک اللہ کافر لوگوں کو راہ (راست) پر نہیں لاتا۔"

(۱۳) آں کہ دوشِ کوہ بارش برنتافت

دیکھئے اِنّا عرضنا ۔

(۱۴) اَن یُّطفِئُوا: اشارہ ہے آیتِ قرآنی کی طرف۔ دیکھئے ۹/۳۲۔ ترجمہ یہ ہے:

یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے (پھونک مار کر) بجھا دیں۔ اور اللہ سوا اس کے نہیں چاہتا کہ اپنی روشنی کو پورا کرے اگرچہ کافر ناخوش ہو جائیں"۔

ظفر علی کہتا ہے:

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

اور علامہ کہتے ہیں:

کیوں ہراساں ہے صہیلِ فرسِ اعدا سے
نورِ حق بجھ نہ سکے گا نفسِ اعدا سے

(۱۵) اے تماشاگاہِ عالم روئے تو تو کجا بہرِ تماشا می روی

یہ سعدی کا شعر ہے۔ علامہ نے اس کے دونوں مصرعوں کو تضمین کیا ہے۔

(دیکھئے سعدی)

ب

(۱) **بالعدل والاحسان:** اشارہ ہے آیت قرآنی کی طرف۔ دیکھیے ۱۶/۹۰۔ ترجمہ یہ ہے:

خدا تم کو انصاف اور احسان کرنے اور رشتہ داروں کو (خرچ سے مدد) دینے کا حکم دیتا ہے۔ اور بے حیائی اور نامعقول کاموں اور سرکشی سے منع کرتا ہے (اور) تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاد رکھو۔

(۲) **بحرِ ما ویرانہ آباد کرد**

اشارہ ہے آیتِ قرآنی کی طرف۔ دیکھیے ۱۴/۳۷۔ ترجمہ یہ ہے:

"اے ہمارے پروردگار بے شک میں نے اپنی اولاد کو ایک بے کھیتی کے جنگل میں تیرے بزرگ گھر کے پاس لبا دیا۔ اے ہمارے پروردگار تاکہ وہ اس میں) نماز پڑھا کریں۔ پس کچھ لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر دے۔ (تاکہ وہ یہاں آکر آباد ہوں) اور انھیں میووں سے روزی دے تاکہ وہ شکر کریں۔"

(۳) بغداد: مشہور شہر ہے اور بہت قدیم ہے۔ اس کلمہ میں بغ بہ جوڑ ہے یعنی بغ + داد۔ داد فارسی میں بخشش اور عطیہ کو کہتے ہیں۔ بغ اور فغ خدا اور دیوتا کو۔ سنسکرت کا لفظ بھگوان اور بغ کا مادہ ایک ہی ہے۔ اضافتِ مقلوب ہے اور کلمے کے معنی ہیں دادۂ بغ۔ یعنی دیوتاؤں کا عطیہ۔ اس کی وجہِ تسمیہ یہ ہے کہ اس شہر میں قدیم الایام سے دیوی استرتی یا اناہیتا کا مندر چلا آتا تھا۔ یہ وہی دیوی ہے جسے ہم ناہید یا زہرہ کے نام سے پہچانتے ہیں۔ اناہیتا کے لغوی معنی بے عیب کے ہیں۔ اردشیر بابکاں جو دولتِ ساسانی کا موسس تھا اس لحاظ سے بھی مشہور تھا کہ اس کے آباؤ اجداد اس مندر کے پروہت تھے اور یہ جو بیان کیا جاتا ہے کہ نوشیرواں یہاں انصاف کیا کرتا تھا اور اس لئے اسے بغداد کہتے ہیں یہ غلطِ صریح ہے۔

بنی اُمیہ کے زوال کے بعد جب سیاسی انقلاب ہوا تو عباسیوں کو ایک نئے دارالخلافہ کی ضرورت ہوئی چنانچہ منصور نے جو عباسیوں کا دوسرا فرماں روا تھا مدائن سے چند میل شمال کی طرف (اور مدائن دریائے دجلہ کے قریب واقع تھا) ایک نیا شہر آباد کیا اور اس کا نام بغداد قرار پایا۔ بنو عباس کے زمانہ میں اس شہر کو بڑی رونق نصیب ہوئی۔ بڑی بڑی عالیشان عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ یوں کہنا چاہئے کہ تمام ریاستی امور کا مرکز و محور یہ شہر بن گیا تھا۔

مختلف شعرا نے اس شہر کی خوبی اور رونق کے متعلق قصیدے کہے ہیں۔ آج کل بغداد کی وہ رونق نہیں تاہم خاصہ آباد شہر ہے۔[1]

---

[1] جغرافیہ خلافت مشرقی۔
تاریخ عالم اسلامی: براکلمن۔
ایران بعہدِ ساسانیاں: محمد اقبال۔
کلیات انوری۔ تاریخِ طبری۔
برہان قاطع (ایرانی ایڈیشن)۔
قاموس سیاسیاتِ عالم: فیبر اینڈ فیبر۔
بغداد: خواجہ عبادالله اختر۔
تاریخِ ایران: سائکس جلد اول و دوم۔

(۴) بوعبید (ابو عبید): قصہ یہ ہے کہ مسلمانوں اور ایرانیوں کے درمیان جو لڑائیاں ہوئی ہیں ان میں دو سردار پیش پیش رہے ہیں۔ ایک ابو عبیدہ جن کا ذکر پہلے تلمیحات میں آچکا ہے (بانگِ درا) دوسرے بوعبید ثقفی۔ ان میں سے بوعبید ثقفی واقعہ جسر (ساحلِ فرات) میں مقتول ہوئے اور مقامِ شہادت تک پہنچے۔ براکلمن نے تصریح کر دی ہے کہ واقعہ جسر میں شہید ہونے والے عربی سردار کا نام بوعبید ثقفی ہے۔ اب مشکل یہ ہے کہ علامہ لکھتے تو بوعبید ہیں لیکن یہ فرماتے ہیں کہ جابان کی گرفتاری کا واقعہ درفشِ کاویانی کے چاک ہونے سے تعلق رکھتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی لکھتے ہیں کہ آتش اولادِ ساسان خاک ہو چکی ہے۔ اس سے گمان یہ ہوتا ہے کہ یہ واقعہ آخری لڑائی میں پیش آیا ہے۔ درانحالیکہ بوعبید پہلی لڑائیوں ہی میں درجۂ شہادت پر فائز ہو چکے تھے۔ رازی کو بھی یہ اشتباہ ہوا ہے کہ جنگ جسر میں ابو عبیدہ شہید ہوئے۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ بوعبید عربی لشکر کے سردار تھے اور ایرانیوں سے جنگ آزما۔[۱]

(۵) بود اندر آب و گلِ آدم ہنوز

اشارہ ہے اس حدیثِ نبوی کی طرف کہ:

كنت نبياً و آدم بين الماء والطين

کہ میں اُس وقت بھی نبی تھا کہ جب حضرتِ آدم ابھی پانی اور کیچڑ کے درمیانی عالم میں تھے۔

---

[۱] تاریخ عالم اسلام: براکلمن۔ تاریخ ایران: جلد اللہ رازی۔

استدراک: سائیکس نے تصریح کی ہے کہ درفش کاویانی جنگِ قادسیہ میں مالِ غنیمت بن کر عربوں کے ہاتھ آیا۔ اگر یہ درست ہے تو ماننا پڑے گا کہ جابان کی گرفتاری جنگ قادسیہ کے نتائج میں داخل ہے اور علامہ نے جو واقعہ بیان کیا ہے وہ اسی جنگ سے متعلق ہے۔

پ

(۱)

پوشش عریانیٔ مرداں زن است
حسنِ دلجو عشق را پیراہن است

آیتِ قرآنی کی طرف اشارہ ہے جوالہ اور متعلقہ جزو کا ترجمہ بہ تفصیلِ ذیل ہے: ۲/۱۸۷ :

"وہ پوشاک ہیں تمہاری اور تم پوشاک ہو ان کی۔" (شاہ عبدالقادر محدث دہلوی)

اسلام نے مرد اور عورت دونوں کے لئے عصمت و عفتِ نظر لازم و ملزوم گردانی ہے اور جہاں عورت کو بہت سے حقوق بخشے ہیں وہاں مرد کو اس کا نگہبان اور محافظ بھی بنایا ہے۔

علامہ نے متعدد بار اس مسئلے پر اظہار خیال کیا ہے۔ مثلاً :

نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد

اور جو تحریک آزادیٔ نسواں کی چلی ہے، اس کے متعلق دیکھئے علامہ کی کتاب 'ضرب کلیم' جس میں اس مسئلے سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

ت

(۱) **تقبل منا:** اشارہ ہے آیتِ قرآنی کی طرف۔ دیکھئے $\frac{۲}{۱۲۸}$ ۔ ترجمہ یہ ہے:

"اے رب! اور کر ہم کو حکم بردار اپنا اور ہماری اولاد میں بھی ایک امت حکم بردار اپنی اور جتا ہم کو دستور حج کرنے کے اور ہم کو معاف کر۔ تو ہی ہے اصل معاف کرنے والا مہربان"۔

(۲) **توحید:** (در رقی الرحمٰن عبداً مضمر است)

اس مصرعہ میں اشارہ ہے آیتِ قرآنی کی طرف۔ دیکھئے $\frac{۱۹}{۹۳}$ ترجمہ یہ ہے:

"کوئی چیز نہیں آسمان و زمین میں۔ جو نہ آنے والی ہو رحمٰن کا بندہ ہو کر"۔

یوں تو توحید کے متعلق مسلمانوں کے عرفانی اور اخلاقی ذخیرۂ کتب میں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن امام غزالی نے کیمیائے سعادت میں جو کچھ لکھا ہے وہ تعریف سے بالاتر ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایمان کا بہترین ثمرہ حالتِ توکل ہے اور توکل اس وقت تک پیدا نہیں ہوتا جب تک

انسان کو رحمت حق تعالیٰ کی امید نہ ہو اور اس کا توحید پر ایمان نہ ہو۔ امام نے توحید کے مدارج مقرر کیے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ عامی بھی توحید کے معتقد ہوتے ہیں اور متکلم بھی لیکن توحید کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ انسان اپنے مشاہدات و واردات کی بنا پر یہ سمجھ لے کہ ہر چیز کی اصل ایک ہے اور فاعل ایک سے زیادہ نہیں بلکہ اور کسی سے نہ فعل تکوین سرزد ہو سکتا ہے نہ ہوتا ہے۔ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ صوفی بھی شعور توحید کا ایک مقام حاصل کرتے ہیں جسے وہ اپنی اصطلاح میں فنا کہتے ہیں۔"

شیخ امام احمد سرہندیؒ نے ہردے رام ہندو کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ پروردگارِ عالم ایک ہے اور بے چون و چگون ہے۔ اتحاد و حلول سے مبرا ہے۔ وہ زمان نہیں کہ زمان تو اس کی تخلیق ہے وہ مکان نہیں بلکہ مکان تو اس کی مصنوعات میں داخل ہے۔ وہ ازلی بھی ہے اور ابدی بھی اور نقص و زوال سے خالی بھی۔

بات یہ ہے کہ توحید پر واقعتاً ایمان لانے کے بعد انسان سوائے خدا کے کسی کی متابعت پر اپنے آپ کو مجبور نہیں پاتا۔ یہی رمز توحید ہے کہ بندۂ خدا ہونے کے بعد وہ بالکل بے خوف خطر ہو جاتا ہے اور باقی تمام بندگان خدا سے بے نیاز۔ یہی اصل توحید ہے۔ صرف کلمۂ طیبہ پڑھ لینے سے ایک عقیدہ کا اظہار ضرور ہوتا ہے لیکن جب تک انسان حقیقی کلمۂ طیبہ کی رمز سے آگاہ نہ ہو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ موحد ہے یا توحید کے معانی پر مطلع ہو گیا ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم "فکر اقبال" میں لکھتے ہیں:

انسانی عقل ابتدائی کوششوں میں اپنے ماحول میں اشیاء و حوادث کا فرداً فرداً ادراک کر کے ان کے ساتھ کوئی ہنگامی توافق پیدا کرتی رہی۔ ابھی تک ایسا شعور بیدار نہ ہوا تھا جو مظاہر کی گونا گونی اور کثرت کو کسی وحدت میں منسلک کر سکے۔

عقل کا پہلا ارتقائی قدم ارتقائی توحید کی بدولت اٹھا ورنہ عقل کے لئے خود اپنا مقصود واضح نہ تھا۔ فطرت کی تسخیر فہم فطرت کے ساتھ وابستہ ہے اور اس فہم کا کام حوادث کی کثرت میں آئین کی وحدت تلاش کرنا ہے کم فہم لوگ دین اور دانش کو الگ الگ بلکہ متضاد چیزیں سمجھتے ہیں۔ اگر نکتۂ توحید ان کی سمجھ میں آجائے تو ان پر یہ حقیقت منکشف ہو کہ توحید کی پیدا کردہ وحدت کوشی ہی دین اور حکمت دونوں کا سرچشمہ ہے اور تمام قسم کی قوتیں اسی سے پیدا ہوتی ہیں۔

عالموں کی حیرت اور عاشقوں کی قوتِ عمل اسی زاویۂ نگاہ کا نتیجہ ہیں۔ یہی عقیدہ خاک کو اکسیر بناتا ہے۔ اس سے انسان کی نوعیت ہی بدل جاتی ہے انسان راہِ حق میں گرم رو ہو جاتا ہے۔ شک اور خوف کی جگہ یقین محکم پیدا ہوتا ہے چشمِ بصیرت پر ضمیرِ کائنات کا انکشاف ہوتا ہے۔

کلمۂ توحید ملتِ بیضا کے تن میں بطور جان ہے۔ یہی عقیدہ ملت کا شیرازہ بند ہے۔ اسی سے زندگی میں قوت کا اضافہ ہوتا ہے۔ اس سے تودۂ گل دل بن جاتا ہے اور ذل ہیں سے اگر یہ نکل جائے تو دل مٹی ہو جاتا ہے۔ مسلمان کی اصلی دولت یہی ہے۔ اسی توحید نے اسود و احمر کی تمیز مٹائی اور بلال حبشی فاروقؓ و ابوذر کا ہمسر ہو گیا۔ ملت نہ جغرافیائی چیز ہے اور نہ نسلی یا لسانی۔ بقول شاعر

ہم دلی از ہم زبانی بہتر است

ملت دلوں کی یک رنگی اور ہم آہنگی سے پیدا ہوتی ہے اور یہ بات توحید ہی کی برکت سے ظاہر ہوتی ہے۔

ملت اسے کہتے ہیں جس میں خیر و شر اور خوب و زشت کا معیار یکساں ہو۔ یہ اتحاد خدائے واحد ہی کی بخشی ہوئی بصیرت کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ ورنہ ہر شخص خود اپنے لئے معیار بن جائے اور انسانی وحدت کا شیرازہ بکھر جائے۔ بعض ملتوں نے اپنی تقدیر کو وطن کے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے۔ بعض نے اتحاد ملت کی تعمیر نسل و نسب کی بنیادوں پر قائم کی ہے لیکن وطن پرستی خدا پرستی نہیں، وہ ایک خطہ ارضی کی پرستش ہے۔ اسی طرح نسب کا مدار جسمانی توارث پر ہے لیکن انسان کی ماہیت جسم نہیں بلکہ روح ہے۔ ملتِ اسلامیہ کی اساس نفسی ہے۔ یہ ایک غیر مرئی رشتہ ہے جس طرح تجاذبِ انجم کے تار کسی کو نظر نہیں آتے مگر وہی نظامِ انجم کے قوام ہیں۔ اس قسم کی وحدتِ نفسی توحید پرستوں کے سوا کہیں اور نظر نہیں آتی۔ قرآن نے جہاں نفسِ مطمئنہ اور نجات یافتہ، خدا رس انسان کا ذکر کیا ہے وہاں اس کے دو ہی صفات بالتکرار بیان کئے ہیں۔ ایک یہ کہ ایسا انسان یاس و حزن و غم سے پاک ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ کسی قسم کا خوف اس کے دل میں نہیں رہتا۔ اسی صفت کا نام حریت ہے اور یہ توحید ہی کا ثمر ہے۔ مردِ موحد کبھی ناامید نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کے نزدیک ناامیدی کفر ہے۔ امید سے زندگی کی قوتیں بیدار اور استوار رہتی ہیں اور یاس سمِ قاتل کا کام کرتی ہے۔ قطع امید سے انسان خودکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ مایوس انسان کے عناصر سست ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے چشمے خشک ہو جاتے ہیں۔ غم انسان کی جان کو کھا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو خدا اور رسول نے "لاتحزن" کی تعلیم دی ہے اور نصب العین لاخوف علیهم ولاهم یحزنون قرار دیا ہے۔

ج

(۱) جابان: یزدجرد کی فوجوں کا ایک ایرانی سردار جسے بوعبید کے لشکریوں نے قید کر لیا تھا (علامہ کے قول کے مطابق) دیکھئے۔ بوعبید۔

(۲) (امام) جعفر (صادق): اثنا عشری فرقہ کے چھٹے امام ہیں۔ جیسا کہ لقب سے ظاہر ہے۔ ان کا صدق مقال مشہور ہے۔ تفقہ میں بے نظیر تھے۔ امام ابو حنیفہ نے ان سے استفادہ کیا ہے اور اس کا بصراحت اعتراف کیا ہے۔ جناب کے والد بزرگوار کا نام محمد باقر ہے۔ بتاریخ وفات ۱۴۸ھ ہے۔[1]

(۳) جلوہ در تاریکیٔ ایام کن   آنچہ بر تو کامل آمد عام کن

اشارہ ہے آیت قرآنی کی طرف۔ حوالہ اور متعلقہ جزو کا ترجمہ بہ تفصیل ذیل ہے:[2]

"آج میں نے تمہارا دین تمہارے لئے کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی۔"

---

[1] امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی: مولانا مناظر احسن گیلانی۔ طبقات سلاطین اسلام۔ حیات احمد بن حنبل۔

(محدث دہلوی (شاہ عبدالقادر)

آج میں پورا دے چکا تم کو دین تمہارا اور پورا کیا تم پر میں نے احسان اپنا۔"

مراد یہی ہے کہ دین اسلام خدا کا آخری پیغام ہے۔ اور اس مسئلے سے متعدد تلمیحات کے سلسلے میں بحث ہو چکی ہے۔

(۴) جنّتے جستند و بئس القرار تا احلّوا قومھم دار البوار

آیاتِ قرآنی کی طرف اشارہ ہے۔ دیکھئے ۱۴/۲۸۔۳۰۔ ترجمہ یہ ہے:

"کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھوں نے خدا کے احسان کو ناشکری سے بدل دیا اور اپنی قوم کو تباہی کے گھر میں اتارا۔ (وہ گھر) دوزخ ہے (سب ناشکرے) اس میں داخل ہوں گے۔ اور وہ بُرا ٹھکانہ ہے۔ اور ان لوگوں نے خدا کے شریک مقرر کئے کہ (لوگوں کو) اس کے رستے سے گمراہ کریں۔ کہہ دو کہ (چند روز) فائدے اٹھا لو آخر کار تم کو دوزخ کی طرف لوٹ جانا ہے۔"

ح

(۱) حرفِ او را ریب نے تبدیل نے

آیاتِ قرآنی کی طرف اشارہ ہے۔ حوالہ یہ ہے ۲/۲ اور ۱۰/۶۴۔

پہلی آیت کا ترجمہ یہ ہے :

"اس کتاب (کے کتاب اللہ ہونے میں) میں کچھ بھی شک نہیں۔ راہ بتاتی ہے پرہیزگاروں کو۔ (یعنی بالقطع و یقین یہی کتاب ہدایت ہے جو اصحابِ تقویٰ کو نجات کا راستہ بتاتی ہے)"

دوسری آیت کا ترجمہ یہ ہے :

"اُن کے لئے دنیاوی زندگانی میں (بھی) بشارت ہے۔ اور آخرت کی (زندگی) میں (بھی) اللہ کے وعدے تبدیل نہیں ہو سکتے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔"

(مراد یہ ہے کہ کلماتِ الٰہی میں نہ کبھی کوئی تغیر و تبدل واقع ہوا نہ ہوگا۔ علامہ کا ارشاد ہے کہ

اسرارِ حیات جس طرح قرآن مجید میں بیان کردیے گئے ہیں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ قرآن مجید ہی خدا کا آخری پیغام ہے اور ہر لحاظ سے مکمل ہے اور اس کے بیانات ہر قسم کے شک و شبہ سے مصئون ہیں اس کی وجہ یہ ہے جن حقائق کا بیان کیا گیا ہے ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ علامہ کے خیال میں تمام ثقافتی معاشرتی اور اخلاقی اقدار کا معیار و پیمانہ قرآن مجید ہی ہے اور سنّت رسول سے ان اقدار کی توضیح ہوتی ہے۔

(۲) حی و قیوم: حی کے لغوی معنی ہیں ہمیشہ زندہ اور قیوم کے ہمیشہ قائم رکھنے والا دونوں اسماء حسنہ الٰہی میں شامل ہیں۔ قرآن مجید میں سورہ بقرہ میں آیا ہے:

لا الٰہ الا ھو الحی القیوم

جس کا ترجمہ ہے:-

اس کے سوا کسی کی بندگی (جائز) نہیں وہ ہمیشہ زندہ اور قائم رکھنے والا ہے۔ (تھامنے والا) حوالہ یہ ہے ۲/۲۵۵ -

خ

(۱) **خجند**: سمرقند سے فرغانہ کی طرف جاتے ہوئے اس صوبہ کے مغربی حصہ میں جو پہلا شہر آتا، وہ خجند یا خجندہ تھا۔ یہ دریائے سیحون کے بائیں ہاتھ والے کنارے پر واقع تھا۔[۱]

(۲) **خرقہ لاتحزنوا اندر برش**

انتم الاعلون تاجے بر سرش

آیت قرآنی کی طرف اشارہ ہے۔ حوالہ یہ ہے ۳/۱۳۹ متعلقہ جزو کا ترجمہ یہ ہے:

"غم نہ کھاؤ اور تم ہی غالب رہو گے..."

(۳) **خطیب**: مشہور محدث ہیں سالِ ولادت ۳۹۲ھ ہے۔ ان کی تصانیف کی تعداد سو سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ بغداد میں مدفون ہیں اور سالِ وفات ۴۶۳ھ ہے۔[۲]

---

[۱] جغرافیہ خلافتِ مشرقی: ترجمہ جمیل الرحمٰن۔

[۲] قاموسِ اسلام (انگریزی)۔

د

(۱) **درفشِ کاویانی:** فارسی کی ادبی روایات مدعی ہیں کہ جب ضحاک (اژی دھاک، اژدہا) کا ظلم وستم حد سے بڑھ گیا تو کاوہ نامی ایک لوہار نے اپنے چرمی لباس کے ایک ٹکڑے کو علم پر لگا لیا اور ملک میں عام بغاوت پھیل گئی۔ چنانچہ ضحاک مارا گیا۔ بعد میں ایرانی فرمانرواؤں نے اس واقعہ کی یاد کو یوں محفوظ رکھا کہ اپنے قومی جھنڈے کو درفشِ کاویانی کہہ کر پکارا۔ نظامی نے سکندر نامہ میں لکھا ہے کہ اس عَلَم پر ریشم و پرنیاں کے پرچم تھے اور زر و جواہر کی لڑیاں عَلَم کے گرد لپیٹی گئی تھیں۔

واضح رہے کہ دُرفش بضم اول ہے اور ارباب لغت لکھتے ہیں کہ اس کے معنی ہیں:

پارچہ قماش سہ گوشہ کہ بزر منقش کردہ بر سر علم بندند"

یعنی کپڑے کا تکون ٹکڑا جس پر سنہری کام ہو۔ صاحب غیاث لکھتے ہیں کہ درفشیدن کے معنی لہرانا ہیں اسی لئے جھنڈے کو درفش کہتے ہیں لیکن خود صاحبِ غیاث ہی مدعی ہیں کہ لغات

اس کلمہ کو بفتحتین بھی پڑھتی ہیں۔ برہانِ قاطع میں پہلا حرف مکسور اور دوسرا مفتوح بتایا گیا ہے۔ (برہان قاطع کے مندرجات سے غیاث کا مقابلہ کر لیا گیا ہے[۴])۔

(۲) دُوئی (ثنویت): رموزِ بے خودی میں جس دُوئی کا ذکر ہے وہ مابعد الطبیعیاتی نہیں بلکہ مذہبی تصورات و افکار سے وابستہ ہے۔ صاحبِ لغتِ فلسفہ کے قول کے مطابق سب سے پہلے ٹامس ہائڈ نے (۱۷۰۰ء) کلمہ Dualisim یا ثنویت استعمال کیا اور اس سے وہ دُوئی مراد لی جو مذاہب میں پیکارِ خیر و شر سے مربوط ہے۔ بیل نے اپنی لغت میں بھی زرتشت پر مضمون لکھتے وقت اس کلمہ کو مذکورہ معنی ہی میں استعمال کیا۔

قصہ یہ ہے کہ بالعموم آریائی اقوام وحدتِ مطلقہ کا تعقل کرنے سے عاجز ہیں۔ وہ یا تو حقیقت کو پارہ پارہ کرکے یا جزوی طور پر دیکھتی ہیں یا پھر یہ ہوتا ہے کہ ان اقوام کے مذہبی اکابر حقیقتِ مجردہ کیلئے مجازی کا جسمانی قالب ڈھونڈتے ہیں۔ یہی قالب بتوں کی صورت اختیار کرتے ہیں اور بتدریج بت پرستی ایک منظم مذہب کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ آریائی اقوام کے تمام بڑے بڑے مفکروں نے کسی نہ کسی شکل میں دوئی کو قبول کیا ہے۔ زرتشت کے ہاں اگرچہ حقیقتِ مطلقہ اہورہ مزدا ہے لیکن خیر اور شر کی قوتیں دائماً برسرِ پیکار رہتی ہیں۔

زرتشت کے مقلّدوں نے اہرمن اور یزداں کی پیکار کو ایسا رنگ دیا کہ بالکل ثنویت کی شکل پیدا ہو گئی اور جب زروان پرستی نے فروغ پایا تو دوئی کا تصوّر بھی خوب پھلا پھولا۔

مانی اور مزدک کے ہاں بھی دُوئی کی مختلف شکلیں ملتی ہیں۔ عیسائیوں میں بھی حقیقت کو پارہ پارہ کرکے اسے تین صورتیں عطا کی گئی ہیں اسے تثلیث کہتے ہیں۔ (دیکھئے زرتشت اور اس کے حالات) مغرب میں دُوئی نے جو کرشمے دکھائے ہیں وہ بڑے حیرت انگیز ہیں۔ اسلام ایک مکمل

---

[۱] سخندانِ پارس: آزاد۔ [۲] غیاث اللغات۔ [۳] برہانِ قاطع۔ [۴] بہارِ عجم۔

نظامِ حیات پیش کرتا ہے جس میں افتراق کی گنجائش نہیں۔ اس کے برخلاف مغرب میں یہ کیفیت ہے کہ دین اور سیاست میں جدائی ہے گویا اربابِ دین سے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ سیاسی معاملات میں دخل نہ دیں۔ صرف یہی نہیں، مغرب میں تو اخلاق اور معاشرت میں بھی جدائی ہے، عرفان اور سائنس میں افتراق ہے۔ اس سے بڑے خوفناک ذہنی اور روحانی امراض پیدا ہوتے ہیں۔

دوئی ہی کا خوفناک مرض عجمی اور مجوسی اثرات کے ماتحت مسلمانوں کے قدیم نظامِ حیات کو کھا گیا۔ حقیقت کے دو ٹکڑے کیے گئے۔ ایک کو شریعت کا نام دیا گیا، ایک کو طریقت[1] کہہ کر پکارا گیا۔ معانیِ قرآن کے سلسلہ میں بھی تاویل اور تنزیل کی اصطلاحات وضع کی گئیں۔ اس کے برخلاف رسول اکرم کی تعلیمات یہ تھیں کہ مشاہدات و واردات، سوز و ساز، ذکر و فکر، دین و سلطنت اور فقر و شہنشاہی مسلمان کی ذات میں سمو دیے گئے ہوں، خود ان کی ذات دوئی کے تصور کے خلاف ایک زندہ ثبوت، توحید کے نکتہ کی تصویر اور حقیقتِ مطلقہ کی وحدت کی برہان بن کر رہ گئی تھی۔

اکثر شعرا نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہم آریائی ہونے کی وجہ سے دوئی کا شکار ہیں اور حقیقتِ مطلقہ کا ادراک نہیں کر سکتے۔ غالب نے بڑے تیکھے انداز میں کہا ہے:

رموزِ دیں نشناسم درست و معذورم　　　　نہادِ من عجمی و طریق من عربی است[1]

(۳) دیلمی: مشہور محدث ہیں ہمدان کے رہنے والے ہیں۔ سالِ وفات ۵۰۹ھ ہے۔ ان کی مشہور کتاب فردوس ہے جو احادیث کا مجموعہ ہے اور حروفِ تہجی کے اعتبار سے ترتیب ملحوظ خاطر رکھی گئی ہے۔ احادیث کی تنقیح میں (بیان کیا جاتا ہے) انھوں نے زیادہ محنت نہیں کی۔[2]

---

[1] انتقاد: سید عابد علی۔　　　　فکرِ اقبال: خلیفہ عبدالحکیم، بزمِ اقبال لاہور۔

لغت فلسفہ: ایرانی۔　　　　تاریخ تصوف در اسلام۔　　　　مزدیسنا: محمد معین۔

[2] بستان المحدثین: شاہ عبدالعزیز دہلوی۔

ذ

(۱) **ذبح عظیم:** اشارہ ہے آیت قرآنی کی طرف۔ دیکھئے ۳۷/۱۰۷۔ ترجمہ یہ ہے:

"اور ہم نے اس کے بدلہ میں ذبح کرنے کے لیے ایک بڑا جانور دیا۔"

علامہ کا خیال ہے کہ ایثار کی جو روایت حضرت اسماعیل سے شروع ہوئی تھی وہ حضرت امام حسین کی شہادت پر ختم ہوئی اسی لیے وہ سیدنا حسین کو معنیً ذبح عظیم کہتے ہیں اور فرماتے ہیں:

غریب و سادہ و رنگین ہے داستان حرم
نہایت اس کی حسین ابتدا ہے اسماعیل

(۲) ذکر او فرمود با طیب و صلوٰۃ

مشہور ہے کہ رسول کریم نے ارشاد فرمایا ہے کہ انھیں تو دنیا میں "تین" چیزوں سے محبت ہے۔ خوشبو، نماز اور نساء۔

بعض کج فہم اور کور ذوق مستشرقین نے اس قول کی حقیقت کو دانستہ پڑھنے والوں

کی نظروں سے چھپانا چاہا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ رسول پاک کا مطلب یہ تھا کہ معاشرتی نظام میں عورتوں کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ سب جانتے ہیں کہ خانوادہ کی تربیت عورتوں کی مرہونِ منّت ہوتی ہے۔ بعض نفسیات دانوں نے تو یہاں تک دعویٰ کیا ہے کہ پانچ چھ سال کی عمر تک بچہ اپنے میلانات و رجحانات کا رُخ متعین کر چکتا ہے اور اس میں کیا شک ہو سکتا ہے کہ اس تعیین میں سب سے زیادہ ماں ہی ممد و معاون ہوتی ہے۔ اسی کی تربیت سے بچہ اچھا شہری اور خدا کا نیک بندہ بنتا ہے۔ باپ کو تو حصولِ معاش کی اُلجھنوں سے اتنی فرصت بھی نہیں ملتی کہ وہ اپنی تربیت کی طرف متوجہ ہو چہ جائیکہ نہایت کمسن بچوں کی عادات کا خیال رکھے۔

ماں کی حیثیت سے عورت جس شفقت کا اظہار کرتی رہی ہے اور کرتی رہے گی وہ عدیم النظیر ہے۔ ممتا جانوروں میں بھی پائی جاتی ہے لیکن اس کی بنا کی اصل جذبۂ استمرار نوع ہے یعنی ہر جاندار چاہتا ہے کہ اس کی نسل قائم رہے۔ اس کے برخلاف انسان اس جذبہ کو اتنا مہذب کرتا ہے کہ صرف اولاد کو زندہ ہی نہیں رکھنا چاہتا بلکہ اسے انسانیت کے مناصبِ بلند پر فائز رکھنا چاہتا ہے۔ اس منصب پر پہنچنے میں ماں ہی اس کی مدد کرتی ہے۔

عورت بہن کی حیثیت میں بھی بھائی کے لئے جو قربانیاں کرتی رہی ہے اس کے ذکر سے تاریخ کے صفحات آج تک بڑے جگمگ جگمگ کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بھائی بہن کا رشتہ اتنا پیارا اور اتنا نازک ہے کہ جس مرد کو بہن کی محبت نصیب نہ ہوئی ہو وہ جان ہی نہیں سکتا کہ یہ کیا چیز ہے۔ بہن میں ماں کی ممتا بھی خوابیدہ ہوتی ہے اور خواہرانہ محبت بھی۔

عورت بیوی کی حیثیت سے بھی خاندان کی آبرو قائم رکھنے کی ضامن ہے۔ وہی شوہر کی زندگی کو جنّت یا جہنم میں تبدیل کر سکتی ہے۔

رسولِ پاک نے عورت کی ان تینوں حیثیتوں کو مدنظر رکھ کر یہ فرمایا کہ عورتوں سے نرمی

اور شفقت کا برتاؤ کیا کرو، یوں بھی عورت کو قعرِ مذلت سے نکال کر اسے ایک بلند معاشرتی مقام عطا کیا۔ انھیں خلع کا حق بخشا، انھیں جائداد کا وارث قرار دیا، انھیں ذاتی املاک رکھنے کی اجازت دی اور مردوں کو تلقین کی کہ جہاں تک ہو سکے عورتوں سے ایسا برتاؤ کریں کہ خاندان کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے۔

مغرب میں بتدریج تہذیب ایسے مقام پر آ پہنچی کہ عورتوں کو محض ہوس رانی کا ذریعہ سمجھ لیا گیا ہے۔ ان سے بچوں کی تربیت کا حق چھین لیا گیا۔ وہ اُمومت کے فریضہ سے محروم کر دی گئیں۔ ایسے ایسے آلات ایجاد ہوئے جن کا مقصد یہ تھا کہ بچے نہ پیدا ہوں۔ اس موضوع پر ہزاروں کتابیں لکھی گئیں نتیجہ یہ نکلا کہ مغرب کے اکثر ممالک میں شہریوں کی تعداد کم ہوگئی اور ملت سمٹ کر رہ گئی۔ یہاں تک کہ فرانس میں اور جرمنی میں ایسے قانون نافذ کرنے پڑے جن کی رو سے زیادہ بچے پیدا کرنے والے میاں بیوی کو انعام و اکرام سے سرفراز کیا جاتا تھا۔ ہٹلر اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مدت تک اپنی ملت کے افراد کو اس بات کی ترغیب دلاتا رہا کہ وہ جرمن قوم میں اضافہ کریں۔

اسلام نے امومت کو بڑا مقدس فریضہ سمجھا ہے اور یہی وجہ ہے کہ علامہ نے امومت کی اتنی تعریف کی ہے اور عورتوں کے معاشرتی فرائض کی اہمیت پر زور دیا ہے انھوں نے یہاں تک کہا ہے کہ عورتیں سیرت اقوام کی صورت گر ہوتی ہیں۔ ضربِ کلیم میں وہ کہتے ہیں:

مکالمات فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلہ سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

فرنگی تہذیب کے متعلق وہ فرماتے ہیں:

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے ہند و یوناں ہیں جس کے حلقہ بگوش

کیا یہی ہے معاشرت کا کمال مرد بیکار و زن تہی آغوش

اسی سلسلہ میں علامہ نے رسول اکرم کے اس قول کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ جنت ماں کے پاؤں کے نیچے ہے (زیر پائے امہات آمد جناں)

علامہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمان عورتوں کو سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا کا اسوۂ حسنہ پیش نظر رکھنا چاہیئے جن کی گود میں سیدنا حسینؓ نے پرورش پائی تھی اور جن سے انھوں نے رموز و اسرار شہادت سیکھے تھے۔

ان باتوں کی روشنی میں اگر رسول پاک کے قول پر غور کیا جائے تو کوئی شک باقی نہ رہے گا کہ وہ قرآن مجید کے احکامات کی تفسیر و تشریح کر رہے تھے۔ عورتوں کا احترام کرنا سکھا کر انھوں نے احکام خداوندی کی پیروی کا فریضہ سر انجام دیا ہے۔ اس کے علاوہ جو تعبیرات و توجیہات ہیں وہ ان بد باطن لوگوں کی خرافات ہیں، جو عورت کو صرف جنسی خواہشات پورا کرنے کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔

ر

(۱) روما: (رومی شہنشاہیت) قدیم روایت یہ ہے کہ رومن ایمپائر یا رومی سلطنت ۷۵۳ق م میں قائم ہوئی۔ ۳۹۰ق م میں گالوں (Gauls) نے روم کو غارت کیا۔ ۱۰۲ق م سے ۴۴ق م تک جولیس سیزر کا دور دورہ رہا جس کے کارنامے تاریخ کو اب تک یاد ہیں۔ ۴۴ق م میں اسے ہلاک کیا گیا۔ حضرت مسیح کی ولادت کے بعد عظیم رومی شہنشاہوں کا دور شروع ہوا۔ مثلاً آگسٹس، کلاڈیس۔ انھیں میں ظالم نیرو بھی شامل ہے جس کے متعلق انگریزی میں کہاوت مشہور ہے کہ روم جل رہا تھا اور وہ بنسری بجا رہا تھا (تاریخی اعتبار سے یہ غلط ہے)۔ رومی بادشاہوں ہی میں مارکس اوریلیس بھی شامل ہے جس کی اخلاقی بلندی کے سب معترف ہیں۔ رومی بادشاہوں میں قسطنطین اعظم اور جولین کے نام بھی بہت مشہور رہے ہیں۔ ۳۵۰ء میں یعنی جولین کے عہد میں قسطنطنیہ کی بنیاد رکھی گئی۔ مشرقی سلطنت میں جسٹنین بہت ممتاز ہے۔ ایرانیوں سے رومیوں کی اکثر لڑائیاں ہوتی رہی ہیں اور ملک میں اندرونی اختلال بھی رہا ہے۔ اس کے

باوجود رومیوں کے ہاں بڑے بڑے فاضل مفکر اور شاعر پیدا ہوئے ہیں۔ مثلاً ورجل، ہورس اووڈ، سینیکا، پلوٹارک، سینٹ آگسٹائن۔ کبھی سلطنت روما کی حدود بہت وسیع تھیں اور یوں کہنا چاہئے کہ بحیرۂ روم گویا اس قوم کے لئے ایک جھیل تھی، لیکن آخر آخر میں سلطنت بہت سمٹ گئی تھی۔

تیرھویں صدی عیسوی میں آل عثمان نے اقتدار حاصل کیا تو اس بات کے آثار ظاہر ہونے لگے کہ (رومی) بازنطینی سلطنت کا زوال اب قریب ہے۔

۱۴۵۳ء میں سلطان محمد ثانی نے قسطنطنیہ فتح کر لیا اور یوں دولتِ روم شرقی کا قصہ تمام ہو گیا۔ اطالیہ سے تو پہلے ہی وہ نکلوائے جا چکے تھے۔[۵]

ل رومی: (انگریزی) آر۔ ایچ بیرو، مڈل سیکس ۱۹۴۹ء۔
طبقاتِ سلاطینِ اسلام۔
اسلامی تاریخ کی اٹلس: پرنسٹن یونیورسٹی۔
تاریخ عالم اسلامی: برا کلمن۔
عبداللہ رازی: تاریخ ایران۔

ز

(۱) مذکورہ آیت قرآنی کی طرف اشارہ ہے دیکھئے ۲۳/۵۲۔ ترجمہ یہ ہے:

پھر ان لوگوں نے باہم اپنے کام (دین) اختلاف کرکے اس (کے) ٹکڑے ٹکڑے کرلیا (اور) ہر گروہ جو کچھ اس کے پاس ہے اس سے خوش ہے۔

علامہ کی مراد اس جگہ یہ ہے کہ مسلمان بھی پرانے زمانے کی امتوں کی طرح فرقوں اور گروہوں میں بٹ گئے ہیں اور ہر فرقہ مدعی ہے کہ دولتِ ایمان اسی کے پاس ہے۔ درانحالیکہ قرآن مجید تمام ادیان و مذاہب کی تطبیق کے لئے حاضر ہوا تھا کجا یہ کہ دین اسلام ہی میں فرقہ بندی پیدا ہو جائے۔

س

(۱) ساسان: ایرانیوں کا عقیدہ ہے کہ اردشیر پاپکاں کا جد امجد ساسان تھا اور اسی شخص کے نام سے وہ سلطنت ساسانی کہلاتی ہے جس کی بنیاد اردشیر نے رکھی (دیکھئے یزدجرد) اردشیر پاپکاں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے پاپک کا لڑکا تھا اور فارس کی ایک ریاست کا فرمانروا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے تمام ملک میں اپنی حکومت قائم کرلی، شاپور، خسرو پرویز، نوشیرواں، بہرام اسی خانوادہ سے متعلق ہیں۔

اس خانوادہ کے زوال پذیر ہونے سے پہلے اس کے طمطراق کا یہ عالم ہے کہ اس کے فرماں رواؤں کے جاہ وجلال کی داستانیں سن سن کر بڑے بڑے جابر بادشاہ اپنے محلوں میں بیٹھے کانپتے تھے۔

ساسانیوں ہی کے زمانہ میں صحیفہ زرتشت کی تدوین از سر نو کی گئی اور مشہور کتاب ارداے ویرافنامہ وجود میں آئی۔ ساسانی اوستا بھی عربوں کے حملے کے بعد

پوری جمع نہ ہو سکی (دیکھئے زرتشت[1])۔

(۲) سبحۂ اَقْلِلْ مِنَ الدُّنیا شمار

از تَعِشْ حُرّاً شوی سرمایہ دار

اشارہ ہے حضرت فاروقِ اعظمؓ کے قول کی طرف یعنی اَقْلِلْ مِنَ الدُّنیا تَعِشْ حُرّاً۔

ترجمہ یہ ہے:

"دنیا کی احتیاج کم کرے اور احرار کی زندگی بسر کر"۔ (دیکھئے سورۂ اخلاص)۔

---

[1] ایران بعہدِ ساسانیاں: محمد اقبال۔ تاریخِ ایران: عبداللہ رازی۔

ایران باستان: حسن پیرنیا۔

ش

(۱) **شیخ احمد (رفاعی)**: اصلاً عراقی تھے اور صاحبِ تصانیفِ متعددہ۔ ان کا یہ قول ان کی بصیرت پر دال ہے کہ عجمی افکار و تصورات سے پرہیز لازم ہے۔ تاریخِ ولادت ۵۱۲ھ ہے۔

عجم کے افکار و تصورات نے بالخصوص تصوف کے دائرہ میں اسلامی تعلیمات کے چشمے کو جس طرح گدلا کیا ہے اس کے خلاف علامہ نے ہمیشہ جہاد کیا ہے۔ اشعار کے ذریعہ بھی، نثر میں بھی اور اپنے مکاتیب میں بھی[۱]۔

---

[۱] ابن الاثیر۔

ض

(۱) **ضعیف (شاذ و مرسل)**: حدیث کی اقسام ہیں۔

علامہ نووی کے بیان کے مطابق حدیث ضعیف وہ ہے جس میں صحیح اور حسن کے شرائط نہ پائے جاتے ہوں، اس کے راوی غیر عادل ہوں مستور نہ ہوں بلکہ ان کا کذب معلوم ہو۔ یا مستور ہوں لیکن تعدد روایت موجود نہ ہو یا اس میں شذوذ اور علتِ خفیہ ہو۔ یہ اسباب کسی حدیث کو ضعیف قرار دینے کے لئے کافی ہیں لیکن حدیث ضعیف اگر متعدد طُرق سے مروی ہو تو درجہ حسن تک ترقی کر جاتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ ضعف کسی راوی کے کاذب یا فاسق ہونے کی وجہ سے نہ ہو۔ کیونکہ اس قسم کے ضعف کی تلافی کثرت اسناد و طُرق سے نہیں ہو سکتی۔

حدیثِ مرسل کے لئے دو اصطلاحیں ہیں:

۱۔ محدثین اس حدیث پر مرسل کا اطلاق کرتے ہیں جس کی سند تابعی تک متصل

ہو اور تابعی نے جس صحابی سے روایت کی ہے اس کا نام ترک کر دیا ہو اور راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دیا ہو۔

٢- ہر وہ حدیث جس میں ایسی سند کا ذکر نہ ہو جو رسولؐ سے متصل ہو مرسل کہی جاتی ہے، خواہ اس کا انقطاع صحابی سے ہو یا کسی اور سے۔ اس میں تابعی کا ارسال اور صحابی کا عدم ذکر بھی شامل ہے۔

حدیثِ شاذ: اگر کوئی ثقہ راوی اپنے سے ثقہ تر راوی کی حدیث کے خلاف روایت کرے تو اس کی حدیث شاذ کہلائے گی اور اس راوی کی حدیث جو اس سے ثقہ تر ہے حدیث محفوظ کہلائے گی[1]۔

---

[1] سیرت امام احمد بن حنبل: مکتبہ سلفیہ۔ دیباچہ مشکوٰۃ المصابیح۔

"سیفٌ من سیوف الہند" (ہندوستان کی تلواروں میں سے ایک تلوار) کے الفاظ سے مخاطب کیا۔ مگر حضورؐ نے کعبؓ کے مصرع میں اصلاح دے کر فرمایا "سیفٌ من سیوف اللہ" کہنا چاہیے (یعنی خدا کی تلواروں میں سے ایک تلوار)۔

(٢) کل مومن اخوۃ: مشہور ہے کہ حدیث نبوی ہے:

"تمام مومن بھائی ہیں۔"

ط

(۱) طَهِّرَا بَيْتِيَ : اشارہ ہے آیتِ قرآنی کی طرف۔ حوالہ یہ ہے ۲/۱۲۵ متعلقہ جزو کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

"۔۔۔۔۔۔اور ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل کو حکم دے دیا کہ ہمارے گھر (یعنی کعبہ کو) طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجدہ کرنے والوں (یعنی نمازیوں) کے لئے پاک (وصاف) رکھو۔"

غ

(١) **غرناطہ:** ہسپانیہ کا مشہور شہر جو مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں دمشق و بغداد کو شرماتا تھا۔

(١٣٨ھ - ٤٢٢ھ = خلفائے اموی

٤٠٤ھ - ٤٣٩ھ = ملوک الطوائف۔

٤٠٣ھ - ٨٩٤ھ = مختلف امرا کے سلسلے مثلاً بنی زیری، بنی عامر، بنی نصر وغیرہ)

انگریزی میں غرناطہ کا نام Granada ہے۔ ہسپانیہ کے جنوب میں یہ شہر واقع ہے۔ نواحی عمارتوں میں سب سے خوبصورت عمارت الحمرا ہے جس کے افسانے اور جس کی داستانیں ادب اور تاریخ کا جزو بن کر رہ گئی ہیں[1]۔

---

[1] عبرت نامۂ اندلس: ڈوزی مترجم عنایت اللہ دہلوی۔ تاریخ اندلس: سکاٹ: مترجمہ خلیل الرحمٰن۔ ہسپانیہ میں اجنبی: ایچ. وی مورٹن، لنڈن ١٩٥٥ء۔

ف

(۱) **فردوس (جنّت)**: اربابِ لغت لکھتے ہیں کہ بہشت آٹھ ہیں بہ تفصیلِ ذیل:

۱۔ خلد	۲۔ دار السلام
۳۔ دار القرار	۴۔ جنّتِ عدن
۵۔ جنّت الماویٰ	۶۔ جنت النعیم
۷۔ علیّین	۸۔ فردوس [۱]

(۲) **فلارنساوی باطل پرست**: اشارہ ہے نکولو میکیا ویلی کی طرف۔ سالِ ولادت ۱۴۶۹ء ہے۔ مدت تک مختلف انتظامی کام کرتا رہا۔ اس کی شہرت کا دارومدار The Prince پر ہے یعنی کتاب الملوک، جس کا سالِ اشاعت ۱۵۳۲ء ہے۔ اس نے سیاسیات اور اخلاقیات کا رشتہ منقطع کر کے یہ دعویٰ کیا کہ سیاسی مصلحتیں اقدار اخلاقی کی تابع نہیں ہو تیں بلکہ مدبر و منتظم اور

[۱] غیاث اللغات۔

سیاستدان اقتضائے حال کے مطابق جو کام کرتے ہیں وہی درست ہوتا ہے۔ اس کا مولد فلارنس ہے۔ اس لئے فلارنساوی کہا گیا۔ ۱۵۲۷ء میں فوت ہوا۔[۱]

(۳) فی القصاص (آمد حیٰوۃ): اشارہ ہے آیاتِ قرآنی کی طرف۔ دیکھئے [۲] ۱۷۸، ۱۷۹ ترجمہ یہ ہے:

"اے ایمان والو! تم پر مقتولوں کے باب میں قصاص فرض کر دیا گیا ہے۔ آزاد کے بدلہ میں آزاد اور غلام کے بدلہ میں غلام اور عورت کے بدلہ میں عورت۔ ہاں جس کسی کو اس کے فریقِ مقابل کی طرف سے کچھ معافی حاصل ہو جائے سو مطالبہ معقول (اور نرم) طریق پر کرنا چاہیئے اور مطالبہ کو (اس فریق) کے پاس خوبی سے پہنچا دینا چاہیے۔ یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے رعایت اور مہربانی ہے سو جو کوئی اس کے بعد بھی زیادتی کرے گا، اس کے لئے (آخرت میں) عذاب دردناک ہے اور تمہارے لئے اے اہلِ فہم (قانون) قصاص میں زندگی ہے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔"

---

[۱] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔ حاشیہ اسرار و رموز، جائے اشاعت مذکور۔

داستانِ فلسفہ: مترجمہ سید عابد علی عابد ۱۹۵۶ء مکتبہ اردو لاہور۔

ق

(۱) قاف (کوہ): ایران اور ہندوستان کی ادبی روایت کے مطابق (فارسی اور اردو شعر ملحوظِ خاطر ہے) قاف وہ پہاڑ ہے جہاں پریاں مقیم ہیں، اور یہاں اسی روایتی معنی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ پریوں کا ذکر ساتھ موجود ہے۔

اس روایت کی توجیہ یہ ہے کہ کوہ قاف کے نواح میں جو لوگ بستے ہیں ان کی خوبصورتی اور رعنائی ضرب المثل ہو گئی ہے۔ اس علاقہ سے شاہی حرم کے لئے کنیزیں مالِ تجارت کی طرح برآمد کی جاتی تھیں۔ جغرافیۂ خلافتِ مشرقی کے بیانات کے مطابق قاف کے پہاڑ جن کی نسبت یہ مشہور ہے زمین کو محیط ہیں البرز کے پہاڑ ہیں، یعنی لوگوں کا یہ خیال ہے یہی وجہ ہے کہ اربابِ لغت کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"نام کوہے کہ گرداگردِ عالم است۔ گفتہ اند کہ از زمرد است"

حقیقت یہ ہے کہ "البرز ایک بلند سلسلہ ہے جو باب الابواب یعنی Caucasus کے پہاڑوں

کے ساتھ علی الاتصال چلا گیا ہے[1]۔"

(۲) قائمِ اسلامیاں ہارون رشید — آنکہ نقفور آب تیغ اوچشید

جب مہدی عباسی نے ۷۸۵ء میں وفات پائی تو اس کا بیٹا موسیٰ ہادی کا لقب اختیار کر کے تخت نشین ہوا۔ اس کی ماں خیزراں جو براکلمن کے قول کے مطابق ایک بربری کنیز تھی، مہدی کے زمانہ میں کاروبارِ سلطنت میں بہت دخیل تھی۔ ہادی نے خیزراں کا اثر کم کرنا چاہا اور جب اس میں کامیاب نہ ہوا تو ماں کو طرح طرح سے پریشان کرنا شروع کیا۔ اس نے یہ بھی کوشش کی کہ اپنے بھائی ہارون کو مجبور کرے کہ وہ تخت نشینی کے حق سے دست بردار ہو جائے۔ خیزراں نے ہارون کی اعانت کی اور آخر ۷۸۶ء میں موسیٰ اپنے حرم میں موصل کے مقام پر مردہ پایا گیا۔ براکلمن مدعی ہیں کہ وہ مقتول ہوا اور اپنی ماں کے ایما پر ہوا لیکن شبلی نے المامونؔ میں بات صاف نہیں کی۔ بہرحال ہارون رشید کا لقب اختیار کر کے ۷۸۶ء میں تخت نشین ہوا۔

براکلمن کا دعویٰ یہ ہے کہ ہارون کے زمانہ میں واقعات ایسے سازگار پیدا ہو گئے تھے کہ سلطنت کی توسیع اور انتظامی امور کی درستی کا سہرا ہارون کے سر بندھا۔

ہارون کے زمانہ میں برمکی جن کے آبا و اجداد بدھ مت کے پیرو تھے بہت با اقتدار تھے اور وزارت گویا ان کے گھر کی کنیز تھی۔ جب ہارون تخت نشین ہوا تو یحییٰ برمکی وزیر ہوا۔ اس کے بیٹے فضل اور جعفر مناصبِ عالی پر فائز ہوئے۔ مشہور تو یہ ہے کہ برمکیوں سے ہارون رشید کی مخالفت کا باعث عباسہ ہے جو ہارون رشید کی بہن تھی اور جسے خلیفہ نے جعفر سے بیاہ دیا تھا۔ روایت کہتی ہے کہ ہارون نے جعفر سے قسم لے لی تھی کہ وہ صحیح معنی میں عباسہ کو اپنی بیوی نہیں سمجھے گا۔ اس کے باوصف جو کچھ ہونا تھا ہو کر رہا۔ ہارون کو معلوم ہوا جعفر سے عباسہ کی اولاد ہے۔

---

[1] غیاث اللغات۔ منتخب اللغات۔ جغرافیۂ خلافتِ مشرقی: ترجمہ جمیل الرحمٰن۔

اور اس نے یہ سوچ کر کہ اس اولاد کی وجہ سے جانشینی کے جھگڑے کھڑے ہو سکتے ہیں بچوں کو بھی قتل کرا دیا اور جعفر کو بھی۔ صاحبِ البرامکہ نے اس واقعہ کی تکذیب کی ہے اور مستند عربی مورخوں کی شہادت سے یہ ثابت کیا ہے کہ برمکیوں کے زوال کا باعث ان کا بڑھتا ہوا اقتدار تھا، جسے ہارون برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

ہارون کے زمانہ میں بازنطینی فرماں رواؤں سے لڑائیاں برابر جاری رہیں۔ یہاں تک کہ ہارون نے نقفور (N eephorus) کو ۸۰۳ء میں مجبور کیا کہ وہ عباسیوں کو خراج ادا کرے۔

ایران میں بھی شورش برپا تھی۔ ہارون خود طوس پہنچا کہ اس شورش کو فرو کرے لیکن وہیں ۸۰۹ء میں مارچ کی چوبیس تاریخ کو اس نے وفات پائی۔

سائیکس اور دوسرے مورخین ہارون کے عہد کو خلفاء کا عہد زریں کہتے ہیں۔ اس کے زمانہ میں ادبیات کو فروغ حاصل ہوا جلیل القدر مفکر اور مصنف پیدا ہوئے۔ مثلاً ابو نواس ہے جس کی شعری تخلیقات کا شہرہ مغرب تک پہنچا ہے۔ اس کا معاصر ابو دلامہ بھی شاعر تھا۔

ہارون رشید ہی کے زمانہ میں فلسفہ اور تاریخ کو بہت فروغ نصیب ہوا۔ اسی زمانہ میں خلیل نے عروض کے اصول مدوّن کئے۔

بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ ہارون رشید کے زمانہ میں مختلف تمدنوں اور تہذیبوں کے تال میل سے عربوں کی زندگی پر نمایاں اثر پڑا۔ علم و فن کو ترقی ہوئی اور حدیث و فقہ سے لے کر موسیقی تک علم کے ہر شعبے میں جلیل القدر مصنفوں نے اپنے کمال دکھائے۔[1]

---

[1] المامون: شبلی نعمانی۔
تاریخ ایران: سائیکس (جلد دوم)۔
طبقات سلاطین اسلام۔
تاریخ عالم اسلامی: براکلمین (انگریزی)۔
بغداد کی دو شہزادیاں: ایبٹ نکاگو ۱۹۴۶ء۔

(۳) **قصیدۂ بردہ (بصیری)**: قصیدۂ بردہ کا مصنف بصیری مصر میں ۱۲۱۲ء میں متولد ہوا۔ وہ ابوالعباس احمد المرسی کے حلقۂ ارادت میں شریک تھا۔ پیشہ کے اعتبار سے وہ قلمی کتب کی نقل کا کام کرتا تھا۔ اسے فالج ہو گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک رات جب وہ سو رہا تھا، رسول اکرمؐ اس کے خواب میں آئے اور اپنی چادر اس پر ڈال دی۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو فالج دور ہو چکا تھا۔ اس واقعہ کے بعد اس نے یہ قصیدۂ بردہ لکھا کہ بُرد عربی میں چادر کو کہتے ہیں۔ یہ نِکلسن کا بیان ہے۔ علامہ لکھتے ہیں کہ:

"بصیری مصنف قصیدہ بردہ جس نے عالم رویا میں نبی کریم کو اپنا قصیدۂ امن تذکر سنایا۔ حضور نے اس کے صلہ میں خوش نصیب بصیری کو نبی چادر مطہر عطا فرمائی"[۱]

(۴) **قُلْ هُوَ اللّٰهُ**: آیت قرآنی ہے۔ دیکھئے ۱/۱۱۲۔ ترجمہ یہ ہے:

"کہہ دے کہ وہ اللہ ایک ہے"

---

[۱] اسرار و رموز (یکجا) ۱۹۴۰ء، صفحہ ۱۹۵، شیخ مبارک علی لاہور۔

ک

(۱) **کربلا**: اس مقام کا نام ہے جہاں حضرت امام حسین شہید ہوئے۔

یہ مقام کوفہ سے شمالِ مغرب میں آٹھ فرسخ کے فاصلہ پر واقع ہے۔ فرسخ یعنی تین میل اور یہ فرسنگ کا معرب ہے اور صاحب برہان قاطع کا بیان ہے کہ میل چار ہزار گز سے عبارت ہے۔ اس طرح کہ ہر گز آٹھ مشت کا ہو، اور صاحب سراج کہتے ہیں کہ گز سے مراد ہے چوبیس انگشت۔

(۲) **(حضرت) کعبؓ (بانت سعاد)**: علامہ خود لکھتے ہیں:

وہ حضرت کعبؓ نبی کریمؐ کو بہت ایذا دیا کرتے تھے۔ فتحِ مکہ کے بعد مکہ سے بھاگ کر طائف چلے گئے وہاں سے قصیدہ بانت سعاد لکھ کر حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے گذشتہ گناہوں کی معافی مانگی، حضور نے ان کو معاف کر دیا اور قصیدے کے صلہ میں اپنی چادر مبارک عطا فرمائی۔ اس قصیدہ میں کعبؓ نے حضورؐ کو

"سیفٌ من سیوف الہند" (ہندوستان کی تلواروں میں سے ایک تلوار) کے الفاظ سے مخاطب کیا۔ مگر حضور نے کعبؓ کے مصرع میں اصلاح دے کر فرمایا: سیفٌ من سیوف اللہ کہنا چاہیے (یعنی خدا کی تلواروں میں سے ایک تلوار)۔

(۲) کل مومن اخوۃ: مشہور ہے کہ حدیث نبوی ہے:

"تمام مومن بھائی بھائی ہیں"

گ

(۱) گرچہ ملت ہم بمیرد مثل فرد — از اجل فرماں پذیرد مثلِ فرد

اشارہ ہے آیت قرآنی کی طرف۔ دیکھئے ۳۴/۷ ترجمہ یہ ہے:

" اور ہر امت کے (ہلاک ہونے کے) لئے ایک مدت (مقرر) ہے۔ پس جب ان کی (مقررہ) مدت آجائے گی تو نہ ایک ساعت کی دیر کر سکتے ہیں اور نہ جلدی کر سکتے ہیں۔"

(۲) گورگان: منگولوں کی زبان میں گورگان مطلق داماد کو کہتے ہیں۔ امیر تیمور معمولاً اسی لقب سے پکارا جاتا تھا۔ عرب شاہ (م ۸۵۴ھ) کہ تیمور کا معاصر ہے اپنی کتاب عجائب المقدور فی نوائب تیمور میں کہتا ہے:

"جب تیمور ماوراء النہر کو مسخر کر چکا اور بادشاہوں کی بیٹیاں اس کے عقد نکاح میں آچکیں تو اس کے القاب میں کلمۂ گورگان کا اضافہ کر دیا گیا کہ منگولوں کی زبان میں اس کے معنی داماد کے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تیمور بادشاہوں کا واقعتاً داماد

بن چکا تھا اور اُن سے اس کی قرابت داری مسلم ہو چکی تھی۔"

علامہ محمد بن عبدالوہاب قزوینی لکھتے ہیں کہ یوسف بن طغری بردی (م ۸۷۴ھ) کہ شاہرخ کا معاصر تھا، بھی یہی لکھتا ہے۔

قاضی احمد غفاری تاریخ جہاں آرا میں لکھتے ہیں کہ امیر تیمور کو گورگاں اس لئے لکھتے ہیں کہ وہ امیر حسین کا داماد تھا۔ مشہور فرانسیسی مستشرق کاترمر لکھتا ہے کہ چینی امیر تیمور کو یوٹن فوما کہتے ہیں۔ یوٹن مغول بادشاہوں کے سلسلہ کا نام ہے جو چین پر حکومت کرتے تھے۔ اور فوما چینی زبان میں داماد کو کہتے ہیں تو یوٹن فوما کے معنی بھی وہی ہوئے جو گورگاں کے ہیں یعنی بادشاہوں کا داماد۔

علامہ قزوینی نے تصریح کی ہے کہ وسط ایشیا کے منگول شاہی خاندان کے ارکان کو درجہ اور منصب کے اعتبار سے مختلف القاب سے یاد کرتے تھے۔ انہی میں لقب گورگاں بھی تھا۔ علامہ قزوینی کے الفاظ میں یہ لقب "یکے از درجات خانوادۂ سلطنتی" ہے۔ مثلاً شہزادہ اور شاید یہی وجہ ہے (علامہ قزوینی فرماتے ہیں) کہ آلِ عثمان نے بھی اپنی سلطنت کے بعض ممتاز ارکان کے لئے داماد کا لقب مخصوص کر دیا تھا۔ مثلاً ابراہیم پاشا۔

قزوینی کی تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ گورگاں کا معنی بادشاہوں کا داماد ہیں مطلق داماد نہیں۔[۱]

---

[۱] بست مقالہ قزوینی: تالیف مرزا محمد خاں بن عبدالوہاب قزوینی باہتمام پورداؤد سلسلہ انتشارات انجمن زرتشتیان ایرانی بمبئی سن طباعت غالباً ۱۹۲۸ء ہے کہ دیباچہ اسی سال کا لکھا ہوا ہے۔

ل

(١) لاتحزن : اشارہ ہے آیتِ قرآنی کی طرف۔ حوالہ بہ تفصیلِ ذیل ہے: ٩/٤٠

ترجمہ یہ ہے :-

"اگر تم پیغمبر کی مدد نہ کروگے تو خدا ان کا مددگار ہے (وہ وقت تم کو یاد ہوگا)
جب ان کو کافروں نے گھروں سے نکال دیا (اس وقت) دو (ہی شخص تھے جن
میں (ایک ابوبکر تھے) دوسرے (خود رسول اللہ) جب وہ دونوں غارِ (ثور) میں
تھے۔ اس وقت پیغمبر اپنے رفیق کو تسلی دیتے تھے کہ غم نہ کرو خدا ہمارے ساتھ ہے۔۔"

(٢) لاخوف علیھم : اشارہ ہے آیتِ قرآنی کی طرف۔ دیکھئے ٢/١١٢ -

ترجمہ یہ ہے :

"ہاں جس نے خدا کے آگے اپنا سر جھکایا اور وہ اچھے کام بھی کرتا ہے تو اس کے
رب کے ہاں اس کا اجر اس کو ملے گا نہ ان کو (آخرت میں کسی قسم کا) ڈر ہوگا اور

نہ ان کو (دنیا کے فوت ہونے کا کچھ) غم ہوگا۔"

(۳) لانبی بعدی: حدیثِ نبوی کا ٹکڑا ہے۔ پوری حدیث کا ترجمہ یہ ہے:

"میں نبیوں کا خاتم ہوں۔ میرے بعد کوئی نبی نہیں"۔

علامہ نے اس قولِ رسول کی توجیہہ کہ "میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا" یوں کی ہے کہ جس طرح رسول پاک خاتم النبیین ہیں، امتِ محمدیہ بھی خاتم اقوام ہے اور مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسی زندگی کا نمونہ پیش کرکے دکھائیں جو عالمگیر اخوت کے اصول پر قائم ہو۔ علاوہ ازیں یہ بھی ملحوظ رہے کہ جب تک رسولِ پاک نے ظہور نہیں کیا تھا اس وقت تک یہ ضرورت محسوس ہوتی رہی تھی کہ خدا اپنے نیک بندوں کو پیغمبر اور نبی بنا کر دنیا میں بھیجے۔ آخر انسان اس مقام پر آ پہنچا کہ مزید نبی بھیجنے کی ضرورت نہ رہی۔ ایک عالمگیر دین مکمل ہوگیا اور انسانوں کی بصیرت پر (بشرطیکہ وہ خدا اور رسول کے احکام کی پیروی کریں) اتنا بھروسہ قائم ہوگیا کہ وہ بوقتِ ضرورت اجتہاد یا اجماع سے ان گتھیوں کو سلجھا سکتے ہیں جو بدلتے ہوئے حالات سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو رسول پاک کا خاتم النبیین ہونا انسانوں کے لئے مژدۂ سعادت ہے کہ عقل انسانی کو یہ مقام بخشا گیا کہ وہ خدا اور رسول کے احکام کو سامنے رکھ کر مستقبل کے تمام مسائل کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ رسول پاک رحمۃ اللعالمین بھی اسی لئے ہیں کہ ان کے ذریعہ خدا نے نہ صرف ایک ایسا دین قائم کیا جو عالمگیر ہے اور جس کے فیوض سے تمام انسان مستفید ہو سکتے ہیں بلکہ انہیں کی زبانی یہ بھی کہلوایا کہ میرے بعد اب کوئی نبی نہیں آئے گا اور انسان خود اپنی ہدایت کا فریضہ سرانجام دے سکیں گے۔ شرط صرف یہ ہے کہ احکام قرآنی کی اور سنت کی پیروی کی جائے اور

سنت ہی کی روشنی میں نئے مسائل کا فیصلہ کیا جائے اور وقت کے نئے تقاضوں کے مطابق تفقّہ سے کام لیا جائے۔ تفقہ کے اعتبار سے راقم کا خیال ہے کہ امام احمد بن حنبل کے اصول میں بہت وسعت اور لچک ہے۔ یہ صرف ایک ذاتی خیال کا اظہار ہے[۹۱]

---

۹۰ علامہ کے انگریزی خطبات۔

حیاتِ امام احمد بن حنبل (اردو) تالیف محمد ابو زہرہ المکتبہ السلفیہ شیش محل روڈ لاہور ۱۹۵۶ء۔

م

(۱) **مالکؒ (امام)**: امام مالک کی ولادت کا سال ۹۳ھ ہے اور وفات کا ۱۷۹ھ آپ خالص عربی تھے۔ پہلے آپ نے مدینہ میں تربیت حاصل کی۔ آپ کے شیوخ میں ابو سہیل نافع، امام محمدؒ اور امام جعفر صادق شامل ہیں۔

حضرت نافع کی وفات کے بعد امام مالک ان کے جانشین ہوئے اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کے تلامذہ میں خلفاء، علماء، ائمہ محدثین، قضاۃ اور مجتہد شامل ہیں۔ ان کے فضل و کمال اور ان کی عظمت کا اعتراف تمام مورخوں اور تمام محدثوں نے کیا ہے۔ ان کی مہمان نوازی، حق گوئی، خودداری اور انصاف پسندی کی تعریف بھی بدونِ استثنا کی گئی ہے۔ ان کی تمام تصانیف میں مؤطا مشہور ترین کتاب ہے۔ ایک تفسیر القرآن بھی ان سے منسوب ہے لیکن بعض مورخوں نے اس کی نسبت مشکوک گردانی ہے۔

کتبِ حدیث میں موطا کا یہ درجہ ہے کہ شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز اسے

صحیح بخاری پر بھی مقدم گردانتے ہیں۔ اس کتاب کی بڑی کثرت سے شرحیں لکھی گئیں اور اس کتاب میں جن لوگوں کا ذکر آیا ہے ان لوگوں کے سوانح بھی قلمبند کیے گئے۔[1]

(۲) مراد (سلطان): آل عثمان کی حکومت کا زمانہ سٹینلی لین پول نے ۱۲۹۹ء سے ۱۹۲۴ء تک قرار دیا ہے۔ سلطان مراد اول کے سنین حکومت کے متعلق اختلاف ہے۔

۱۔ عباس اقبال ۱۳۶۰ء ـ ۱۳۸۹ء۔

۲۔ براکلمن ۱۳۶۲ء (جلوس)۔

۳۔ ڈاکٹر محمد عزیز صاحب دولتِ عثمانیہ ۱۳۵۹ء ـ ۱۳۸۹ء۔

ڈاکٹر محمد عزیز بھی لکھتے ہیں کہ مراد نے تیس سال تک حکومت کی۔ مراد کا عہدِ حکومت اپنے کارناموں کے اعتبار سے محمد فاتح اور سلیمان اعظم کے عہدِ حکومت سے کم نہیں۔ گبن نے اس کے کارناموں کو بہت سراہا ہے۔ سلطان مراد کے زمانہ تک جو مسجدیں تعمیر ہوئی ہیں، ان سے جلال اور عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔[2]

(۳) مے ندانی آیۂ اُم الکتاب   اُمتِ عادل ترا آمد خطاب

آیتِ قرآنی کی طرف اشارہ ہے۔ حوالہ اور متعلقہ جزو کا ترجمہ بہ تفصیلِ ذیل ہے $\frac{2}{143}$:

اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک امتِ عادل بنا دیا ہے کہ تم گواہ رہو لوگوں پر اور رسول گواہ رہیں تم پر۔"

---

[1] سیرۃ ائمہ اربعہ: کتاب منزل لاہور۔ قاموس اسلام (انگریزی)۔

[2] طبقات سلاطین اسلام: لین پول۔ تاریخ عالم اسلامی: براکلمن۔

دولت اسلامیہ: ڈاکٹر محمد عزیز۔

ن

(۱) نحن نزلنا : آیتِ قرآنی کی طرف اشارہ ہے۔ دیکھئے 15/9۔ ترجمہ یہ ہے:

"ہم نے آپ اُتاری ہے یہ نصیحت اور ہم اس کے نگہبان ہیں"

(نصیحت سے مراد قرآن ہے)۔

(۲) نعم الجمل : رسولؐ خدا سیدنا حسینؓ کو اپنے کندھوں پر سوار کر لیا کرتے تھے۔ اسی واقعہ کی طرف علامہ نے اشارہ کیا ہے کہ کیا اچھا اونٹ ہے۔

٥

(۱) ہست شیطاں از جماعت دور تر

مشہور ہے کہ حدیثِ نبوی ہے شیطان جماعت سے دور رہتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جب فرد اپنے بعض حقوق و مراعات سے دست بردار ہو جاتا ہے تو ریاست وجود میں آتی ہے۔ بالفاظِ دیگر ملت کا وجود میں آنا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک افراد اپنے بعض حقوق سے دست بردار نہ ہو جائیں اور یہ حقوق جماعت کو یا اس کے نمائندوں کو نہ دے دیں۔ مثال کے طور پر قانون اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ریاست میں کوئی فرد کسی جرم کے ارتکاب کا بدلہ چکانے کی کوشش کرے۔ بہر حال اسے اپنے حق انتقام گیری سے دست بردار ہو کر ملت سے رجوع کرنا پڑے گا اور ملت کے مقرر کردہ قاضی یا منصف یا جج قضیہ چکائیں گے۔ یہ صورت نہ ہو تو شدید قسم کا اختلالِ ملی پیدا ہو کر قصاص لینے والا جذبات سے مغلوب و مجبور ہو کر مجرم کو زیادہ سے زیادہ سزا دینا چاہے گا اور ان متعلقہ

واقعات کو ملحوظِ خاطر نہیں رکھے گا جن سے جرم کی شدت میں تخفیف ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر آدمی کا حق ہے کہ وہ جب چاہے، جہاں چاہے، جس طرح چاہے اپنے خیالات کا اظہار کرے لیکن اس پر یہ پابندی لگا دی گئی ہے کہ دوسرے افراد کی دل آزاری نہ ہو اور اس بات کی تبلیغ نہ کی جائے کہ ملکی حکومت کو بجبر و قہر ہٹا کر دوسری حکومت قائم کی جائے۔ یہاں بھی فرد اپنے حقوق سے جزواً دست بردار ہو گیا ہے۔

فرمانِ نبوی کا مطلب یہ ہے کہ جب افراد جماعت کی شکل میں منظم ہو جاتے ہیں اور جماعتی مفاد کو انفرادی مفاد پر ترجیح دینے لگتے ہیں کہ اسی میں ان کا بھلا ہے تو شیطان طبعًا ان سے دور رہتا ہے کہ اس بات کا امکان بہت کم ہے کہ پوری کی پوری جماعت شیطنت کا ارتکاب کرے۔

اسی سلسلہ میں ربطِ فرد و ملت کے متعلق اقبال نے اپنا زاویہ نگاہ پیش کیا ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم "فکرِ اقبال" میں فرماتے ہیں:

"یہ مسئلہ نفسیات، اخلاقیات، سیاسیات اور معاشیات کا اہم ترین مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کے متعلق اختلاف زندگی کے تمام شعبوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ فرد کو ایک ایٹم سمجھ کر جو نفسیات لکھی گئی ہے وہ حقیقتِ حیات سے بہت دور ہو گئی۔ یا وہ اخلاقی تصورات بھی اس کے لئے ناقابلِ فہم ہو گئے اور بجوگ جیسے اخلاقیات پر ضخیم تصنیف کرنے والے فلسفی آخر میں یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ کیوں ایک شخص اپنی ذاتی مسرت کو دوسروں کے لئے قربان کر دے۔ کانٹ کی اخلاقیات بھی آخر میں بے بنیاد ہو گئی اور اس نے اس عقیدہ کا سہارا لیا کہ اگر تلافی کرنے والے خدا اور حیات بعد الموت کا عقیدہ نہ ہو تو

فرد کی فرض شناسی اور جماعت کے اغراض کے لئے اس کی ذاتی سعادت و مسرت کی قربانی کی کوئی عقلی تاسیس ممکن نہیں۔ جرمن فلسفی شٹیرنر اور نطشے کی طرح بعض حکمانے فرد کو مطلق العنان کرنے کی تلقین کی تاکہ جماعت کے حدود و قیود اور اوامر و نواہی اس کی شخصیت کے بے روک ارتقار میں خلل انداز نہ ہوں دوسری طرف ہیگل جیسے فلاسفہ نے جماعت اور مملکت کو معبود بنا دیا اور فرد کی انفرادیت وہاں ایک بے حقیقت سا مظہر رہ گئی۔ اس کا اثر معاشیات و سیاسیات پر بہت گہرا پڑا۔ کارل مارکس نے اپنے فلسفہ کا ڈھانچا ہیگل سے اخذ کیا اور اس کا عملی نتیجہ وہ اشتراکیت ہے جہاں فرد کی آزادئ ضمیر اور آزادئ عمل ایک گناہ کبیرہ ہے۔ مغرب میں حقوق طلبی کے جوش و خروش میں فرد نے جماعت کو اپنا حریف سمجھا، رفتہ رفتہ وہ مذہب سے بھی برگشتہ ہو گیا جو فرد کو جماعت کے ساتھ وابستہ رکھنا چاہتا تھا۔ یہ تمام کشاکش افراط و تفریط کا نتیجہ تھی۔

اسلام اعتدال اور توازن کا نام ہے۔ ادیان میں فرد و ملت کے ربط کا مسئلہ عمدہ طور پر اسلام نے حل کیا تھا۔ اسلام فرد کی نفسیات کے کسی پہلو کو جماعت کے مفاد سے الگ نہیں کرتا۔ اس کی تمام عبادات میں اجتماعی عنصر بہت نمایاں ہیں۔ نماز ہو یا روزہ، حج ہو یا زکوٰۃ سب میں فرد جماعت کے ساتھ وابستہ ہے اس کے باوجود اسلام نے بڑے زور و شور سے آزادئ ضمیر کی تلقین کی اور بتایا کہ دین جس میں عقیدہ اور طریق زندگی شامل ہے کسی جبر کو گوارا نہیں کرتا۔ جو اختیار سے قبول نہیں کی گئی اس کی کچھ قدر و قیمت نہیں۔ رہبانی مذاہب میں اخلاق و روحانیت انفرادی رہ گئے تھے۔ ایک طرف خدا اور دوسری طرف فرد

جو غار میں یا صحرا میں جماعت سے بے نیاز ہو کر خدا کا قرب حاصل کر سکتا ہے۔

اقبال کے ہاں ربطِ فرد و ملت کا نظریہ اسی اسلامی زاویۂ نگاہ سے اخذ کردہ ہے۔ جماعت کے ساتھ تمام نفسیاتی روابط کو ساقط کر کے اگر نفسِ انسانی کی باقی ماندہ حیثیت کو دیکھیں تو وہ صفر رہ جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اقبال نے بہت پہلے کہا تھا کہ "افراد کا وجود مجازی ہے" یعنی فرد کی جماعت سے ربط کے بغیر کوئی حیثیت نہیں لیکن جماعت کا یہ ہمہ گیر رابطہ انسان کی انفرادی خودی کو سوخت نہیں کرتا بلکہ اس کی پرورش کرتا ہے۔ ہر شاخ اور ہر پتّے کی اپنی بھی ایک مخصوص حیثیت ہے لیکن شجر سے منقطع ہو کر نہ شاخ میں رویدگی رہ سکتی ہے نہ پتا سرسبز رہ سکتا ہے:

پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

تمام نوعِ انسانی کی وحدت کی تعلیم قرآن میں تھی۔"

(۲) ہفت اندام: علامہ لکھتے ہیں اعضائے جسمانی۔ اربابِ لغت نے تفصیل یوں بتائی ہے "بحسبِ ظاہر: اول سر، دوم سینہ، سوم پشت، چہارم و پنجم ہر دو دست، ششم و ہفتم ہر دو پا۔ و بحسبِ باطن: دماغ و دل و جگر و سپرز و شش و زہرہ، و معدہ بعض بجائے معدہ گردہ نوشتہ اند۔ و موافق تفسیرِ حسینی چشم و زبان و گوش و بطن و فرج و دست و پا و تمام رگیست و آنرا بہمین سبب ہفت اندام گویند کہ بفصدِ خون سر و سینہ و پشت و دست و پا خارج می شود" (غیاث باستنادِ لطائف)۔

(۳) ھل اتیٰ: اشارہ ہے آیتِ قرآنی کی طرف۔ دیکھئے ۱/۷۶۔ ترجمہ یہ ہے:

"کیا انسان پر کوئی زمانہ ایسا آیا ہے کہ وہ کوئی چیز نہ تھا"

ی

(۱) **یزداں** : (دیکھئے زرتشت اور ثنویت اور دُوئی) علامہ کہتے ہیں کہ سیدنا حسینؑ کے ہمراہیوں کی تعداد یزداں کی ہم عدد تھی یعنی بہتر۔ بہ تفصیلِ ذیل :-

ی	=	۱۰
ز	=	۷
د	=	۴
ا	=	۱
ں	=	۵۰
یزداں	=	۷۲

(۲) **یزدجرد یا یزدگرد** : خانوادۂ ساسانی کا آخری بادشاہ ہے۔ سالِ جلوس ۶۳۲ء ہے حقیقت یہ ہے کہ یزدجرد کے تخت نشین ہونے سے پہلے ہی ساسانی سلطنت کی بنیادیں

متزلزل ہو چکی تھیں۔ آخری سالوں میں کئی ساسانی بادشاہ تختِ پر بیٹھے، معزول ہوئے اور ذلیل و خوار ہوئے۔ اس سلسلہ کی آخری کڑی یزدجرد تھا۔

جنگِ نہاوند کے بعد یزدجرد کی ہمت بالکل پست ہو گئی۔ آخر وہ ایک آسیابان کے ہاتھوں مارا گیا جو دراصل اس کے لباسِ فاخرہ کو حاصل کرنے کا متمنی تھا۔

ساسانیوں کا عہدِ حکومت ۲۲۶ء سے ۶۵۰ء تک ہے۔[1]

(۳) یزید: یزیدِ اول کا سالِ جلوس ۶۰ھ ہے اور سالِ وفات ۶۴ھ۔ اسی کے حکم سے حضرت امام حسینؓ کو شہید کیا گیا۔ بعض بر خود غلط مورخوں نے سرے سے واقعۂ کربلا ہی سے انکار کر دیا ہے اور بعض مورخ اس سلسلہ میں یزید کو حق بجانب ٹھہراتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ عامۂ مسلمین کا عقیدہ یہ ہے کہ یزید فاسق و فاجر تھا اور امام حسینؓ کے قتل کا حکم دے کر یا ان کی شہادت کے اسباب بہم پہنچا کر اس نے ایسی غلطی کی تھی جس کی نظیر عالمِ اسلام میں نہیں ملتی۔

(۴) یھدی من یرید: اشارہ ہے آیتِ قرآنی کی طرف۔ حوالہ یہ ہے ۲۲/۱۶

ترجمہ یہ ہے:

"اور اسی طرح ہم نے قرآن کو واضح نشانیاں (بنا کر) اُتارا ہے اور بے شک اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔"

---

[1] تاریخِ ادبیاتِ ایران: سلیم نیساری   تاریخِ ایران: عبداللہ رازی۔